صدرِ محترم

اشرف شاد

صدرِ محترم

سے

اشرف شاد

دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد

ضابطہ

ISBN: 969-496-228-5

کتاب	:	صدرِ محترم
مصنف	:	اشرف شاد
موسم اشاعت	:	2004ء
سرِ ورق	:	خالد رشید
مطبع	:	پرفیکٹ پرنٹرز
قیمت	:	320.00روپے

دوست پبلی کیشنز 8A خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

اپنی ناول نگار بیٹی

سمن شاد

کے نام

ناول میں شامل جملہ واقعات و کردار فرضی
ہیں اور کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

مصنف

ترتیب

پیش لفظ

جب ''وزیراعظم'' اشاعت کے مراحل طے کر رہا تھا تو نئے ناول کا ابتدائی خاکہ، پلاٹ، کرداروں کا انتخاب اور ابواب کی تقسیم تک مکمل ہوگئی تھی، اسی لیے ''وزیراعظم'' میں یہ نوید دی گئی تھی کہ ''صدرِ محترم'' ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آ جائے گا۔ بہت سے دوست بازار میں تلاش کرتے رہے، جو خیر خواہ تھے انہوں نے کسی نہ کسی ذریعے سے رابطہ کر کے بتایا بھی کہ کتاب بازار سے غائب ہے۔ ''دوست'' والے بھی مایوس ہونے لگے تھے۔ ''لوگوں نے اب پوچھنا چھوڑ دیا ہے۔'' آصف محمود نے پچھلے سال مجھے بتایا تھا۔ مجھے پتا ہے مارکیٹنگ کے اعتبار سے یہ اچھی خبر نہیں ہے۔ ہم ویسے بھی بھول جانے والے لوگ ہیں، لیکن تخلیقی کام بھی مشینی عمل یا ٹائم ٹیبل کا پابند نہیں ہوتا۔ ''صدرِ محترم'' لکھنے میں دو کی جگہ چار سال لگ گئے اور کتاب کے بازار میں آتے آتے شاید ۲۰۰۴ء آ جائے۔

کئی وجوہات تھیں۔ کچھ روزگار کی مصروفیات تھیں، حالاتِ زمانہ بھی سازگار نہیں تھے۔ ''وزیراعظم'' لکھنے کے دوران تین وزرائے اعظم بدلے تھے، ''صدرِ محترم'' لکھتے

ہوئے وزارتِ عظمٰی کے پورے ادارے ہی کی بساط الٹ گئی۔ اس وقت ایک دوست نے مشورہ دیا تھا کہ نام بدل کر ''چیف ایگزیکٹو'' رکھ دیا جائے، لیکن میں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، مجھے کتاب کا نام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

نام تبدیل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ ''صدرِ محترم'' محض ایک فینٹسی ہے، کسی سچ مچ کے کردار کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی...... یہ سبق میں نے ''وزیراعظم'' سے سیکھا تھا۔ کہانی وزیراعظم کی بھی افسانوی تھی، لیکن کئی کردار پاکستان کی سیاست سے لیے گئے تھے۔ اکثر قاری فرضی ناموں کے پیچھے چھپے ہوئے اصلی کرداروں کی تلاش میں کھو گئے۔ ان کرداروں میں بھی کسی نہ کسی کی شباہت تلاش کر لی گئی جو واقعی فرضی تھے۔ ''وزیراعظم'' کے برعکس میں نے ''صدرِ محترم'' میں یہ احتیاط رکھی ہے کہ کوئی کردار اتفاقاً بھی حقیقی نہ نظر آئے۔

''صدرِ محترم'' ایک مختلف طرح کا فکشن ہے۔ یہ ایک سپنا ہے۔ میں نے یہ خواب ''وزیراعظم'' لکھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اسے اس میں سمو نہ سکا تھا اسی لیے ''وزیراعظم'' اپنے انجام کے اعتبار سے ایک نامکمل ناول تھا۔ ''صدرِ محترم'' میں اس کی تکمیل ہوئی ہے۔ ایک ایسا صدر برسرِ اقتدار آیا ہے جو ملک کی کایا پلٹ کر اسے ''نیا پاکستان'' بنا دیتا ہے۔ یہ مستقبل کی کہانی ہے۔ ''وزیراعظم'' زمانۂ حال کی کہانی تھی۔ وہ حال جو ماضی ہی کا حصّہ تھا اور جس کے آئینے میں مستقبل دیکھنا مشکل تھا۔ میں نے یہ مستقبل ''صدرِ محترم'' میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن گزشتہ دو تین برسوں سے زمین اتنی تیزی سے گردش کر رہی ہے کہ مستقبل نزدیک آ کر پھر دور چلا جاتا ہے۔

پاکستان میں جب حالیہ فوجی انقلاب آیا تھا اس وقت میں ''نیا پاکستان'' والا باب لکھ چکا تھا۔ میں نے سڈنی میں ایک ایڈیٹر دوست کو گواہ بنا کر اس کے اقتباسات سنائے تھے۔ کئی چیزیں اسی طرح ہو رہی تھیں جیسے لکھی گئی تھیں، لیکن پھر سب کچھ آتے جاتے موسموں کا کھیل بن گیا۔ کئی بار یہ بھی ہوا کہ دنیا اس مقام پر آتے آتے رک گئی جو ''صدرِ محترم'' کی کہانی کا

اختتام ہے اور میں کانپ گیا کہ کہیں واقعی ایسا نہ ہو جائے۔ اس ناول کے آخری دو باب لکھتے ہوئے میں نے اپنی تمام عقیدتوں کو جمع کر کے یہ دعا کی تھی کہ میری کہانی کا انجام سچ ثابت نہ ہو...... میرا یہ ناول محض ایک فینٹسی ہی نہیں، امن کی شدید خواہش کا اظہار بھی ہے۔

پاکستان میں میرے پچھلے دونوں ناولوں ''بے وطن'' اور ''وزیر اعظم'' کے بارے میں کافی کچھ لکھا گیا۔ کچھ اچھا لکھا گیا ہوگا اور شاید کچھ اچھا نہ بھی لکھا گیا ہو۔ لیکن میں جہاں رہتا ہوں وہاں تک ان تمام چیزوں کی رسائی نہیں ہے اس لیے میرا ذہنی سکون اور اطمینان قائم ہے۔ بے خبری ایک نعمت ہے اور میں اس نعمت سے مالا مال ہوں۔ میری ایک الگ دنیا ہے جہاں میں زنگ آلودہ زنجیروں اور روایتی قیود سے آزاد ہو کر اور کسی تنقید نگار کو نہیں، قاری کو سامنے رکھ کر لکھتا ہوں اور اسی سے داد کا طلب گار بھی ہوں۔

یوں تو کئی رومانس ہیں جو تڑپ رہے ہیں، کئی سماجی موضوعات پر لکھنا چاہتا ہوں، کئی افسانے بھی کلبلا رہے ہیں، لیکن ''وزیر اعظم'' اور ''صدرِ محترم'' کے سلسلے کا ایک اور ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ ''جج صاحب'' کا خاکہ تقریباً تیار ہے، صرف رنگ بھرنا باقی ہے۔ یہ ایک ایسے ملک کی کہانی ہے جس کا منصف ظالموں سے مل گیا تھا۔ اُس ملک کی صرف اچھی بات یہ تھی کہ وہاں ججوں کے بارے میں لکھنے والوں کو توہین عدالت کی سولی پر نہیں چڑھایا جاتا تھا، اس لیے شاید میری بھی بچت ہو جائے۔

اشرف شاد

العین، ۹ رنومبر ۲۰۰۳ء

اختتام

1

نئ دہلی

''میں نے اس سے کہا سرے تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔'' پروفیسر شری واستو نے دایاں ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے پتلون کی کولھے والی جیب کو ٹٹول کر ایک رومال برآمد کیا جس سے اس نے اپنے چوڑے کشادہ ماتھے سے پسینہ پونچھا' رومال پچھلی جیب میں واپس رکھا اور بش شرٹ کی دل والی جیب سے ولز کی ڈبیا اور لائٹر نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔ سب کچھ اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے کیا تھا۔ بایاں ہاتھ اسی طرح جیب میں تھا جسے دائیں ہاتھ کی مصروفیات کا کوئی علم نہیں تھا۔ میں نے پروفیسر واستو کا بایاں ہاتھ ہمیشہ جیب ہی میں دیکھا تھا۔ آج اسے لنچ کے دوران دونوں ہاتھوں سے کانٹا چھری تھامے نہ دیکھتا تو میرا یہ خیال یقین بن جاتا کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں ہے' مصنوعی ہے یا چھ انگلیوں والا

ہے جسے وہ جیب میں چھپائے رکھتا ہے۔

''میں نے ایلن کو بھڑکا دیا۔ سسرامگا بے کی لینڈ ریفارمز کے خلاف اور گورے زمیں داروں کی طرف داری میں بول رہا تھا۔'' شری واستو نے بیک وقت نتھنوں اور حلق سے دھویں کا گہرا غبار خارج کر کے اور ہلکی سی پر اسرار مسکراہٹ پھینک کر کہا۔

''وہ ایک دم طیش میں آ گئی۔ اس نے اپنے سفیر سے ایسی ڈانٹ لگوائی کہ سسرے کے ہوش اڑ گئے۔ دوڑا دوڑا میرے پاس آیا کہ ایلن کو سمجھاؤ۔''

''ایلن کون؟'' میں نے اَن جان بن کر پوچھا۔

''یار وہی کینیا والی جو تمھارے لیکچر میں سب سے آگے بیٹھی بار بار سوال کر رہی تھی۔ وہ ہر بلیک کاز کے لیے جذباتی ہو جاتی ہے۔ آج کل اس پر زمبابوے کا بھوت سوار ہے۔''

مجھے وہ اچھی طرح یاد تھی۔ اس کا نام' اس کا سراپا اور اُس کے لباس کی ایک ایک تفصیل یاد تھی۔ بس اس کا نام لینا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سامنے آتے ہی نئی دہلی کی گرم دوپہر میں افریقہ کی صحرائی رات کی خنکی سما گئی تھی۔ وہ سیاہ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی جس کا رنگ اس کے اپنے رنگ سے مل گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ پہنے ہوئے نہ ہو۔ شوخ لال رنگ کا سادہ سا بلاؤز' لمبی سی صراحی دار گردن میں سونے کا ایک موٹا سا کڑا۔ اور ہونٹ' میں نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبائے تو سی نکل گئی۔ اس کے ہونٹ ایسے ہی تھے۔ موٹے موٹے' بہت نمایاں۔ نچلا ہونٹ زیادہ بھاری اور پھیلا ہوا۔ دونوں ہونٹ بلاؤز ہی کی طرح کے شوخ سرخ رنگ سے پُتے ہوئے تھے۔ میں کوئی اچھی سی تشبیہ سوچنے لگا۔ جیسے اندھیری رات میں جگنوؤں کی قطار۔ دہکتے ہوئے سرخ انگارے۔ شعلہ سا لپک جائے ہے ہونٹ تو دیکھو۔ مصرع کچھ جما نہیں تو ذہن میں ایک پرانی پاکستانی فلم کے مکالمے گونجنے لگے۔ کہاں سے لائی ہو یہ ہونٹ۔ کس نے دیے ہیں یہ ہونٹ۔ کیسے سجائے ہیں یہ ہونٹ......

اس کے سر پر باریک باریک چٹیوں کا بنا ہوا بڑا سا چھتا تھا۔ زلف شانوں پر کیسے

لہرائے گی؟ میری سوچیں بالکل ہی بے قابو ہو رہی تھیں۔

''یار بہت وقت لگتا ہوگا۔''

''بالکل نہیں۔ سسرا بہت بے شرم ہے۔ ڈانٹ کھاتے ہی بھاگا بھاگا آیا اور میرے سامنے بیٹھ کر ممیانے لگا۔'' شری واستو ابھی تک اپنے ڈائرکٹر کی شکست کا مزا لے رہا تھا۔

''وہ نہیں۔ ایلن۔ اس کے سر کی چٹیاں۔''

''ارے وہ۔ کوئی سمے نہیں لگتا۔ وہ ان کی ہابی ہے۔ ایک بار بنانے کے بعد کئی دن تک سر دھونے اور کنگھی کرنے سے فرصت مل جاتی ہے۔ ایلن کا اسائنمنٹ کبھی لیٹ نہیں ہوتا۔ کلاس میں بھی سب سے پہلے پہنچتی ہے۔''

شری واستو نے سگریٹ کا دھواں خارج کر کے ایلن کا خیال بھی ہوا میں اڑا دیا اور پھر اپنے پسندیدہ موضوع کی طرف آ گیا۔

''میں نے اس سے کہا ایلن کو میں دیکھ لوں گا لیکن کانفرنس کے لیے سنگاپور جانے کی پرمیشن......؟ دو منٹ میں اس کا سیکریٹری پرمیشن ٹائپ کر کے لے آیا۔ سالے نے ایک مہینے سے لٹکایا ہوا تھا' کہتا تھا نہیں جانے دوں گا۔ میں نے کہا سسرے تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔''

شری واستو نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ٹوٹا زور سے دور پھینکا' جیسے اپنے ڈائرکٹر کے منہ پر آگ کا گولہ کھینچ کر مار رہا ہو۔

پروفیسر شری واستو سے میری ملاقات پچھلے سال بنکاک میں گلوبل میڈیا پر ہونے والی ایک کانفرنس میں ہوئی تھی۔ میں نے جو مقالہ پڑھا تھا' اس میں ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مغربی پریس تیسری دنیا کی خبریں کس طرح مسخ کرتا ہے۔ شری واستو بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ پکاّ قوم پرست ہندوستانی تھا اور دلّی میں یونیسکو کی امداد سے چلنے والے ماس میڈیا انسٹیٹیوٹ میں تیسری دنیا کے ممالک سے آنے والے صحافیوں کے ایک کورس کا انچارج تھا۔ وہ پوری ایک شام مجھ سے الجھا مجھے تقسیم ہندوستان کے بارے میں اپنی تھیوری سمجھاتا رہا۔ اسے اپنی تھیوری

کی دوطرفہ تائید کے لیے ایک پاکستانی پروفیسر کی حمایت درکار تھی لیکن مجھے بنکاک کی شام تقسیم ہندوستان کی تھیوری پر ضائع کرنے کا شوق نہیں تھا۔ میں کانفرنسیں چھٹیوں کے طور پر گزارنا پسند کرتا ہوں۔ اپنا پیپر دیا' ہلکے پھلکے ہو گئے اور بس۔ کندھوں سے پروفیسری کا چوغہ اتارا اور شام ہوتے ہی خود کو میزبان شہر کی بانہوں میں دے دیا۔

لیکن پروفیسر شری واستو نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے ایک سیمینار دینے کے لیے مجھے انسٹیٹیوٹ کا دعوت نامہ بھجوا دیا۔ میں ہندوستان میں پیدا ہوا تھا لیکن کبھی ہندوستان گیا نہیں تھا۔ جانے کا شوق تھا۔ مڈٹرم بریک بھی تھا۔ میں دلّی پہنچا' سوچا تھا کہ پروفیسر شری واستو کی میزبانی کے مزے لوں گا۔ لیکن اب بیزار ہو رہا تھا۔ شری واستو بہت بور ثابت ہوا تھا۔ اس کی اپنے انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر سے نہیں بنتی تھی اور ڈائرکٹر سے ہونے والے جھگڑوں میں اپنی فتوحات کے قصے سنانا اس کا سب سے دل پسند مشغلہ تھا۔ یا پھر وہ تقسیم ہندوستان کی اپنی تھیوری میں الجھائے رکھتا۔ اس وقت وہ اپنی تھیوری ثابت کرنے مجھے راج پت لے کر جا رہا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ تقسیم ہندوستان کی تھیوری کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے بعد شری واستو سے جان چھڑا لوں گا اور دلّی کی شاموں اور راتوں کی اپنے طور پر کھوج لگاؤں گا۔ ایلن نے بھی شام کو فون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ شاید وہ آ جائے۔ میری فتوحات میں افریقہ شامل نہیں تھا۔ ایلن میں بہت سے امکانات نظر آ رہے تھے۔ سیمینار کے بعد لنچ میں وہ میرے ساتھ چپکی رہی تھی۔ میری ریسرچ کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہی تھی۔ کئی بار میری آنکھوں میں جھانک کر معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ میرا بلڈ پریشر کئی بار بڑھا تھا۔ میں اسے ڈنر پر چلنے کے لیے کہوں گا۔ شاید مان جائے۔ وہ Globalisation کے خلاف نوجوانوں کی عالمی تحریک ''ایس الیون'' میں شامل تھی۔ ملبورن میں عالمی اقتصادی فورم کا اجلاس ہونے والا تھا۔ ان کے خلاف مظاہرے میں شریک ہونے اسے ملبورن جانا تھا۔ پچھلے سال وہ عالمی تجارتی اداروں کے خلاف مظاہرہ کرنے سیاٹل اور واشنگٹن بھی جانا چاہتی تھی لیکن ان شہروں میں اس کا کوئی جاننے

والا نہیں تھا اس لیے نہیں جا سکی تھی۔ میں نے اسے دعوت دے دی تھی کہ وہ ملبورن میں میرے پاس رہ سکتی ہے۔

''لیکن آپ تو سڈنی میں رہتے ہیں۔''

''میرا ملبورن میں بھی ایک فلیٹ ہے۔ میں دو شہروں میں رہتا ہوں۔'' میں نے اسے سمجھا دیا تھا۔ ساتھ ہی ذہن میں منصوبہ بھی بن گیا تھا۔ چوہدری صاحب ملبورن میں اپنے فلیٹ میں اکیلے رہتے ہیں۔ ان سے کہوں گا کہ ایک ہفتے کے لیے کسی دوست کے پاس رہنے چلے جائیں۔ وہ ملبورن آئے گی تو ہفتے بھر کی چھٹی لے کر میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ ہم فلیٹ میں تنہا ہوں گے تو پوچھوں گا کس نے دیے ہیں یہ ہونٹ۔ کہاں سے لائی ہو یہ ہونٹ۔ کیسے سجائے ہیں یہ ہونٹ...... زلفیں نہ لہرائیں تو کیا ہوا۔ مجھے ویسے بھی زلفوں کا اپنے شانوں پر لہرانا پسند نہیں ہے۔ وہ تکیے پر سجی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں۔

''کہاں کھو گئے پروفیسر؟'' شری واستو نے رومال نکال کر پیشانی سے پسینہ پوچھنے اور سگریٹ سلگانے کا عمل دہراتے ہوئے مجھے چونکایا۔

''آں...... ہاں...... کہیں نہیں، میں......''

''پچھلے سال بھی سسرے نے یہی کیا تھا۔'' شری واستو نے میری وضاحت سنے بغیر اپنی داستان پھر شروع کر دی۔ ''بنکاک کا انویٹیشن دبا کر بیٹھ گیا۔ کہتا تھا نہیں جانے دوں گا۔ میں نے عرب لڑکوں کو بتا دیا کہ سسرے نے اسرائیلیوں کو انسٹیٹیوٹ آنے کی دعوت دی ہے۔ دنگا ہوا تو بھاگا بھاگا آیا اور گڑگڑانے لگا کہ احمد کو سمجھاؤ۔ میں نے کہا بنکاک...... تو دومنٹ میں پرمیشن ٹائپ کر کے دے دی۔ میں نے کہا سسرے تجھے تو میں دیکھ لوں گا......''

پروفیسر واستو کی لن ترانیاں جاری تھیں۔ میں نے اپنی سماعتوں کے دروازے بند کر لیے اور افریقہ پہنچ گیا۔ افریقہ نہیں ملبورن۔ ایلن آ چکی تھی۔ ہم فلیٹ میں اکیلے تھے اور میں پوچھ رہا تھا کہاں سے لائی ہو یہ ہونٹ......

ہم انڈیا گیٹ کی چوڑی اور سرخ پتھروں والی سڑک پر چلتے ہوئے وجے چوک پہنچ گئے اور اب رائے سینا ہل کی چڑھائی طے کرتے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ شری واستو اپنے ڈائرکٹر کی کہانی درمیان میں چھوڑ کر خاموش ہو گیا تھا' شاید پرانا ٹیپ اتار کر نیا ٹیپ چڑھا رہا تھا۔ چڑھائی ختم ہوتے ہی ٹیپ بجنا شروع ہو گیا۔ کاہل نظر آنے والے شری واستو میں اچانک بہت سی توانائی آ گئی۔ سگریٹ ابھی آدھا باقی تھا لیکن اس نے زمین پر پھینک کر جوتے سے رگڑ دیا۔ پہلی بار دونوں ہاتھ جیبوں سے باہر نکل آئے۔ ''پروفیسر! تم بڑے بڑے سرخ پتھروں والی یہ عالی شان عمارتیں دیکھ رہے ہو۔'' شری واستو نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھومنے اور ساتھ میں مجھے گھماتے ہوئے کہا۔

''دیکھو وہ سامنے راشٹر پتی بھون ہے۔ ایوان صدر...... یہاں وائسرائے رہا کرتا تھا۔ یہ دونوں طرف کی لمبی چوڑی بلڈنگیں اس کے دفتر تھے جہاں سے گوری سرکار اس دیش کے کالوں پر حکومت کرتی تھی۔ سرکار آج بھی یہیں بیٹھی ہے۔ دائیں طرف ہوم اور بائیں طرف فارن منسٹری ہے۔ پلٹ کر دیکھو وہ بڑا سا میدان۔ وہ بھی پورا سرخ پتھروں سے بنا ہے اور وہ انڈیا گیٹ جہاں سے گزر کر ہم یہاں آئے ہیں۔ پہلے بھی یہاں دیسی فوجی پریڈ کرتے تھے۔ اس وقت بینڈ انگریزی ہوتا تھا۔ بینڈ اب بھی وہی ہے صرف وِنڈ وڈریسنگ بدل گئی ہے۔ تم کو پتا ہے پروفیسر! یہ ساری عمارتیں اور سڑکیں بنانے پر کتنی مایا خرچ ہوئی ہوگی۔ کتنا سمے لگا ہوگا؟ آؤ میں تمھیں دکھاؤں۔''

شری واستو مجھے بار بار سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے چار اونچے اونچے ستونوں کی طرف لے گیا اور ان پر کندہ عبارتیں دکھانے لگا۔ ''یہ چاروں انگریز ایمپائر کے گیٹ تھے۔ یہ ساؤتھ بلاک ہے جہاں نیوزی لینڈ سے انڈیا اور کینیڈا سے انڈیا کے یہ دو کھمبے کھڑے ہیں۔ اور نارتھ بلاک میں ساؤتھ افریقہ اور آسٹریلیا کے کھمبے۔ دیکھو ان پر جو سال کھدا ہے۔ ۱۹۳۰ء۔ تمھارا خیال ہے' کنجوس انگریز آزادی دینے سے صرف چند سال پہلے یہ عمارتیں بنا کر

اپنے غلاموں کو اتنی منہگی بھینٹ دے کر جانا چاہتا تھا؟''

شری واستو نے خاموش ہو کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں خاموش رہا۔ میں اس کا ٹیپ پورا سننا چاہتا تھا۔ ''نہیں پروفیسر! نہیں''۔ ٹیپ رک کر دوبارہ چلنا شروع ہو گیا۔ ''انگریز جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے یہاں اپنی ایمپائر کا دوسرا کیپٹل بنایا تھا۔ لندن کو خطرہ ہو تو ملکہ اس اونچے استھان اور موٹے موٹے پتھروں کی دیوار کے پیچھے بیٹھ کر حکومت کر سکے۔ لڑائی جیت کر بھی وہ اپنے تاج کا سب سے بڑا ہیرا نوچ کر پھینکنا نہیں چاہتا تھا' لیکن نیشنلسٹوں نے اسے مجبور کر دیا۔ وہ بوریا بستر گول کرنے پر مجبور ہوا تو جاتے جاتے سینے میں خنجر مار گیا' ہمیں کاٹ کر دو کر گیا۔ ایک دوسرے سے الگ الگ کر گیا۔ دیکھو ہمارے زخموں سے اب بھی خون رِس رہا ہے۔ یہ آزادی نہیں تھی' سازش تھی سازش۔ سسرے انگریز کی سازش۔''

شری واستو اپنی تقریر ختم کر کے اپنی کولھے والی جیب ٹٹول رہا تھا۔ میں بھی ایلن کو ملبورن کے فلیٹ میں تنہا چھوڑ کر واپس آ گیا۔ مجھے واپس آنا ہی تھا ورنہ مجھے خطرہ تھا کہ پروفیسر جو پہلے ہی سرحد پھلانگ چکا تھا اور اندر تک گھسا چلا آئے گا۔ اس کی تقسیم ہندوستان کی تھیوری جس نے مجھے اس دھوپ میں جھلسایا تھا میرے اندر بھی آگ لگا رہی تھی۔

''تم...... میری قوم پرستی کو سازش کا نتیجہ بتا کر اپنی قوم پرستی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔'' میرے لہجے میں جو اہانت تھی وہ چھپی نہ رہ سکی۔

''نہیں پروفیسر! نہیں' میں تو......''

''میری بات مت کاٹو اور سنو!''

میں نے اپنا بایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت سے شری واستو کے سینے میں چھید کرتے ہوئے اپنی تقریر شروع کی: ''شری واستو! تم میڈیا پڑھاتے ہو لیکن تم نے تاریخ نہیں پڑھی اور پڑھی ہے تو ایک آنکھ بند کر کے۔ تمھیں اپنے نیشنلٹوں پر بہت فخر ہے۔ جاؤ' ان کے ناموں کی فہرست پڑھ کر آؤ۔ ان میں میرے مردانِ مجاہد بھی ہیں۔ اور

اتنے ہیں کہ تم گنتی بھول جاؤ گے۔ تم سمجھتے ہو انگریز تمھارا دشمن تھا؟ انگریز تمھارا نہیں ہمارا دشمن تھا۔ اس نے حکومت تم سے نہیں، ہم سے چھینی تھی' اس کے خلاف جگہ جگہ اور بار بار لڑائیاں تم سے زیادہ ہم نے لڑی تھیں' تلوار کے دھنی بھی ہمارے تھے۔ ان کی آنکھوں کے شعلے بجھ کر راکھ بن گئے تھے پھر بھی ان سے چنگاریاں نکلتی تھیں۔ وہ تو ہماری عربی فارسی سے بھی ڈرتا تھا۔ حکومت لیتے ہی اس نے فارسی کی سرکاری حیثیت بدل دی تھی۔''

شری واستو اسی طرح اپنے دونوں ہاتھ کو جیبوں میں ڈالے آسٹریلیا والے ستون سے ٹکا ہوا کھڑا خاموشی سے میری تقریر سن رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پلکیں جھپکانا بھول گیا ہو۔

''تم نے اپنی شناخت کی ساری گواہیاں ہم سے ادھار لی تھیں۔ صرف ایک تاج محل' ایک شاہی قلعہ اور ایک قطب مینار ہی نہیں تھا۔ زمین پر جگہ جگہ اُگے ہوئے محل' قلعے اور مینار' وہ جرنیلی سڑک' میر و غالب اور اقبال...... سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' وہ سب ہمارے تھے۔ انگریز یہ سب کچھ جہیز میں تمھیں دے گیا۔ ہمیں کیا ملا۔ جنوب میں ایک بڑا ریگستان۔ درمیان میں جو ہرے بھرے کھیت تھے اس نے وہ بھی درمیان سے کاٹ کر ان پر خون کی لکیر پھیر دی۔ اس کے آگے شمال اور مغرب کے بنجر' پتھریلے پہاڑی سلسلے جہاں افیم اگتی ہے یا گولیاں گونجتی ہیں۔ ہمارے جو دریا تھے ان کا گلا بھی اس نے تمھارے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔ یہ اگر سازش تھی تو تمھارے نہیں' ہمارے خلاف تھی۔ انگریز نے اپنے پرانے آقاؤں کو سزا دی تھی۔''

شری واستو نے ستون کی ٹیک چھوڑ دی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ مجھے سگریٹ چھوڑے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے لیکن اس وقت طلب ہو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو شری واستو نے سگریٹ کی ڈبیا میرے آگے کر دی۔ میں نے ایک سگریٹ لے کر ہونٹوں میں دبایا لیکن شری واستو کو سلگانے نہیں دیا بلکہ دانتوں سے سگریٹ کا فلٹر چبانے لگا۔ غصہ پھر بھی دھیما نہیں ہو رہا تھا۔

''تمھیں پتا ہے، تمھارا اور تم جیسے لوگوں کا مسئلہ کیا ہے؟ تم اپنی تاریخ سے پچھلی سات آٹھ صدیاں پھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو۔ تم ایک ہونے کا خواب بار بار ری سائکل کر کے نئی تھیوریاں گڑھتے ہو۔ شری واستو! یہ کام تنگ نظر مہا سبھائیوں پر چھوڑ دو۔ تم ایک کھلے ذہن کے آدمی ہو، حقیقت پہچانو...... ہم اور تم جس شکل میں ہیں وہی ہماری حقیقت ہے۔ تم ہمیں تباہ نہیں کر سکتے، ہم تمھیں تباہ نہیں کر سکتے۔ اس حقیقت کے ساتھ زندہ رہنا سیکھو۔''

''ہاہاہاہا......'' فضا میں شری واستو کا اونچا قہقہہ گونجا۔ جیسے ہنس کر اس نے سارا تناؤ جھٹک دیا ہو۔ میں نے بھی کچلے ہوئے فلٹر والا بے جلا سگریٹ منہ سے نکال کر پھینکا اور غصہ تھوک کر حیرت سے شری واستو کو دیکھنے لگا۔

''پروفیسر! خاتمہ ہمارا تمھارا نصیب ہے۔ ہمیں ختم ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' شری واستو کی آواز پہلے سے کچھ زیادہ اونچی ہو گئی تھی۔ ''آؤ، تمھیں بتاؤں کیوں؟'' وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر نیچے کی طرف گھسیٹنے لگا، ساتھ ہی اس کا مکالمہ بھی جاری تھا۔

''ہمیں خود کشی کرنے کا شوق ہے۔ ہم بہت سخت جان ہیں، بار بار بچ جاتے ہیں لیکن پھر کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ تم صحیح کہتے ہو تم ہمیں یا ہم تمھیں ختم نہیں کر سکتے لیکن ہم اپنے آپ کو ختم کر سکتے ہیں۔ اپنا جسم دیکھو۔ اس پر جو گھاؤ ہیں وہ ہم نے نہیں، تم نے خود لگائے ہیں۔ ہمارے بدن کے داغ دھبے بھی خود ہمارے بنائے ہوئے ہیں، تمھارے نہیں۔ مجھے اپنی اور تمھاری اس صلاحیت پر پورا بھروسا ہے۔ ہم بہت جلد خود کو مکمل طور پر ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' شری واستو نے ایک بار پھر زور کا قہقہہ لگایا۔

ہم ساؤتھ بلاک کی طرف دیوار میں گڑے ہوئے ایک سنگ بنیاد کے سامنے رک گئے۔ اس پر عمارتیں تعمیر کرنے والے ٹھیکے داروں کے نام کھدے تھے۔

''پڑھو پروفیسر! تم بھی پڑھ کر دیکھو۔'' شری واستو نے پتھر پر کھدے ہوئے ناموں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''سردار بہادر، خان بہادر، خان صاحب، نواب صاحب، انگریز اپنی حکومت ہمیں نہیں، اپنے انھی پجاریوں کو دے کر گیا تھا۔ یہاں بھی راج گھاٹ انھی سسروں کا ہے۔ تمھارے آقا بھی یہی نواب اور خان بہادر ہیں۔'' شری واستو مجھے لے کر دوبارہ انھی ستونوں کی طرف واپس چل پڑا۔

''جب تک ہم اس نیو کے پتھر کو اکھاڑ کر نہیں پھینکیں گے اور یہ چاروں کھمبے نہیں گرائیں گے جو ہماری غلامی کا نشان بنے کھڑے ہیں، ہمیں آزادی نہیں ملے گی۔ ہم کبھی آزاد نہیں ہوں گے۔ یہی میری آزادی کی تھیوری ہے۔ وہ نہیں جو تم سمجھ کر غصہ کر رہے تھے۔''

ہم چلتے ہوئے گیٹ وے ٹو انڈیا والے ستونوں تک پہنچ گئے تھے۔ میرا خیال تھا ہم واپسی کے سفر پر ہیں لیکن شری واستو ایک ستون کے پاس جا کر ٹھیر گیا۔

''پروفیسر! یہ کھمبے گرانے ہی ہوں گے۔ انھیں ہم مل کر ہی گرا سکتے ہیں۔ آؤ شروع کریں۔ میں اس کھمبے کو دھکا دیتا ہوں، تم سامنے نارتھ بلاک والا کھمبا پکڑ لو۔'' شری واستو یہ کہہ کر ستونوں کو سچ مچ دھکا لگانے لگا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ شری واستو شاید دیوانہ ہو گیا تھا۔

''جاؤ پروفیسر! جا کے اپنے کھمبے کو دھکا دو، یہ کھمبے ہمیں آج ہی گرانے ہیں۔'' شری واستو ستون کو دھکا لگاتے ہوئے اپنا چہرہ میری طرف کر کے چلایا۔ میں تماشا بننے کے خوف سے جلدی جلدی قدم بڑھا کر نارتھ بلاک کی طرف چل دیا اور ستونوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

''دھکا لگاؤ پروفیسر!...... زور لگا کے ہیا......'' شری واستو میری طرف منہ کر کے ایک بار پھر چیخا۔ میں بھی سچ مچ ستون کو دھکا دینے لگا۔ شری واستو کی دیوانگی نے شاید مجھے بھی چھو لیا تھا۔

لیکن یہ کیا......؟؟؟

ستون سچ مچ گرنے لگا۔ پتھر آگ بن کر نرم ہو گئے تھے۔ میں جس ہاتھ سے دھکا

دے رہا تھا' وہ ستون کے اندر گھس کر پتھر کے ساتھ گھل گیا۔ بدن کا گوشت موم کی طرح ہڈیوں سے پگھل کر اتر رہا تھا۔ ہڈیاں بھی برقی ہیٹر کے تاروں کی طرح سرخ ہو کر چمکنے لگی تھیں۔ شری واستو جس ستون کو دھکا دے رہا تھا' وہ اور دوسرے ستون بھی ایک ایک کر کے گر گئے۔ خود شری واستو دھوئیں کی لکیر بن گیا تھا۔ میرے ذہن میں آنے والی آخری تصویر ایلن کے ہونٹوں کی تھی لیکن وہ بھی لال رنگ کا سیّال بن کر بہہ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہر شبیہہ ہر خیال فنا کے تاریک غاروں میں دفن ہو گیا۔

جہاں راشٹر پتی بھون تھا وہاں سے دھوئیں کا ایک بڑا سا مرغولہ اٹھ کر بڑے سے مشروم کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

2

اسلام آباد

آج منگل کا دن تھا۔ گاڑی میں صرف تین مسافر تھے۔ ایک غیر ملکی تھا۔ حلیے سے
امریکی لگتا تھا۔ ایک بہت ضعیف اور نڈھال سا شخص تھا۔ اُس کے ساتھ اس سے آدھی عمر کی
ایک عورت تھی۔ دیکھنے میں اس کی دیکھ بھال کرنے والی نرس یا ملازمہ لگتی تھی۔ ہوسکتا ہے، بیوی
ہو۔ اکثر بڈھے آخری عمر میں شادی کر کے بیوی کی شکل میں ایک مفت کی ملازمہ رکھ لیتے ہیں۔
دونوں پاکستانی معلوم ہوتے تھے۔ آپس میں باتیں بھی اردو میں کر رہے تھے لیکن اس امریکی
کی وجہ سے مجھے مسلسل انگریزی بولنا تھی۔ میں آہستہ آہستہ اپنا جبڑا کو سہلا کر اسے اس مشقت
کے لیے تیار کرنے لگی۔

جانے منگل کا دن اتنا سست کیوں ہوتا ہے۔ بدن خود بخود انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ سوچتے

ہی مجھے ایک بڑی سی جماہی آ گئی۔ آج کی نہیں، ہر منگل کی یہی کہانی تھی۔ کسی بھی منگل کو تین چار سے زیادہ مسافر نہیں ہوتے تھے۔ آدھی سے زیادہ گاڑی خالی دیکھ کر خواہ مخواہ سستی سوار ہونے لگتی، ہنسنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مسکرانا پڑتا تو مسکراہٹ بھی تھکی تھکی سی باہر نکلتی۔ میں ہمیشہ سوچتی ہوں کہ ہفتے کے سات دنوں میں صرف منگل کو دنیا بھر میں سست ہونے کا اعزاز کیوں حاصل ہے۔

ہندوؤں کے لیے منگل کے معنی خوشی، ہندستان جاؤ تو وہاں بھی منگل بیٹھا ستا رہا ہے۔ سب برت رکھ کر اینڈ رہے ہیں، گوشت سے پرہیز کر رہے ہیں، لیکن پاکستان میں تو مسلمان رہتے ہیں وہاں بھی گوشت کا ناغہ منگل کے دن! یورپ امریکہ جاؤ تو وہاں بھی مندی کا دن منگل۔ میں جب سڈنی میں تھی تو فلم دیکھنے کا دن تھا منگل Super Tuesday ہر فلم کا ٹکٹ آدھی قیمت کا۔ ہر ٹیکسی ڈرائیور مسافروں کے نہ ہونے کی شکایت کرتا ہوا۔ بار اور کیفے اپنی کرسیاں سرِ شام ہی الٹ دیتے۔ وہاں تو وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ ہفتہ وار تنخواہیں بدھ یا جمعرات کو ملتی تھیں۔ منگل جیب خالی ہونے کا دن تھا۔ تنخواہوں کے بنک اکاؤنٹ میں آتے ہی کرنٹ دوڑنے لگتا۔ جمعرات کو ہر سرگرمی اپنے شباب پر ہوتی۔ چھ بجے بند ہونے والے بازار بھی نو بجے تک کھلے ہوتے۔

لیکن یہ پاکستان کو کیا ہوا؟ جب چھٹی جمعے کے دن تھی ...... منگل جب بھی منگل تھا اور اب اتوار چھٹی کا دن ہے تب بھی منگل، منگل کی طرح ہے۔ منگل بازار کے علاوہ کہیں رش نہیں ہوتا۔ رش مجھے پسند ہے۔ کام کرنے میں مزہ آتا ہے۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ درجن بھر سواریوں میں ایک دو ایسے ضرور نکل آتے ہیں جن میں حسِ مزاح ہوتی ہے۔ ان سے نوک جھونک کر کے قہقہے لگانا اچھا لگتا ہے۔ گاڑی میں قہقہے گونجتے ہوں تو سفر آسان ہو جاتا ہے اور کام بھی! ان قہقہوں کی گونج سیاست کے اس عجائب گھر میں بھی سنائی دیتی ہے جہاں مجھے ٹور گائڈ کی حیثیت سے دن میں کئی بار المیوں سے بھری تاریخ کا سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ ماحول کا بھاری پن ہنسنے اور مسکرانے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔

مجھے ٹور گائڈ کے کام کی تربیت دینے والے نے یہی سمجھایا تھا۔ سڈنی میں جب

اولمپکس ہوئے تو میں وہیں تھی۔ میں جس کے ساتھ رہتی تھی' وہ رضا کار بھرتی ہونے گئی تو مجھے بھی ساتھ لے گئی تھی۔ وہ ایک دل چسپ تجربہ تھا۔ میرا کام شہر کی سیر کو جانے والے کھلاڑیوں کو گائڈ کرنا تھا۔ جس نے ہماری تربیت کی تھی' وہ خود بھی رضا کار اور ایک تجربہ کار گائڈ تھا۔ اس کا کہنا تھا' تم کتنی ہی خوب صورت تاریخ بیان کر رہی ہو یا بہت خوب صورت منظر کشی کر رہی ہو' کوئی بھی تین منٹ سے زیادہ اپنی توجہ قائم نہیں رکھ سکے گا۔ اس لیے بیچ میں لطیفے ڈالو' انھیں گفتگو میں شامل کرو' کوئی نہ کوئی حاضر جواب یا لطیفہ باز تمھارا کام خود بخود آسان کر دے گا۔ اس زمانے میں میری انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی۔ لیکن ٹور لینے والے کھلاڑی بھی انگریزی بولنے والے ملکوں کے نہیں تھے اس لیے میری انگریزی چل نکلی تھی اور ہر روز کئی گھنٹے بولتے رہنے کی وجہ سے فرّاٹے بھرنے لگی تھی۔

میں نے بہت مشکل سے ایک اور آنے والی جماہی روکی۔ مجھے معلوم تھا' بار بار جماہی لینے سے مسافروں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا' وہ خود بھی جماہیاں لینے لگیں گے۔ پورا سفر بہت بور گزرے گا۔ ایوان صدر کو سیاست کے عجائب گھر میں تبدیل کرنا ایک انوکھا تجربہ تھا اس لیے اسلام آباد آنے والے ملکی اور غیر ملکی دونوں اسے دیکھنے کھنچے کھنچے آتے۔ یہ عجائب گھر پاکستان کی سیاست کا ایسا سفر تھا جس میں گڑھے ہی گڑھے اور کھائیاں ہی کھائیاں تھیں۔ ہر مقام افسوس کا مقام تھا۔ ہر سنگ میل گزرے ہوئے سفر کا نوحہ پڑھتا ہوا۔ ہر کتبے پر کھدا ہوا نام اور سنہ دل میں خوشیوں کے بجائے المیوں کی یادیں تازہ کرتا ہوا۔ میوزیم بنانے والوں نے یہ سفر خوش گوار بنانے کے لیے بہت محنت کی تھی لیکن اپنے بدن کے داغ دھبوں کی نمائش کرتے ہوئے مسکراہٹیں بانٹنا آسان کام نہیں تھا۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ ٹور میں شریک کسی نہ کسی پاکستانی کی حب الوطنی جوش میں آ جاتی۔ وہ مجھے اردو یا پنجابی میں ڈانٹنے لگتے کہ میں غیر ملکیوں کے سامنے اپنا ملک بدنام کر رہی ہوں لیکن مجھے ان کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ ایمان علی کا کہنا تھا' داغ دھبے اجاگر نہیں ہوں گے تو صاف بھی نہ ہو سکیں گے۔ ڈھانپنے اور چھپانے کی کوششوں نے زخم ناسور

بنا دیے تھے۔ ان میں پیپ پڑ گئی تھی۔ انھیں سکھانے اور مندمل کرنے کے لیے کھلی ہوا کی ضرورت تھی۔ صدر ایمان علی کی باتیں تاریکی میں بھٹکتی ہوئی حبّ الوطنی کو ایک سمت دینے لگی تھیں۔

ایمان علی نے صدر بننے کے بعد ایک معمولی مکان کو اپنا دفتر اور قیام گاہ بنایا تھا اور ایوان صدر کو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایوان صدر کو میوزیم بنانے میں ایک سال سے زیادہ لگ گیا تھا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ یہ ایک نیا اور انوکھا خیال تھا جو ماہرین کے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا۔ ایمان علی نے کئی عالمی ماہرین کو دعوت دی تھی۔ میوزیم بنانے میں ان سب کے ماہرانہ مشورے شامل تھے۔ کسی نے ان مشوروں کی فیس نہیں لی تھی۔ مصوروں اور مجسمہ سازوں نے بھی کسی معاوضے کے بغیر تصویریں بنا کر اور بت تراش کر اپنے فن کا حق ادا کیا تھا۔ ملاؤں نے ایمان علی پر بت پرستی کو فروغ دینے کے الزامات لگائے تھے۔ ایمان علی کا کہنا تھا کہ وہ بت پرستی نہیں، بت شکنی کر رہا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ہر بت مجسمے کی شکل میں موجود تھا۔ ساتھ ہی ان کا نامۂ اعمال بھی ٹنگا ہوا تھا۔ اسے پڑھنے سے کئی بت پاش پاش ہوئے تھے۔ جس نے بھی عجائب گھر کی سیر کی تھی ایمان علی کی بات سچ جانی تھی کہ اس نے بت بنا کر بت توڑے تھے۔ یہ ایک نئی طرح کی بت شکنی تھی۔ یہ عجائب گھر تھا بھی نہیں۔ یہ ایک عبرت کدہ تھا۔

میں دن میں کئی بار سیاحوں کو لے کر یہاں آتی تھی اور ہر بار مجھے سب سے اچھا وقت وہ لگتا جب گیٹ میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے آتی ہوئی موسیقی کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگتی۔ سب سے پہلے قومی ترانے کی دُھن اور اس کے بعد مرکزی ہال کی بیرونی سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے باری باری ہر علاقے کی مشہور لوک دھنیں۔ سب تانیں ایک دوسرے سے مل کر اچھی لگتیں، بے جوڑ ہونے کا احساس نہیں ابھرتا۔ مایوسی کی لے دھیمی ہونے لگتی۔ مرکزی ہال بہت وسیع و عریض اور پُرشکوہ تھا۔ مغرور ستونوں پر ٹکی ہوئی اونچی چھت۔ رنگین وردیوں میں چاروں کونوں میں کھڑے باادب خدّام۔ وسط میں سب سے بڑا حصہ

بانیء پاکستان کے لیے مخصوص تھا۔ سب سے اونچا' بارعب اور باوقار۔ کالی شیروانی اور سفید شلوار۔ ایک آنکھ پر پڑھنے والے چشمے کا عدسہ ٹکا ہوا۔ چاروں طرف شیشے کے شوکیسوں میں ان کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں تھیں۔ وہ پرچم تھا جو پاکستان بننے کے بعد پہلی بار لہرایا گیا تھا۔ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کا مسودہ بھی تھا۔ بری' فضائی اور بحری فوج کے تین سپاہی اپنی اپنی فوجی وردی میں سلیوٹ دینے کے انداز میں تنے کھڑے ہوتے۔ ایسا لگتا جیسے ان کے سلامی دینے والے ہاتھ کبھی نہیں گریں گے۔ ہر گھنٹے بعد یہ تینوں سپاہی بدل جاتے۔ ان کی جگہ آنے والے سلامی دے کر اپنی پوزیشن سنبھالتے اور ان کے ہاتھ اگلے ایک گھنٹے تک اسی طرح ماتھے پر ٹکے رہتے۔

ایک بڑا سا میورال تھا۔ ''آغاز سفر۔'' کئی مصوروں نے مل کر بنایا تھا۔ آغاز سفر کی یہ کہانی خون سے لکھی ہوئی تھی۔ ٹرین کی اکھڑی ہوئی پٹڑیاں' ڈبوں کی کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی لاشیں' کھیتوں' کھلیانوں اور مکانوں سے اٹھتے ہوئے آگ کے شعلے۔ ہاتھوں میں پرچم لیے ایک بڑا سا ہجوم رواں دواں تھا' جس کی آنکھوں میں چمک' آگ اور خون کا دریا پار کرنے کا حوصلہ اور نئے مستقبل کی تعمیر کی لگن تھی۔ مرکزی ہال کے چاروں طرف ان لوگوں کے مجسمے تھے جو کبھی نہ کبھی پاکستان کے صدر رہے تھے۔ کوئی تمن دار تھا اور کوئی چوہدری۔ شلوار قمیص میں ملبوس ایک بُت بہت نمایاں تھا لیکن اس کے سر پر بھی فوجی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ سفید رنگ کی وردی کے کوٹ پر تمغے سجائے ہوئے انگریزوں کے زمانے کا ایک ڈپٹی کمشنر بھی تھا۔ ایک بت ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے کھڑا تھا۔ ایک مولوی جیسا شخص ہاتھ اور چہرے کے ساتھ خود بھی جھکا ہوا تھا جیسے پیٹھ پر کوئی سوار ہو۔ تاریخ کی گرد میں گم ہو جانے والے کئی اور چہرے تھے۔ ان سب کے چہرے مجرموں جیسے تھے۔ سب کے پیچھے ان کے گناہوں کی تاریخیں اور عنوان چارٹ کی شکل میں لٹکے ہوئے تھے۔ میں کبھی کبھی سوچتی' اگر بانئ پاکستان کے بت میں جان پڑ گئی تو وہ اپنے ہاتھوں میں لوہے کا گرز لے کر سارے بُت ریزہ ریزہ کر دیں گے اور پھر اپنی

جگہ پر آ کے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر بیٹھ جائیں گے۔

مرکزی ہال سے لفٹ اوپر لے کر جاتی تھی جہاں صدر کا دفتر تھا۔ اسے اس کی اصل حالت میں رہنے دیا گیا تھا۔ صرف دیوار پر چاروں طرف وہ حکم نامے فریم کر کے لگائے گئے تھے جن کے ذریعے اپنے اپنے وقت کے صدر یا گورنر جنرل نے حکومتیں اور اسمبلیاں توڑی تھیں۔ دیواریں بھری ہوئی تھیں اور ان پر اب کوئی نیا فریم لٹکانے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ ایک کمرے میں وہ آئین اور آئینی ڈھانچے رکھے ہوئے تھے جو مختلف اوقات میں معطل، منسوخ کیے یا بدلے گئے تھے۔ اس کمرے میں چاروں طرف پھٹے ہوئے کاغذوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ راہ داریوں میں جا بجا کھونٹیوں پر فوجی ٹوپیاں اور وردیاں اور وہ شیروانیاں لٹکی ہوئی تھیں جو یہاں رہنے والے پہنا کرتے تھے۔ ان راہ داریوں سے گزرتے ہوئے دونوں طرف کی دیواروں سے فوجی بینڈ بجنے کی آوازیں آتی سنائی دیتیں۔ کبھی کبھی درمیان میں سندھی یا پنجابی کی کوئی اداس سی لوک دُھن ابھرنے لگتی جسے سن کر غم، افسوس، صدمے اور مایوسی کے سب جذبے ایک ساتھ مل کر حملہ آور ہوتے۔

میں دن میں کئی کئی بار میوزیم دیکھنے کے لیے آنے والوں کو ایک ایک بُت کے سامنے اور ایک ایک کمرے میں لے جا کر رٹے ہوئے سبق دہراتے ہوئے کبھی تھکی نہیں۔ ٹور گائڈ کی یہ ملازمت میرے لیے ایک بہت دلچسپ، انوکھا اور سنسنی خیز تجربہ تھی۔ اپنے کارآمد ہونے کا احساس ہوتے ہی میں سڈنی کو ایک برے خواب کی طرح بھول گئی تھی، لیکن اب مجھے نیا سفر درپیش تھا۔ میرے گاؤں کا میدانی اسکول میری اگلی منزل تھا۔

○ ○ ○
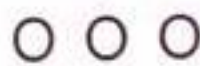
ہم جہلم کے علاقے میں جلال پور شریف کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ میرا باپ ایک غریب کسان تھا جو کسی مرض میں مبتلا ہو کر میرے بچپن ہی میں مر گیا تھا۔

میں اس وقت صرف چار سال کی تھی۔ گاؤں میں کچھ کرنا مشکل تھا اس لیے میری ماں مجھے لے کر اپنے بھائی کے پاس اسلام آباد آ گئی۔ میری مامی فوت ہو چکی تھی اور ماما اپنے بیٹے کے ساتھ جو مجھ سے دو تین سال بڑا تھا' اسلام آباد سے باہر ایک کچی بستی میں رہتا تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا اور کشمیر میں لڑائی کے دوران اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو چکی تھی۔ بہادری دکھانے پر اسے تمغہ ملا تھا لیکن یہ تمغہ اور اس کی پنشن اسے بمشکل دو وقت کی روٹی دیتے تھے۔ اس نے بہت محبت سے ہمیں اپنے پاس رکھا لیکن میری ماں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ پیٹ بھرنے کے لیے معذور بھائی کی محبت کافی نہیں ہوگی۔ وہ ایک کسان گھر کی عورت تھی اور محنت کرنا جانتی تھی۔ آس پاس کے بنگلوں میں محنتی خادماؤں کی مانگ بہت تھی۔ میری ماں بھی مختلف بنگلوں میں برتن کپڑے دھونے اور جھاڑو پونچھے کے کام پر لگ گئی۔

بنگلوں میں کام کرتے ہوئے وہاں کی زندگی دیکھ کر میری ماں نے مجھے بھی ایسے ہی کسی بنگلے میں سجانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ اپنے یہ خواب پورے کرنے کے لیے وہ مجھے پڑھانا چاہتی تھی۔ لیکن دو وقت کی روٹی کمانے کی مشقت میں زندگی گزارنے والوں کے لیے اپنے بچوں کو تعلیم دلانا آسان نہیں تھا۔ اسی زمانے میں ایک بے روزگار اسکول ٹیچر نے جو ابھی تک قومی خدمت کے خواب دیکھتا تھا' بنگلوں کے درمیان اجاڑ پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے پارک میں غریب بچوں کے لیے ایک میدانی اسکول کھول دیا۔ کچی بستی کے دوسرے بچوں کی طرح میری ماں نے بھی مجھے اور میرے ماما کے بیٹے شوکت کو جسے سب پیار سے شوکی کہتے تھے' بے در و دیوار اور بغیر چھت والے اس اسکول میں داخل کر دیا۔

یہ اپنی نوعیت کا واحد اسکول تھا۔ اس کا کل سرمایہ ایک بلیک بورڈ اور لکڑی کی ایک کرسی تھی جس پر ماسٹر صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ ان کا نام کسی کو نہیں معلوم تھا۔ بچے بڑے سب انھیں ماسٹر صاحب پکارا کرتے تھے۔ انھوں نے انگریزی اردو کی بہت سی پرانی کتابیں اور قاعدے جمع کر لیے تھے اور کسی بچے کو کتاب سے محروم نہیں رکھا تھا۔ بچے اپنے چھوٹے

چھوٹے بستوں یا تھیلوں میں ایک سلیٹ ایک کاپی ایک پنسل اور چاک لیے بڑے فخر سے کچی بستی سے بنگلوں اور کاروں والے اس مخملی محلے کا رخ کرتے جہاں ماسٹر صاحب نے ٹاٹ کا پیوند لگا یا ہوا تھا اور جس کی ٹھنڈی اور گیلی ننگی زمین پر بیٹھ کر وہ ماسٹر صاحب کے دیے ہوئے سبق یاد کیا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب نے کبھی خود کسی سے فیس نہیں مانگی۔ جس نے جو دیا' لے لیا۔ کسی نے پانچ کسی نے دو اور کسی نے ایک روپیہ دیا' کسی نے کچھ بھی نہیں دیا۔ اسکول سہ پہر کو اس وقت شروع ہوتا جب سورج کی تمازت کم ہو جاتی اور روشنی باقی رہنے تک جاری رہتا۔ جب دن جلدی چھپنے لگتا تو اسکول پارک سے نکل کر گلی کے نکڑ پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کے نیچے منتقل ہو جاتا۔ کچی بستی کے لوگ اپنے بچوں کو واپس گھر لے جانے آتے اور انھیں پڑھتا دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ جھل مل کرنے لگتے۔ مجھے اور شوکی کو اسکول لانے اور واپس لے جانے کی ذمّے داری میرے ماما کی تھی جو اپنی بیساکھیوں پر اچھلتا ہوا ہمیں چھوڑنے اور لینے آتا اور دیر تک پارک کے دروازے پر دربان کی طرح کھڑا رہتا جیسے کوئی فوجی محاذ پر ڈٹا ہوا ہو۔

بنگلے والوں کا خیال تھا اسکول ایک نوجوان ٹیچر کا رومانس ہے' جلد ہی ختم ہو جائے گا' لیکن اسکول پھلتا پھولتا دیکھ کر ان میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ کوئی پارک کو اپنے نام الاٹ کرا کے وہاں بنگلا بنوانے کی فکر میں تھا۔ کسی کو یہ فکر تھی کہ پڑھنے کے بہانے آنے والے غریب بستی کے بچے ان کے گھروں میں چوریاں کرنے لگیں گے۔ سی ڈی اے کو فون ہوئے۔ پولیس کو رپورٹ لکھوائی گئی۔ دوسرے ہی دن سی ڈی اے کے اہل کار نوٹس لے کر پہنچ گئے کہ کل سے یہ اسکول بند...... ماسٹر صاحب دھن کے پکے تھے۔ وہ دوسرے دن بھی اسکول لگا کر بیٹھ گئے۔ لیکن انھوں نے بستی والوں کو بتا دیا تھا کہ پولیس اسکول بند کروانے آ سکتی ہے اس لیے وہ چاہیں تو بچوں کو نہ بھیجیں۔ کچھ بچے آئے' کچھ نہیں آئے' لیکن میرا ماما مجھے اور شوکی کو وقت سے پہلے ہی اسکول لے آیا۔ اس دن وہ پورے اہتمام کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ محاذ پر جانے

والے سپاہی کی طرح اس نے اپنی پوری فوجی وردی پہنی ہوئی تھی۔ سینے پر سرکار سے ملا ہوا بہادری کا تمغہ لگایا تھا' اپنی بندوق صاف کر کے بھری تھی اور کندھے پر لٹکا کر بیساکھی سے کھٹ کھٹ کرتا ہوا اسکول پہنچا تھا۔ وہ ہمیں پارک کے اندر بھیج کر خود ایک ٹانگ اور بیساکھی کے سہارے بندوق تان کر داخلے کے راستے پر کھڑا ہو گیا۔ بنگلوں سے پھر فون ہوئے کہ اسکول تو آج بھی لگا ہے۔ سی ڈی اے کے اہل کار پولیس والوں کو لے کر پھر پہنچ گئے' لیکن جس ملک کا وزیراعظم بھی فوجیوں سے ڈرتا ہو وہاں معمولی اہل کاروں اور پولیس والوں کی کیا مجال تھی۔ اپنے سینوں کی طرف ایک فوجی کی بندوق تنی دیکھ کر وہ بھی ڈر گئے۔ سی ڈی اے کے اہل کاروں نے ماسٹر صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ یہ اسکول غیر قانونی طور پر چلا رہے ہیں۔ ماسٹر صاحب نے کہا کہ یہ ایک پبلک پارک ہے جہاں وہ بچوں کو جھولے جھلانے کے بجائے تعلیم دے رہے ہیں۔ یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے۔ محلے کے شرفاء کو بھی بولنے کی ہمت ہوئی۔ انھوں نے کہا' انھیں ڈر ہے یہاں چوریاں شروع ہو جائیں گی۔ میرے ماما نے پہلی بار بندوق کی نال نیچی کی اور محلے والوں کو یقین دلایا کہ وہ کوئی تنخواہ لیے بغیر رات کو محلے کی پہرے داری کرے گا۔ محلے والے ایک لنگڑے فوجی کی بہادری کا مظاہرہ دیکھ چکے تھے۔ وہ خوش ہو کر چلے گئے۔ انھیں اپنے گھروں کے لیے ایک معتبر اور مفت کا چوکی دار مل گیا تھا۔ میرے ماما نے آخری دم تک اپنا وعدہ نبھایا۔ وہ دن بھر گھر میں خالی پڑا رہتا تھا' اس لیے خوش تھا کہ اُس کا بیکار ہو جانے والا وجود کسی کام آ رہا ہے۔

اسکول کی چھٹی کا کوئی دن مقرر نہیں تھا۔ جب بارش ہوتی یا گھٹائیں گھر کر آتیں اور بارش کا خطرہ ہوتا اس روز سب کو پتا ہوتا تھا کہ آج اسکول نہیں لگے گا اس لیے خود بخود اسکول کی چھٹی ہو جاتی۔ ایک روز جب مطلع بالکل صاف تھا اور اسکول معمول کے مطابق لگا ہوا تھا' اچانک بادل گھر کر آئے اور بارش نے چھما چھم شروع کر دی۔ ماسٹر صاحب بارش سے بچنے کے لیے بچوں کو ایک درخت کے نیچے لے کر بیٹھ گئے۔ درخت کی چھت کافی نہیں تھی۔ پانی

چھن چھن کر آ رہا تھا۔ زیادہ ڈر یہ تھا کہ کتابیں بھیگ کر پھٹ گئیں تو دوسری کتابیں کہاں سے آ ئیں گی۔ اسی وقت سامنے والے بڑے بنگلے میں ایک گاڑی آ کر رکی۔ اس میں بیٹھے ہوئے شخص نے اپنا ڈرائیور بھیج کر ہم سب کو پناہ لینے اپنے گھر کے برآمدے میں بلا لیا۔ انھوں نے گھر میں جا کر ماسٹر صاحب کے لیے گرم گرم چائے اور بچوں کے لیے مٹھائی بھجوائی اور پھر خود بھی اپنی چائے لے کر باہر آئے اور ماسٹر صاحب کے ساتھ کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شیروانی صاحب ایک بڑے سرکاری افسر تھے اور حال ہی میں اسلام آباد تبادلے کے بعد اس بنگلے میں رہنے آئے تھے۔ وہ اس اسکول سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے ماسٹر صاحب کو اسکول ختم ہونے کے بعد سامان گیرج میں رکھنے اور بارش کی صورت میں اپنے بنگلے کے برآمدے میں پناہ لینے کی اجازت دے دی۔ دوسرے دن انھوں نے ہمارے بیٹھنے کے لیے ایک بڑی دری بھی بھجوائی۔ میں اس روز پڑھائی بھول کر دیر تک اس کھردری دری پر ہاتھ پھیرتی اور اس کی چکناہٹ کے مزے لیتی رہی۔ اس دری کا لمس مجھے آج بھی اپنی ہتھیلی پر محسوس ہوتا ہے اور کسی بھی مخملی بستر سے زیادہ نرم لگتا ہے۔

ایک رات میرے ماما پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ہسپتال جانے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اس المیے کا غبار ہلکا ہوا تو ایک اور المیہ میرے انتظار میں تھا۔ شوکی کی مرحومہ ماں کا ایک بھائی جلال پور شریف میں دکان لگاتا تھا' وہ شوکی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ کہتا تھا کہ وہ شوکی کو باقاعدہ اسکول میں داخل کرا کے پڑھائے گا۔ شوکی کا اچانک چلے جانا مجھے بہت اداس کر گیا۔ میں اور شوکی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے میدانی سکول جایا اور واپس آیا کرتے تھے۔ شوکی کے جانے کے بعد مجھے اپنا ہاتھ بالکل خالی لگتا۔ میں اسکول جاتے ہوئے بہت دنوں تک اپنا خالی ہاتھ ہلاتی رہی' بالکل اس طرح جیسے شوکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہلایا کرتی تھی۔ بچپن گیا' جوانی آئی' میری شادی ہوئی اور میرا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا گیا لیکن مجھے اپنا ہاتھ ہمیشہ خالی ہی لگا۔

کئی سال میدانی اسکول میں پڑھنے کے بعد اب وہ مرحلہ آ گیا تھا جب مجھے بھی کسی باقاعدہ اسکول میں داخل ہونا تھا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ میری ماں نے شیروانی صاحب کی بہت تعریف سنی تھی۔ وہ ایک دن ان کے گھر گئی اور زمین پر اپنی اوڑھنی پھیلا کر بیٹھ گئی۔ وہ بھیک مانگنا گناہ سمجھتی تھی، لیکن شیروانی صاحب سے اپنی بیٹی کی تعلیم کی خیرات مانگنا اسے برا نہیں لگا۔ اس کے بدلے وہ شیروانی صاحب کے گھر میں مفت کام کرنے کو تیار تھی۔ شیروانی صاحب ایک نیک دل انسان تھے۔ انھوں نے میری ماں سے کبھی مفت کام نہیں کرایا۔ دوسرے دن مجھے میری ماں کے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر اسکول داخل کرانے لے گئے۔ میں اور میری ماں ان کی گاڑی کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ خود پچھلی نشست پر نیم دراز تھے۔ گاڑی کی یہ سیر بھی ایک عجیب سا لطف دے گئی تھی۔ میں پہلی بار کار میں بیٹھی تھی۔ میں سڈنی اور اب پاکستان میں بھی بہت اچھی آرام دہ اور بڑی گاڑیوں میں بیٹھ چکی ہوں، لیکن شیروانی صاحب کی کار میں پہلی بار بیٹھنے کا جو مزہ آیا تھا وہ کبھی نہیں آیا۔ ایسا لگا تھا جیسے میں شہزادی بن گئی ہوں۔ میرے پَر نکل آئے ہیں۔ شیروانی صاحب نے میری تعلیم کی ذمّے داری لے لی تھی۔ ان کی مدد سے میں نے میٹرک کیا۔ انہوں نے کالج میں داخلہ لینے کے لیے بھی میری حوصلہ افزائی کی۔ میرا وظیفہ ہو گیا۔ وہ اور ان کے گھر والے بی۔ اے کرنے تک میرا ساتھ دیتے رہے۔

شوکی بھی جلال پور شریف کے اسکول سے میٹرک کر کے کالج میں پڑھنے جہلم چلا گیا تھا۔ وہاں سے بی اے کر کے ملازمت تلاش کرتا رہا لیکن سفارش کے بغیر کلرکی بھی ملنا مشکل تھی۔ وہ جلد ہی مایوس ہو کر اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔ وہاں اس نے ماسٹر صاحب کی پیروی میں میدانی اسکول کھول کر دن میں بچوں اور رات میں بڑوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اسکول کا افتتاح کرنے اس نے ماسٹر صاحب کو خاص طور پر گاؤں بلایا تھا۔ گاؤں والوں کے دل میں تعلیم کی عزت بڑھی تو سب نے مل کر ایک چھپر بنا دیا۔ میدانی اسکول اب چھپر اسکول بن گیا تھا

جہاں دھوپ اور بارش میں بھی پڑھانا ممکن تھا۔ اسے اتنے پیسے بھی مل جاتے تھے کہ وہ گاؤں میں رہ کر اپنا گزارہ کر لیتا۔ وہ خوش تھا کہ بی۔ اے کر کے کلرکی کرنے کے بجائے ماسٹر صاحب کا مشن آگے بڑھا رہا تھا۔

جانے کے بعد پہلی بار شوکی اپنے میٹرک میں پاس ہونے کی مٹھائی لے کر اسلام آباد آیا تھا۔ اس کے بعد وہ سال میں دو بار ضرور آتا۔ ایک بار اپنے پاس ہونے کی مٹھائی لے کر اور ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں۔ وہ بڑا ہو کر بہت شرمیلا اور خاموش ہو گیا تھا۔ مجھے سخت غصہ آتا۔ وہ میری آنکھوں میں کیوں نہیں دیکھتا' کچھ پڑھتا کیوں نہیں' میرا خالی ہاتھ کیوں نہیں دیکھتا' اسے تھامتا کیوں نہیں۔ وہ اسی طرح آنکھیں نیچی کیے بیٹھا ماں سے باتیں کرتا اور مجھے اداس کر کے چلا جاتا۔ میں بی۔ اے میں پاس ہوئی تو اس نے مبارکباد کا خط بھیجا' اپنے آنے کی نوید بھی دی۔ وہ آیا تو پہلی بار اس کی آنکھیں اٹھی ہوئی تھیں اور ان میں دو تیز قندیلیں چمک رہی تھیں۔ اس دن وہ میرے خالی ہاتھ اپنے ہاتھ سے بھرنے آیا تھا۔ اس دن میری آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ماں نے اسے میری شادی طے ہونے کی خبر سنائی تو اس کی آنکھیں ایک دم ہی بجھ گئیں۔ تیز ہوا کے ایک ہی جھونکے نے قندیلیں گل کر دی تھیں۔ وہ کچھ دیر اسی طرح خاموش بیٹھا رہا' پھر ایک دم اٹھ کر چلا گیا۔ وہ میری شادی پر ماں کے بار بار بلانے پر بھی نہیں آیا۔ صرف مبارکباد کا ایک کارڈ بھیج دیا تھا۔ وہ بھی میرے نہیں' میری ماں کے نام۔

میری جس سے شادی ہوئی' وہ اسی بستی کا رہنے والا تھا۔ کئی سال پہلے ویزا خرید کر آسٹریلیا چلا گیا تھا اور اب قانونی ہو کر شادی کرنے اسلام آباد آیا تھا۔ اسے مجھ ہی جیسی لڑکی چاہیے تھی جو پڑھی لکھی ہو اور اس کے طبقے کی ہو۔ اس کے ماں باپ میری ماں کے پاس رشتہ لے کر آئے تو میری ماں کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ میں بہت منتیں کرتی رہی' بہت گڑگڑائی' اسے سمجھایا کہ وہ اکیلی رہ جائے گی' میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ لیکن وہ نہ مانی۔ وہ خوش تھی

کہ اس کی بیٹی سمندر پار جا کر میموں کی طرح اور شیروانی صاحب جیسے بنگلے اور کار کی مالک بن کر رہے گی۔

چند ہی دنوں میں ہمارا نکاح ہو گیا اور میرا شوہر میرے ویزے کے کاغذات جمع کرا کے سڈنی واپس چلا گیا۔ چھ ماہ بعد ویزا لگ جانے پر میں بھی پردیس سدھار گئی۔ سنگاپور سے سڈنی کے سفر میں مجھے ربیکا ملی تھی۔ وہ بیوہ تھی اور اکیلی رہتی تھی۔ دنیا کی سیر کرنے کے بعد اب واپس سڈنی جا رہی تھی۔

میرا شوہر سیکیورٹی گارڈ کا کام کرتا تھا اور سڈنی سے باہر ایک معمولی سی بستی میں ایک کمرے کے چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا جو میرے لیے اسلام آباد کے کچے مکان کے مقابلے میں محل جیسا تھا۔ مجھے آئے ہوئے ابھی دو تین دن ہی ہوئے تھے اور ابھی میں نے اپنا سامان بھی پوری طرح نہیں کھولا تھا کہ ایک روز جب میرا شوہر کام پر گیا ہوا تھا ایک گوری عورت گود میں بچہ لیے ہوئے میرے فلیٹ میں آ دھمکی۔ اس نے آتے ہی بچہ میری گود میں پٹخا اور چیخنے لگی: ''تو نے جس سے شادی کی ہے، اس کا بچہ بھی سنبھال۔''

وہ مجھے دیوانی لگ رہی تھی۔ میں انگریزی سمجھ تو سکتی تھی لیکن بولنا مشکل تھا۔ میں اس کا بچہ لیے گنگ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ بچہ اجنبی گود پا کر رونے لگا۔ میں اسے سینے سے لگا کر چپ کرنے کی کوشش کرنے لگی تو وہ مجھ پر جھپٹ پڑی اور بچہ مجھ سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ بچہ پھر بھی چپ نہیں ہوا تو اسے دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ بچہ دودھ پی کر خاموش ہو گیا تو وہ خود رونے لگی۔ رونا بند ہوا تو کچھ دیر اسی طرح خاموش بیٹھی رہی پھر میرے پوچھے بغیر ہی اپنی کہانی سنانے لگی:

''تم نے جس سے شادی کی ہے اس نے پہلے محبت کے جال میں پھنسا کر مجھ سے شادی کی۔ جب اس کا امیگریشن کا کام ہو گیا تو آنکھیں دکھانے لگا۔ کہتا تھا، ہر گوری عورت رنڈی ہوتی ہے۔ اسے اپنے بچے پر بھی شک تھا کہ یہ اس کا نہیں، کسی اور کا ہے۔ کہتا تھا اس کی

آنکھیں نیلی کیوں ہیں۔ میں نے ڈی این اے کرا کے رپورٹ اس کے منہ پر ماری کہ دیکھ یہ تیرا ہی نطفہ ہے۔ پھر بھی اس کا شک نہیں گیا۔ میرا بچہ رات رات بھر مجھے جگاتا تھا۔ وہ رات کی ڈیوٹی کر کے آتا اور مجھے سوتا دیکھتا تو پاگل ہو جاتا۔ کہتا تھا رات کو ضرور کوئی نہ کوئی آ کر مجھے جگائے رکھتا ہے۔ ایک صبح' وہ رات کی ڈیوٹی کر کے آیا تو مجھے سوتا دیکھ کر اس نے مجھے لات ماری اور کہنے لگا' میں رات کس کے ساتھ سوئی تھی۔ میں نے بھی ایسی لاتیں ماریں کہ کتا زندگی بھر یاد رکھے گا۔ میں اسی وقت اپنا بچہ اور طلاق لے کر اس فلیٹ سے چلی گئی۔''

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ رونا تھما تو بچے کو اٹھا کر جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے واپس جانے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر رکی اور پلٹ کر کہنے لگی۔ ''تم بہت معصوم لگتی ہو۔ ابھی نئی ہو جب راستے جان لوگی تو تمھارا شوہر رات کی ڈیوٹی کر کے آنے کے بعد تم سے بھی یہی پوچھے گا کہ رات کو کس کے ساتھ گئی تھی' کس کے ساتھ سوئی تھی۔''

وہ میری چند روزہ شادی شدہ زندگی کو ایک لمحے میں تہہ و بالا کر کے چلی گئی۔ میرے دماغ میں اس کا جملہ ہتھوڑے برسا رہا تھا: ''رات کو کس کے ساتھ سوئی تھی؟'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اُس وقت مجھے ربیکا یاد آئی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا مجھے جب بھی ضرورت ہو' میں مدد کے لیے اسے فون کر سکتی ہوں۔ میں نے اسے فون کیا تو وہ مجھے میرے کھلے اور ادھ کھلے سامان سمیت اپنے گھر لے آئی۔ میں نے اسے اپنی کہانی سنائی اور بتایا کہ میں اب اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گی۔ ربیکا مجھے اپنے وکیل کے پاس لے گئی۔ طلاق کے کاغذات بنوائے اور میرے شوہر کو فون کر کے بلایا۔ وہ میرے غائب ہونے پر پریشان تھا' مجھے لینے فوراً ہی دوڑا چلا آیا۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ اس نے اپنی شادی اور بچے کی کہانی چھپا کر مجھے دھوکا دیا ہے اور میں ایک دھوکے باز کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس نے مجھے دھمکیاں دینے کی کوشش کی لیکن جب ربیکا نے اسے آنکھیں دکھائیں اور کہا کہ وہ اس کا امیگریشن کا کیس دوبارہ کھلوا دے گی تو چپ چاپ طلاق کے کاغذات پر دستخط کر کے چلا گیا۔

شوکی میرے واپس آنے کے کئی مہینے بعد مجھ سے ملنے اسلام آباد آیا تھا۔ اسے میری شادی کے المیے کا علم ہو چکا تھا۔ شاید اسی لیے بہت اداس اداس اور کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ گزرے ہوئے برسوں نے اسے بڑا اور باہمت بنا دیا تھا۔ آسٹریلیا نے میری جھجک بھی توڑ دی تھی۔ جب شوکی نے مجھ سے باہر چلنے کے لیے کہا تو میں ماں کی نگاہوں کی پروا کیے بغیر تیار ہو گئی۔ ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر ہمارا رخ اسی سڑک کی طرف ہو گیا جو بنگلوں والی آبادی سے ہماری بستی کو ملاتی تھی۔ چھوٹا سا کیچڑ بھرا میدان عبور کر کے ہم اوپر چڑھے اور اندھیری سنسان سڑک پر آ گئے۔ سردیوں کے دن تھے سورج جلدی چھپ گیا تھا۔ اب چاند کی باری تھی جو بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ سڑک کے ایک طرف کچی مٹی کی پٹی تھی۔ بچپن میں ہم گاڑیوں کے ڈر سے اسی کچی پٹی پر چلتے، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے اور دھول اڑاتے ہوئے اسکول جایا کرتے تھے۔ سڑک پر ٹریفک نہیں تھی اور دور تک کسی گاڑی کی روشنی چمکتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم کچی مٹی کی رہ گزر پر نہیں، بلکہ ڈرے بغیر سڑک کے بیچوں بیچ چل رہے تھے۔ شوکی کا ہاتھ خودکار طریقے سے میرے ہاتھوں میں آ گیا تھا اور اسے ہلاتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا بچپن لوٹ آیا ہو۔ شوکی کی آنکھوں میں بجھی ہوئی قندیلیں پھر سے جل اٹھی تھیں۔ میرا ہاتھ تھامے تھامے بیچ سڑک پر رک کر جب اس نے مجھ سے کہا: ''مجھ سے شادی کرو گی'' تو خاموش سڑک پر دور تک میری ان کہی ہاں گونج گئی۔

ہمارے بچپن کے میدانی اسکول کے سامنے رہنے والے شیروانی صاحب جنھوں نے بی۔اے تک پڑھانے میں میری مدد کی تھی، کئی سال پہلے رِٹائر ہو گئے تھے۔ وہ ایک فرض شناس اور بہت قابل افسر تھے۔ صدر ایمان علی کی اپیل پر کئی سابق افسروں کے ساتھ انھوں نے بھی کسی تنخواہ کے بغیر اپنی خدمات حکومت کو پیش کر دی تھیں۔ انھوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک میدانی اسکول بغیر وسائل کے چلتے اور کسی حد تک کام یاب ہوتے بھی دیکھا تھا۔ انھوں نے حکومت کی مدد اور اپنی مدد آپ کے تحت اسی طرز کے میدانی اور چھپر اسکول گاؤں گاؤں اور

محلے محلے کھولنے کا ایک مکمل منصوبہ تیار کر کے صدر ایمان علی کو دیا تو فوری منظور کر لیا گیا۔ مخالفت بھی ہوئی تھی۔ کہا گیا تھا کہ ایسے تجربے پہلے بھی ہوئے ہیں اور ناکام ہو چکے ہیں۔ لیکن اس وقت پورا ملک ایک انقلابی عمل سے گزر رہا تھا۔ ایمان علی نے ملک کی شرح خواندگی کو دو سال کے اندر اندر دوگنا کرنے کو اپنا ہدف بنایا تھا۔ یہ معجزہ دکھانے کے لیے ایسے ہی کسی انقلابی منصوبے کی ضرورت تھی۔

ایمان علی نے زرعی آمدنی پر ٹیکس لگا کر اس کا ۲۵ فیصدی دیہی علاقوں کے ترقیاتی کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ فیصلہ کیا تھا کہ جو زمین دار ٹیکس بچانے کے لیے خسارہ دکھائیں گے، ان کی زمینیں منافع بخش بنانے کے لیے کوآپریٹوز کے حوالے کر دی جائیں گی۔ اس نے خود اپنی ورثے میں ملی ہوئی زمینیں بھی کوئی معاوضہ لیے بغیر کوآپریٹوز کو دے دی تھیں۔ حکومت نے خبردار کیا تھا کہ جو زمینیں فصلوں کا سونا اگلتی ہیں، ان کے مالکوں نے ٹیکس نہیں دیا تو زمینیں چھین لی جائیں گی۔ ایمان علی نے اپنے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فوج استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی۔ جاگیردار سہم گئے تھے۔ دیہات کی آبادیاں خوش تھیں کہ ان کی زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی اب ان پر بھی خرچ ہوگی۔ میدانی اور چھپر اسکولوں کے لیے فنڈز بھی زرعی ٹیکس سے ہونے والی آمدنی سے ادا ہونے تھے۔ تعلیم کے بجٹ پر کوئی اضافی بوجھ نہیں پڑا تھا۔ یہی شیروانی صاحب کے بنائے ہوئے منصوبے کی خوبی تھی۔

○ ○ ○

گزرے ہوئے دنوں کی یادوں نے میری سستی دور کر دی۔ ہم ''ہالی ڈے ان'' کے سامنے کھڑے ایک اور مسافر کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی وجہ سے وہ مسافر نہیں آ سکا تھا اور اب زیادہ انتظار ممکن نہیں تھا۔ میں نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا تو اس نے لیور دبا کر خودکار دروازے بند کیے اور گاڑی آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔ میں نے بھی اپنی پوزیشن سنبھال لی اور گلا

صاف کر کے اپنے روزمرہ کے کلام کا آغاز کیا:

''میں پاکستان ٹورسٹ بورڈ کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ میں آج آپ کی گائڈ ہوں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میرے ساتھی گل ریز خان ہیں۔ آپ ان کی بڑی بڑی مونچھوں سے مت ڈریے۔ یہ اندر سے بہت نرم دل انسان ہیں۔ مونچھیں انھوں نے اپنی تین بیویوں اور آٹھ بچوں پر رعب رکھنے کے لیے بڑھائی ہیں۔''

تینوں مسافروں کے چہروں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹیں نمودار ہوئیں۔ گل ریز خان بھی اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے زیرلب مسکرایا اور پھر مصنوعی غصے سے مجھے دیکھتے ہوئے مکا لہرانے لگا۔ گل ریز خان کو مذاق کا نشانہ بننے کی پروا نہیں تھی۔ اسے بس اپنا موضوع گفتگو بننا پسند تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے تینوں مسافروں کا تعارف حاصل کیا۔ بوڑھا شخص ریٹائرڈ ڈاکٹر تھا۔ تمام عمر غیر ممالک میں کام کرتا اور پیسے کماتا رہا تھا۔ بڑھاپے میں باہر کوئی سہارا دینے والا نہیں رہا تھا تو وطن کی یاد آئی تھی۔ عورت اس کی دور کی رشتے دار تھی جو معاوضے پر اپنے امیر رشتے دار کی دیکھ بھال کا کام کرتی تھی۔ امریکی کسی غیر ملکی کمپیوٹر کمپنی کا سیلز مین تھا۔

''ہم آپ کو پاکستان کی سیاست کا عجائب گھر دکھائیں گے۔'' میں نے اپنا ٹیپ بجانا شروع کیا۔

''یہ پہلے ایوان صدر تھا جہاں پاکستان کے بے اختیار صدر رہا کرتے تھے۔ وہ اپنے ہر عمل میں وزیراعظم کے تابع تھے۔ ان کا کام صرف حکومت کے تیار کردہ قوانین پر انگوٹھا لگانا تھا پھر بھی ان کا ایک پورا سیکریٹریٹ تھا جو مشیروں، اعلیٰ افسروں، کلرکوں اور چپراسیوں کی ایک فوج پر مشتمل تھا۔ ملازموں، باورچیوں، باغ بانوں اور ذاتی خدمت گاروں کا لشکر اس کے علاوہ تھا۔ ان سب پر اور ایوان صدر کی دیکھ بھال، مرمت اور نگرانی پر ہر سال نصف ارب روپے سے زیادہ کا خرچ آتا تھا۔ جی ہاں نصف ارب، تقریباً ایک ملین ڈالر۔''

میں نے تینوں مسافروں کے چہرے دیکھے۔ تینوں پوری طرح متوجہ تھے۔

''ایوان صدر میں رہنے والے آخری صدر صوم وصلوٰۃ کے پابند اور باشرع مسلمان تھے۔ بہت نورانی داڑھی تھی۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنتے۔ جب خلفائے راشدین کے زمانے کے واقعات سناتے تھے تو ان پر رقّت طاری ہو جاتی تھی۔ ان سے کسی نے پوچھا' آپ اتنے بڑے محل میں رہتے ہیں۔ آپ کے سونے' آرام کرنے اور بیٹھنے تک کے کمرے الگ الگ' بڑے بڑے اور بہت آرام دہ ہیں' بے شمار ملازمین آپ کی خدمت پر مامور ہیں اور آپ کی کھانے کی میز پر کم از کم تین وقت انواع واقسام کے کھانے سجتے ہیں جبکہ آپ کے آس پاس رہنے والی آپ کی مسلمان رعایا کو ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی روکھی سوکھی ملتی ہے۔ ان کا پورا خاندان ایک کمرے کے مکان میں رہتا ہے جس کی چھت ٹپکتی ہے اور جن کے نلکوں میں پانی نہیں آتا۔ آپ خلفائے راشدین کی روایت کی پے روی کیوں نہیں کرتے؟ آپ کو پتا ہے' انھوں نے کیا جواب دیا؟''

میں نے باری باری تینوں کے چہرے دیکھے۔ تجسس تھا اور ہونٹوں پر کوئی حرکت نہیں تھی۔

''انھوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا کہ سب اس کی شان کا ظہور ہے۔ اُس نے اپنے ایک فقیر کو محل میں رہنے کی عزت دی ہے۔ یہ صرف اسی کی شان کا ظہور ہے۔ اس کی مرضی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ یہ کہہ کر وہ قیلولہ کرنے اور ملازم سے اپنی ٹانگیں دبوانے اندر چلے گئے۔''

میں نے دیکھا تینوں افسوس کے عالم میں سر ہلا رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔

''اسی ایوان صدر میں ایک ایسے صدر بھی رہتے تھے جو اس ڈر سے ایوان صدر سے نہیں نکلتے تھے کہ کہیں وزیر اعظم کی نظر ان پر نہ پڑ جائے اور وہ انھیں بدل کر کسی اور کو صدر نہ بنا دیں۔'' میں نے ایک اور کہانی شروع کی۔ ''اس زمانے میں وہاں ایک سفیدی کرنے والے کی

ڈیوٹی مستقل کردی گئی تھی۔ اس کا کام تھا کہ وہ ہر صبح باہر کی دیواروں کی پتائی کیا کرے۔ ان پر رات کو کالج کے شریر لڑکے یہ نعرہ لکھ جاتے تھے کہ ہمارے صدر کو رہا کرو۔''

کسی کے چہرے پر کوئی ہنسی نہیں آئی۔ سب چہرے سپاٹ کیے بیٹھے تھے۔ مجھے ان کے قہقہوں کی توقع بھی نہیں تھی۔ اصل لطیفوں کا وقت وہ ہوگا جب عجائب گھر کی سیر کے دوران ان کے چہروں پر اکتاہٹ یا تھکن کے آثار نظر آئیں گے۔ ہم تھوڑی دیر میں ایوان صدر پہنچنے والے تھے، اس وقت تک بس تھوڑی سی گفتگو کا وقت اور تھا۔

''ایک صدر ایسے تھے جنھیں شکایت تھی کہ ایوان صدر میں گرم پانی والا پیراکی کا تالاب نہیں ہے۔ وہ مالی طور پر مشکل زمانہ تھا۔ روز نئے ٹیکس لگانے پڑ رہے تھے۔ حکومت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کا بجٹ کم کر کے ایوان صدر میں گرم پانی کا سوئمنگ پول بنانے کے لیے ۶۵ کروڑ روپے دے دیے۔'' اس بار ان تینوں سے پہلے میں نے افسوس کے اظہار میں اپنی گردن ہلائی۔

''دل چسپ بات یہ ہے کہ صدر خود تیراکی نہیں جانتے تھے۔ بس پول کے کنارے بیٹھے اپنے دوستوں اور افسروں کی بیویوں کو تیرتے دیکھا کرتے تھے۔'' بڑے میاں بھی اپنی ساتھی عورت کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگے۔

''یہ سوئمنگ پول اب اسلام آباد کے اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے لڑکیوں کو تیراکی سکھانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو عجائب گھر دیکھنے کے بعد اس میں تیر سکتے ہیں۔ اس کی فیس آپ کے ٹور پیکج میں شامل ہے۔''

ہم ایوان صدر پہنچنے ہی والے تھے۔ عجائب گھر پہنچنے سے پہلے کی گفتگو کا صرف آخری حصہ باقی تھا۔

''ایمان علی نے صدر بننے کے بعد ایوان صدر میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ان کے پاؤں زہریلی دلدل میں پھنس جائیں گے۔ انھوں نے شہر سے باہر

ایک بستی میں دو بنگلے لے کر اپنا گھر اور دفتر بنایا ہے۔ اس کا خرچ بھی ایوان صدر کے میوزیم سے ہونے والی آمدنی سے پورا ہوتا ہے۔ اپنے صدر کو دیکھ کر بڑے بڑے افسروں نے بھی اپنے اپنے بنگلے اور گاڑیاں چھوٹی کر لی ہیں۔ دنیا بھر میں آدھے سے زیادہ غیر اہم سفارت خانے بند کر دیے گئے ہیں۔ جو باقی ہیں' ان کے خرچ بھی آدھے کر دیے گئے ہیں۔ جن سفیروں کو شکایت تھی' ان سے کہا گیا ہے کہ وہ استعفیٰ دے دیں یا اپنا تبادلہ کرا کے واپس آ جائیں۔ دوسرے ملکوں کے سربراہ اور اہم مہمان جب ایمان علی سے ان کے چھوٹے سے بنگلے میں جا کر ملتے ہیں تو متاثر ہو کر واپس جاتے ہیں۔ دنیا بھر میں اس سربراہ مملکت کا چرچا ہے جو ایک عام آدمی کی طرح رہتا ہے اور اپنے ملک کے سرکاری خزانے پر بوجھ نہیں ہے۔''

''تو کیا پاکستان میں اب ہمیشہ ایمان علی کی حکومت رہے گی' کبھی انتخابات نہیں ہوں گے؟'' امریکی سیاح نے پوچھا۔

''ایمان علی نے اگلے سال انتخابات کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ آئینی ماہرین کا ایک پینل نئے جمہوری نظام پر کام کر رہا ہے۔ نئے آئین کا ڈھانچا بن گیا تو اس پر ریفرنڈم کرایا جائے گا۔''

''شرف الدین ہوگا' وہی بنائے گا۔'' بڑے میاں نے بہت جوشیلے انداز میں کہا۔ ''وہ میرا مریض رہا ہے' مجھی سے علاج کراتا تھا' میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت چالاک ہے' قانون اور آئین کے سب داؤ پیچ جانتا ہے' مجھے یقین ہے وہی ہوگا۔''

''جی نہیں...... نئے جمہوری ڈھانچے پر شرف الدین کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔'' میں نے بہت سرد لہجے میں انھیں بتایا۔ ''شرف الدین کے بارے میں تجویز ہے کہ انھیں حنوط کر کے ان کی ممی عجائب گھر میں محفوظ کر دی جائے۔''

''ہاہاہاہا...... ہاہاہاہا...... مزہ آ گیا۔'' بوڑھے ڈاکٹر نے اپنی ران پیٹ کر زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ امریکی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ساتھی عورت اس کا بازو

سہلا کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی وقت ایوان صدر آ گیا......گل ریز خان نے گاڑی روک کر خود کار دروازے کھولے اور میں مسافروں کو اترنے کا اشارہ کرنے لگی۔

عجائب گھر کے سفر کا پہلا مقام گیٹ کے وہ ستون تھے جنھیں عجائب گھر بنانے والوں نے یادگار میں بدل دیا تھا۔

''اس ستون کو بلوچستان کے رنگا رنگ ماربل سے بنایا گیا ہے۔'' میں نے انھیں بتانا شروع کیا۔ ''اس ستون پر جو نام کندہ ہیں' وہ ان کے ہیں جنھوں نے ایوان صدر کو عجائب گھر میں تبدیل کرنے میں کوئی نہ کوئی اہم حصہ ادا کیا ہے۔ یہ پاکستانی فن کاروں کی سنگ تراشی کا کمال ہے۔ یہ نام ماربل پر پینٹ نہیں کیے گئے بلکہ کھود کر اور پھر اسی کے برابر سنگ سیاہ کو کاٹ کر ان میں بھرے گئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح تاج محل کے دروازوں کے گرد قرآنی آیات نقش ہیں۔ آیئے' اپنی انگلیوں کو ان ناموں پر پھیر کر محسوس کیجئے۔''

میرے ساتھ مزید تین ہاتھ ستون پر بنے ہوئے ناموں پر انگلیاں پھیرنے لگے۔

لیکن یہ کیا......؟

لفظ پگھلنے لگے اور انگلیاں ان میں دھنس گئیں۔ گوشت ہڈیاں اور پتھر ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہے تھے۔ ہم سب شعلوں کی طرح چمکتا ہوا وجود بن گئے تھے۔ ہڈیوں سے گوشت موم بن کر بہنے لگا تھا۔ میرے ذہن میں آخری منظر میرے گاؤں کے اس میدانی اسکول کا تھا جہاں لہروں کی شکل میں آگ کا لاوا شوکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ درخت کے نیچے ہاتھ میں لالٹین لیے میرا انتظار کر رہا تھا۔ لالٹین اچانک ہی بجھ گئی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔ گہرا دبیز اندھیرا' بے کراں سناٹا!

ایوان صدر کے اوپر گہرے دھوئیں کا ایک بڑا سا مرغولہ مشروم کی شکل میں آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔

چند سال پہلے

3

اسلام آباد

دروازہ پیٹنے کی آواز نے سجاد احمد کو نیند سے چونکا دیا۔

وہ بے خوابی کا مریض تھا اور اس وقت بہت مشکل سے اس کی آنکھ لگی تھی۔ دیر تک ٹی وی کی اسکرین پر نظریں گاڑے ایک بور سا پروگرام دیکھتا رہا تھا۔ نسخے نے کام کیا تھا اور اسے صوفے پر بیٹھے بیٹھے جھونکا آ گیا تھا۔ سب نے دم سادھ لیا تھا۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر سونے کے کمرے میں بھیج دے۔ سب کو پتا تھا کہ اس وقت جگا دیا گیا تو اسے بہت دیر تک نیند نہیں آئے گی اور آئے گی بھی یا نہیں۔ اس کی بیٹی تکریم کئی بار ننگے پیر اور دبے پاؤں ڈرائنگ روم میں آئی تھی اور اسے سوتا دیکھ کر چلی گئی تھی۔ باورچی خانہ ڈرائنگ روم سے فاصلے پر تھا پھر بھی اس کی بیوی سالن بھوننے کے لیے لکڑی کی ڈوئی استعمال کر رہی تھی، وہ بھی اتنی

احتیاط سے کہ کھٹ کھٹ کی آواز دروازے سے باہر نہ نکلے۔

تکریم کے ڈاکٹر ہونے نے مسئلہ اور مشکل کر دیا تھا۔ وہ نیند کے لیے گولیوں پر انحصار کرنے کے سخت خلاف تھی۔ سجاد احمد سائنس دان تھا اور تجربہ گاہ میں رات رات بھر جاگنے کی عادت پختہ ہو کر بے خوابی کا مرض بن گئی تھی۔ سونے کے لیے نیند کی گولی کا استعمال ضروری ہو گیا تھا۔ بیٹی نئی نئی ڈاکٹر بنی تھی' اس نے گولیاں بند کرا دیں اور ان کی جگہ دودھ شہد اور ورزش کو دے دی۔ نسخہ کام کر رہا تھا' نیند بھی آنے لگی تھی لیکن ایسی کہ ہلکی سی آہٹ سے بھی اچٹ جائے۔ گھر کے اندر کی آہٹوں پر قابو پایا جا سکتا تھا' باہر کا شور گراں ہوتا تھا۔ جب سے ایمان علی نے سجاد احمد کے گھر کے برابر کے دونوں مکان کرائے پر لے کر اپنا گھر اور صدارتی دفتر بنایا تھا' پوری گلی دن رات پولیس کی گاڑیوں کے سائرن اور پولیس کی سیٹیوں کی آوازوں سے گونجتی تھی۔ صدر کی حفاظت کے لیے سجاد احمد کے گھر کی چھت پر بھی دو فوجیوں کا پہرا تھا۔ کبھی کبھی ان کے قدموں کی دھمک بھی سر پر ہتھوڑے برسانے لگتی۔

سجاد احمد گھر آتا تو سخت وحشت زدہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتا جاتا یا ٹی وی پر نظریں گاڑے بیٹھا رہتا۔ نیند جس طرح آتی اسی طرح چلی جاتی۔ طبیعت میں سخت جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ آ گئی تھی۔ بیٹی کو ڈر ہوا کہ بے خوابی کے ساتھ بلڈ پریشر کا مریض بھی ہو جائے گا۔ اس نے نیند کی گولیاں پھر شروع کرا دیں۔ اب نیند کی گولیوں کا اثر بھی کم ہو گیا تھا۔ تکریم کی امریکہ جانے کی سب تیاریاں مکمل تھیں لیکن وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور انھیں اس حال میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔

تکریم کو سب سے زیادہ غصہ ایمان علی پر تھا جس کے آنے سے گلی کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا اور اس کے باپ کی بے خوابی کا مرض ٹھیک ہوتے ہوتے پھر بگڑ گیا تھا۔ تکریم کے پاس گلی کے شور کا علاج نہیں تھا لیکن اس میں اپنے غصے کا اظہار کرنے کی ہمت تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے اپنا غصہ چھپائے رکھتے ہیں۔ اس

نے ایمان علی کو ایک غصے بھرا خط لکھ دیا۔ یہ ایک شکایت نامہ تھا۔ غصے میں تکریم نے اور بہت کچھ بھی لکھ دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ایوان صدر چھوڑ کر اور شہری آبادی کا مکان دفتر بنا کر ایمان علی سستی پبلسٹی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور جو شخص اپنے پڑوس کو تکلیف میں مبتلا کر سکتا ہے، وہ باقی ملک کو کس طرح آرام دے سکتا ہے۔ اسی طرح کی اور بہت سی تلخ اور طنزیہ باتیں تھیں۔ خط بھیج دینے کے بعد دوسرے دن اس نے اپنے باپ کو بھی بتا دیا تھا۔

سجاد احمد کچھ نہیں بول سکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ تکریم اسی کی بیٹی ہے۔ بے خوف، نڈر اور نتائج سے بے پروا۔ سجاد احمد نے خود اپنا طالب علمی کا زمانہ اسی طرح کی بے خوفی کے ساتھ اور پولیس سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔ سجاد احمد کے باپ نے اسے گُم راہ ہونے سے بچانے کے لیے پڑھنے باہر بھیج دیا تھا۔ سجاد احمد ڈاکٹریٹ کر کے وہیں پڑھانے لگا تھا۔ طبیعت کی بے چینی نے اسے زیادہ عرصے باہر نہیں رہنے دیا اور واپس وطن آ کر اس نے خود کو تحقیقی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ سجاد احمد اتنا گم نام بھی نہیں تھا۔ وہ ایک حساس ادارے کی زیرزمین تجربہ گاہ میں کام کرتا تھا اور حساس ادارے اور حکومت کے اہم لوگ اس کے نام سے واقف تھے۔ سجاد احمد کو معلوم تھا کہ صدر کے نام ایک سرکاری ملازم کی بیٹی کے توہین آمیز خط کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ اس کی بیوی نے سر پیٹ پیٹ کر بیٹی کو برا بھلا کہا تھا لیکن سجاد احمد نے کسی تشویش کا اظہار کیے بغیر نتائج کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔

''کون ہے؟'' دروازہ پیٹے جانے کی دوبارہ آواز سن کر سجاد احمد دہاڑا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ چوکی دار ہوگا۔ بادشاہ خان کے دستک دینے کا انداز دروازہ پیٹنے جیسا ہی تھا یا شاید اس کا ہاتھ اتنا بھاری تھا کہ ہلکی سی تھاپ بھی ہتھوڑے کی طرح لگتی تھی۔ اسی وقت اپنے کمرے سے تکریم ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے ساتھ ہی باورچی خانے سے نکل کر اس کی بیوی بھی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''بادشاہ خان تم سے کتنی بار کہا ہے کہ دروازہ مت توڑا کرو، گھنٹی بجایا کرو۔'' تکریم

نے دروازہ کھول کر باہر کھڑے ہوئے چوکی دار سے کہا۔

''بی بی صاحب! آپ کو پتا ہے بجلی نہیں ہے اس واسطے ہم ......'' سجاد احمد نے سوچا صرف حکومت بدلی ہے اور کچھ نہیں بدلا۔ بجلی نہیں ہے' نلکوں میں پانی بھی نہیں ہو گا۔

''بولو کیا بات ہے۔''

''بی بی صاحبہ باہر گیٹ پر کوئی آدمی آیا ہے۔ بولتا ہے' صاحب سے ملنا ہے۔ اس کے ساتھ دو فوجی اور ایک پولیس افسر بھی ہے۔''

تکریم کا چہرہ سفید ہو گیا لیکن سجاد احمد تن کر کھڑا ہو گیا۔

''صاحب! ہم نے بولا ہے آپ نہیں بولے گا تو وہ اندر نہیں آ سکتا ہے۔ ہم فوج سے نہیں ڈرتا ہے صاحب! سینے پر گولی کھائے گا! ہمارا باپ بھی ......''

''خاموش رہو۔ یہ لڑائی کا میدان نہیں ہے۔ جاؤ گیٹ کھولو' انھیں اندر آنے دو۔'' سجاد احمد نے بہت سرد لہجے میں کہا۔

''بہادر باپ کی بہادر بیٹی! دیکھ لیا انجام'' سجاد احمد کی بیوی نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ وہ ایسے موقعوں پر ہسٹیریا کا شکار ہو جاتی تھی۔ ''لے جا کر اٹک کے قلعے میں ڈال دیں گے۔ جاگتے جاگتے مر جائے گا تیرا باپ۔ میرا مزار بن جائے گا یہ مکان۔ میں کہتی ہوں تو امریکہ چلی کیوں نہیں گئی۔ باپ کی نیند کا علاج کرنے آئی تھی اب قلعے کی ننگی زمین پر سوئے گا تیرا باپ۔ مولا! میں کیا کروں ...... کیا کروں مولا ......''

سجاد احمد کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ ماں کے لعن طعن کا نشانہ بنی ہوئی تکریم بھی لگتا تھا رو پڑے گی۔

''رونا بند کیجیے۔ ابھی میری میت نہیں اٹھی۔'' سجاد احمد نے سخت مگر دبے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی بیوی کا رونا اور تیز ہو گیا۔

''بیٹی اپنی ماں کو سمجھاؤ بلکہ انھیں اندر لے جاؤ۔ ہم پچھلی صدی کے کسی جنگل میں نہیں

ہیں۔ یہ لوگ میرے پروجیکٹ کی سیکیورٹی کے بارے میں بات کرنے آئے ہوں گے۔ جاؤ' تم دونوں اندر جاؤ۔''

ماں بیٹی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دونوں اسی طرح اپنی اپنی جگہ تھیں۔ سجاد احمد نے ڈرائنگ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھا تو بادشاہ خان نے گیٹ کھول دیا تھا۔ سادہ لباس والے شخص کے پیچھے آنے والے دو فوجی اور ایک پولیس افسر اپنی اپنی وردیوں سے بڑے عہدوں والے لگتے تھے۔ باہر شام کا ملگجا سا اندھیرا تھا اس لیے چہرے پہچاننا مشکل تھا۔ سادہ لباس والا شخص ڈرائنگ روم کے دروازے پر آیا تو اس نے پلٹ کر فوجیوں اور پولیس والے کو باہر رکنے کا اشارہ کیا اور قدم اندر رکھتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ وہ سفید قمیص شلوار اور کالے پشاوری چپل پہنے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ نظر آیا تو سجاد احمد پتھر کا بن گیا۔ تکریم کے چہرے کا سفید رنگ سرخ ہو گیا اور حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس کی ماں بھی رونا بھول کر اپنا دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔

''میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''صدر محترم! آپ!!''

سجاد احمد نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے کہا۔ پھر اچانک ہی بُت میں جان پڑ گئی اور وہ آگے بڑھ کر ایمان علی کا مصافحے کے لیے بڑھا ہاتھ' ہاتھ میں لے کر اسے نزدیک رکھے ہوئے صوفے پر بٹھانے لگا۔ تکریم بھی آگے بڑھ آئی تھی۔ اس کی ماں اپنی جگہ تھی صرف کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''صدر محترم! آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ مجھے طلب کیا ہوتا' میں حاضر ہو جاتا۔''

ایمان علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمرے کے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے ماحول کا جائزہ لے رہا ہو۔

''یہ تکریم ہے' میری بیٹی اور وہ میری بیگم عابدہ احمد ہیں۔ ان کا خیال تھا فوج مجھے

گرفتار کر کے اٹک کے قلعے لے جانے آئی ہے۔'' سجاد احمد نے جو اپنی حیرت پر قابو پا چکا تھا' مسکراتے ہوئے کہا۔

''اٹک کے قلعے تو آپ کو جانا پڑے گا۔'' ایمان علی نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں نہ کہتی تھی ......'' سجاد احمد کی بیگم بولیں' پھر بیٹی کی گھورتی ہوئی نظروں سے ڈر کر خاموش ہو گئیں۔

''میں نے اٹک قلعے کا عقوبت خانہ بند کر کے قلعہ سائنس کی وزارت کو دے دیا ہے جہاں وہ انٹرنیشنل ریسرچ سنٹر قائم کریں گے۔ میں نے پراویٹ سیکٹر سے انویسٹمنٹ کرنے کے لیے کہا ہے۔ یہ سنٹر بن گیا تو ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔''

''جب بھی' کسی بھی وقت۔'' سجاد احمد کے اندر کا سائنس دان ایک دم جوش میں آ گیا۔ ''یہ آپ بہت بڑا کام کریں گے۔ ہم نے اگر اپنے مستقبل کے لیے سرمایہ کاری نہیں کی تو آنے والی نسلیں اور ملک دونوں کھوکھلے ہو جائیں گے۔''

''مجھے معلوم ہے' مجھے معلوم ہے۔''

ایمان علی کے چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''ڈاکٹر سجاد! میں اس وقت آپ کے ملک کے صدر کی حیثیت سے نہیں آیا۔ ایک پڑوسی کی حیثیت سے آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔''

''جناب صدر آپ......''

''میں نے ہر ممکن احتیاط کرنے کے لیے کہا ہے۔'' ایمان علی نے سجاد احمد کی مداخلت نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر آپ چاہیں تو آپ کے لیے کسی دوسری جگہ ایسا ہی مکان لیا جا سکتا ہے۔ شفٹنگ کا انتظام اور خرچ حکومت کے ذمے ہو گا۔''

''میری بیگم کو مکانوں کی قسمت پر بہت یقین ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ یہ مکان ہمارے لیے بہت خوش قسمت اور بابرکت ہے۔ اس لیے وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ اس

مکان سے ہماری زندگی کی کئی اچھی یادیں بھی وابستہ ہیں۔''

''میں غلط نہیں کہتی۔'' سجاد احمد کی بیگم پھر بول پڑیں اور بیٹی کے گھورنے کے باوجود خاموش نہ ہوئیں۔ ''کس مکان کی ایسی قسمت ہوگی جس میں صدر صاحب خود چل کر آئے ہیں۔''

''مس احمد! میں نے آپ کی شکایت پر ہدایات جاری کر دی ہیں۔'' ایمان علی نے تکریم کی طرف رخ کر کے کہا۔ تکریم نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔ ''عملے کی گاڑیاں اب گلی میں نہیں آئیں گی اور سڑک کے دوسری طرف پارک ہوں گی۔ مہمانوں کو لاتے ہوئے پولیس کی گاڑیاں سائرن نہیں بجائیں گی۔ کوئی پولیس والا یا چوکی دار سیٹی نہیں بجائے گا۔ چھت پر پہرا دینے والے فوجیوں کو بھی بتا دیا گیا ہے کہ قدموں کی آواز نہ سنائی دے۔ پھر بھی آپ کو کوئی شکایت ہو' آپ میرے اے ڈی سی کرنل افتخار سے بات کر سکتی ہیں۔''

''شکریہ سر......''

''یہ سب کچھ کرنے میں میرا اپنا انٹرسٹ ہے۔'' ایمان علی نے سجاد احمد کا شکریہ نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ایک اہم کام میں مصروف ہیں۔ آپ کی نیند ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ آپ اگر تجربہ گاہ میں سوئے بغیر آئے تو وہ منصوبہ سو جائے گا جس پر آپ کام کر رہے ہیں۔'' کسی نے کچھ نہیں کہا۔ سب خاموش تھے۔

''مجھے اجازت دیجیے۔'' ایمان علی نے جانے کے لیے قدم اٹھائے تو عابدہ احمد ہڑبڑا کر ایک دم اٹھ گئیں۔

''جناب صدر آپ کچھ کھائے پیے بغیر نہیں جائیں گے۔''

''پھر کبھی۔''

''مسٹر پریذیڈنٹ! آئی ایم ساری I am really sorry'' تکریم نے بہت مشکل سے وہ جملہ ادا کیا جو وہ بہت دیر سے دل میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ اپنے شکایت نامے

کے ایک ایک لفظ پر شرمندہ ہو رہی تھی۔ ایمان علی کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

''مس احمد! آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ غلط نہیں ہے۔'' ایمان علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے لکھا تھا کہ میں جان بوجھ کر سستی پبلسٹی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں ایک غریب ملک کا صدر ہوں اس لیے مہنگی پبلسٹی کی عیاشی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک بنگلے میں ایوان صدر لانے سے صرف خرچ ہی نہیں بچا' آپ کی یہ President Lane دنیا بھر کے اخباروں اور ٹی وی کے لیے دلچسپ خبر بن گئی ہے۔ ایڈ دینے والوں کو اب یہ یقین دلانا آسان ہو گیا ہے کہ ان کی امداد بجیرو گاڑیاں خریدنے پر نہیں' ان کاموں پر خرچ ہو گی جس کے لیے وہ مدد دے رہی ہیں۔ اب انھیں ہمیں ایڈ دینے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ یہ Cheap پبلسٹی میرے بہت کام آ رہی ہے۔''

تکریم شرمندگی سے زمین میں کچھ اور گڑ گئی۔

ایمان علی جانے سے پہلے ایک بار پھر سجاد احمد کی بیگم کی طرف مڑا۔ ''مجھے افسوس ہے' فوجیوں کو اپنے دروازے پر دیکھ کر آپ کو صدمہ ہوا۔ وہ میری سیکیورٹی کی مجبوری ہے۔ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ میں منع کرتا ہوں لیکن نہیں مانتے۔''

''وہ ٹھیک کرتے ہیں۔ آپ قوم کی امانت ہیں۔ آپ کی حفاظت ضروری ہے۔'' سجاد احمد نے خلوص سے کہا۔

''آپ ایک منٹ کے لیے بیٹھ جائیں۔'' عابدہ احمد نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''میں آپ کی نظر اتاروں گی۔ ایسا حصار کھینچوں گی کہ کوئی آپ کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔''

''میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' ایمان علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اگر ہوا تو ضرور آ کر آپ سے نظر اترواؤں گا اور آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا بھی کھاؤں گا۔''

''آپ مجھے آٹوگراف دیں گے؟'' تکریم کی فرمائش نے ایک بار پھر ایمان علی کے

قدم روک لیے۔ وہ رُکا تو تکریم جلدی سے کونے کی میز سے اپنی آٹوگراف کی کتاب اور قلم اٹھا لائی۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''میں نے ایم بی بی ایس کے بعد ہاؤس جاب ختم کیا ہے اور اب اسپیشلائزیشن کرنے امریکہ جا رہی ہوں۔''

''آپ باہر جا کر میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم لیں گی اور پھر شادی کر کے اسی دنیا میں رہ جائیں گی۔'' ایمان علی نے مسکرا کر کہا اور تکریم کو ایسا لگا جیسے ایمان علی نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہے۔

''آپ کو پتا ہے یہ غریب ملک ایک ڈاکٹر بنانے پر کتنا سرمایہ خرچ کرتا ہے؟'' ایمان علی نے تکریم سے آٹوگراف کی کتاب لے کر کہا۔ ''ہمارے نوجوان نوکری یا اسکالرشپ لے کر باہر جاتے ہیں، پھر وہیں رہ کر اپنی حب الوطنی کا ڈنکا بجاتے ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا ہے اس ملک کے بیماروں کا کیا ہوگا؟''

جواب دیتے ہوئے تکریم کا چہرہ آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگا۔

''مسٹر پریذیڈنٹ! میرے باپ کو میرے دادا نے اپنی زمینیں بیچ کر پڑھنے کے لیے باہر بھیجا تھا۔ انھوں نے باہر رہ کر اپنی حب الوطنی کا ڈنکا نہیں پیٹا، وہ واپس آ کر ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ مجھے ڈاکٹر بنانے پر اس ملک کا ایک پیسہ خرچ نہیں ہوا۔ میں نے پراؤٹ میڈیکل کالج میں بھاری فیس دے کر پڑھا ہے۔ میں اسکالرشپ پر باہر نہیں جا رہی۔ مجھے باہر بھیجنے کے لیے میرے گھر والوں نے اپنی ساری پونجی لگا دی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اس ملک کا صدر ایک اجنبی گھر میں قدم نہیں رکھتا۔'' ایمان علی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں آپ بھی ڈاکٹر سجاد کی پے روی کریں۔ یہ ملک اس وقت شاید آپ کو کچھ نہ دے سکے۔ اس وقت یہ آپ سے کچھ لینا چاہتا ہے۔ اسے مایوس

مت کیجیے گا۔''

ایمان علی نے آٹوگراف کی کتاب پر کچھ لکھ کر تکریم کو کتاب واپس کر دی اور خدا حافظ کہہ کر جانے لگا۔ ڈاکٹر سجاد احمد اسے باہر تک چھوڑنے اس کے پیچھے لپکا تھا۔ تکریم نے وہ صفحہ دیکھا جس پر ایمان علی نے آٹوگراف دیا تھا۔ روشنی کی ایک لکیر پھیلی ہوئی تھی۔

''مستقبل کے مسیحا کے نام!''

4

نیویارک

تکریم کو ایونیو آف امریکا کے کونے پر کافی کا بورڈ نظر آیا تو وہ تیزی سے اندر گھس گئی۔ تھکن ہو رہی تھی اور سردی بھی لگنے لگی تھی۔ دکان میں بیٹھ کر کافی پینے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ کیفے لاتے کا بھرا ہوا گلاس، شکر کی پڑیاں اور انھیں کافی میں ڈال کر ہلانے والی پلاسٹک کی سلائی لے کر باہر نکلی اور کہیں بیٹھ کر پینے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگی۔ سڑک کے دوسری طرف ایک باغ تھا۔ اس کے سوکھی ٹہنیوں اور سوکھے پتوں والے اونچے اور لمبے درخت اسے سڑک عبور کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ پارک میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہرے رنگ کی پلاسٹک کی کرسیاں تھیں۔ جیسے کسی نے اپنے ذاتی باغ میں شام کی چائے پینے کے لیے سجا کر رکھی ہوں۔ تکریم ایک کرسی پر بیٹھ کر کافی میں چینی ملانے لگی۔

جس درخت کے نیچے بیٹھی تھی اس کی ٹہنی سے ٹوٹا ہوا ایک پتہ اس کی کافی پر آ گرا۔ پتہ کسی نازک سی ہتھیلی کے برابر تھا۔ کافی میں ڈوبا نہیں، بلکہ گلاس پر ڈھکنے کی طرح بیٹھ گیا۔ تکریم کو درخت کا نام نہیں معلوم تھا لیکن پتہ بالکل میپل جیسا تھا۔ تکریم نے پتے کو کیرم کی گوٹ بنا کر انگلی ماری تو پتہ زخمی ہو کر نیچے گر پڑا۔

پت جھڑ کا موسم تھا۔ نیویارک کی سردی ابھی عروج پر نہیں آئی تھی، پھر بھی سرد ہوا بدن کو کاٹ رہی تھی۔ زمین پر دور تک سوکھے پتوں کا فرش بچھا تھا۔ سورج کی شعاعوں سے درختوں پر لگے ہوئے سوکھے پتے کچھ اور چمکنے لگے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے پیڑ سونے سے لدے ہوئے ہوں۔ وہ جب ڈابس فیری Dobseferry سے ٹرین لے کر مین ہیٹن آتی تو اس کے ایک طرف چوڑا اور کشادہ دور تک پھیلا ہوا دریائے ہڈسن ہوتا اور دوسری طرف پیڑوں کی قطاریں! پتے کیسے کیسے رنگ پہنے کھڑے ہوتے۔ لال، گلابی، نارنجی، پیلے، سنہری، اودے اور پھر ان رنگوں کے کتنے ہی ہلکے ہلکے اور گہرے گہرے شیڈز۔ تکریم کبھی کبھی سوچتی کہ شاید خزاں پتوں سے بہار کے پھولوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

سامنے سے ایک جوڑا شانے سے شانہ ملائے آ رہا تھا۔ باغ کے درمیان پہنچتے ہی دونوں بہت بے صبری سے لپٹ کر ایک دوسرے کے ہونٹ نچوڑنے لگے۔ تکریم کو لگا جیسے کسی نے سوئچ آن کر کے دونوں کے جسموں میں بجلی دوڑا دی ہو۔ تکریم نے اوورکوٹ اپنے جسم کے گرد مضبوطی سے کس کر اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ اسے ہونٹوں، جسموں یا دلوں کے ملاپ کے منظر دیکھ کر اپنے اندر کوئی جذبہ نہیں جگاتا تھا۔ یہ صرف دھوکے کی دنیا تھی۔ تکریم نے کافی کے دو تین گہرے گہرے گھونٹ لینے کے بعد انھیں پلٹ کر دیکھا تو وہ باغ کی سیڑھیاں اتر کر سڑک پر دو مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔

''فراڈیے۔ دھوکے باز'' تکریم کے اندر ایک زور کی آواز گونجی۔

کافی کا گلاس اتنا بڑا تھا کہ لمبے لمبے گھونٹ لینے کے باوجود خالی نہیں ہو رہا تھا۔ امریکہ

کی ہر چیز ایسی ہی بڑی تھی۔ ان کے سینڈوچز، برگر، اسٹیک، دکانیں، بازار، عمارتیں، بس نیویارک شہر کی سڑکیں ذرا تنگ تھیں۔ یا شاید ٹریفک کی زیادتی اور اپنے دونوں طرف کھڑی ہوئی فلک بوس عمارتوں کی ہیبت سے دبی دبی لگتی تھیں۔ تکریم کے دائیں ہاتھ پر ایونیو آف امریکہ اور پشت پر 42nd اسٹریٹ تھی۔

پہلی ہی دو عمارتیں ایک دوسرے کی ضد نظر آتی تھیں۔ ایک دائرہ بنا کر اوپر کو جاتی ہوئی جسے دیکھتے ہی اسکیٹنگ کرنے والے کسی بھی مہم جو کے پیروں میں گدگدی ہونے لگے اور دوسری بالکل سیدھی! اسپائڈر مین کے لیے چیلنج بنی ہوئی۔ سامنے درختوں کے پیچھے اوپر جاتی ہوئی پرانے طرز کی مخروطی شکل کی ایک اونچی عمارت تھی۔ اس کے سیاہ پتھروں پر کہیں کہیں پیلا رنگ جھانک رہا تھا۔ جیسے کسی سیہ فام ماڈل نے اپنے سر پر سنہری وگ اور ہونٹوں پر پیلی لپ اسٹک لگالی ہو۔

کافی کا کپ کچرے کے ڈبے میں ڈال کر تکریم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے اور اب نیویارک کا آرکی ٹیکچر ناپنے تولنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ باغ سے اتری اور 42ویں اسٹریٹ پر نیویارک پبلک لائبریری کی طرف چل دی۔ اسے یقین تھا اب وہ صحیح راستے پر جا رہی ہے۔ اسے جہاں جانا تھا وہ جگہ اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے تھی۔ کسی نے بتایا تھا کہ 46ویں اسٹریٹ پر اتر کر فرسٹ ایونیو تک پہنچ جائے۔ وہ گرینڈ سنٹرل پر ٹرین سے اتری تو ''لیگ زنگٹن'' ایونیو کے چوراہے پر کھڑی دیر تک سوچتی رہی کہ فرسٹ ایونیو تک پہنچنے کے لیے سیدھے ہاتھ کو جائے یا بائیں۔ دونوں طرف سیمنٹ، پتھر اور شیشے کی عمارتوں کے ڈبے کھڑے تھے۔ تکریم کو دور سے وہ سب ایک سے لگتے تھے۔ وہ اندازے سے سیدھے ہاتھ کی طرف چل دی تھی۔ بہت دیر تک چلنے کے بعد نظر اٹھا کر دیکھا تو آٹھویں ایونیو کے چوراہے پر کھڑی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ جس سمت کا انتخاب کرتی ہے، غلط کیوں نکلتی ہے اور دوبارہ واپسی کا سفر شروع کر دیا تھا۔ یہ کوئی مختصر سفر نہیں تھا۔ اسے سات ایونیو چلنا تھا۔ ہر ایونیو دس

منٹ کے برابر تھا۔

تکریم نے شروع میں مین ہیٹن کی گلیوں کے بہت چکر لگائے تھے پھر بھی وہ مین ہیٹن سے زیادہ واقف نہیں تھی۔ وہ ڈابس فیری آنے اور جانے کے لیے گرینڈ سنٹرل جاتی لیکن نیچے ہی نیچے ٹرین بدل کر گھر چلی جاتی۔ اس نے اس دوران ایک دو بار سڑکوں پر مٹرگشت کرنے کے لیے اسٹیشن سے باہر نکلنا چاہا تھا لیکن ہر دفعہ موسم خراب تھا۔ وہ بارش اور ہوا کے تھپیڑے کھا کر دوبارہ اسٹیشن میں گھس گئی تھی اور زیرِ زمین ریلوے کی جانی بوجھی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی شٹل سے ٹائم اسکوائر اور وہاں سے دو نمبر کی ٹرین لے کر اپر مین ہٹن پہنچ گئی تھی جو کوئنز کے اس محلے سے بالکل مختلف تھا جس کا نام جیکسن ہائٹس تھا اور جسے مقصود ایمپریس مارکیٹ کہتا تھا۔ وہاں وہ جس کمرے میں رہتی رہی تھی وہ اس کے اسلام آباد کے بنگلے کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے اس کی ملازمہ کے کمرے کے ایک چوتھائی حصے کے برابر تھا۔ اتنا چھوٹا کہ اس کی سانس سامنے کی دیوار سے ٹکرا کر واپس آتی اور اس کے چہرے کو ہوا دینے لگتی۔ اس زیر زمین کمرے میں گزرا ہوا ایک ایک دن تکریم کے سینے پر ایک گھاؤ بن کر تحریر تھا۔ اسے وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جب وہ نیویارک پہنچی تھی۔

○ ○ ○

تکریم جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ کے ٹرمنل نمبر سات پر کھڑی ہوئی مقصود کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک گھنٹا گزرنے کے بعد اب سوچ رہی تھی کہ انکل رحمان کو فون کرے۔ سجاد احمد نے اپنے دوست سرجن رحمان کے پاس ٹھہرنے کے لیے زور دیا تھا لیکن تکریم نے ایک فرضی سہیلی کے ساتھ رہنے کا انتظام ہو جانے کا بہانہ کر دیا تھا۔ اس کا نیویارک کا مشن ایسا تھا کہ اسے اپنے باپ کے دوستوں کی پہنچ سے باہر رہنا تھا' لیکن اگر مقصود نہیں آیا تو...... شاید ٹریفک میں پھنس گیا ہو۔ اس نے سنا تھا کہ نیویارک کا ٹریفک بہت خراب ہے۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ

اب نیویارک بہت محفوظ ہوگیا ہے، پھر بھی کوئی سیاہ فام شخص جھومتا ہوا اس کے سامنے سے گزرتا تو اپنے دونوں سوٹ کیسوں پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو جاتی۔ کچھ دیر اور گزرنے کے بعد اس نے مقصود کے پتے کی پرچی نکالی اور انفارمیشن کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی بہت کاہل سی ایک عورت کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''اس پتے پر پہنچنے کے لیے کتنا کرایہ لگ سکتا ہے؟'' تکریم نے پرچی عورت کی طرف بڑھا کر پوچھا۔

''پیلی ٹیکسی، پرائیویٹ کار یا لیموزین؟'' عورت نے اپنے سر کی چھوٹی چھوٹی چٹیوں کا بڑا سا چھتا ہلا کر کہا۔ آنکھوں میں دوستی نہیں تھی، ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کے کام کی مجبوری تھی۔ تکریم نے سوچا، آنکھوں کی طرح ہونٹ بھی سچ کیوں نہیں بولتے۔

''جو چیز بھی سب سے سستی ہو۔''

''سامنے دروازے سے باہر نکل کر بائیں ہاتھ کو مڑو، تمھیں یلو کیب مل جائے گی۔'' عورت نے اسے باہر کا دروازہ دکھاتے ہوئے کہا، ''۳۰ سے ۴۰ ڈالر لگیں گے۔ ٹپ دینا مت بھولنا ورنہ وہ تمھارا سامان اتارے بغیر بھاگ جائے گا۔'' عورت نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس بار اس کی آنکھیں بھی ہنسی تھیں، شاید تکریم پر...... لیکن وہ فوراً ہی اپنی ہنسی مسکراہٹ میں بدل کر تکریم کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک اور مسافر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

تکریم آہستہ آہستہ ٹرالی کھینچتی ہوئی دوبارہ قطار میں لگی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ ''چالیس ڈالر تو بہت زیادہ ہیں۔'' اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ ''تقریباً ڈھائی ہزار روپے۔ اتنے پیسے تو وہ ایک مہینے کے کام کے بدلے اپنی ملازمہ کو دیتے تھے اور اگر مقصود گھر پر نہیں ہوا تو......''

اسی وقت سامنے کے دروازے سے مقصود داخل ہوا۔ اس کے چھ فٹ کے فریم پر یورپی تراش کا سوٹ تھا۔ سامنے سے کھلی ہوئی گہرے نیلے رنگ کی برساتی...... ہاتھ جیبوں میں اور دونوں کندھے اوپر کو اٹھے ہوئے۔ ماتھے پر ہمیشہ کی طرح کھنچی ہوئی تین متوازی لکیریں،

نظر کے چشمے کے نیچے مچی مچی سی آنکھیں، گھنے گھنگریالے بال اور گھنی مونچھوں سے چھن کر آتی ہوئی مسکراہٹ۔ تکریم نے دروازے سے اپنے پاس پہنچنے تک اس کے سراپا کی ایک ایک تفصیل کا جائزہ لے لیا۔ ایک ایک چیز اسی طرح تھی جب ایک سال پہلے مقصود کراچی ایئرپورٹ سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا تھا۔

''مائی ڈارلنگ، مائی کٹو، مائی ڈیئر تکی......'' مقصود نے قریب آ کر بانہیں پھیلائیں تو تکریم بے ساختہ ان میں سما گئی۔ ایسا لگا تھا جیسے کوئی بچھڑی ہوئی خوشی اچانک مل گئی ہو۔ دل رونے کو بھی چاہا تھا لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ وہ ایک کھلی جگہ اتنے مسافروں کے بیچ ایک مرد سے لپٹی کھڑی ہے تو جلدی سے الگ ہو گئی۔ ''تم کو پتا ہے میں ایک گھنٹے سے انتظار کر رہی ہوں۔''

''سوری یار تم کو پتا ہے نیویارک کا ٹریفک......''

''مجھے معلوم ہے۔'' تکریم نے اس کے سارے گناہ پہلے ہی معاف کر دیے تھے۔ اسی وقت مقصود کے پیچھے سے دبلا پتلا سا ایک شخص نکل کر آیا۔ اس کا قد چھوٹا لیکن مونچھیں بڑی بڑی اور سر کے بال آدھے سفید تھے۔

''السلام علیکم باجی!'' تکریم اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ یہ اس سے دگنی عمر کا آدمی کون تھا جو اسے باجی کہہ رہا تھا۔

''تکریم! یہ عاطف بٹ ہیں، ہمارا جگر۔ اور یہ ہماری سویٹ ہارٹ ہے، ہماری منگیتر تکریم عرف تکی۔ بٹ صاحب! ہنڑ اے ٹرالی پھڑ دے تے چلو۔''

''مقصود تم خود کیوں نہیں......''

''نہیں باجی! آپ فکر نہ کریں، ہم ڈاکٹر صاحب کے خادم ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب......!'' تکریم نے حیرت سے مقصود کو دیکھا۔ وہ ایم بی ایس کر کے آیا تھا لیکن نیویارک میں وہ ڈاکٹر کیسے بن گیا۔ مقصود اسے آنکھ مار کر مسکرایا۔ عاطف بٹ بڑی

سعادت مندی سے ٹرالی لے کر آگے آگے چل دیا تھا۔ مقصود ایک ہاتھ جیب میں ڈالے اور دوسرے ہاتھ سے تکریم کا بازو پکڑے شاہانہ انداز میں پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

عاطف بٹ کی گاڑی سفید رنگ کی ایک بڑی سی وین ثابت ہوئی۔ اس نے تکریم کے صندوق گاڑی میں چڑھائے۔ مقصود دونوں ہاتھ کو اوور کوٹ کی جیبوں میں ڈالے اس طرح کھڑا تھا جیسے ماتحتوں کی کام کی نگرانی کر رہا ہو۔ عاطف بٹ نے تکریم کے لیے پچھلا دروازہ کھولا تو مقصود اچھل کر اگلی سیٹ پر سوار ہو گیا اور بہت شان سے نشست کی پشت پر اپنا بازو دراز کر کے بیٹھ گیا۔ بٹ کی وین شاید سامان ڈھونے کے لیے استعمال ہوتی تھی اور اس میں عجیب سی بو بسی ہوئی تھی، لیکن مقصود اس طرح بیٹھا تھا جیسے لیموزین میں سفر کر رہا ہو۔

''ڈاکٹر صاحب کدھر چلنا ہے، بروکلین یا کوئنز......؟'' بٹ نے پارکنگ کے پیسے دے کر باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

''جیکسن ہائٹس بابو۔ وین وک لے کے تے کوئنز بلیوارڈ پھڑ لو۔ سیونٹی تھرڈ اینڈ تھرٹی ففتھ ایونیو۔ اوجیڑا شاہ صاحب دا نوا دفتر اے۔'' مقصود نے پنجابی زبان کی ٹانگ توڑتے ہوئے کہا۔

''تم نے پنجابی کب سے بولنی شروع کر دی؟'' تکریم نے آگے جھک کر سرگوشی کی۔

''میرے زیادہ تر کلائنٹس پنجاب کے ہیں۔''

''کلائنٹس؟''

''مریض، بے بی مریض۔'' مقصود نے ایک بار پھر بائیں آنکھ دبا کر کہا اور بٹ کا تعارف کرانے لگا۔ ''بٹ صاحب بڑے بزنس مین ہیں۔ نیویارک میں سب انھیں جانتے ہیں۔ میں اگلے الیکشن میں انھیں ڈیموکریٹک پارٹی کا ٹکٹ دلوانے والا ہوں۔''

''کیوں مذاق کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب! ہم تو بس آپ کے خادم ہیں۔ باجی! آپ کو نیویارک میں کوئی پروبلم ہو تو مجھے بتائیں۔ یہ کارڈ رکھیں اس پر میرا نمبر ہے، آپ نمبر ملاؤ۔ آپ

کا تابعدار جن آپ کی خدمت میں حاضر۔''

''جیندا رہ مرے شیر۔ کیا اشتہار بنایا ہے۔'' مقصود نے بٹ کی کمر تھپکتے ہوئے کہا۔ تکریم نے مسکرا کر بٹ کا کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا جس کے ہر دو کونوں میں ہرے رنگ سے چاند ستارہ بنا ہوا اور درمیان میں پاکستان زندہ باد لکھا تھا۔ نیچے بٹ اور اس کی کمپنی کا نام اور پتا تھا۔

جمعے کی رات تھی، ٹریفک کا رش بہت زیادہ تھا۔ بعض مقامات پر گاڑی بالکل رینگنے لگتی۔ تکریم کو جہاز میں اڑتے اور ایئر پورٹوں پر دھکے کھاتے ہوئے بیس بائیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ گاڑی کے اندر جو بو بسی ہوئی تھی، وہ بھی نا قابل برداشت ہو رہی تھی۔ طبیعت متلانے لگی۔ اسے لگا، اگر تھوڑی دیر اور گاڑی میں بیٹھی رہی تو الٹی ہو جائے گی۔

''گھر ابھی کتنی دور ہے؟'' اس نے مقصود کا ہاتھ ہلا کر پوچھا جو نیند کے جھونکے لے رہا تھا۔

''بس تھوڑی دیر اور......'' مقصود نے کھڑکی کے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں جیسے ہی ایمپریس مارکیٹ جیسا علاقہ نظر آئے، سمجھو گھر آ گیا۔''

مقصود نے غلط نہیں کہا تھا۔ گاڑی ایک بہت روشن چوک پر پہنچی تو سامنے کونے کی ایک بڑی سی دکان کے باہر سبزیوں کے ڈھیر لگے نظر آئے۔ بڑا سا بورڈ تھا جس پر انگریزی میں سبزی منڈی لکھا تھا۔

''نیو یارک میں سبزی منڈی؟'' تکریم کو حیرت ہوئی۔

''بے بی! یہ نیو یارک نہیں، یہ ایمپریس مارکیٹ ہے ایمپریس مارکیٹ۔ دور دور تک دیکھو، تمھیں کوئی امریکی نظر آتا ہے؟''

مقصود صحیح کہہ رہا تھا۔ فٹ پاتھوں پر، دکانوں میں، گاڑیوں میں انڈین، پاکستانی، بنگالی اور اسپینی عورتوں اور مردوں کا ہجوم تھا۔ ہر ریسٹورنٹ انڈین تھا یا پاکستانی۔ جگہ جگہ حلال گوشت

کے طغرے لگے ہوئے تھے اور ہر دوسری دکان انڈیا' پاکستان اور بنگلا دیش فون کرنے والے کارڈوں سے بجی ہوئی تھی۔ ایک سینما گھر بھی نظر آ رہا تھا۔ اس میں کوئی انڈین فلم چل رہی تھی۔

گاڑی رکی تو تکریم جلدی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ مسالوں اور بھنے ہوئے سالنوں کی خوشبو آ رہی تھی لیکن وہ گاڑی کے اندر بسی ہوئی بو سے کہیں بہتر تھی۔ مقصود اس کا بازو پکڑ کر کھلے احاطے میں داخل ہوا۔ تینوں طرف مکانوں کے دروازے تھے۔ دائیں ہاتھ کے مکان کی کھڑکی سے دو عورتیں جھانک رہی تھیں۔ بائیں طرف کے دروازے سے جس پر مسجد کا بورڈ لگا ہوا تھا' داڑھیوں والے دو تین لوگ شاید نماز پڑھ کر باہر نکل رہے تھے۔ مقصود اسی کے آگے آخری کونے میں ایک دروازے کا قفل کھولنے لگا۔ پیچھے پیچھے عاطف بٹ تکریم کے سوٹ کیس باری باری کھینچ کر لا رہا تھا۔

دروازہ کھلا تو تنگ سی سیڑھیاں نیچے تہہ خانے میں جا رہی تھیں۔ ان پر ادھڑا ہوا پرانا قالین پڑا تھا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی سامنے ایک کھلے دروازے سے بہت تنگ اور چھوٹا سا باتھ روم جھانک رہا تھا۔ دائیں طرف دو تین سیڑھیاں اتر کر چھوٹا سا چوکور لاؤنج تھا جسے شاید دفتر بنا دیا گیا تھا۔ ہر خالی جگہ پر اخباروں کی اونچی اونچی گڈیاں تھیں۔ کئی میزیں تھیں۔ دو میزوں پر کمپیوٹر اور ایک بڑی سی میز پر بڑے بڑے سادہ کاغذوں' قلموں اور قینچیوں کا ڈھیر تھا۔ ایک دروازہ اور تھا۔ مقصود اسے کھول کر اندر داخل ہوا اور تکریم کو اندر بلانے لگا۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟'' تکریم اس گھر میں داخل ہوتے ہی سہم گئی تھی' کمرا دیکھ کر اور خوف زدہ ہو گئی۔ کونے میں ایک بستر اور ایک چھوٹی سی سائڈ ٹیبل تھی۔ ایک کرسی اور اخباروں کے ڈھیر سے جو جگہ بچی تھی' وہ بس اتنی تھی کہ تکریم کے دو سوٹ کیس آنے کے بعد گزرنے کی جگہ نہیں بچتی۔

''ریلیکس...... صرف چند دنوں کی بات ہے جس کے بعد ہم اپنے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔'' مقصود نے کہا اور پہلی بار عاطف بٹ کی مدد کرنے لگا جسے تنگ سیڑھیوں کی وجہ

سے تکریم کے سوٹ کیس نیچے اتارنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ دونوں مل کر تکریم کا سامان کمرے میں ٹھونسنے میں کام یاب ہو گئے۔

''بٹ صاحب! ذرا نسں کے کباب کنگ سے دو آدمیوں کا کھانا تے پھڑ لو۔'' بٹ اللہ دین کے غلام جن جیسی سعادت مندی سے کچھ کہے بغیر واپس مڑا اور باہر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

مقصود نے کمرے میں رکھی ہوئی اکلوتی کرسی پر گر کر بڑی سی انگڑائی لی۔ تکریم اسی طرح کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

''مِکّی یہ کیا ہے؟'' مقصود اسے تکی کہتا تو وہ بھی اسے مِکّی کہنے لگی تھی۔

''کہاں کیا ہے؟''

''یہ قبر جیسا ایک چھوٹے سے بستر کا تنگ سا کمرا۔ یہ...... یہ......''

''جان من! ہمیں صرف ایک بستر چاہیے۔ اور یہ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ چلو آزما کر دیکھتے ہیں۔ چھوٹا ثابت ہوا تو بڑا لے آئیں گے۔'' مقصود نے کرسی سے اٹھ کر تکریم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر وہ مخصوص شرارتی مسکراہٹ تھی جو اُس کی شناخت تھی۔

''مذاق مت کرو۔ مجھ میں اس وقت غصہ کرنے کی انرجی نہیں ہے۔'' تکریم نے مقصود کو دھکا دے کر دوبارہ کرسی میں گراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے صاف صاف بتاؤ یہ سب کچھ کیا ہے۔ تم نے کہا تھا' ایک سال کے اندر اندر تمھارے قدم جم جائیں گے۔ آنے سے پہلے تمھیں فون کیا تھا تو تم نے کہا تھا' سب کچھ ٹھیک ہے' بس آ جاؤ۔ میں آ گئی ہوں لیکن میں یہاں اس تہہ خانے میں دفن ہونے نہیں آئی۔ مجھے تمھارے ساتھ تمھارے گھر میں رہنا ہے۔''

''Promise!'' مقصود کے ہونٹوں پر دوبارہ اس کی شرارتی مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن جلد ہی معدوم ہو گئی۔ ''میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تین آدمیوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرے پاس صرف ایک بستر ہے اور تم شادی سے پہلے ہم بستر ہونے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تیار

ہو بھی جاؤ تو میں رات کی ڈیوٹی کرتا ہوں اور تمھیں رات بھر اکیلا تین آدمیوں کے ساتھ چھوڑنے کا چانس نہیں لے سکتا۔''

''تم نے انتظام کیوں نہیں کیا؟ تمھیں پتا تھا' میں آ رہی ہوں۔'' تکریم کا غصہ تیز ہو رہا تھا۔

مقصود کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔ ''تم لمبی پرواز سے واپس آئی ہو۔ تھکی ہوئی ہو۔ کھانا کھا کر سو جاؤ۔ صبح اٹھو گی تو ہر چیز اتنی تنگ اور تاریک نظر نہیں آئے گی۔'' مقصود پہلی بار سنجیدہ ہو کر گفتگو کر رہا تھا۔ ''سب کچھ اسی طرح ہو گا جس طرح ہم نے طے کیا تھا۔ ہم پہلی فرصت میں شادی کریں گے۔ ویک اینڈ پر تم مکمل آرام کرو۔ پیر کو ہم اپنا بلڈ ٹیسٹ کرائیں گے اور......''

''بلڈ ٹیسٹ کیوں......؟''

''امریکہ میں شادی کے لیے بلڈ ٹیسٹ کرانا ضروری ہے۔''

''اور بلڈ میچ نہیں ہوا تو؟''

''تو پھر شادی کے بغیر عیش کریں گے۔'' مقصود نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اور دوبارہ سنجیدہ ہو کر بتانے لگا۔

''ہم دونوں کو اپنا بلڈ گروپ معلوم ہے۔ ہماری قسمت میں عیاشی صرف شادی کے بعد ہی لکھی ہے۔ شادی ہوتے ہی ہم اپنا اپارٹمنٹ لے لیں گے لیکن یہاں ایمپریس مارکیٹ یا کسی بھاٹی گیٹ پر نہیں۔ کسی اچھی جگہ۔ سچ مچ کے نیویارک میں۔''

''اس وقت تک میں تہہ خانے کی اس کھولی میں قید رہوں گی؟''

''یہ قید نہیں ہے۔ تم یہاں بہت محفوظ اور شہزادی کی طرح رہو گی۔ یہ اخبار کا دفتر ہے' یہاں صبح نو سے چھ بجے شام تک کام ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ جگہ صرف تمھاری ہے۔ دن میں بھی کوئی تمھیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ کوئی تمھارے کمرے میں نہیں آئے گا۔ تمھاری ایک

آواز پر سب تمھارا حکم بجالانے کو تیار ہوں گے۔ خود سیّد یہاں پر ہوگا۔ میں اسے پاکستان سے جانتا ہوں۔ وہاں اس کے اخبار کے لیے کالم لکھا کرتا تھا۔ وہ یہاں شاہ صاحب کہلاتا ہے۔ تم اس پر پورا بھروسہ کرسکتی ہو۔''

تکریم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ اسی طرح نظریں جھکائے خاموش بیٹھی زمین پر بار بار ٹھوکر مار رہی تھی، لیکن یقین آہستہ آہستہ بحال ہو رہا تھا۔ مقصود اسے غور سے دیکھتا ہوا ایک بار پھر تسلی آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ ''میں پہلے سے انتظام کر لیتا تو تم میرے ساتھ اکیلے رہتے ہوئے گھبراتیں۔ تمھارا ایمان خطرے میں پڑ جاتا۔''

''ایمان کی بات نہیں ہے۔ میرے ماں باپ نے مجھ پر جو بھروسا کیا ہے، میں اسے نہیں توڑ سکتی۔''

''انھیں کیا پتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟''

''مجھے تو پتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔''

''لیکن تم انھیں بتائے بغیر مجھ سے شادی کر کے ان کا بھروسا توڑنے والی ہو۔''

''انھیں دکھ ہوگا لیکن یہ اطمینان بھی کہ میں نے شادی کی ہے، کوئی گناہ نہیں کیا۔''

''اوکے مائی ڈیئر Stone age little angel تم خواب دیکھو، مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے۔'' مقصود نے کرسی سے اٹھ کر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بٹ ابھی تک کھانا لے کر نہیں آیا۔ سالا بھاگ تو نہیں گیا؟''

''تم...... تم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟'' تکریم کا خوف پھر واپس آ گیا۔

''تکی، یہ نیویارک ہے، یہاں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر روٹی نہیں ملتی۔ کام نہیں کروں گا تو ہمارے خواب بھی پورے نہیں ہوں گے۔ مجھے ایک گھنٹے کے اندر ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔''

''تم کرتے کیا ہو؟''

''میں؟'' مقصود نے اپنا سینہ پھلا کر اس پر مکے مارتے ہوئے کہا۔ ''میں سید مقصود علی

قریشی، ایم بی بی ایس، ڈی ایم سی۔ گارڈ کا کام کرتا ہوں۔ چوکی دار ہوں۔ چو۔کی۔دار۔"

"لیکن وہ بٹ تمھیں ڈاکٹر صاحب کہہ رہا تھا۔ اور وہ تمھارے کلائنٹ...... وہ مریض......"

"وہ بھیس میں بٹ جیسے دو نمبریوں کے لیے بدلتا ہوں۔ نیویارک میں دو لاکھ پاکستانی ہیں۔ صرف لاکھ سوا لاکھ ٹھیک ہیں باقی سب دو نمبری۔ انھیں کوئی نہ کوئی چکر چلانے کے لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں ایک ڈاکٹر دوست سے انھیں سرٹیفکیٹ دلوا کر اپنا کمیشن وصول کرتا ہوں۔"

تکریم کی آنکھوں میں غصے کی جگہ ہمدردی بھر گئی۔

"انشااللہ جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" تسلی دینے کی باری اب اس کی تھی۔ "ایک مہینے کے اندر میری پڑھائی شروع ہو گی تو مجھے ہاؤس جاب مل جائے گی۔ تمھیں پھر چوکی داری کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ تم امتحان دینے کی تیاری کرنا۔ جلد ہی ہماری اپنی پریکٹس ہو گی۔ دروازے پر بڑا سا بورڈ لگا ہو گا۔ ڈاکٹر سیّد مقصود علی قریشی۔ ایم بی بی ایس۔ ڈی ایم سی۔"

تکریم کی آنکھوں میں سنہرے مستقبل کے چراغ روشن ہونے لگے تھے۔ مقصود نے ایک لمبی سی جماہی لی۔ اس کی آنکھوں میں صرف تھکن تھی۔

"تمھارا دوست کیسا آدمی ہے؟" تکریم خوابوں کے محل سے پھر واپس اسی تنگ کمرے میں آ گئی جہاں اسے چند روز رہنا تھا۔

"کون دوست؟"

"سیّد...... اس کھولی کا مالک۔"

"سیّد نہیں، شاہ صاحب کہو شاہ صاحب۔ اسے سیّد صرف میں کہہ سکتا ہوں۔" مقصود نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک درویش آدمی ہے لیکن کریک ہے۔ رعب اتنا ہے

کہ ایک زمانے میں اس کا نام سن کر پاکستانی سفیر کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے تھے۔ اسے کسی کی پروانہیں ہے۔ وہ اپنے اصولوں سے چمٹا ہوا ہے۔ میں نے کئی بار کہا کہ مجھے پارٹنر بنا لے' چھ مہینے میں اس تہہ خانے سے نکال کر مین ہیٹن کی پچاس منزلہ عمارت میں پہنچا دوں گا' لیکن وہ مجھے ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔''

''تم کیا کرو گے؟ وہی جسے تم دو نمبر کا کام کہتے ہو؟''

''تکی! گھی نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنا پڑتی ہے۔ عاطف بٹ کو دیکھو۔ ابھی تک قانونی نہیں ہوا۔ میٹرک فیل ہے اور ہزاروں میں کھیلتا ہے۔ میرے پاس گرین کارڈ ہے۔ ڈاکٹر ہوں اور چوکی داری کرتا ہوں۔ جس دن میری انگلی ٹیڑھی ہو گئی' گھی کے چشمے بہہ نکلیں گے۔''

''ہمیں گھی کے چشمے نہیں چاہئیں۔'' تکریم کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ ''میں تمھاری انگلی ٹیڑھی ہونے سے پہلے توڑ دوں گی۔ تم نے دھوکے بازی کا کوئی کاروبار کیا تو تمھیں اسی نیویارک میں دفن کروں گی۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔''

''میری شیرنی! تم بھی مجھے نہیں جانتیں۔ میں بہت تیز دوڑتا ہوں۔ ایسا بھاگوں گا کہ تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔'' مقصود نے قہقہہ لگا کر کہا۔

تکریم مقصود کو غور سے دیکھنے لگی۔ وہ اسے کچھ بدلا بدلا اور الجھا الجھا سا لگا۔ سب کو ہنسی میں اڑانے والا' اس وقت اپنے اوپر ہنس رہا تھا۔ تکریم کو وہ ایسا بچہ لگا جسے اس کی ماں بھرے بازار میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہو اور جو اپنی بچہ گاڑی میں لیٹا ہوا آنے جانے والی تیز گاڑیاں حیرت سے دیکھ رہا ہو۔ وہ نفسیاتی الجھنیں سمجھتی تھی۔ اسے پتا تھا مقصود اپنی زمین سے اکھڑا ہوا ایسا پودا ہے جو نئی زمین میں جڑ پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ عمل آسان نہیں تھا اس لیے بکھرا بکھرا سا اور ضدی ہو گیا ہے۔ اس نے سوچا' وہ جلد ہی اس پودے کی جڑیں ایک گملے میں محفوظ کر دے گی۔ دو تین برسوں کی بات تھی اس کے بعد وہ یہ گملا واپس لے جا کر اس کے پودے کو

اس کی اپنی زمین سے دوبارہ جوڑ دے گی۔ تکریم کا سارا غصہ اور تمام وسوسے ہوا ہو گئے۔ اس نے اتنے پیار سے مقصود کو دیکھا کہ وہ بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ بٹ شاید کھانا لے کر آ گیا تھا۔

مقصود تکریم کو چھوڑ کر اور تہہ خانے سے نکل کر باہر سڑک پر آیا تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آج وہ دن میں بھی نہیں سویا تھا اور اب اگلے بارہ گھنٹے تک پھر جاگنا تھا۔ ابھی اسے گھر جا کر ویلری سے نمٹنا تھا۔ کپڑے بدلنے تھے اور ڈیوٹی شروع ہونے میں صرف ایک گھنٹا باقی بچا تھا۔ مقصود نے سوچا' اس نے اچھا کیا تھا جو بٹ کو روک رکھا تھا ورنہ ٹرین کے انتظار اور سفر میں آدھا گھنٹا لگ سکتا تھا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے تکریم کو ابھی امریکہ کیوں آنے دیا۔ ایک وقت میں گلے میں دو دو گھنٹیاں باندھنے کی کیا ضرورت تھی بلکہ امریکہ میں پاکستانی لڑکی کی ضرورت بھی کیا تھی' لیکن پھر اسے خیال آیا کہ تکریم کو پڑھائی کے لیے امریکہ آنا ہی تھا۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ پھر وہ اپنی عادت سے بھی مجبور تھا۔ تکریم سے اس کا عشق ابھی اپنے انجام کو نہیں پہنچا تھا۔ وہ یہ عشق نامکمل چھوڑ دیتا تو اس کا ریکارڈ خراب ہو جاتا۔ تکریم کو اپنی خود اعتمادی اور خوش اعتقادی پر بہت فخر تھا۔ اس کا یہ گھمنڈ بھی توڑنا تھا۔ یہ وہ کھیل تھا جس میں فتح ہمیشہ مقصود کی ہوتی تھی۔

مقصود پاکستانی لڑکیوں کا یہ مسئلہ کبھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ مولوی کے دو بول پڑھتے ہی حرام حلال کیسے ہو جاتا ہے۔ اسے امریکی لڑکیوں کی منطق پسند تھی۔ پہلے جسم کا رشتہ استوار کرو۔ بدن کی کیمسٹری صحیح کام کر رہی ہے تو مولوی بلوا لو یا گرجے چلے جاؤ۔ نہیں تو بائی بائی۔ لیکن ویلری بھی تو امریکی تھی۔ نہیں امریکی نہیں' اسپینی۔ کولمبیا کی تھی مگر اس کا خمیر شاید اسپین کے اس چپے سے اٹھا تھا جس پر مسلمانوں کے قدموں کے نشان ابھی باقی تھے۔ اس نے بھی پہلے ہی بوسے کے بعد شادی کا سوال اٹھا دیا تھا۔ مقصود کے لیے شادی کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسے شادیوں کی عادت تھی مگر وہ امریکہ رہ کر اتنی جلدی اس جنجال میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ

رات اتنی نشیلی تھی اور ویلری کا قرب اس کے حواس پر اس طرح چھایا تھا کہ وہ عادتاً ہاں کہہ کر اس کے سامنے گھٹنے کے بل جھک گیا تھا۔

ویلری اسے کوئنز میں روز ویلٹ ایونیو کے ایک اسپینی بار میں ملی تھی جہاں وہ گارڈ کی ڈیوٹی دیتا تھا اور ویلری کاؤنٹر کے پیچھے ساقی گری کا کام کرتی تھی۔ جس طرح جیکسن ہائٹس کراچی، بمبئی یا ڈھاکا کا کوئی بازار تھا، فوسٹر ایونیو لاہور یا امرت سر فلشنگ چین یا کوریا کا کوئی شہر اور برائٹن بیچ ماسکو کا کوئی غریب محلہ، اسی طرح اسپینی شراب خانے کے اندر جنوبی امریکہ اور میکسیکو آباد تھا۔ ٹکیلا کی خوشبو ہر دوسری شراب کی مہک پر حاوی تھی۔ جیوک بکس میں اونچی آوازوں سے بجتے ہوئے اسپینی گانوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے لیے چیخنا ضروری تھا۔ پھر بھی نیم تاریک گوشوں میں رکھی ہوئی اونچی میزوں اور اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے ایک دوسرے کے کانوں میں جو سرگوشیاں کرتے، وہ دور تک سنی جا سکتی تھیں۔ سب سے زیادہ ہجوم بار کاؤنٹر پر ہوتا جس کے پیچھے بھرے بھرے جسموں اور چست لباسوں والی تین لڑکیاں جام دینے کے ساتھ ساتھ گاہکوں پر اپنی ادائیں اور مسکراہٹیں بھی برساتی تھیں۔

ویلری ان میں سب سے زیادہ شوخ اور چنچل تھی۔ ہر گاہک اس سے خوش تھا۔ سب کو پتا تھا کہ مسکرانا اس کا پیشہ ہے پھر بھی سب کو یہ گمان رہتا کہ وہ ان پر زیادہ مائل ہے۔ یہی ویلری کا کمال تھا۔ وہ پھرکی کی طرح حرکت کرتی تھی۔ ایک کو آنکھ مارتی، دوسرے پر مسکراہٹ کا وار کرتی، تیسرے کا ہاتھ دبا دیتی، چوتھے کے کان میں سرگوشی کرتی اور پانچویں کو جام بنا کر دیتے ہوئے چھٹے شخص کو قتل کرنے والی نگاہ سے دیکھتی۔ اس نے اپنے قد کی کمی اونچے پلیٹ فارم والے جوتے پہن کر پوری کی تھی۔ عمر ۲۲۔۲۳ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کالے بالوں کی کچھ لٹیں سنہری رنگی ہوئی تھیں جو پیشانی پر جھولتی ہوئی اچھی لگتیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور قدرتی کاجل لیے ہوئے تھیں۔ بھرے بھرے ہونٹ گہرے سرخ رنگ سے تپے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کام کرتے ہوئے اس کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ سب سے زیادہ اس کے سینے کی دو صحت مند

بوٹیاں جو تنگ لباس میں جکڑی ہونے کے باوجود اپنی عمودی جنبشوں سے سب کے دلوں کی دھڑکنیں تہہ و بالا کر دیتی تھیں۔ وہ جب بوتل نکالنے کے لیے پلٹتی تو اس کے اسکرٹ میں پھنسی ہوئی گولائیاں دیکھ کر الکحل میں ڈوبے ہوئے شرابی بھی چونک کر اپنے اپنے جاموں سے باہر کود پڑتے۔

ویلری مقصود کی توجہ کا خاص مرکز بن گئی تھی۔ وہ کوک یا پانی کا گلاس صرف اسی سے لے کر پیتا تھا۔ آتے جاتے کوئی برجستہ جملہ چست کر جاتا۔ اسپینی گاہکوں کے مقابلے میں اس کی شخصیت زیادہ جاذب نظر تھی۔ گارڈ کی یونیفارم میں وہ اور زیادہ بارعب لگتا۔ ویلری بھی کبھی کبھی سچ مچ کی مسکراہٹ پھینک کر اس کی توجہ کا جواب توجہ سے دینے لگی تھی۔ وہ شراب خانے سے پندرہ منٹ کی پیدل مسافت پر رہتی تھی اور اکیلے گھر جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مقصود نے اس کا محافظ بن کر اسے گھر تک چھوڑنے کی ڈیوٹی خود لے لی۔ وہ بار میں آنے والے شرابیوں کا مذاق اڑاتے، لطیفے سناتے اور ایک دوسرے کو ہنساتے یہ سفر طے کرتے۔ ایک دن وہ مقصود کو مذاق کا نشانہ بنا کر بھی خوب ہنسی تھی۔

''تم کیا اپنے ملک میں فوجی تھے؟'' ویلری نے پوچھا تھا۔

''کیوں؟ کیا میں فوجی لگتا ہوں؟''

''ہاں، مگر بھگوڑے۔'' وہ ہنسی۔

''میں پاکستان میں ڈاکٹر تھا، ڈاکٹر۔'' مقصود نے بہت فخر سے کہا۔

''ڈاکٹر؟'' ویلری نے کہا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ دیر تک پیٹ پکڑے ہنستی رہی۔

''کیوں، کیا تمھیں یقین نہیں آیا؟'' مقصود کو اپنے ڈاکٹر ہونے کا مذاق اڑوانا پسند نہیں تھا۔

''نہیں نہیں! بالکل یقین آ گیا۔ میں بھی اپنے ملک کے وزیراعظم کی بیٹی ہوں۔'' ویلری ایک بار پھر ہنسنے لگی۔

''تمھارا خیال ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' مقصود جھنجھلا گیا تھا۔

''تمھارا خیال ہے، میں جھوٹ بول رہی ہوں۔'' ویلری نے کہا اور ایک بار پھر ہنس پڑی۔ مقصود نے کچھ نہیں کہا، بس خاموشی سے چلتا رہا۔ ویلری نے بھی اپنی ہنسی روک لی تھی۔ اس کا گھر آ گیا تو ''بائی بائی ڈاکٹر'' کہہ کر ہنستی ہوئی اپنی بلڈنگ میں داخل ہوگئی۔ مقصود کا گھر ویلری کے گھر سے مزید پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا۔

ایک دن ہوا تیز تھی اور سردی پڑ رہی تھی۔ دونوں ہنسنا ہنسانا بھول کر اپنے اپنے اوورکوٹوں میں جکڑے اور کپکپاتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ ویلری کی بلڈنگ کے سامنے پہنچ کر مقصود خدا حافظ کہنے کے لیے رکا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بلڈنگ کے اندر کھینچ لائی۔ ''کافی پی کر جاؤ ورنہ سردی میں جم جاؤ گے۔''

مقصود کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ سردی نے ویلری کی برف توڑ دی ہے۔ دونوں ہاتھ پکڑے پکڑے لفٹ سے چوتھی منزل پر آئے۔ وہ ایک چھوٹے سے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ صرف ایک کمرا تھا جو بیڈ روم بھی تھا اور ڈرائنگ روم بھی۔ تین نشستی صوفے نے بستر اور ایک چھوٹے سے کچن کے درمیان حد فاصل قائم کی ہوئی تھی۔

ویلری نے اپنا اور مقصود کا اوورکوٹ اتار کر کونے میں کھڑے ہوئے ایک اسٹینڈ پر لٹکا دیا۔ وہ ابھی تک اپنا شراب خانے والا چست لباس پہنے ہوئے تھی جس کا چمک دار رنگ چنگاریاں برسا رہا تھا۔ مقصود نے اسی لباس میں اسے شراب خانے کے ملگجے اندھیرے میں اور ایک فاصلے سے دیکھا تھا۔ اتنے قریب سے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ کافی بنانے کچن کی طرف جانے لگی تو مقصود نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا۔ ویلری نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

''ویلری! تمھیں پتا ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''مجھے بھی تم سے محبت ہے، ڈاکٹر۔'' ڈاکٹر کہتے ہی ویلری کی ہنسی چھوٹ پڑی اور وہ

مچھلی کی طرح مقصود کے بازوؤں سے پھسل کر نکل گئی لیکن مقصود اس وقت برا ماننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ آیا ہوا شکار چھوڑنا نہیں سیکھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دوبارہ ویلری کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر بھینچا اور ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ ویلری کا جوابی بوسہ اس سے زیادہ طویل اور پر جوش تھا۔ مقصود کو پہلی بار غیر ملکی بوسے کی لذت حاصل ہوئی تو اس نے سوچا پاکستانی لڑکیوں کو بوسہ دینا بالکل نہیں آتا۔ مقصود ویلری کو اسی طرح بانہوں میں لیے لیے بستر کی طرف بڑھنے لگا تو ویلری نے قدم فرش پر جما دیے اور مقصود کو اپنے آپ سے الگ کر دیا۔ مقصود نے ایک بار پھر اس کی طرف بڑھنا چاہا لیکن ویلری نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ اچانک بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ''تم میرے ساتھ سونا چاہتے ہو؟'' اس نے اس طرح کہا جیسے چائے کے لیے پوچھ رہی ہو۔

مقصود احمقوں کی طرح زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''تمھارے ساتھ سونے سے مجھے کیا ملے گا؟''

''لذت' آسودگی' پیار۔''

''یہ سب کچھ مجھے شراب خانے کے کسی بھی گاہک سے مل سکتا ہے۔ وہ مجھے مالا مال بھی کر سکتے ہیں۔''

''پھر مجھے گھر لے کر کیوں آئی تھیں؟'' مقصود نے اپنا اوور کوٹ لینے کے لیے اسٹینڈ کی طرف قدم بڑھایا۔

''آئی لو یو میک!'' مقصود کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر ویلری کو دیکھا تو امید کی کرن ایک بار پھر نظر آنے لگی۔

''I love you too honey.'' اس نے اپنی آواز میں بہت سے جذبے بھر کر کہا تھا۔

''مجھ سے شادی کرو گے؟''

''شادی؟'' مقصود کے حلق میں کوئی گولا سا اٹک گیا۔

''مجھے رنڈی نہیں بننا۔ مجھے ایک رات کا نہیں، زندگی بھر کا ساتھی چاہیے۔ کہو، مجھ سے شادی کرو گے۔ اس کے بعد میرے بدن اور گھر کے سب دروازے تمھارے لیے کھلے ہیں۔''

ویلری خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی تو اس کے اندر کا مقصود جاگ گیا۔ مکالمے بول کر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پہلے ہی کافی وقت ضائع ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا دایاں گھٹنا زمین پر ٹکایا اور ویلری کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔ ''مجھ سے شادی کرو گی؟''

''انگوٹھی کہاں ہے ایڈیٹ؟''

مقصود نے ویلری کی وہ انگلی جس میں انگوٹھی پہنائی جاتی ہے، جڑ تک اپنے منہ میں لے لی۔

''میرے ہونٹوں کی انگوٹھی کسی بھی سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔'' اس نے انگلی منہ سے نکال کر کہا۔

''بولو۔ مجھ سے شادی کرو گی؟''

''یس، یس ڈاکٹر!'' ویلری اس بار ڈاکٹر کہہ کر ہنسی نہیں بلکہ اس نے اپنی وہ انگلی جسے مقصود اپنے ہونٹوں کی انگوٹھی پہنا چکا تھا، اپنے منہ میں لے لی۔ مقصود نے اٹھ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹا تو ویلری بے صبری سے اسے جگہ جگہ سے چومنے لگی۔

دوسرے دن جب مقصود ویلری کے فلیٹ سے نکلا تو وہ پوری طرح اس کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی شام وہ اپنا سامان لے کر ویلری کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا تھا اور اگلے ہفتے ایک چرچ میں دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔ جس اسپینی پادری نے شادی کے بول پڑھائے، اس کی زبان کا ایک لفظ بھی مقصود کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ویلری نے کہنی ماری تھی تو چونک کر ''ہاں، مجھے قبول ہے'' کہا تھا اور ویلری کے ہونٹوں پر شادی شدہ ہونے کی مہر ثبت کر دی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! اب کدھر چلنا ہے؟'' بٹ نے گیئر بدلتے ہوئے پوچھا تو مقصود چونک پڑا۔

''ادھر ہی رستے میں اتار دینا۔''

''رستے میں کدھر؟''

''آسٹوریا...... 31st اسٹریٹ۔''

''وہ تو الٹی طرف ہے۔ میں بروکلین جا رہا ہوں' فوسٹر ایونیو۔''

''کمال کر دے او بٹ صاب۔ ۲۷۸ پھڑ کے تے اٹلانٹک ایونیو لے لو۔ او تیکا ایونیو پہنچ کے تے سجے ہتھ نوں ہو جاؤ' او تا نو سیدھی بھائی گیٹ پہنچائے گی۔''

''ڈاکٹر صاحب! آپ پنجابی غلط بولتے ہو' اوپر سے رستہ بھی غلط بتاتے ہو۔'' بٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ فکر نہ کرو۔ آپ جدھر بولو گے' پہنچاؤں گا۔'' عاطف بٹ' مقصود کو کئی دن سے گاڑی میں گھما رہا تھا لیکن اب تک یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ مقصود کا اپنا گھر کہاں ہے۔ اس نے سوچا شاید اس وقت اپنے گھر جا رہا ہو۔

''کون سی بلڈنگ پر روکوں۔'' ۳۱ ویں اسٹریٹ آتے ہی بٹ نے پوچھا۔

''بس ادھر ہی۔'' مقصود نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''ڈاکٹر صاحب میرا سرٹیفکیٹ......''

''کل صبح شاہ صاحب کے دفتر آ جاؤ' تیار ملے گا۔ آج تمھاری بھابی کو لینے ایئرپورٹ نہ جانا ہوتا تو آج......''

''دوپہر کو مجھے اسی طرف مال ڈلیور کرنا ہے' ایک بجے آ جاؤں؟''

''ٹھیک ہے' تین چار آدمیوں کا کھانا بھی پکڑتے لانا۔ تمھاری بھابی اور شاہ صاحب کے ساتھ مل کر کھائیں گے۔ بہاری کباب ضرور لانا۔ آج تم نے ڈنڈی ماردی تھی۔''

''جو حکم ڈاکٹر صاحب۔'' بٹ سوچنے لگا شاید یہ آخری کھانا ہو۔ وہ مقصود کو گاڑی سے

اتر کر سڑک کراس کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اسے دیکھنا تھا وہ کس عمارت میں داخل ہوتا ہے لیکن مقصود سیدھا کونے والی دکان میں گھس گیا۔ سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی تھی۔ تکریم نے بہت پہلے اس سے سگریٹ نہ پینے کی قسم لی تھی۔ وہ اس کے سامنے سگریٹ پی کر نیا جھگڑا کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ قصہ نہ ہوتا تب بھی وہ سیّد کے گھر میں سگریٹ نہیں پی سکتا تھا۔ سیّد کی جگہ چھوٹی ضرور تھی لیکن اسے صفائی اور ماحولیات کا مرض تھا۔ اس کی حدود میں سگریٹ پینا منع تھا۔ بٹ کی گاڑی میں بھی نو اسموکنگ کا اشتہار چپکا ہوا تھا۔

دکان دار نے اس کے کہنے سے پہلے ڈنہل بلیو کا پیکٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور ویلری کی خیریت پوچھنے لگا۔ وہ انھی کی بلڈنگ کی ساتویں منزل پر تین کمروں کے ایک بڑے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور مقصود کو اچھی طرح جانتا تھا۔ مقصود نے دکان سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا' بٹ کی گاڑی جا چکی تھی۔ اس کی بلڈنگ وہاں سے تین گلی دور تھی۔ وہ سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ ان کے گھر میں سگریٹ پینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنے فلیٹ میں آکسیجن بھی سگریٹ کے دھوئیں سے حاصل کرتے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ڈیوٹی پر پہنچنے میں ۴۵ منٹ باقی تھے۔ پندرہ منٹ ویلری سے جھگڑا کرنے کے' پندرہ منٹ تیاری کے اور پندرہ منٹ شراب خانے تک پہنچنے کے۔

ویلری سے اس کی شادی کو تین مہینے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ مقصود کا خیال تھا کہ شادی صرف تین مہینے تک ہنی مون بن کر گزرتی ہے اس کے بعد بیماری بن جاتی ہے۔ مکان کا کرایہ' بجلی' فون اور گیس کے بل' کھانا پکانے' صفائی کرنے اور کچرا پھینکنے کی ڈیوٹی' کہاں گئے تھے کی تفتیش' کب آؤ گے کے سوال۔ جھگڑے کی کتنی ہی وجوہ تھیں۔ اور پھر حمل ٹھہرنے کے بعد الٹیوں کا سلسلہ' پھولتا ہوا بدنما پیٹ' ہسپتالوں کے چکر' رات بھر روتے ہوئے بچے کے لیے اپنی نیند اور آرام کی قربانی' بچوں کا مستقبل بنانے کی پریشانی میں گرتے یا سفید ہوتے ہوئے بال۔ مقصود کو حیرت ہوتی تھی' لوگ اپنی پوری عمر ایک ہی زنجیر میں لٹکے ہوئے کس طرح گزار دیتے

تھے۔ مقصود کے لیے ویلری کی سج دھج اور چمک دمک اب اپنا اثر کھونے لگی تھی۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ ویلری سے اس کے تعلق کی عمر اب ختم ہونے والی ہے۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح کسی بھی وقت کوئی نئی بجلی چمکے گی اور ویلری دھواں ہو جائے گی۔ اس نے جیب سے ۲۵ سینٹ کا سکہ نکال کر اچھالا۔ بجلی بن کر اب کون گرے گا...... تکریم یا ماریا...... ماریا کا نام آتے ہی اس کی زبان سے ایک سسکی نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی سکہ واپس ہاتھ میں آنے کے بجائے ہتھیلی سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا اور لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے ایک جالی میں سے ہوتا کیچڑ بھری نالی میں چلا گیا۔

مقصود گھر میں داخل ہوا تو ویلری صرف انگیا اور چڈی پہنے کچن میں کچھ کر رہی تھی، ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا جس کی راکھ اب گرنے ہی والی تھی۔ مقصود کو آتا دیکھ کر اس نے نل بند کیا اور دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں سگریٹ کے دھوئیں سے گیلی ہو رہی تھیں لیکن مقصود کو لگا جیسے شعلے برسا رہی ہوں۔

''تم یہ سوٹ ٹائی پہن کر اس کتیا سے ملنے گئے تھے؟''

''کس کتیا سے؟''

''وہ میکسیکن بچ (bitch)۔ ماریا۔''

''تم دیوانی ہو گئی ہو۔ ایک دوست پاکستان سے آیا ہے میں اسے لینے ایئرپورٹ گیا تھا۔ میرا ایک دوست میرے ساتھ تھا۔ یہ اس کا کارڈ ہے، تم اسے فون کر کے میرے دن بھر کا حساب لے سکتی ہو۔'' مقصود نے جیب سے عاطف بٹ کا کارڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے اب تیار ہونے دو۔ میرے ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

مقصود نے قدم آگے بڑھایا لیکن ویلری اسی طرح کھڑی رہی۔ مقصود کو معلوم تھا کہ اس کا شک دور کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ماریا میکسیکو کی بجلی تھی اور بار میں نئی نئی آئی تھی۔ اس کے آتے ہی ویلری کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور شراب خانے کے گاہک ویلری کے مقابلے میں اس کی

طرف زیادہ متوجہ ہونے لگے تھے۔ اس لیے ویلری حسد کا شکار ہو گئی تھی۔ ایک دن اس نے مقصود کو ماریا سے ہنسی مذاق کرتے دیکھ لیا تھا تو رقابت کی آگ بھی بھڑک اٹھی تھی۔

''تم نے کچرا باہر پھینکا نہ ویکیوم کیا۔ سنک میں گندے برتن بھرے پڑے ہیں۔ ایک ہفتے سے لانڈری نہیں ہوئی۔ یہ سب کام کون کرے گا' تمھارے نوکر؟''

''کل ویکیوم بھی ہو جائے گا اور لانڈری بھی' وعدہ!'' مقصود کو معلوم تھا جب تک اس کا شک دور نہیں ہو گا اسے اپنے غم یاد آتے رہیں گے۔

''تم نہ کرایہ دیتے ہو نہ کوئی بل۔ اتنے پیسے کماتے ہو وہ کہاں جاتے ہیں؟''

''جانِ من! ہمیں اپنے بچوں کو کالج میں پڑھانا ہے۔ اس کے لیے جمع کر رہا ہوں۔ میں انھیں اپنی طرح ڈاکٹر بناؤں گا۔''

''مجھے اپنے بچوں کو گارڈ نہیں بنانا۔''

''میں تمھارا پیٹ چیر کر اور تمھاری آنت کاٹ کر باہر نکالوں گا تب تمھیں یقین آئے گا کہ میں سچ مچ ڈاکٹر ہوں۔'' مقصود نے اس کے پیٹ میں گدگدی کرتے ہوئے کہا۔ ویلری دوہری ہو کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔

''مجھے ہنسانے کی کوشش مت کرو۔ میں نے تمھیں اس کتیا سے دوبارہ آنکھ لڑاتے دیکھا تو تمھارا نرخرہ چبا جاؤں گی۔''

''جب چاہو جانِ من' جب چاہو۔'' مقصود نے اپنا گلا اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا لیکن پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ ''میں نے تمھارا شک دور کرنے اگلے ہفتے سے اپنی ڈیوٹی تمھارے بارے سے بدلوا کر مین ہیٹن کی ایک عمارت میں لگوا لی ہے۔''

''سچ!''

''ہاں' پیر سے میں نئی جگہ کام شروع کروں گا۔ وہاں نہ ماریا ہو گی اور نہ تمھارا یہ روز روز کا باجا بجے گا۔''

''آئی لو یو ڈارلنگ!'' ویلری اس سے لپٹ کر اسے پیار کرنے لگی۔

مقصود نے غلط نہیں کہا تھا۔ ویلری کی نظروں سے دور ماریا سے شہر میں ملنا زیادہ آسان تھا' اور اب تکریم بھی آ گئی تھی۔ دن میں اسے سونے کا وقت ملنا مشکل تھا۔ نئی جگہ ایسی تھی جہاں وہ کام کے دوران اپنی نیند پوری کر سکتا تھا۔

ویلری سے جھگڑا نمٹانے کے لیے جو پندرہ منٹ رکھے تھے' وہ پورے ہو گئے تھے۔ تیار ہونے کے لیے اس کے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔ وہ ویلری کو خود سے الگ کر کے یونیفارم پہننے کے لیے اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ ویلری کچن میں جا کر خوشی خوشی جھوٹے برتن دھونے لگی تھی۔

○ ○ ○
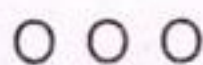
تکریم کو جیکسن ہائٹس میں رہتے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ یہ ہفتہ مقصود نے اس سے آنکھ مچولی کھیلنے میں گزارا تھا۔ پہلے دونوں دن وہ صبح و شام دونوں وقت آیا۔ اس کے بعد صرف شام کو آتا تھا وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ ایک دن غوطہ لگا دیا تھا اور بالکل نہیں آیا تھا۔ وہ آتا تو دونوں باہر نکل کر گلیوں میں ٹہلتے۔ کسی انڈین پاکستانی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھاتے یا گھر سے اگلی گلی میں انڈین بازار کی دکانوں کے شوکیسوں کے سامنے کھڑے ہو کر زیورات اور بنارسی ساڑھیوں کی قیمتوں کا موازنہ کرتے۔ شادی کے بھاری سرخ جوڑے دیکھ کر تکریم گلابی ہو جاتی۔ اس نے ایک بار مقصود کو بلڈ ٹیسٹ کے لیے یاد بھی دلایا تھا لیکن اس نے یہ بتا کر اگلے ہفتے تک کے لیے ٹال دیا تھا کہ وہ آج کل ڈبل شفٹ کر رہا ہے۔ تکریم کا دل اس کے لیے کڑھتا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگلے ہفتے سے وہ بھی سنجیدگی سے کوئی کام ڈھونڈے گی تاکہ مقصود کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ انکل رحمان سے بات کرے گی۔ وہ اتنے بڑے سرجن تھے' اسے کسی نہ کسی ہسپتال میں نوکری دلوا سکتے تھے۔ اس نے جب بھی گھر

فون کیا تھا' اس کے باپ نے ہر بار اسے سرجن رحمان کے پاس جانے کی تاکید کی تھی لیکن وہ ابھی تک ہمت نہیں کر سکی تھی۔

اسے ہفتہ گزرنے کا اس لیے بھی پتا نہیں چلا تھا کہ تین چار دن تو یونیورسٹی کی بھول بھلیوں میں گزر گئے تھے۔ ایک دن تلاش کرنے میں اور دو دن داخلے کی رسمی کارروائیوں اور پروفیسروں سے ملنے اور تعارف حاصل کرنے میں۔ ایک پورا دن بنکوں کے چکر میں گزرا تھا۔ پڑھائی شروع ہونے میں ابھی مہینے سے زیادہ وقت باقی تھا۔ تکریم نے سوچا تھا اس عرصے میں وہ شادی کے مرحلے سے گزر کر رہنے کے لیے مکان تلاش کر کے اپنا گھر بنائیں گے۔ اسے ہر قیمت پر مقصود کی گارڈ کی یونیفارم اتروانی اور اسے دوبارہ وہی ڈاکٹر بنانا تھا جو مریضوں کا آدھا درد انھیں اپنی باتوں سے ہنسا کر دور کر دیتا تھا۔ اسلام آباد کے ہسپتال میں جہاں دونوں نے ایک ساتھ ہاؤس جاب کیا تھا اور جہاں ان کا عشق پروان چڑھا تھا' ڈاکٹر مقصود قریشی ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں میں یکساں مقبول تھا۔ مریضوں کا تو وہ ڈارلنگ تھا۔ وہ نبض دیکھ کر قسمت کا حال اور دل کی دھڑکنیں سن کر بچوں کی تعداد بتا سکتا تھا۔ وہ دوائیں لکھتا اور لطیفے بانٹتا ہوا تیزی سے ایک سے دوسرے مریض کی طرف بڑھ جاتا اور پھر وقت سے پہلے اپنا راؤنڈ مکمل کر کے نرسوں کی بنائی ہوئی کافی پی کر انھیں ہنسانے لگتا۔ تکریم اسی ڈاکٹر مقصود کو دوبارہ بیدار کرنا چاہتی تھی۔

تکریم کو اس ایک ہفتے کے اندر اندر اس تنگ تہہ خانے میں رہنے کی عادت ہوگئی تھی۔ صرف پہلا دن بہت مشکل گزرا تھا۔ مقصود کے جانے کے بعد وہ آدھی رات تک کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ نئی جگہ' اکیلے پن کا خوف' مستقبل کے وسوسے...... نیند بالکل اڑ گئی تھی لیکن ۲۴ گھنٹوں سے جاگی ہوئی تھی اس لیے سوئی تو دوسرے دن دس بجے سو کر اٹھی۔ باہر لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں' شاید شاہ صاحب کے دفتر میں کام کرنے والے لوگ تھے۔ وہ دیر تک پاؤں لٹکائے بستر کے کنارے بیٹھی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باہر بیٹھے آدمیوں کے

درمیان سے گزر کر باتھ روم کیسے جائے' لیکن باتھ روم جانے کی ضرورت نے زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی جہاں تین آدمی بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی تینوں نے اپنی اپنی میز پر سر جھکا کر نظریں نیچی کرلیں اور مشغول نظر آنے لگے۔

باتھ روم واقعی بہت چھوٹا تھا۔ کپڑے اتارتے ہوئے کہنیاں دیواروں اور گھٹنے ٹائلٹ سے ٹکرائے تھے۔ اسے اس وقت بہت شرم آئی جب اس نے شاور کھولا اور شور مچاتا ہوا پانی اس کے بدن پر گرنے لگا۔ اسے لگا جیسے باہر بیٹھا ہوا ہر شخص اسے نہاتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ باتھ روم سے کمرے میں واپس جاتے ہوئے یہی محسوس ہوا جیسے وہ ننگی ہو اور ہر آنکھ اسے تک رہی ہو۔ کمرے میں آتے ہی اس نے ہیئر ڈرائر کھول کر اس کی تیز آواز میں اپنے ہر وہم' شرم اور خوف کو دبا دیا۔

اسے تیار ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر بہت نرم سی دستک ہوئی۔ وہ سمجھی کہ مقصود آ گیا ہے۔ اس نے لپک کر دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ کوئی اور شخص تھا۔ سر کے بال روئی کی طرح سفید تھے لیکن سانولا چہرہ بہت تازہ تھا۔ پینتالیس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ بال کسی وجہ سے سفید ہو گئے تھے یا اس نے خود کروا لیے تھے۔ اچھی تراش کا نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ تکریم نے سوچا' اس کا یہ لباس اس جگہ سے میچ نہیں کر رہا تھا۔ ایسے لباس والے کو تو وال اسٹریٹ پر نظر آنا چاہیے تھا۔

''میں سیّد ہوں' مقصود کا دوست۔'' اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرے لباس سے غلط اندازے مت لگائیے۔ میں اپنے دشمنوں کی وجہ سے خوش لباس رہتا ہوں۔ وہ میرے کپڑے دیکھ کر مجھے خوش حال سمجھتے ہیں اور کڑھتے رہتے ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے لیے کافی اور یہ ڈونٹس لایا ہوں۔ اگر آپ ناشتے میں کچھ اور کھانا چاہیں تو......''

''جی نہیں ڈونٹس ٹھیک ہیں۔'' تکریم نے اس سے براؤن لفافہ اور کافی کا گلاس لیتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو اپنے گھر میں رکھ سکتا تھا لیکن میری بیوی بہت جھگڑالو ہے۔ اسے میں' میرے پاکستانی دوست' یہ کام' یہ جگہ' کچھ پسند نہیں ہے۔ وہ بہت شکی ہے' خواہ مخواہ اسکینڈل کھڑا کر دیتی۔''

''پھر تو میرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔'' تکریم گھبرا گئی۔ ''آپ کے دفتر میں کام کرنے والوں نے بتا دیا کہ میں یہاں رہتی ہوں تو......''

''میرے دفتر والوں نے؟'' سیّد نے پھر قہقہہ لگایا۔ ''میری بیوی نے ان سے اتنی بار بدتمیزی کی ہے کہ جس دن میں نے اسے طلاق دی' وہ مٹھائیاں بانٹیں گے۔''

''کیا آپ واقعی......؟''

''اپنے بیٹے کا خیال ہے ورنہ کب کا چھوڑ دیتا۔'' سیّد نے اپنی اداسی چھپانے کے لیے کافی کا کپ منہ سے لگا لیا۔ تکریم نے سوچا' اس کے بال وقت سے پہلے بے وجہ سفید نہیں ہوئے۔

''مقصود نے بتایا تھا کہ آپ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔'' سیّد نے موضوع بدلا۔

''جی ہاں! شاید اگلے ہفتے۔''

''آپ کے گھر والوں کو پتا ہے؟''

''نہیں!''

''کیوں؟''

''وہ تیار نہیں ہوتے۔''

''آپ نے کوشش نہیں کی؟''

''کوئی فائدہ نہیں تھا۔ انھیں آمادہ کرنے کی کوشش میں ان کا بلڈ پریشر بڑھانے اور انھیں مستقل ٹینشن میں مبتلا رکھنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی جھٹکے میں سب کچھ کرلیا جائے۔ انھیں صدمہ ہوگا لیکن مقدر سمجھ کر تسلیم کرلیں گے۔''

''مقصود آپ کی طرح ڈاکٹر ہے۔ اچھے خاندان کا ہے۔ آپ کوشش کرتیں تو شاید......''

''آپ میری ماں کو نہیں جانتے۔'' تکریم نے اداس لہجے میں کہا۔'' ان کا خیال ہے وہ میرا نفع نقصان مجھ سے زیادہ سمجھتی ہیں۔ وہ میری شادی کسی بیوروکریٹ سے کرنا چاہتی ہیں۔ وہ ڈاکٹروں کو پسند نہیں کرتیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان میں ڈاکٹروں کا بھاؤ گر گیا ہے۔ وہ یورپ امریکہ جا کر بھی پریکٹس نہیں کرسکتے۔ ٹیکسی چلاتے ہیں یا گارڈ کا کام کرتے ہیں۔''

''آپ کی امی کا خیال زیادہ غلط نہیں ہے۔'' سیّد نے مسکرا کر کہا۔

''مقصود میری وجہ سے مجبوراً یہ کام کر رہے ہیں۔'' تکریم نے تیزی سے کہا۔'' اب میں آ گئی ہوں۔ اگلے مہینے میرا ہاؤس جاب شروع ہو جائے گا تو مقصود اپنے امتحان کی تیاری شروع کردیں گے۔ ان سے اچھا اور کامیاب ڈاکٹر پورے نیویارک میں نہیں ہوگا۔ میری امی بھی مقصود کو دیکھ کر اپنا خیال بدل دیں گی۔''

''آپ کو مقصود پر بہت اعتماد ہے؟'' سیّد نے تکریم کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''اتنا ہی جتنا مجھے اپنے اوپر ہے۔'' تکریم کا لہجہ بھی اتنا ہی پراعتماد تھا۔

سیّد تھوڑی دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور پھر اچانک اٹھ گیا۔'' یہ جگہ تنگ ہے آپ کو رہنے میں پریشانی ہوگی' لیکن مقصود نے کہا تھا' چند دنوں کی بات ہے۔'' سیّد اب تیز تیز بول رہا تھا جیسے جانے کی جلدی ہو۔'' میں نے یہاں چائے بنانے یا کھانا پکانے کا انتظام نہیں رکھا کیونکہ چند ہی دنوں میں ہر طرف ٹی بیگ کے ڈھیر اور سنک میں جھوٹے برتنوں پر کاکروچ

رینگتے نظر آنے لگتے ہیں۔ مجھے کمرے میں بسی ہوئی چکنے کھانوں کی بو بھی پسند نہیں ہے' لیکن ضرورت کی ہر چیز دروازے سے باہر نکلتے ہی مل جاتی ہے۔ آپ کو پریشانی ہو تو باہر بیٹھے ہوئے کسی شخص سے کہہ سکتی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے' آپ میری فکر مت کیجیے' میں باہر نکل کر اپنے راستے تلاش کرلوں گی۔''

سیّد خاموشی سے سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تکریم اس کے بعد صبح ہی صبح اٹھ کر تیار ہو جاتی اور دفتر میں کام کرنے والوں کے آنے سے پہلے باہر نکل جاتی۔ کسی کیفے میں بیٹھ کر ناشتہ کرتی' اخبار پڑھتی اور پھر دس بجے جب دفتر جانے والوں کا رش کم ہو جاتا تو ٹرین لے کر مین ہٹین کے آخری اسٹیشن پر اتر جاتی۔ اونچی اونچی عمارتوں کو باہر سے تکتی' ان کے اندر بنے ہوئے بازاروں میں چکراتی' ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت کا محفوظ کیا ہوا ملبہ دیکھ کر عبرت حاصل کرتی یا سمندر کے پاس جا کر اسٹیٹن آئی لینڈ آنے جانے والی فیریز کو یا دور لبرٹی آئی لینڈ پر کھڑا ہوا دھندلا دھندلا نظر آنے والا مجسمۂ آزادی کو گھورا کرتی اور شام تک گھر واپس آ کر تہہ خانے جیسے کمرے میں مقصود کے آنے کا انتظار کرنے لگتی۔

جس دن سیّد کا اخبار چھپنے جاتا' اس دن دفتر میں گھما گھمی بڑھ جاتی۔ کام بھی دیر تک ہوتا۔ فون پر بات کرتے ہوئے سیّد کی آواز اور تیز اور درشت ہو جاتی۔ مقصود نے غلط نہیں کہا تھا۔ سیّد نے کسی کو خاطر میں لانا نہیں سیکھا تھا۔ ایک شام جب تکریم کمرے کے اندر اکیلی بیٹھی مقصود کا انتظار کر رہی تھی' باہر کسی خاتون مہمان کے ساتھ ہونے والے سیّد کے مکالموں نے تکریم کو حیران اور کسی حد تک پریشان کر دیا۔ آنے والی' پچھلی حکومت کے دوران پاکستان کی سفیر رہی تھی۔ تکریم نے اپنے کان بالکل دیوار سے لگا دیے۔ دفتر میں سیّد کے علاوہ صرف چوہدری صاحب تھے۔ باقی دونوں لوگ شاید کھانا کھانے باہر گئے تھے۔

''تشریف لائیے۔آپ اکیلی آئی ہیں؟''

''میرا ڈرائیور ساتھ ہے۔ پارکنگ نہیں ملی تھی اس لیے ڈبل پارک کر کے اوپر گاڑی میں بیٹھا ہے۔آئی ایم سوری' مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔''

''نہیں نہیں' ہم بالکل بے کار لوگ ہیں۔ ہمارے پاس وقت ہی وقت ہے۔آپ جب چاہے آسکتی ہیں' آپ کو فون کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔'' سیّد نے وقفہ لے کر اپنے ساتھی سے کہا۔''چوہدری صاحب!اتنی بڑی ہستی آئی ہے' کافی نہیں پلوائیں گے؟ آپ کیسی کافی پیئیں گی؟''

''بلیک'نو شوگر۔''

''بیٹھیے'اس کرسی پر تشریف رکھیے۔''

''میں یہاں سیڑھیوں پر بیٹھوں گی۔ مجھے سیڑھیوں پر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔سنا ہے'آپ کے دفتر میں وزیراعظم تک آچکے ہیں۔''

''جی ہاں' لیکن کرسی سے اترنے کے بعد۔'' سیّد نے اپنا مخصوص قہقہہ لگا کر کہا۔'' عامر نذیر نے بھی مجھے انھی سیڑھیوں پر بیٹھ کر انٹرویو دیا تھا۔''

''یہ سیڑھیاں بہت تاریخی ہیں؟''

''جی ہاں! مجھے معلوم ہے کہ آپ کے طبقے میں سیڑھیوں پر بیٹھنے کا فیشن ہے۔اسی لیے میں نے خاص طور پر یہ سیڑھیوں والا دفتر لیا ہے۔لیکن یہ سیڑھیاں اوپر نہیں جاتیں۔صرف نیچے آتی ہیں۔'' سیّد نے ایک اور قہقہہ بلند کیا۔

''آپ اتنی چھوٹی جگہ بیٹھ کر اتنی بڑی بڑی باتیں کیسے کر سکتے ہیں؟''

''بالکل اسی طرح جس طرح آپ محل جیسے بڑے سفارت خانے میں بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی تھیں۔'' اس بار دونوں نے مل کر قہقہہ لگایا۔لیکن پھر سیّد سنجیدہ ہو کر کہنے لگا: ''میری آپ سے کوئی ذاتی لڑائی نہیں تھی۔ میں نے آپ کی ذاتی باتیں کبھی چھاپی بھی نہیں۔

میرا اسٹیبلشمنٹ سے پرانا جھگڑا ہے۔ مجھے ان کا اندازِ حکم رانی پسند نہیں ہے۔ آپ کا سفارت خانہ بھی اسی اندازِ حکم رانی کا عکس تھا۔''

''ایمان علی کے صدر بنتے ہی کیا اسٹیبلشمنٹ سے آپ کا جھگڑا ختم ہو گیا ہے؟ آج کل آپ کے دونوں اخبار حکومت کے قصیدے لکھ رہے ہیں۔''

''میں اختلاف برائے اختلاف نہیں کرتا۔ میرا جھگڑا یہ تھا کہ کشکول ہاتھ میں لے کر پھرنے والوں کو محلوں میں نہیں رہنا چاہیے۔ ایمان علی صدر بننے کے بعد ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا ہے۔ آپ کا سفارت خانہ اور قونصل خانہ بھی کم کرایے والے چھوٹے دفتروں میں منتقل ہو گیا ہے۔ تمام غیر ضروری افسر اور عملہ واپس چلا گیا ہے۔ پینٹ ہاؤسوں میں رہنے والے سفارت کار اپنی اوقات پر آ گئے ہیں۔ زمین دار اپنی آمدنی صرف نئی شادیوں' امریکہ آنے جانے اور فور وہیل گاڑیوں پر خرچ نہیں کرتے' ٹیکس بھی دیتے ہیں' اِس سے اسکول اور ڈسپنسریاں چلتی ہیں۔ میں اس کے خلاف کیسے لکھوں؟''

''شاہ صاحب! آنکھیں کھول کر اور اس بیسمنٹ سے باہر نکل کر دیکھیے۔ امریکہ سپر پاور ہی نہیں' سرمایہ داروں کا کیپیٹل بھی ہے۔ یہاں پر حیثیت سرمائے سے ناپی جاتی ہے۔ چھوٹے مکان میں رہنے اور چھوٹی گاڑیوں میں چلنے والے پگمیز سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری شان و شوکت اور ہمارا امیج ختم ہو گیا ہے۔ دو پیسے کی عزت ہو گئی ہے۔ سر شرم سے جھک گئے ہیں۔ میں ان کی دنیا میں رہتی ہوں' مجھ سے پوچھیے' لوگ کیا کہتے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم' کون لوگ کیا کہتے ہیں۔ میں نے تو صرف اچھی باتیں سنی ہیں۔ یہ تعریف سنی ہے کہ پاکستان نے اپنی چادر اپنے قد کے برابر کر لی ہے۔''

''آپ نے شاید خواب دیکھا ہو گا یا آپ کے کان بجتے [illegible] گے۔''

''میں خواب دیکھتا ہوں نہ میرے کان بجتے ہیں۔'' سیّد کی آواز تیز ہو گئی۔ پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ''میں نے یہ سب کچھ نیویارک ٹائمز' واشنگٹن پوسٹ' شکاگو ٹریبیون اور لاس

اینجلس ٹائمز میں پڑھا ہے۔ یہ وہ اخبار ہیں جن سے خود امریکی حکومت بھی ڈرتی ہے۔''

''ایمان علی صرف پبلک ریلیشنز کا فن جانتا ہے۔ وہ زیادہ عرصے تک بے وقوف نہیں بنا سکے گا۔''

''یہ پبلک ریلیشنز نہیں ہے۔ ایمان علی نے سفارت خانے کے لیے جو سپورٹ اور لابی گروپ بنایا ہے، اس نے آپ کی شان و شوکت اور بڑھائی ہے۔ پچھلے ۱۴ راگست کو پہلی بار امریکہ کے ہر بڑے شہر میں سرکاری استقبالیے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ باوقار استقبالیے کبھی نہیں ہوئے، نہ کبھی ان میں اتنی بڑی تعداد میں سینیٹرز، کانگریس مین اور اہم افراد شریک ہوئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اسی سپورٹ گروپ نے اپنی دولت اور اپنے تعلقات سے کیا ہے۔ ہمارے سر جھکے نہیں اور اونچے ہو گئے ہیں۔''

''یہ دولت مندوں کا گروپ ہے۔ سب وزیر سفیر بننے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ایمان علی ان کے ذریعے پورا پاکستان بیچ دے گا۔ آپ اس حکومت کے اتنے بڑے حامی ہیں۔ اس گروپ میں آپ کو شامل کیوں نہیں کیا گیا؟''

''اس لیے کہ میرا اس گروپ میں کوئی کام نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کا گروپ ہے جن کے پاس سرمایہ ہے، جن کے امریکی سینیٹروں، گورنروں اور صدر سے تعلقات ہیں اور جو اس سرمائے اور تعلقات کو پاکستان کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھیں آپ چندہ لینے کے لیے سفارت خانے بلایا کرتی تھیں۔ آپ نے انھیں کیا بیچا تھا؟''

''میں بیوپاری نہیں ہوں۔ میرا کام خریدنا بیچنا نہیں ہے۔ میرا ہر سانس صرف اپنے ملک کی عزت اور امیج بڑھانے کے لیے وقف ہے۔''

''آپ اٹھ کیوں گئیں۔ بیٹھیے۔''

''میں یہاں کرسی پر بیٹھوں گی۔ آپ کی سیڑھیاں برف ہو رہی ہیں۔''

اسی وقت چوہدری صاحب کافی لے آئے...... کچھ دیر خاموشی رہی۔

''کافی ٹھنڈی تو نہیں ہے؟'' سیّد نے پوچھا۔

''جی نہیں، بالکل ٹھیک ہے۔ شاہ صاحب! میں اس وقت آپ سے بحث کرنے نہیں آئی۔ ہم اور آپ دونوں اپنے ملک کی عزت اور اس کا وقار بڑھانا چاہتے ہیں۔ پوائنٹ آف ویو کا تھوڑا سا اختلاف ہے۔ یہ دور کیا جا سکتا ہے۔''

''آپ اس وقت کیا یہی اختلاف دور کرنے آئی ہیں؟''

''شاہ صاحب! یہاں اور بھی اخبار نکلتے ہیں۔ میں کسی اور کے پاس بھی جا سکتی تھی۔ میں کسی اور کے پاس نہیں گئی۔ میں......''

''آپ کو ان کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں۔'' سیّد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''آپ سیٹی بجائیے، وہ دم ہلاتے ہوئے آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ وہ صحافی نہیں، تالیاں بجا کر مچھر بھگانے والے قوّال ہیں۔ جس کا کھاتے ہیں، اس کا گاتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے لفظ کی قیمت ''دھیلے'' برابر بھی نہیں۔ آپ میرے پاس اس لیے آئی ہیں کہ میرے لفظ میں تاثیر ہے، میرا اعتبار ہے۔''

''بالکل! میں اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔ ہم آپ کا یہ اعتبار اور بڑھانا چاہتے ہیں۔''

''ہم کون؟''

''میں اور میرے ہم خیال دوست، لیکن آپ اپنا اعتبار اس تنگ و تاریک بیسمنٹ میں بیٹھ کر نہیں بڑھا سکتے۔ پارک ایونیو پر میرے ایک دوست کا تین کمروں کا سوئیٹ خالی ہے۔ آپ اپنا دفتر وہاں لے آیئے۔ ایک اور دوست آپ کے اخبار میں انوسٹمنٹ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے لاس اینجلس کے ایک اخبار میں چار لاکھ ڈالر لگائے ہیں۔ آپ کے دو اخبار ہیں۔ وہ آدھے ملین تک کی انوسٹمنٹ کر سکتے ہیں۔ آپ باقاعدہ عملہ رکھ کر اخبار نکالیے۔ پاکستان سے کسی جرنلسٹ کو بلانے کی ضرورت ہو تو اس کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ آپ کے اخبار امریکہ

کے سب سے معتبر پاکستانی اخبار بن جائیں گے۔''

''مجھے اس کے بدلے کیا کرنا ہوگا؟''

''آپ کو اخباروں کے پچاس فی صد شیئرز انوسٹمنٹ کرنے والے دوست کے نام کرنے ہوں گے۔''

''fair enough۔اس کے علاوہ؟''

''ہمارے پوائنٹ آف ویو کو سمجھنے کے لیے کھلے ذہن سے کام لینا ہوگا۔''

''یعنی آپ کی آنکھوں سے معاملات دیکھنے ہوں گے۔''

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔

''آپ کو اسی وقت سوچنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کل تک مجھے فون کر کے بتا سکتے ہیں۔''

''میں سوچ نہیں رہا۔ میں آپ کی کافی ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں تا کہ آپ کو خدا حافظ کہہ سکوں۔''

''مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے کافی ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ٹھنڈے دماغ سے کام لیجیے۔ آپ کو اس آفر کی ڈیٹیلز چاہئیں تو جب چاہے' مجھے فون کر سکتے ہیں۔''

''آپ میرے سوالوں کا جواب نہیں دے سکیں گی۔ مجھے آپ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے جوابات معلوم ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ امریکی ہیں نہ یہاں آپ کا کوئی کاروبار ہے پھر بھی آپ شوفر والی گاڑی کیسے رکھ سکتی ہیں۔ مجھے پتا ہے' آپ کے وہ دوست کون ہیں جن کے پاس پارک ایونیو کے خالی سوئیٹ ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے پاس اخباروں میں سرمایہ لگانے کے لیے لاکھوں ڈالر کہاں سے آئے ہیں۔ مجھے اس لیبارٹری کا پتہ معلوم ہے جہاں سے آپ نے ایڈز کا ٹیسٹ کرایا تھا۔ مجھے آپ کے بھائی کا اکاؤنٹ نمبر بھی معلوم ہے جو ایف ۱۶ کے بدلے پاکستان کو میراج طیارے بکوا رہا تھا۔ مجھے پتا ہے کہ......''

''شاہ صاحب ذرا ہاتھ ہولے رکھ کے......'' چوہدری صاحب نے مداخلت کی کوشش کی۔

''تم نالی کے کیڑے ہو' نالی ہی میں مرو گے۔''

''Get out you bitch مجھے خریدنے آئی ہے۔''

''کتے کی طرح مت بھونکو۔ جا رہی ہوں لیکن تمھیں چھوڑوں گی نہیں۔''

دونوں نے اپنے اپنے چہرے پر چڑھے ہوئے خوش مزاجی کے نقاب اتار دیے تھے۔

''شاہ صاحب! وہ آپ سے اپنا جوڑا لگا گئی ہے۔ آپ نے اسے کتیا کہا وہ آپ کو کتا کہہ گئی۔ ہاہاہا۔'' دروازہ بند ہونے کے بعد چوہدری صاحب کا قہقہہ گونج اٹھا۔ ان کے لیے یہ معرکے شاید روز کا معمول تھے۔

''عورت سمجھ کر چھوڑ دیا ورنہ......''

''ٹھنڈا پانی دوں؟''

''نہیں چوہدری صاحب۔ بس لیڈ بدل دو۔''

''لیڈ؟ شاہ صاحب اخبار لیٹ ہو جائے گا۔''

''ہونے دو۔ نئی سرخی لکھو۔ صدر ایمان علی کی حکومت بدلنے کا واشنگٹن پلان......''

''سی آئی اے نے پاکستانی صدر کا تختہ الٹنے کے لیے سابق سفیر کی خدمات حاصل کر لیں۔''

''شاہ صاحب! وہ کورٹ میں کھینچ لے گی۔''

''میں اسے کورٹ میں ننگا کر دوں گا۔ تم فکر مت کرو۔ لیڈ لکھو' خبر میں بعد میں بناؤں گا' ذرا تکریم بی بی کی خیریت پوچھ لوں۔''

سیّد دستک دے کر اندر آیا تو تکریم اسے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

''آپ ابھی ابھی آدھے ملین ڈالر کو ٹھوکر مار کر آ رہے ہیں۔''

''پلیز نو لیکچر۔ مجھے معلوم ہے میں بے وقوف ہوں' مجھے موقع شناسی نہیں آتی۔ میں

بدتمیز ہوں۔ میں نے ابھی ایک عورت کو گالی دی ہے۔''

''نہیں نہیں! آپ بہت آئیڈیل آدمی ہیں۔ مجھے پہلی بار آپ کی یہ جگہ کھلی کھلی، کشادہ اور بڑی لگ رہی ہے۔''

''تھینک یو۔ میں بس یہ دیکھنے آیا تھا کہ آپ خوف زدہ تو نہیں ہوئیں۔ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں۔''

''میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ یہ بتائیے ایمان علی کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟''

''خطرات سے کھیلنے والے ہمیشہ خطروں میں رہتے ہیں۔ ڈرنے والے کبھی کچھ نہیں کر پاتے۔''

''کیا سی آئی اے واقعی......''

''ہاں شاید۔ ایمان علی کو بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر قدم پھونک کر اٹھانا ہوگا۔''

''آپ مجھے بتائیے۔ میں ایمان علی کو پیغام بھجوا سکتی ہوں۔ آج ہی۔ اسی وقت۔''

''تم؟''

''میرا گھر ایوان صدر کے بالکل برابر میں ہے۔ صدر ہمارے گھر بھی آ چکے ہیں...... آپ کو یقین نہیں آیا؟ یہ دیکھیے انھوں نے مجھے آٹوگراف بھی دیا تھا۔'' تکریم نے سیّد کو اپنی آٹو گراف بک کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''اپنے والدین سے کہو، گھر بدل لیں۔ وہ توپ کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''کیا۔ کیا۔ واقعی اتنا خطرہ ہے؟''

''ایمان علی کو پتا ہے وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی پتا ہے اسے کن خطروں کا سامنا ہے۔ مجھے یقین ہے، اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔''

''میں امی سے کہوں گی کہ وہ ان کی نظر اتار دیں۔ انھوں نے امی سے وعدہ کیا تھا۔

میری امی کا کھینچا ہوا حصار بہت مضبوط ہوتا ہے۔''

''اسی وقت دستک دیے بغیر دروازہ کھول کر مقصود داخل ہوا۔ پہلے وہ کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا پھر کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔

''سیّد تمھیں میرے خلاف بھڑکا رہا ہوگا۔'' مقصود نے سیّد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھڑکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے شر سے بچانے کے لیے تکریم کی ماں نے اُس کے گرد حصار کھینچ رکھا ہے۔ تم تکریم کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔''

''تم میرے شر کی قوت سے واقف نہیں ہو۔ بڑے بڑے مضبوط حصار پانی کر دیتا ہوں۔ ہاہاہا۔'' مقصود مصنوعی قہقہے لگاتا ہوا اُٹھ گیا۔ ''تکی اٹھ جاؤ' سخت بھوک لگی ہے۔ خان بابا کو میں کھانا لگانے کا بول کر آیا ہوں۔''

''شاہ صاحب آپ بھی......''

''نہیں تم لوگ جاؤ۔'' سیّد نے اس طرح ہوا میں ہاتھ ہلایا جیسے مکھی اڑا رہا ہو۔

تکریم نے بھی صرف تکلفاً ہی پوچھا تھا۔ اسے آج کسی تیسرے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج وہ مقصود سے سنجیدگی سے بات چیت کرنا چاہتی تھی۔ گھر سے باہر نکلے تو تکریم مسجد کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ نماز شاید کافی دیر پہلے ختم ہو چکی تھی اور مسجد کا دروازہ بند تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اور آس پاس کوئی نہیں تھا۔ تکریم نے سوچا' ریسٹورنٹ میں بھیڑ ہو گی اور کھانا کھاتے ہی مقصود کو ڈیوٹی پر جانے کی جلدی ہو گی۔ اس لیے یہی جگہ اور وقت بات کرنے کے لیے مناسب ہے۔''

''مکّی میں اب زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''کیوں؟ کیا سیّد نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں...... وہ بہت اچھے آدمی ہیں لیکن یہ دفتر ہے۔ ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔

میرا اب یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں کل انکل رحمان سے ملنے جارہی ہوں' انھوں نے مجھ سے ٹھیرنے کے لیے کہا تو میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گی۔ میں وہاں رہنے لگی تو تم مجھ سے ملنے کو ترس جاؤ گے۔''

''نہیں، تم کہیں نہیں جاؤ گی۔'' مقصود نے تکریم کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔ ''میں تمھیں کھانے پر یہی بتانے والا تھا۔ میں نے سب بندوبست کرلیا ہے۔ آج جمعہ ہے۔ ہفتہ اور اتوار کو میں ڈبل شفٹ کر رہا ہوں اس لیے تیسری شفٹ یعنی تم سے ملنے کا ٹائم نہیں ہوگا۔ میں نے پیر کی چھٹی لے لی ہے۔ ہم صبح بلڈ ٹیسٹ کرائیں گے' شام کو شاپنگ کریں گے۔ جمعے کو اسی مسجد میں نکاح پڑھوائیں گے۔ سیّد اور چوہدری کو گواہ کرلیں گے۔ میں والڈروف آسٹوریا میں ہنی مون سوئیٹ بک کرا رہا ہوں۔ ہفتے کی صبح اٹھ کر ہم مین ہیٹن میں اپنا اپارٹمنٹ کرائے پر لیں گے اور اپنی نئی زندگی شروع کریں گے۔ بولو منظور؟''

''تم سچ کہہ رہے ہو؟ مذاق تو نہیں کر رہے؟'' تکریم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں نے کبھی مذاق کیا ہے۔ جھوٹ بولا ہے؟''

''آئی لو یو مکّی!'' تکریم نے اپنا سر مقصود کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اب اسے پروا نہیں تھی کہ وہ ایک کھلی جگہ کھڑی ہے۔ اس کے بدن میں بہت سی کلیاں کھل گئی تھیں۔ اچانک بھوک بھی لگنے لگی تھی۔

اس رات کھانا کھاتے ہوئے تکریم کو پتا نہیں تھا کہ مقصود کے ساتھ یہ اس کا آخری کھانا ہے۔ مقصود پیر کو نہیں آیا' بلکہ کسی بھی دن نہیں آیا۔ اسے ڈھونڈنے تکریم کو خود جانا پڑا تھا۔ یہ تلاش تکریم کے لیے بہت سی حیرتیں' صدمے اور غم لے کر آئی۔

تکریم نے ہفتہ اتوار شاپنگ کرنے میں گزارا تھا۔ وہ مقصود کو حیران کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ والڈروف آسٹوریا کے ہنی مون سوئیٹ کا خیال اس کے جسم میں گدگدیاں کر رہا تھا۔ پیر کو وہ صبح سے تیار ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اس دن اسے چھوٹا سا تنگ باتھ روم بہت کھلا کھلا اور بڑا

لگا۔ نہاتے ہوئے گنگنائی بھی تھی۔ کئی ڈھولک گیت یاد آئے تھے۔ آنکھیں کئی بار نم ہوئی تھیں۔ ماں کا چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ ہر دستک' قدموں کی چاپ اور آہٹ پر مقصود کے آنے کا گمان ہوتا۔ کئی بار خود دروازہ کھول کر دیکھنے باہر گئی۔ سیّد نے ہر بار اسے تشویش سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ ایک بار آ کر اس سے کھانے کے لیے بھی پوچھا تھا لیکن تکریم کو بھوک نہیں تھی۔ دفتر کے سب لوگ چلے گئے پھر بھی کمرے میں بند ہو کر بیٹھی رہی۔ دن بھر کچھ نہیں کھایا تھا اس لیے بھوک نے ستایا تو باہر نکلی۔ موٹے اوورکوٹ میں لپٹی ہوئی تھی پھر بھی کپکپا رہی تھی۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ کپکپاہٹ کی وجہ سردی تھی یا جسم کے اندر کوئی خوف کسمسا رہا تھا۔

پوری رات سوتے جاگتے اور ڈراؤنے خواب دیکھتے گزری۔ اسے مقصود کی خیریت کی فکر تھی۔ یہ اندیشے ستا رہے تھے کہ اسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔ وہ گارڈ کی نوکری کرتا تھا۔ نیویارک جیسے شہر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پھر اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ شاید پیر کی چھٹی منسوخ ہو گئی ہو۔ ڈبل ڈیوٹی لگ گئی ہو۔ بے پروا تو تھا ہی' فون کرنا بھول گیا ہو۔ فون کیا بھی ہو تو سید کا فون اکثر فیکس مشین پر لگا ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا اگلی صبح کسی وقت آئے گا اور اسے ستانے کے لیے جملے پھینکتا ہوا عادت کے مطابق کرسی میں ڈھیر ہو جائے گا۔

وہ دوسرے دن بھی نہیں آیا۔

تکریم منگل کو بھی صبح ہی سے تیار ہو کر بیٹھ گئی لیکن خود پر قابو رکھا۔ ہر آہٹ پر دروازہ کھول کر باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ رات ہوتے ہوتے تکریم کی تشویش اور بڑھ گئی۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہوئی تھی۔ اس روز سیّد کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ شاید دفتر نہیں آیا تھا۔ تکریم نے سوچا' اب صرف انتظار میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کل وہ سیّد سے بات کرے گی۔ مقصود کو تلاش کرنے خود باہر نکلے گی۔

اگلے دن سیّد خود تکریم سے ملنے اس کے کمرے میں آ گیا۔ دفتر میں ابھی کوئی نہیں آیا تھا۔ سیّد بھی کبھی اتنی جلدی دفتر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے اور تکریم کے لیے کافی لے کر آیا تھا۔ وہ

خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا اور کچھ کہے بغیر کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔ تکریم کا دل اندر سے بیٹھ گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سیّد کے پاس کوئی بری خبر ہے۔ تکریم چہرہ سپاٹ کیے ہوئے خاموشی سے کافی پیتی رہی۔ اندر کے جذبے چہرے پر لا کر سجانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سیّد جو کہنا چاہتا تھا اس کے لیے شاید الفاظ کو جمع کر رہا تھا۔ اس نے کافی کا ایک لمبا سا گھونٹ لیا اور گلاس سائڈ میں پڑے ہوئے اخباروں پر رکھ دیا۔ ''کل رات مجھے عاطف بٹ ملا تھا۔''

''عاطف بٹ؟''

''مقصود نے اسے میڈیکل سرٹیفیکٹ دیا تھا' وہ جعلی تھا۔ بٹ بہت مشکل سے اور بہت پیسے خرچ کر کے خود کو بچا سکا ہے۔ وہ مقصود کو تلاش کر رہا ہے لیکن اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔''

''مقصود نے کوئی سرٹیفیکٹ نہیں دیا۔ اپنے کسی ڈاکٹر دوست سے دلوایا تھا۔ مقصود نے مجھے بتایا تھا۔'' تکریم نے بہت سخت لہجے میں کہا۔

''کئی فارمیسیوں والے بھی مقصود کو ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اس نے انھیں دواؤں کے جعلی نسخے پچاس فی صد پر بیچ کر ہزاروں ڈالر وصول کیے تھے۔''

''مقصود کا وہ ڈاکٹر دوست۔ وہ کوئی فراڈ ہے۔ اس نے مقصود کو پھنسایا ہوگا۔ مکّی خود ایسا نہیں ہے۔'' تکریم کے لہجے میں ابھی تک سختی تھی۔ اس کے یقین کی لو دھیمی نہیں ہوئی تھی۔

''جس ڈاکٹر کے نام سے نسخے جاری ہوئے ہیں' اس کی پریکٹس چھ مہینے سے بند ہے۔ وہ کوئی خیراتی ہسپتال بنانے پاکستان گیا ہوا ہے۔ جن کے نام نسخے بنے ہیں' ان کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔''

تکریم کے اندر کی پریشانی اب باہر آ گئی۔ اس کا چہرہ آہستہ آہستہ سفید ہوتا جا رہا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''وہ سب خطرناک لوگ ہیں۔ معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر نمٹانے والے۔'' سیّد کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اب کیا ہوگا؟'' تکریم نے ہتھیار ڈال دیے۔

''میں بٹ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ مقصود نے دواؤں کے نسخے بھی اسی کے ذریعے بیچے تھے۔ مقصود مل جائے تو میں دونوں کو بٹھا کر کوئی سمجھوتا کرادوں گا لیکن مقصود مل نہیں رہا۔ وہ اس علاقے میں اب آئے گا بھی نہیں۔ شاید تمھیں فون کرے۔ کہنا' مجھ سے فوری رابطہ کرے۔''

سیّد کافی کا گلاس لے کر اٹھ گیا اور کمرے سے باہر جانے لگا لیکن دروازے پر رک گیا۔ ''آئی ایم سوری تکریم!'' اس نے پلٹ کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ تکریم بہت دیر تک ساکت بیٹھی اپنی سوچیں مجتمع کرتی رہی لیکن اس طرح بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ سیّد کے اپنے مسائل کم نہیں تھے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے گا۔ پھر یہ سیّد کا مسئلہ تھا بھی نہیں۔ یہ ان کا اپنا مسئلہ تھا۔ مقصود کو بچانے کے لیے اسے خود کچھ کرنا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ سیّد باہر اپنی کرسی پر بیٹھا کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر تکریم کو باہر جاتے ہوئے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ پیشانی پر تفکر کے نشان ابھر آئے تھے۔

تکریم نے باہر آ کر وہ کارڈ نکالا جو عاطف بٹ نے اسے دیا تھا اور فون بوتھ میں داخل ہو کر اس کا نمبر گھمانے لگی۔ بٹ نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ کسی محکوم جن کی طرح فون ملنے کے آدھے گھنٹے کے اندر ایک چھوٹے سے کیفے میں تکریم کے سامنے بیٹھا میز پر رکھی نمک دانی سے کھیل رہا تھا۔

''بٹ صاحب مجھے افسوس ہے۔ آپ کو مقصود کی وجہ سے پریشان ہونا پڑا۔''

''ڈاکٹر صاحب نے اچھا نہیں کیا۔''

''مقصود ایسے نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے' انھیں کسی نے پھنسایا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب اچھے آدمی نہیں ہیں باجی۔'' عاطف بٹ نے کہا۔ آنکھیں بدستور میز

پر جھکی ہوئی تھیں۔ تکریم کو حیرت تھی کہ وہ اب بھی مقصود کو احترام سے ڈاکٹر صاحب کہہ رہا تھا۔ تکریم نے سوچا، مقصود کی بے گناہی کے بارے میں بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''آپ کا جو نقصان ہوا ہے میں پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ مقصود کو چھوڑ دیجیے۔'' بٹ کچھ نہیں بولا' اسی طرح میز پر رکھی ہوئی شیشیوں سے کھیلتا رہا۔ تکریم نے سوچا' شاید اسے یقین نہیں۔ اس نے پرس سے چیک بک نکال کر میز پر رکھ دی' قلم بھی نکال لیا۔

''بتایئے آپ کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ میں چیک لکھ دیتی ہوں۔ میرے پاس پورے پیسے نہیں ہوئے تو باقی بعد میں دے دوں گی۔ شاہ صاحب میری ضمانت دے سکتے ہیں۔''

''باجی آپ جس کے واسطے یہ سب کچھ کر رہی ہیں' وہ آپ کے قابل نہیں ہے۔''

''آپ باجی کہتے ہیں تو بہن کی بات مان لیجیے۔ مجھے بتایئے' مقصود سے آپ کو کتنا نقصان ہوا ہے۔'' بٹ نمک دانی چھوڑ کر اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ تکریم چیک بک کھولے اور قلم ہاتھوں میں لیے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''ہم جدھر کے ہیں' ادھر بہنوں سے پیسے لینے والے بے غیرت کہلاتے ہیں۔''
عاطف بٹ نے کہا اور جانے لگا۔

''لیکن وہ مقصود......؟''

''آپ کی خاطر بھول جاتے ہیں۔ آپ بھی بھول جایئے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔''

''اور وہ فارمیسی والے؟ شاہ صاحب کہہ رہے تھے......''

''وہ بھی سب چور ہیں۔ میں ان کو ٹھیک کر لوں گا۔ وہ اسے نقصان کا دھندا سمجھ کر بھول جائیں گے۔ باجی آپ بھی بھول جائیں۔ وہ آدمی خراب ہے۔''

''آپ کو کیسے معلوم کہ مقصود خراب آدمی ہیں۔ صرف ایک غلطی کی وجہ سے؟'' تکریم بار بار ایک ہی بات سن کر جھنجھلا گئی تھی۔

''مجھے پتا ہے باجی...... میں اس کے گھر جا چکا ہوں۔''

''آپ کو مقصود کا گھر معلوم ہے؟'' تکریم چیک بک اور قلم پرس میں رکھ کر ایک دم کھڑی ہوگئی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا لیکن میں نے ڈھونڈھ لیا ہے۔کل گیا تھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ آج جاتا مگر آپ نے......''

''مجھے لے کر چلیے۔ابھی۔اسی وقت۔''

''نہیں باجی! آپ......''

تکریم کی ضد کے آگے مجبور ہو کر بٹ تکریم کو اسی بلڈنگ کے سامنے لے آیا جہاں مقصود ویلری کے ساتھ رہتا تھا۔آصف بٹ بھی تکریم کے ساتھ اوپر جانا چاہتا تھا لیکن تکریم نے سختی سے منع کر دیا۔بٹ افسوس کے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔اس نے مقصود کو ایک بار جس کونے کی دکان کے سامنے اتارا تھا' اس کے مالک نے بٹ کو مقصود کا پتا ہی نہیں' اس کی بیوی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

تکریم کافی دیر تک گھنٹی بجاتی رہی۔اس کا خیال تھا کہ مقصود اسے اپنے فلیٹ کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران رہ جائے گا' لیکن وہ شاید گھر میں تھا نہیں۔'' تکریم نے سوچا' اس کے ساتھ فلیٹ میں رہنے والے باقی تینوں لوگ بھی کام پر گئے ہوئے ہوں گے۔وہ واپس جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ویلری نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔تکریم ایک نیم برہنہ لڑکی کو سامنے دیکھ کر حیران ہوگئی۔ویلری ہمیشہ کی طرح صرف انڈرویئر اور تنگ سی چولی پہنے ہوئے تھی۔دروازہ کھولنے سے پہلے تکلفاً باریک سی ایک نائٹی پہن لی تھی لیکن وہ بھی اس کا بدن چھپانے کے لیے کافی نہیں تھی۔منہ میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔وہ تکریم کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''یہاں جو لوگ رہتے تھے وہ......''

''لوگ؟ کون لوگ؟ یہاں ہمیشہ سے میں رہتی ہوں' میں۔'' تکریم سمجھ گئی کہ بٹ نے

اسے غلط نمبر بتایا تھا۔ وہ واپس جانا ہی چاہتی تھی لیکن ویلری کی آواز سن کر رک گئی۔

''تم کسے ڈھونڈھ رہی ہو؟''

''مقصود کو۔''

''کون مقصود؟''

''ڈاکٹر مقصود......''

''میک! وہ فراڈ ڈاکٹر۔'' ویلری کا انداز ہ ایک دم جارحانہ ہو گیا۔ ''مجھے پتا تھا تم اسی کو پوچھ رہی ہو گی۔ تم اُسی کے ملک کی لگتی ہو۔ تم کون ہو؟ کیا تم بھی اس کی بیوی ہو؟ لگتا ہے تمھیں بھی اُس نے ڈاکٹر بن کر بے وقوف بنایا ہے......''

''نہیں نہیں۔ میں اس کی بیوی نہیں' دوست ہوں۔ کیا وہ یہیں رہتے ہیں؟''

''اور کہاں رہتا کتا۔ اسے ڈنگر خانے سے نکال کر اپنے گھر لائی تھی۔ مجھ سے شادی کر کے میرے ٹکڑوں پر پل رہا تھا۔ اب اس کتیا ماریا کے ساتھ میکسیکو بھاگ گیا ہے۔ وہاں اس سے شادی کر کے ڈاکٹری کا چکر چلائے گا۔ دھوکے باز۔ میرے پیٹ میں اپنا پلا بھی ڈال گیا ہے۔'' وہ پھر رونے لگی۔ لیکن پھر رونا بھول کر غصے میں چیخنے لگی ''میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ جب بھی ملے گا' دونوں ہاتھوں میں پتھر لے کر اس کی گولیاں توڑ دوں گی۔ حرامی۔ کتا......'' ویلری زور زور سے مغلظات بکنے لگی۔ آس پاس کے فلیٹ سے لوگ دروازہ کھول کر جھانکنے لگے تھے۔

تکریم لفٹ کا انتظار کیے بغیر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے خواب میں بھاگ رہی ہو اور روتے اور بھونکتے کتوں کا غول اس کے پیچھے ہو۔ اس نے سوچا' عاطف بٹ نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ مقصود ایک خراب آدمی تھا' وہ اس کے قابل نہیں تھا۔ بٹ ابھی تک نیچے کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تکریم کی تمام حسیات بالکل سن ہو چکی تھیں۔ بٹ نے تکریم کو جب اپنی گاڑی میں اس کے گھر چھوڑا تو وہ بمشکل شکریہ کہہ سکی۔

کچھ دیر فٹ پاتھ پر کھڑی خالی نظروں سے عاطف بٹ کی گاڑی جاتے دیکھتی رہی۔

گھر کی سیڑھیاں اترنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا' تہہ خانے کی تنگ اور تاریک کھولی میں تو دنیا اور اندھیری لگے گی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مسجد کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ وہ کچھ سوچے بغیر اندر داخل ہوگئی۔ ایک طرف وضو کرنے کی جگہ بنی تھی۔ وہ وضو کرتے ہوئے دیر تک منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی رہی۔ مسجد خالی تھی' صرف ایک بڑی عمر کے بزرگ ایک طرف بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ان کا رعشہ زدہ چہرہ زور زور سے ہل رہا تھا۔ تکریم کی نماز پڑھنے کی تیاری دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''بیٹی! عورتوں کے لیے اُدھر پردے کے پیچھے انتظام ہے۔'' انہوں نے ایک چھوٹے گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ابھی ظہر کا وقت نہیں ہوا۔''

''مجھے شکرانے کے نفل پڑھنے ہیں۔'' تکریم نے کہا اور پردے کے پیچھے چلی گئی۔ دو نفل پڑھے اور دیوار سے ٹیک لگائے دیر تک بیٹھی رہی۔ ماں کا چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے سر پر سایہ کیے بیٹھی ہے۔ تکریم جب مسجد سے نکلی تو بہت پرسکون ہوگئی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ زمانے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بار پھر تیار ہوگئی ہو۔

اپنے تہہ خانے والے گھر میں اتر کر آئی تو دفتر میں سیّد اکیلا بیٹھا شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

''کافی پیو گی؟'' تکریم نے سر ہلایا اور وہیں دفتر میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سیّد کی لائی ہوئی کافی اس وقت اسے ایک بڑی نعمت لگی۔

''خبر اچھی نہیں ہے۔'' سیّد نے حسب عادت کچھ دیر کی خاموشی اور کافی کے کئی گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ وہ تکریم کے چہرے پر بری خبر کی اطلاع کا تاثر تلاش کر رہا تھا لیکن تکریم کو اس قدر پرسکون دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

''میں اس اپینی بار کے مالک سے مل کر آیا ہوں جہاں مقصود کام کرتا تھا۔'' سیّد نے بری خبر سناتے ہوئے کہا۔ ''مقصود اس کے شراب خانے میں کام کرنے والی ایک لڑکی کو لے کر

میکسیکو بھاگ گیا ہے اور ایک حاملہ بیوی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''کیا؟'' سیّد کا خیال تھا کہ اس نے دھما کہ کیا ہے۔ لیکن تکریم نے الٹا اسے حیران کر دیا۔

''میں اس کی بیوی سے مل کر آ رہی ہوں۔''

''کیسے؟''

''عاطف بٹ کو پتا معلوم تھا' وہ مجھے لے کر گیا تھا۔''

''عاطف بٹ؟'' سیّد کو مزید حیرت ہوئی لیکن وہ خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ تکریم کو بھی کافی پی کر سکون مل رہا تھا۔

''میں اسے ڈھونڈنے میکسیکو جانا چاہتی تھی۔''

''کیوں؟''

''وہ کام کرنے جو اس کی اپنی بیوی کرنا چاہتی ہے۔''

''کیا کام؟''

تکریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے تصور میں لگا جیسے اس کے دونوں ہاتھوں میں پتھر ہوں' لیکن پھر اس نے سوچا' یہ پتھر خود اپنے سر پر دے مارے۔ آخر وہ اتنی اندھی کیوں ہو گئی تھی۔

''پھر کیا ہوا۔ ارادہ بدل گیا؟''

''ہاں' وہ اس قابل نہیں ہے۔''

''تمھاری امی کا کھینچا ہوا حصار واقعی بہت مضبوط ہے۔ تمھیں بال بال بچا لیا۔''

تکریم چپ رہی۔

''اس کا ایک پرانا دوست اسے ڈھونڈتا ہوا آج صبح میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے مقصود کی کہانی سنائی ہے۔'' سیّد نے سسپنس پیدا کرنے کے لیے کافی کے گھونٹوں کا وقفہ لیا اور پھر ایک اور دھما کا کیا۔ ''مقصود کی دو بیویاں اور ہیں جو اسے آج بھی تلاش کر رہی ہیں۔''

5

کراچی

مقصود میڈیکل کے پانچویں سال میں آیا تو پڑھائی سے زیادہ زیب النساء چیلنج بن گئی تھی۔ صرف نام ہی نہیں' اس کا سراپا' اس کی انا' بیگانگی' عدم توجہی' نظر انداز کرنے کی ادا' حتیٰ کہ اس کی انگریزی بھی۔ وہ کسی دوسرے کالج سے تبادلہ کرا کے نئی نئی ڈو میڈیکل کالج میں آئی تھی۔ مقصود اس وقت تک اپنا نام کافی روشن کر چکا تھا اور کالج کی لڑکیوں میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ مقبولیت کی ایک وجہ یہ سنہرا اصول بھی تھا کہ اپنے کالج کی لڑکی سے کبھی عشق نہ کرو' لیکن یہ مجبہ نہ جانے کیوں اس کے سائے سے بھی بھڑک رہی تھی۔

زیب النساء ان کے کلاس کی واحد لڑکی تھی جو حجاب باندھتی تھی۔ وہ بھی سفید رنگ اور سوتی کپڑے کا۔ رنگ بہت گورا تھا۔ درمیان میں رخساروں کی لالی نہ ہوتی تو پورا چہرہ حجاب کا

حصہ لگتا۔ چہرے پر پاکیزگی اور معصومیت تھی، پھر بھی سہمی سہمی سی نظر آتی۔ لڑکیوں کا خیال تھا مڈل کلاس گھرانے کی اردو میڈیم لڑکی ہے اس لیے الگ الگ اور ڈری ڈری رہتی ہے۔ الیکشن کے زمانے میں ایک فیشن زدہ لڑکی نے جب کیلون کلائن کا کالا چشمہ آنکھوں سے اپنے سر پر کھسکا کر ڈیفنس سوسائٹی والے انگریزی لہجے میں ووٹ مانگا اور جواب میں امریکی لہجے کی انگریزی سنی تو بوکھلا کر اردو بولنے لگی۔ پتا چلا کہ زیب النساء امریکہ میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں باپ بہت مذہبی تھے، انھوں نے ہائی اسکول کے بعد پاکستان بھیج دیا تھا تاکہ ان کی بیٹی اپنے تہذیبی اور اسلامی ماحول میں تعلیم حاصل کر سکے۔ وہ میڈیکل کا آخری سال ختم کر کے شکاگو واپس جانے والی تھی۔ زیب النساء کے امریکی ہونے کا راز کھلتے ہی ہم جماعت لڑکیوں نے اس سے قریب ہونے کی کوششیں شروع کر دیں اور وہ دوستوں کے ایک گروپ میں ضم ہو کر زیب النساء سے زیبی ہوگئی۔ مقصود نے پہلی چوٹ نام کے سلسلے میں بے تکلف ہو کر کھائی تھی۔

اس دن ہسپتال کے راؤنڈ پر جانے والے گروپ میں مقصود اور زیب النساء ایک ساتھ تھے۔ واپس آتے ہوئے مقصود نے تعلقات کا پل باندھنے کی کوشش کی۔

''زیبی آپ نے......''

''میرا نام زیبی نہیں، زیب النساء ہے۔''

''لیکن فرح، مینا، عینی سب آپ کو......''

''وہ میری قریبی دوست ہیں۔ انھیں حق ہے۔ آپ کے لیے میں زیب النساء ہوں۔ بلکہ زیب النساء شہید۔''

''شہید؟''

''یہ میرا فیملی نیم ہے۔ آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟''

''میرا نام بھی شہید ہے۔ اس لیے......''

''آپ کا نام تو......''

''سید مقصود علی قریشی! دراصل میں شاعر بھی ہوں۔ شہید میرا تخلص ہے۔''

''تو آپ ہسپتال میں کیا کر رہے ہیں۔ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر پان چبایئے' شعر سنایئے' واہ واہ کیجیے۔''

''میں ماڈرن قسم کا شاعر ہوں۔ میری شاعری......''

''شاعری صرف بے کار لوگوں کا کام ہے۔ جو کچھ نہیں کرتے وہ شاعری کرتے ہیں۔''

''بالکل! آپ صحیح کہتی ہیں۔ میں بھی شاعری اسی وقت کرتا ہوں جب کرنے کے لیے کچھ اور نہیں ہوتا۔ بالکل بے کار ہوتا ہوں۔ میں صرف شاعری کی وجہ سے شہید نہیں ہوں۔ شہادت میرا شوق ہے۔ بچپن سے شہید ہونے کی تمنا ہے۔ دل چاہتا ہے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار لہراتا ہوا میدان جنگ کی طرف جاؤں اور میری ہیروئن میرے شہید ہونے کی دعا مانگتی رہے۔''

''پلیز...... مجھے آپ کی تاریخ سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔''

''ہو بھی نہیں سکتی۔ مجھے معلوم ہے آپ امریکی ہیں۔ آپ کی تاریخ سے کینیڈی کا قتل' میرلین منرو کی خودکشی' ایلوس پریسلے کی گم شدگی' مونیکا لیونسکی اور عراق نکل جائے تو کیا بچے گا؟ ابراہیم لنکن یا جارج واشنگٹن جیسے بور لوگ' یا پھر ویت نام کی جنگ اور جاپان پر ایٹم بم برسانے والے ٹرومین جسے کوئی یاد رکھنا نہیں چاہتا۔ آپ اپنا رشتہ دوبارہ اپنی تاریخ سے جوڑیے۔ نسیم حجازی کے ناول پڑھیے۔''

''مجھے ناول پڑھنے سے بھی کوئی دل چسپی نہیں ہے۔'' زیب النساء چلتے چلتے رک گئی اور براہ راست مقصود کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ''آپ سمجھتے ہیں کہ میرے فیملی نیم کا مذاق اڑا کر مجھے amuse کر رہے ہیں تو آپ غلط ہیں۔ آپ کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ آپ current affairs کے ایکسپرٹ ہیں یا آپ کا sense of humour بہت اچھا

ہے۔ please leave me alone '' یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ مقصود وہیں کھڑا سر کھجاتا رہ گیا۔

زیب النساء سے ہونے والے پہلے ہی معرکے میں مقصود کی اس ہزیمت کو ان دوستوں نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا جو لڑکیوں میں مقصود کی مقبولیت سے جلتے تھے۔ اسے چیلنج کیا کہ وہ زیب النساء کے سر سے حجاب اتروا کر دکھائے۔ مقصود نے اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا' بس دل ہی دل میں زیب النساء کا حجاب اتروانے کا عہد کرنے لگا۔ اب کالج کی کسی لڑکی سے عشق نہ کرنے کی روایت نباہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

عشق کے معاملے میں مقصود کا رویہ بہت عملی تھا۔ وہ طویل دورانیے کے عشق کا قائل نہیں تھا۔ اس نے کالج آتے ہی طے کر لیا تھا کہ چار پانچ دل شکستہ اور منہ بسورتی لڑکیوں کے ساتھ کالج میں پانچ چھ برس گزارنا مشکل ہوں گے۔ عشق کے لیے باہر کی دنیا بہت زرخیز تھی۔ میڈیکل کے پہلے سال میں تھا تو ڈاکٹروں والا سفید کوٹ اور گلے میں اسٹتھیسکوپ لٹکائے ڈومیڈیکل کے نزدیک لڑکیوں کے کالج کے آس پاس ٹہلتا اور دیر تک بس اسٹاپ پر کھڑا اس بس کا انتظار کرتا جو کبھی نہیں آتی تھی۔ ڈاکٹر شوہروں کا خواب دیکھنے والی کچھ لڑکیوں کی آنکھوں میں بس گیا تھا لیکن ان سے معاملات زیادہ عرصہ نہیں چل سکے۔ وہ تیسری ہی ملاقات میں رشتے کے لیے ماں باپ کو گھر بھیجنے کی ضد کرنے لگتیں۔ مقصود کے لیے رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اس تھیوری کی اپنے طور پر توضیح کرتا تھا کہ رشتے صرف پیداواری ہوتے ہیں۔ وہ ضرورت پڑنے پر کوئی بھی رشتہ پیدا کر سکتا تھا' کسی کو بھی بیوی' ماں' باپ یا کچھ اور بنا سکتا تھا۔ اس کے لیے رشتے توڑنا یا جوڑنا صرف ایک کھیل تھا۔ اس نے یہ کھیل پیدا ہوتے ہی سیکھ لیا تھا۔

مقصود کی ماں کا اس کی پیدائش کے وقت انتقال ہو گیا تھا۔ مقصود کو کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ ماں کسے کہتے ہیں۔ اس کے باپ کو اس کی ماں سے بہت محبت تھی۔ وہ مقصود کو اپنی بیوی کی

موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا جو بقول اس کے پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کو کھا گیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کو باپ کی محبت نہ دے سکا۔ بچپن میں خالہ نے اپنی بہن کی نشانی کو سینے سے لگا کر رکھا۔ خالہ ہجرت کر کے ہالینڈ چلی گئی تو باپ نے بورڈنگ اسکول بھیج دیا۔ مقصود جب چھٹیوں میں گھر آتا تو اسے خود اپنا وجود، اپنا باپ، سب کچھ اجنبی لگتا۔ باپ جو بیوی کی موت کا غم سینے سے لگائے بیٹھا تھا، جلد ہی زندگی کی لڑائی ہار گیا۔ باپ کا انتقال ہوا تو مقصود میٹرک میں تھا۔ اس وقت پھوپھی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ میٹرک کے بعد اسے گھر لے آئی اور بورڈنگ سے نکال کر شہر کے کالج میں داخل کرا دیا۔ بے حد ذہین اور حاضر دماغ تھا اس لیے پڑھنے میں بہت اچھا تھا۔ انٹر میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا تو میڈیکل میں داخلہ ملنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

وہ کالج کی طرح اپنے خاندان میں بھی محبت یا شادی کا قائل نہیں تھا۔ پھوپھی کی بیٹی جوان ہوئی تو مقصود کو دیکھ کر شرمانے لگی، لیکن مقصود کے لیے وہ گھر کے کسی بھی فرد کی طرح تھی۔ وہ بلا تکلف اسکی چٹیا پکڑ کر کھینچتا اور سر پر چپت لگا دیتا۔ وہ اسے محبت کا انداز سمجھنے لگی۔ پھوپھی خوش تھیں کہ انھیں گھر بیٹھے داماد مل گیا ہے۔ گھر کا لڑکا تھا، ہونہار تھا اور چند سالوں میں ڈاکٹر بننے والا تھا۔ ماں بیٹی کے خواب ایک دن اچانک ٹوٹ گئے۔ بیٹی نے اپنے کالج کی ایک لڑکی کے ساتھ اسے کسی ریسٹورنٹ سے نکلتے دیکھ لیا تو گھر آ کر سارا دن ماں کی گود میں سر رکھے روتی رہی۔ پھوپھی نے سوچا اب بھتیجے کو زنجیر سے باندھنے کا وقت آ گیا ہے۔ انھوں نے مقصود کو فیصلہ سنایا کہ وہ اس کا نکاح کر رہی ہیں، پڑھائی ختم ہونے کے بعد رخصتی ہوگی۔ ان کا خیال تھا مقصود سر جھکا کر فیصلہ مان لے گا، لیکن مقصود کے لیے یہ رسی تڑانے کا وقت تھا۔ اس نے اسی روز پھوپھی کا گھر چھوڑ دیا اور دو سال بعد پہلی بار صرف اس روز گیا جس دن ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ دلہن بنی ہوئی پھوپھی زاد بہن کے سر پر چپت لگا کر اسے مبارک باد دی اور چلا آیا۔ اس کے بعد اس گلی سے کبھی نہیں گزرا۔

ہاسٹل اس کے لیے سچ مچ کے گھر کی طرح تھا۔ وہ بورڈنگ اسکول میں رہتے اور پڑھتے ہوئے بڑا ہوا تھا۔ بمبئی ہوٹل کا کمرا تو ایک بنی بنائی جنت تھا۔ جہاں بورڈنگ والا ڈسپلن اور وہاں کی پابندیاں نہیں تھیں۔ اخراجات پورے کرنے کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ باپ نے محبت نہ سہی دولت چھوڑی تھی۔ لیکن وہ اتنی نہیں تھی کہ دیر تک مقصود کی شاہ خرچی کا بار اٹھا سکتی۔ اس نے ایک ڈاکٹر دوست کے مشورے اور مدد سے کورنگی میں اپنی ڈسپنسری کھول لی۔ وہ اس وقت میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا۔ پریکٹس غیر قانونی تھی اس لیے ڈرتا تھا۔ اس کے دوست نے سمجھایا کہ غریب بستیوں اور دیہات میں کتنے ہی ایسے عطائی نیم ڈاکٹر کا بورڈ لگائے بیٹھے ہیں جنھیں وہ اے بی سی ڈی بھی پڑھنا نہیں آتی جوانھوں نے ڈگریوں کے حروف کے طور پر نام کے نیچے لکھ رکھی ہے۔ ڈر ختم ہوا تو جلد ہی ڈاکٹر ایم اے قریشی' ایم بی بی ایس' آر ایم پی کی پریکٹس چل نکلی۔

آج کل مقصود کا عشق ایک ایر ہوسٹس سے چل رہا تھا۔ یہ پہلا عشق تھا جو اتنی مدت تک چلا تھا اور جس کے مزید کئی سال تک چلنے کے امکانات تھے۔ اس عشق کے طویل دورانیے میں داخل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں طویل وقفے آتے تھے۔ مقصود کو محبوبہ کا ہر وقت سر پر یا اعصاب پر سوار رہنا برا لگتا تھا۔ ہر وقت بچوں جیسے جذباتی چونچلے یا پھر شادی اور اولاد کے خواب! وہ بین الاقوامی پروازوں پر جاتی اور بعض دفعہ کئی ہفتوں تک غائب رہتی۔ جب آتی تو بالکل تازہ تازہ' نئی نئی سی۔ دو چار روز رہتی اور اسے آسودہ کر کے چلی جاتی۔ مقصود پروفیسروں میں اسی کے لائے ہوئے سگار اور پرفیوم تقسیم کر کے مقبول ہوا تھا۔ وہ کبھی شادی کا لفظ زبان پر نہیں لائی۔ یہ تذکرہ بھی ایک بار مقصود نے چھیڑا تھا۔ اسے خوف تھا کہ بین الاقوامی پروازوں کے دوران کوئی شیخ اسے اڑا کر نہ لے جائے۔ باندھ رکھنے کا آسان طریقہ یہی تھا کہ شادی کی نکیل ڈال دی جائے۔ لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ کہا تھا کہ مقصود میڈیکل کا کورس مکمل کر کے ڈاکٹر بن جائے اور اس کا ایئر ہوسٹس کا کنٹریکٹ پورا ہو جائے' اس کے بعد مستقبل کے بارے

میں فیصلہ کیا جائے گا۔ مقصود مطمئن ہو گیا تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ دبئی، لندن یا نیویارک میں اس کی محبوبہ کو شاپنگ کون کراتا ہے۔ وہ لوٹ کر اس کے پاس آتی تھی۔ مقصود کے لیے یہی کافی تھا۔ کیمسٹری صحیح کام کر رہی تھی۔

○ ○ ○

زیب النساء ایک روز برآمدے کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی نظر آئی تو مقصود ہیلو کہہ کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا، صرف سر ہلا کر چیونگم چباتی رہی۔

''اس دن کے لئے آئی ایم سوری۔ میں......''

''کس دن کے لیے؟''

''اس دن جب ہم ہسپتال کے راؤنڈ سے آ رہے تھے۔ میں نے آپ کے فیملی نیم کے بارے میں......''

''Not to worry- رات گئی بات گئی۔''

''رات؟ رات تو ابھی آئی ہی نہیں۔'' جملہ بے ارادہ منہ سے نکل گیا۔

''آپ مجھے پھر irritate کرنا چاہتے ہیں؟'' زیب النساء نے غصے سے کہا۔ ساتھ ہی چوسی ہوئی چیونگم منہ سے نکال کر ٹشو پیپر میں لپیٹی اور اپنے پرس میں رکھ لی۔

''نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ آئی ایم ساری۔ میں دراصل عادت سے مجبور ہوں۔ بعض اوقات زبان پر اختیار نہیں رہتا۔''

''یہ Tourrette کے symptoms ہیں۔ آپ کو پتا ہو گا muscles کے بے ارادہ حرکت کرنے کی بیماری، اس کا علاج کرائیے۔''

''میرے یہاں بیٹھنے پر آپ کو اعتراض تو نہیں؟'' مقصود نے زیب النساء کی بات نظر انداز کر کے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس سے کچھ ہٹ کر بیٹھ گیا۔ زیب النساء نے کندھے

اچکا دیے اور اپنے بیگ سے چیونگم کا پیکٹ نکال کر کھولنے لگی۔ کچھ سوچ کر اس نے ایک چیونگم مقصود کی طرف بڑھائی۔

"No Thanks! چیونگم چباتے ہوئے مجھے جگالی کرتی ہوئی بکری یاد آنے لگتی ہے۔"

زیب النساء نے اسے غصے سے دیکھا' لیکن پھر اچانک ہنس پڑی۔

"مجھے آج تک آپ لوگوں کے Sense of humour کی عادت نہیں ہو سکی۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ آپ لوگوں کے ہیومر میں مذاق اور بدتمیزی کے درمیان فرق نہیں ہوتا۔"

"میری وجہ سے سب کو الزام مت دیجیے۔ آپ خود ہی کہہ چکی ہیں میں Tourrette کا مریض ہوں۔ مجھے اپنی زبان پر......"

"اختیار نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے۔" زیب النساء نے جملہ مکمل کیا اور چیونگم منہ میں رکھے بغیر پرس میں واپس ڈال دی۔

"میں آیا تھا سوری کہنے لیکن آپ کچھ اور ناراض ہو گئیں۔"

"آپ کو سوری کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دن کی بات مجھے یاد بھی نہیں رہی۔ میں باتوں کو دل میں نہیں رکھتی۔ آپ کی دوستوں کی طرح' جو آپ کے مذاق پر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر ہٹ بے شرم کہتی' لیکن دل ہی دل میں خوش ہوتی ہیں۔ میں آپ کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے شرم کہہ سکتی ہوں۔ آپ اپنا ہنر اپنی دوستوں پر آزمایئے۔"

"میری دوست ...... میرے مذاق پر چہرہ نہیں چھپاتیں' قہقہہ لگا کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں I Love You اور وہ شرما کر آنکھیں جھکانے کے بجائے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب میں کہے I love you too!"

"آپ شاید امریکی فلمیں بہت دیکھتے ہیں۔ امریکہ جایئے' آپ کے خوابوں کی تعبیر

وہیں پوری ہو سکے گی۔"

"کیوں؟ امریکہ جانا کیوں ضروری ہے۔ کیا ہم یہیں......"

"شٹ اپ!" زیب النساء کا چہرہ ہلکا سا سرخ ہو گیا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر چل دی۔ مقصود اسے جاتا ہوا دیکھ کر سوچ رہا تھا' اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔

زیب النساء سے ہونے والی اگلی دو چار ملاقاتیں مختصر رہیں۔ زیب النساء نے بات بڑھانے کا موقع نہیں دیا اور خود مقصود نے بھی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں چڑیا اڑ نہ جائے۔ وہ ایک بڑے معرکے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک شام یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی گزار کر آیا تھا۔ اسی کے دوسرے روز دونوں اپنڈکس کا آپریشن کرنے والے گروپ میں شامل تھے۔ آپریشن تھیٹر سے کالج کی طرف واپس آتے ہوئے مقصود زیب النساء کے ہم قدم ہو گیا۔

"مس شہید! آیئے آپ کو چائے پلائی جائے۔"

"میں چائے نہیں پیتی۔"

"کوک' پیپسی' فانٹا' آئس کریم سوڈا......"

"میں صرف پانی پیتی ہوں۔ بوتل میرے پاس ہے۔" زیب النساء نے اپنا بیگ تھپ تھپایا۔

"آپ مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے ڈرتی ہیں اس لیے......" مقصود نے چیلنج پھینکا۔

"آپ سے خوف زدہ؟ ہا! آپ کوئی سورما ہیں؟" زیب النساء مقصود کے چہرے کی طرف انگلی گھماتے ہوئے ہنسی۔ "چلیے۔ میں پانی پیوں گی اور آپ کو چائے پیتا ہوا دیکھوں گی۔" چڑیا نے دانہ چگ لیا تھا۔

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کینٹین کی طرف آئے۔ اس وقت زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ شروع سالوں کے دو تین لڑکے اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ مقصود اور زیب النساء

کی ایک ہم جماعت سینڈوچ کھاتے ہوئے کسی ان جانی دنیا میں اس طرح گم تھی کہ اس نے انھیں دیکھا تک نہیں۔ مقصود بہت سنجیدہ اور خاموش تھا۔ وہ چائے آنے اور بنانے تک کچھ نہیں بولا۔

''آج آپریشن کرتے وقت آپ کی انگلیاں کپکپا گئی تھیں۔'' اس نے چائے کا گھونٹ لینے کے بعد کہا۔

''کیا؟'' زیب النساء ایک دم بھڑک اٹھی۔ ''آپ میری انسلٹ کرنے یہاں لائے ہیں؟ آپ کون ہوتے ہیں میری پرفارمنس جج کرنے والے؟''

''آپ کا دوست! پروفیسر سلیمی کی توجہ اس وقت کہیں اور تھی ورنہ وہ سب کے سامنے ڈانٹ دیتے۔''

''میں نے پہلا اپنڈکس نہیں نکالا۔ تین آپریشن پہلے بھی کر چکی ہوں۔ ہر دفعہ پروفیسر سلیمی میرے ساتھ تھے۔ ہر بار انہوں نے میری تعریف کی۔ میرا ہاتھ نہیں کپکپایا۔ آپ کی آنکھیں کم زور ہوگئی ہیں۔ چشمے کا نمبر بدل وائیے۔''

''آپ سرجن بننے کے بارے میں سیریس ہیں؟''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''آپ Oxidational stress کا شکار ہیں۔ آپ کے سر کو ہوا نہیں لگتی جس کی وجہ سے آپ anaerobic ہوگئی ہیں۔''

"you must be crazy." آپ oxidation کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ مجھے external oxidation کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے اندر اتنی آکسیجن ہے کہ آپ کو اپنے سر کے بال صاف کرانے کے بعد بھی نہیں ملے گی۔'' زیب النساء اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''آپ کبھی عرب دنیا میں نہیں گئے۔ وہاں کی ڈاکٹر عورتیں حجاب باندھ کر آپریشن کرتی ہیں۔''

''اسی لیے ان کا ریکارڈ زیادہ اچھا نہیں ہے' اور آپ عرب دنیا میں نہیں ڈاکٹری کرنے امریکہ جارہی ہیں۔ اپنے مستقبل کے مریضوں پر رحم کیجیے۔''

''آپ وہاں کی فکر مت کیجیے۔ وہاں حجاب پہننے والوں کو anaerabic ہونے کا طعنہ کوئی نہیں دیتا۔''

''آپ حجاب کیوں پہنتی ہیں؟'' مقصود بحث کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔

''اس لیے کہ میں مسلمان ہوں۔''

''تو؟''

''پردہ کرنا' اپنے آپ کو ڈھکنا' چھپانا مذہب کی طرف سے مجھ پر فرض ہے۔''

''غلط! بالکل غلط! اسلام میں کہیں نہیں آیا کہ عورتیں نقاب پہنیں اور حجاب اوڑھیں۔''

''آپ کا خیال ہے پردہ عورتوں کو نہیں مردوں کو کرنا چاہیے۔'' زیب النساء نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو تو خاص طور پر...... میرے نانا بتاتے ہیں کہ عرب دنیا میں مرد نقاب پہنا کرتے تھے۔ پانچویں صدی کے مشہور عرب شاعر نظر بد سے بچنے کے لیے نقاب پہن کر میلے میں جاتے تھے۔ آپ بھی مشہور ہیں اور شاعر بھی......''

''میری طرح آپ بھی مذاق کرنے لگیں۔'' مقصود نے برا مانے بغیر کہا۔ ''تمام اسکالرز کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں عورتوں کے پردے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ آرنلڈ' ہیوسن' اسٹرن' ڈیننگر' ٹیڈلر جیسے اسکالرز نے کئی سال ریسرچ کر کے ثابت کیا ہے کہ پردے کی روایت عیسائیت سے بھی پہلے کے سماجوں کی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پانچ سو سال پہلے کے ایتھنز میں یونان کے امیر طبقے کی عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ یونانی مصر پہنچے تو انھوں نے وہاں بھی یہ روایت شروع کی اور مصر کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتی تھیں ان کی برابری کی حیثیت ختم کر دی۔ آپ جو حجاب اوڑھے ہوئے ہیں وہ یونانی عورتیں اپنے سر پر لپیٹے پھرتی تھیں۔ اس طرح کا پردہ کرتی ہوئی یونانی عورتیں آج بھی نظر آئیں گی۔''

''آپ نے صرف کافروں کو پڑھا ہے' یہ ریسرچ نہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں یورو کرسچین ذہنیت کی تنگ نظری ہے جس کا مقصد اسلام کی ہر روایت کو جھوٹا اور مسخ کر کے پیش کرنا ہے۔''

''مسخ! کتنا مشکل لفظ ہے۔''

''distortion! یہ کام آپ بھی بہت محنت سے کر رہے ہیں۔''

''پرسنل مت لیجیے۔ میں نے واقعی بہت محنت کی ہے۔ اس طرح پڑھا ہے جیسے امتحان دینے جا رہا ہوں۔ آپ یورپی عیسائی اسکالرز کی ریسرچ چھوڑیے۔ لیلیٰ احمد' مخلوف' فدوی الجندی' فاطمہ مروسی' ابراہیم سیّد' سب مسلمان اسکالرز ہیں۔ نیم ملا خطرۂ ایمان والے نہیں۔ وہ مختلف شعبوں اور ان کے سماجوں کی تاریخ کا مکمل علم رکھنے والے لوگ ہیں۔ انھوں نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے۔ رحم' نطفے اور شرم گاہوں کے پردے کا حکم ہے' نقاب اوڑھنے اور سر پر حجاب لپیٹنے اور جسم کا اک اک بال چھپانے کا ذکر نہیں ہے۔''

''میں آپ کی طرح تیاری کر کے نہیں آئی اس لیے بحث نہیں کر سکتی۔ مانتی ہوں کہ پردہ اسلام اور عیسائیت سے بھی پہلے کی چیز ہے۔ لیکن پردے کو قانون بنا کر اسے اسلام نے معتبر کیا ہے۔ یہ بات آپ کے اسکالرز بھی مانتے ہیں۔''

''لیلیٰ احمد کی تھیسس یہی تھی' لیکن اس نے بعد میں خود ہی اسے غلط ثابت کر دیا۔ اس نے لکھا ہے کہ پردہ کرنے کے قانون اسلام سے سینکڑوں سال پہلے بنا دیے گئے تھے۔ ایک ایک اصول طے تھا کہ کون پردہ کرے گا اور کون نہیں۔ کنیزوں اور خادماؤں کو پردہ کرنے کی اجازت نہیں تھی' خلاف ورزی کرنے پر ناک' کان کاٹنے کی سزائیں تھیں۔'' مقصود نے ایک گہری سانس لی اور میز پر آگے کی طرف جھک آیا۔ ''آپ کو پتا ہے آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ آپ اپنے عورت ہونے سے خوف زدہ ہیں۔ خود سے ڈرتی ہیں۔ اس لیے اپنے آپ کو چھپائے اور لپیٹے پھرتی ہیں۔ یا آپ خود کو ہزاروں سال پرانی یونانی عورت کی طرح اونچے طبقے کا ثابت

کرنا چاہتی ہیں۔''

''!Bullshit'' زیب النساء کو اچانک غصہ آ گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر اس نے اپنی اونچی ہوتی ہوئی آواز دھیمی کر لی اور کہنے لگی۔ ''آپ ہمارا مسئلہ نہیں سمجھ سکتے۔ آپ پاکستان میں رہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی ملٹی کلچرل دنیا میں پردہ ہماری شناخت ہے جو ہمیں آزادی کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جانے سے روکتا ہے۔ یہ ہماری لائف بوٹ ہے۔ سیفٹی بیلٹ۔''

''تو پھر صرف مذہبی شناخت کیوں؟ قومی، قبائلی اور خاندانی شناخت بھی دکھایئے۔ آپ کو چہرے پر کئی بینرز لگانے اور کئی حفاظتی بند باندھنے پڑیں گے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف مذہب کا بینر کافی ہے۔''

''آپ کو پتا ہے آپ کی امریکہ ہی کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر ابراہیم سیّد کیا کہتے ہیں؟ ان کا کہنا ہے مسلمان مردوں نے اپنی عورتوں کو کمتر رکھنے کے لیے پردے کا بت تراشا ہے۔ پردہ محکومیت کی نشانی ہے جو مسلمان عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ چلنے سے روکتا ہے۔''

''بکواس!''

''پاکستان میں آپ کی شناخت کا کیا مسئلہ ہے؟ یہ تو امریکہ کی ملٹی کلچرل دنیا نہیں ہے یا آپ بتانا چاہتی ہیں کہ صرف آپ پاک باز ہیں، باقی سب لڑکیاں کم درجے کی مسلمان ہیں؟''

''میں کچھ بتانا نہیں چاہتی...... یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ now leave me alone'' زیب النساء جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بری طرح جھنجھلا گئی تھی۔

''جواب دے کر جایئے۔ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے کیا؟''

''مجھے بتانے کی ضرورت نہیں، پھر بھی سنیے۔ مجھے آپ کی نگاہوں کی تسکین کے لیے اپنا حسن اور اپنے بال سنوارنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے ہر ایرے غیرے اور راہ گیروں کے نظاروں کا سامان بننے سے دل چسپی نہیں ہے۔ میں ماڈل نہیں ہوں۔ خود کو سجا کر آپ کو لبھانا میرا

کام نہیں ہے۔ میں اپنی زلفیں اور اپنا حسن سب کو نہیں صرف اسے دکھاؤں گی جس کا اس پر حق ہو گا۔ میں جس کی اور جو میرا ہو گا۔ !Period پلیز! اس مسئلے پر آئندہ بور نہ کیجیے گا۔''

زیب النساء اپنے سفید ٹینس کے جوتوں سے بے آواز قدم اٹھاتی ہوئی تیزی کے ساتھ کینٹین سے نکل گئی۔

مقصود نے زیب النساء سے پردے کے مسئلے پر پھر کبھی بات نہیں کی۔ اس دن کی بحث کے بعد زیب النساء کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی۔ وہ اسے نظر انداز نہیں کرتی تھی اور آہستہ آہستہ اس سے متاثر ہونے لگی تھی۔ آپریشن کرتے ہوئے مقصود کی مہارت' ہسپتال میں مریضوں کے وارڈوں میں اس کی مقبولیت اور پروفیسروں کی نظروں میں اس کے لیے عزت دیکھ کر اسے شروع میں جو حیرت ہوئی تھی وہ پسندیدگی میں بدل گئی تھی۔ ملتا تو آنکھیں مسکرانے لگتیں۔ مقصود نے ایک دن ڈرتے ڈرتے اسے زیبی کہہ کر بھی دیکھا' اسے برا نہیں لگا تھا۔ آپ کی جگہ تم کا رشتہ قائم کرنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ کینٹین آ کر اس کے ساتھ پانی نہیں چائے پینے لگی تھی۔ ایک دن برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے اس نے مقصود کو اندر سے کرید کر بھی دیکھا تھا۔

''اتنے اچھے اور ذہین ڈاکٹر ہو' خود پر آوارگی کا خول کیوں چڑھا لیا ہے؟''

''میں اور آوارہ؟'' مقصود نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ''تم نے کبھی سنا ہے کہ میں نے کالج کی کسی لڑکی کو Pregnant کیا' کسی کو لے کر بھاگا' کسی کا دل توڑا' کبھی شراب پی کر آیا' کبھی کسی سے جھگڑا کیا' کلاس چھوڑی' پروفیسروں سے بدتمیزی کی؟ تم اتنا قریب ہو' کبھی تمھیں چھو کر دیکھا؟''

''تم بہت بیہودہ ہو۔'' زیب النساء جھینپ گئی۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو......''

''میں تمھارا مطلب سمجھتا ہوں۔ تم نے غلط نہیں کہا۔ میں سچ مچ آوارہ ہوں۔ ایک دم پکا آوارہ۔ سنو گی کیوں؟''

زیب النساء کچھ نہیں بولی۔ مقصود بھی کچھ دیر خاموش رہا۔ بولا تو جیسے خود سے مخاطب تھا۔ ''میں ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا...... بچپن میں بہت حساس اور زود رنج تھا۔ ایک پرانے انگریز شاعر نے شاید میرے ہی لیے لکھا تھا کہ میں نے پیدا ہوتے ہی رونا شروع کر دیا تھا اور میری زندگی کا ہر دن میرے آنسوؤں کی گواہی تھا۔ میرے غم کی وجہ میری ذات نہیں تھی۔ میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا دیکھ کر کڑھتا تھا۔ غصے سے بدن اکڑ جاتا۔ راتوں کو اٹھ کر دیوار پر مکے مارتا' سر ٹکراتا...... میرے ہوسٹل کے سامنے جھگیوں کی ایک دنیا آباد تھی۔ اس بستی کی کہانی بھی کسی بھی غریب بستی جیسی تھی۔ میں کبھی کبھی اس بستی میں جاتا اور اپنے پیسے اور کپڑے بچوں میں بانٹ دیتا۔ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتا کہ کہیں کسی کا شکریہ شرمندہ نہ کر دے۔

''بڑا ہو کر اخبار پڑھنا شروع کیا تو پہلی بار پتا چلا کہ ہوسٹل کے سامنے والی بستی کی کہانی پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ بڑے لوگ' بڑے طبقے اور بڑی طاقتیں سب اپنی اپنی برتری قائم کرنے والے کھیل کھیل رہے ہیں۔ بے انصافی کرنے والے ہاتھوں میں انصاف کا پرچم ہے۔ خدمت کے نام پر لوگ آقا بن گئے ہیں۔ میرے اندر کا غصہ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ خود کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے اللہ سے مدد مانگی۔ وہی سب کچھ کرنے پر قادر تھا۔ نمازیں پڑھنا شروع کیں۔ دیر تک سجدے میں پڑا گڑگڑاتا اور گھنٹوں ہاتھ اٹھائے دعائیں مانگتا رہتا۔ خدا کو میری دعائیں سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا دل بھی صرف یورپ' امریکہ اور جاپان کی خوشحال دنیاؤں میں لگتا تھا۔ میرا ایک دوست جو یورپ ہو کر آیا تھا کہتا تھا خدا نے اپنی دنیا بنا کر بچا ہوا ملبہ اور کوڑا کرکٹ پھینکا تو ہماری دنیا تخلیق ہو گئی۔ وہ صحیح کہتا تھا۔ ہماری دنیا کسی عمارت کا چھوڑا ہوا ملبہ اور کوڑا کرکٹ ہی تھی۔ کوئی جان بوجھ کر ایسی دنیا نہیں بنا سکتا تھا۔

''برسوں کی عبادت اور دعاؤں کے بعد بھی بھوک ختم نہیں ہوئی' خون خرابا نہیں رکا' وباؤں نے دم نہیں توڑا' بے انصافیاں بند نہیں ہوئیں' کشمیر اور فلسطین تک آزاد نہیں ہوئے تو

میں نے بھی خدا کو تنگ کرنا چھوڑ دیا۔ میرے ایک استاد میری طرح دنیا کی ناانصافیاں دیکھ کر دکھی رہتے تھے۔ میں نے خدا سے لو لگائی تھی' انھوں نے انقلاب سے امید باندھی تھی اور تھک کر بیٹھ گئے تھے۔ انھوں نے مجھے سمجھایا کہ دنیا میں ناانصافیوں کا چلن کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نہ دعا قبول ہوگی نہ انقلاب آئے گا۔ بے انصافیاں نظر انداز کرنا یا ان کے ساتھ زندہ رہنا سیکھو' ورنہ آنکھیں بند کر کے زندگی سے گزر جاؤ۔ زندگی سے تو نہیں گزرا لیکن آنکھیں بند کر لیں۔ غصے کی گرد آہستہ آہستہ بیٹھ گئی۔ اندر جو ویکیوم پیدا ہو گیا تھا وہ خلا میں نے آوارگی سے بھر دیا ہے۔ میں آوارہ ہو گیا ہوں۔ آ۔ وا۔ رہ۔''

مقصود میز پر طبلہ بجا کر فلم آوارہ کا گانا ''آوارہ ہوں'' گنگناتا رہا۔ زیب النساء اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کبھی کبھی پرانی چنگاری بھڑکنے لگتی ہے تو اسے بجھا دیتا ہوں۔'' مقصود نے گانا بند کر کے کہا۔ ''میں ایک غریب بستی میں کلینک کرتا ہوں۔ وہاں بیماروں کو دوا خریدنے کے لیے ایک وقت کا فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دن ایک بوڑھی عورت نے دوا کے دس روپے دینے کے لیے پلّو کی گانٹھ کھول کر مڑے تڑے نوٹ نکالے تو ایک روپیا کم تھا۔ اس نے دوپٹے کا دوسرا سرا کھول کر ریزگاری نکالی۔ چار آنے پھر بھی کم تھے۔ بہت عاجزی سے کہنے لگی' چونی اگلے ہفتے دے دوں گی۔ اس کی آنکھوں میں التجائیں تھیں۔ میں کانپ گیا۔ میں نے اس کے پیسے اسے واپس کر دیے۔ جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوشیاں اور ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔ اگلے ہفتے آئی تو اس کی بیمار رہنے والی جوان بیٹی بھی ساتھ تھی۔ دونوں نے دوالی اور دوپٹے کے پلّوؤں میں بندھی ہوئی گانٹھیں کھول کر نوٹ اور ریزگاری گنی اور پورے بیس روپے میری میز پر رکھ دیے۔ میں نے پیسے لے کر دراز میں رکھے اور میز پر نظریں جمائے کچھ لکھنے لگا۔ مجھے بڑھیا کی آنکھوں میں چھپی مایوسی اور شکایت دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔''

''تم اتنے بے حس ہو گئے تھے؟ تمھیں شرم نہیں آئی؟''

''پہلے آتی تھی' اب نہیں آتی۔'' مقصود زیب النساء کا احتجاج نظرانداز کر کے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی بہت کھوکھلی تھی۔ ''گھوڑا گھاس سے کب تک یاری کرے گا۔ مجھے اپنی گاڑی میں پٹرول ڈلوانا تھا۔ کسی کو ڈنر پر لے کر جانا تھا۔''

''اور وہ تمھاری بوڑھی مریضہ؟ اس نے کیا کھایا ہوگا۔''

''بھوکا رہنا اس کا مقدر رہے۔ اسے عادت ہے۔ مجھے استادوں نے یہی سکھایا ہے۔ پروفیسر سلیمی زیور بکوا دیتے ہیں اور پوری فیس لیے بغیر مریض کو آپریشن روم میں گھسنے نہیں دیتے۔ اور وہ ڈاکٹر قربان' کینسر اسپیشلسٹ جو مریض کو دیکھتے ہوئے بھی منہ سے پائپ نہیں نکالتے۔ ان کا علاج کراتے ہوئے جائیداد بک جاتی ہے پھر بھی مریض نہیں بچتا۔ پورا بل لیے بغیر لاش کا چہرہ نہیں دیکھنے دیتے۔ ڈاکٹر رئیس' پتھالوجسٹ جسے میں ڈاکٹر خبیث کہتا ہوں۔ اس نے سول ہسپتال سے پرانی ایکسرے مشینیں خرید کر لیبارٹری لگائی ہے۔ مشینیں کام نہیں کرتیں تو پرانا ایکسرے دے کر رپورٹ بنا دیتا ہے۔ وہ مریضوں کو مار کر چھٹیاں منانے سوئٹزرلینڈ چلے جاتے ہیں جہاں سب کی اپنی اپنی کاٹیج ہے۔ یہ میرے استاد ہیں۔ میرے آئیڈیل!''

''.Shame on you'' زیب النساء جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم جاؤ میں ابھی یہیں بیٹھوں گا۔'' زیب النساء تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کینٹین سے نکل گئی تو مقصود نے آواز لگا کر بیرے سے ایک کڑک چائے کے لیے کہا اور میز پر طبلہ بجا کر گنگنانے لگا۔ ''آوارہ ہوں۔ آوارہ ہوں۔''

دونوں میں چھوٹے چھوٹے معرکے ہوتے رہے' لیکن دوستی بھی بڑھتی رہی۔ اب وہ اکثر ساتھ نظر آتے۔ کالج میں ان کے بارے میں چہ مہ گوئیاں ہونے لگی تھیں۔ مقصود کو پروا نہیں تھی' زیب النساء بھی سرگوشیوں پر کان دھرنے والی نہیں تھی۔ منہ پھٹ تھی اس لیے سب ڈرتے تھے۔ ان سب کا آخری سال تھا' سب مصروف تھے اس لیے سرگوشیاں اونچی نہ ہو سکیں۔ مقصود زیب النساء کے ساتھ اپنا معاملہ آخری مر[illegible]یں لے جانے کی فکر میں تھا۔

وقت کم بچا تھا۔ زیب النساء پڑھائی ختم کر کے واپس امریکہ جانے والی تھی۔ مقصود کا خیال تھا آخری مرحلہ سب سے کٹھن ہوگا لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔

ان کی کلاس پک نک کے لیے پیراڈائز پائنٹ گئی تھی۔ مقصود سمندر کے کنارے بیٹھ کر پورا دن ضائع کرنے والوں میں سے نہیں تھا' زیب النساء جارہی تھی اس لیے ساتھ ہولیا تھا۔ شاید کوئی موقع نکل آئے! اسے معلوم تھا ساحلوں پر پہنچ کر لڑکیاں بے قابو ہو جاتی ہیں۔ اندر کا پنچھی پھڑ پھڑانے اور آبی پرندوں کی طرح چونچیں مارنے لگتا ہے۔ نرم گیلی ریت کا لمس جسم کا درجۂ حرارت بدل دیتا ہے۔ سمندر جادو کر دیتا ہے۔ وہ اپنی شلواروں کے پائنچے اوپر اٹھائے پانی میں داخل ہو کر بے خوفی سے موجوں کو تکتی ہیں جیسے دعوت دے رہی ہوں کہ آؤ ہمیں بہا کر لے جاؤ۔ ان کی چیخیں سمندر کے شور سے مل کر وہ موسیقی پیدا کرتی ہیں جو شاید آدم و حوا کے ملاپ نے پیدا کی ہو۔

لڑکیوں کا ایک ٹولہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں تھا اور چیخیں مارتا ہوا جھاگ اڑاتی موجوں کو ٹھوکریں مار رہا تھا۔ موجیں بھی بے تکلفی پر اتر آئی تھیں اور اپنی حدوں سے تجاوز کر رہی تھیں۔ گیلے لباس نے بدن سے چپک کر جسم کے خطوط اجاگر کر دیے تھے' لیکن انھیں پروا نہیں تھی۔ زیب النساء پانی میں نہیں گئی تھی بلکہ ایک دوسری ٹولی کے ساتھ گیلی ریت پر ٹہل رہی تھی۔ تیراکی کرتے ہوئے کچھ لڑکے موجوں سے گتھم گتھا تھے۔ مقصود خشک ریت پر بچھی دری پر اکیلا بیٹھا سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو تکتے رہنے سے خالی الذہنی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

زیب النساء اپنی ٹولی کا ساتھ چھوڑ کر واپس آئی اور مقصود کے پاس دری پر بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ وہ اسے دیکھے بغیر ساکت بیٹھا رہا۔ سگریٹ ختم ہوا تو پھینک کر زیب النساء کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ریت پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

''تم انھیں دیکھ رہی ہو؟'' مقصود نے موجوں سے کھیلتی ہوئی لڑکیوں کی طرف اشارہ

کیا۔ ''ہوا ان کے بال کس طرح اڑا رہی ہے۔ جیسے اڑتے ہوئے پرندوں کے پر۔ وہ ان پروں کے سہارے پرواز کرتی ہوئی سمندر پار جاسکتی ہیں۔ تمھیں یہ آزادی اچھی نہیں لگتی ؟''

زیب النساء کچھ نہیں بولی' اسی طرح ریت پر لکیریں بناتی رہی۔ مقصود کھڑا ہو گیا۔

''اٹھو! میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں ؟''

''سامنے چٹان کا جو کٹاؤ ہے اس کے پیچھے۔ میں تمھیں آزادی دلاؤں گا۔ ڈرو مت تمھیں آزاد ہوتے ہوئے کوئی نہیں دیکھے گا۔ یہ آزادی صرف تمھاری ہوگی۔''

زیب النساء اسی طرح پاؤں سمیٹے بیٹھی رہی۔

''اٹھو ورنہ سب کے سامنے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لوں گا۔''

زیب النساء نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔ دونوں ان چٹانوں کے پیچھے پہنچے جہاں سے ساحل نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

''اب آزاد ہو جاؤ۔ حجاب اتار دو تاکہ تمھاری زلفیں سمندری ہوا سے باتیں کرسکیں۔ میں چٹان کے دوسری طرف کھڑا ہو کر پہرہ دیتا ہوں۔ کوئی اس طرف آیا تو آواز دوں گا۔ تم دوبارہ قید ہو جانا۔ اعتبار کرو' میں تمھیں جھانک کر نہیں دیکھوں گا۔''

مقصود جواب سنے بغیر چٹان کے دوسری طرف چلا گیا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ دل کی دھڑکنیں ٹک ٹک کرتی ہوئی شاید' شاید کی صدا دے رہی تھیں۔ وہ اپنے نام کی آواز سن کر چونک پڑا۔ زیب النساء اسے آواز دے رہی تھی۔ پتھر کی دوسری طرف گیا تو دیکھتا رہ گیا۔ جادو نے زیب النساء پر بھی اثر کر دیا تھا۔ پتہ نہیں جادو مقصود کا تھا یا سمندر کا یا شاید دونوں کا' زیب النساء کی کھلی ہوئی دراز زلفیں ہوا کے جھونکوں سے پریشان تھیں۔ ہلکے سیاہ بالوں پر سنہری سی دھنک چھائی ہوئی تھی۔ ہوا کی شدت سے کچھ لٹیں بار بار ماتھے پر ہلال بنا رہی تھیں۔ بالوں کے ساتھ چہرہ بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ یہ زیب النساء کا نہیں' زیبی کا چہرہ تھا۔

مقصود زیب النساء کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ''میں تمھارے بالوں کو چھو کر دیکھ لوں؟''

''تم نے انھیں آزاد کیا ہے۔ آج سے یہ تمھارے ہیں۔''

''آئی لو یو زیبی۔'' مقصود نے اس کے ماتھے کی ایک جھولتی لٹ ناک کے پاس لے جا کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

زیب النساء نے کچھ نہیں کہا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرہ گل نار ہو رہا تھا۔

''آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو نا کہ تمھیں بھی مجھ سے محبت ہے۔''

''کہنا ضروری ہے؟'' اس نے سرگوشی کی۔ مقصود نے اسے بانہوں میں لینا چاہا تو پیچھے ہٹ گئی اور اٹھ کر اپنے بال سمیٹ کر حجاب باندھنے لگی۔ ''آؤ واپس چلیں۔ کوئی آ گیا تو تماشا بنے گا۔''

دونوں کے لیے وقت کچھ دیر ٹھہرا رہا۔ واپس ساحل پر آئے تو سب کچھ ایسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ آئے تھے۔ سمندر کا شور۔ لڑکیوں کی چیخیں۔ موجوں سے لڑتے ہوئے تیراک لڑکے۔ ریت پر ٹہلتی ہوئی لڑکیاں۔ حدِ نظر تک پانی کی چادر اور اس پر پھیلا ہوا سورج کا جگ مگ کرتا سونا۔ صرف زیب النساء بدلی ہوئی تھی۔

پک نک سے واپس آنے کے بعد مقصود کو کالج میں کئی دن تک زیب النساء سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ زیب النساء نے خود یہ موقع نہیں دیا تھا۔ دوستوں کے گروپ میں ہوتی یا اسے دیکھ کر غائب ہو جاتی۔ ایک دن مقصود نے اسے دیکھ کر پکڑ لیا۔

''تم مجھ سے بھاگ کیوں رہی ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟ اس دن تم نے خود ہی تو......''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر؟''

''لگتا ہے سب ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ سب کو پتا ہے۔''

''پتا ہے تو کیا ہوا۔ ہم نے محبت کی ہے، چوری نہیں۔''

''شادی سے پہلے چوری ہی ہے۔شادی کے بعد عبادت!''

''شادی؟'' ڈرنے کی باری مقصود کی تھی۔ ''تم مجھ سے شادی کروگی؟''

''کیوں؟ کیا تمھیں شک ہے؟'' زیب النساء نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے شادی کروں گی۔صرف تم سے۔''

''تو آؤ مسجد خضرا چلیں۔امام میرے جاننے والے ہیں۔ابھی ہمارا نکاح پڑھا دیں گے۔''

''مذاق مت کرو۔صرف تین چار مہینے کی بات ہے۔میں شکاگو جا کر امی سے بات کروں گی۔مجھے یقین ہے وہ مان جائیں گی۔ڈیڈی بہت سخت ہیں لیکن امی انھیں منالیں گی۔تم امریکہ آنا ہم وہیں شادی کریں گے۔''

''اس وقت تک اس دل کا کیا ہوگا؟ یہ اگر رک گیا' تھم گیا۔ڈوب گیا؟''

''ڈاکٹر رحیم سے ای سی جی کراتے رہنا۔کچھ نہیں ہوگا۔'' زیب النساء مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

آہستہ آہستہ زیب النساء کا ڈر ختم ہو گیا تو وہ کسی جھجک کے بغیر مقصود سے ملنے لگی۔برآمدے کی سیڑھیوں پر یا کینٹین میں بیٹھ کر زمانے بھر کی باتیں کرتی۔آنکھوں میں ناچتے ہوئے خواب زبان پر آتے تو رکنے کا نام نہیں لیتے۔ایک دن مقصود نے اسے کالج سے باہر ایک ریسٹورنٹ میں کافی پینے پر تیار کر لیا۔بیرا جب بل اور کافی کے برتن سمیٹ کر لے گیا تو مقصود نے کیبن کا پردہ برابر کر کے اس کا حجاب کھول دیا۔زیب النساء نے سر جھٹکا تو بال لہرا کر پیشانی پر بکھر گئے۔مقصود نے بالوں کی لٹ ہاتھ میں لے کر چومی لیکن ہونٹوں کا بوسہ لینا چاہا تو زیب النساء نے اسے اس کی نشست کی طرف دھکیل دیا۔

''ہم یہاں چونچیں لڑانے نہیں آئے۔''

''تم اتنی غیر رومینٹک کیوں ہو؟ چونچیں! مائی گاڈ!''

''یہ یورپیوں کے چونچلے ہیں۔ مامتا کے پیار کو جنسی مظاہرہ بنا دیا ہے۔''

''مامتا کا پیار؟''

''تم کو پتا ہے بوسے کی ابتدا کیسے ہوئی تھی؟''

''مجھے نہیں سننا۔'' مقصود نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

''سننا پڑے گا!'' زیب النساء نے سنجیدہ پوز بنا کر کہنا شروع کیا۔ ''لاکھوں سال پہلے مائیں کھانا چبا کر اپنے منہ سے شیر خوار بچے کے منہ میں ڈالتی تھیں۔ ہونٹوں کا بوسہ ماں اور بچے کے درمیان کھانا کھلانے کا نام تھا۔ پاپوانیوگنی اور افریقہ کے قبیلوں میں پچھلے زمانوں تک بوسے کا یہی کام تھا۔ یورپیوں نے آ کر اسے جنسی کھیل بنا دیا۔ ساؤتھ پیسفک میں مانگیا آئی لینڈ کے رہنے والے جن کی جنسی گرم جوشی مشہور تھی' بوسہ لینا تک نہ جانتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں یورپیوں نے وہاں پہنچ کر انھیں بھی بوسہ باز بنا دیا۔''

''یا خدا!'' مقصود نے جو دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھا تھا' نعرہ لگایا۔ ''ذرا سا پیار مانگا تو ریسرچ کی ہانڈی چڑھا دی۔ سہاگ رات میں گائنا کالوجی پڑھاؤ گی؟''

''شٹ اپ!'' زیب النساء جھینپ گئی۔ ''بڑے ریسرچر بنتے ہو' جواب کیوں نہیں دیتے۔''

''مجھے چیلنج کر رہی ہو' ڈاکٹر مقصود علی قریشی کو جو کے آئی ڈبل ایس Kiss کا اسپیشلسٹ ہے۔''

''بہت تجربہ ہے؟''

''تجربہ نہیں علم! تم مولوی لوگ ہر کام کو یورپ کے کھاتے میں ڈال دیتے ہو۔ بوسے بازی کو یورپیوں نے جنس کا حصہ نہیں بنایا تھا' یہ کام تمھارے ہندوستانیوں کا ہے۔ ساڑھے تین ہزار سال پہلے سنسکرت کے ویدوں میں لکھا گیا تھا کہ عورت مرد ایک دوسرے کی ناک سے ناک رگڑتے تھے۔ چھٹی صدی کی کام ستر بوسوں سے بھری ہوئی ہے۔ بوسوں کی قسمیں تک بیان کی

ہیں۔سنو گی؟'' زیب النساء زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''یورپ میں بوسے کی ابتدا یونانیوں نے کی تھی۔اس کے بعد بوسہ مرکزی یورپ کی زندگی کا ایک ضروری حصہ بن گیا تھا۔کیتھولک چرچ نے اسے گناہ قرار دیا۔فتویٰ دیا کہ بوسے بازی کرنے والے جہنم کی آگ میں جلیں گے' لیکن کیا ہوا؟ جہنم کی آگ سے کوئی نہیں ڈرا۔ یورپ امریکہ میں بوسے بازی کا مظاہرہ سرعام ہوتا ہے۔ ہر شریف مرد و زن یہی کرتا ہے۔ پادری اور ملاّ سیلاب پر بند نہیں باندھ سکتے۔''

مقصود نے زیب النساء کا حجاب اٹھا کر اس کے سامنے لہرایا۔اس نے چھین کر دوبارہ اپنے سر پر باندھ لیا۔ ''تمھیں معلوم ہے بوسے کے ذریعے تقریباً ۲۷۸ قسم کے بیکٹیریا سفر کر کے ایک سے دوسرے کے جسم میں پہنچ جاتے ہیں؟''

''تو کیا......تو کیا......تم شادی کے بعد بھی......''

''شادی کے بعد ہمارے بیکٹیریا بھی ایک دوسرے کے ہوں گے۔'' زیب النساء نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔مقصود کو معلوم تھا اب وہ کچھ کہے اور سنے بغیر باہر نکل جائے گی۔

ایک دن زیب النساء نے خود باہر چل کر چائے پینے کے لیے کہا۔وہ پریشان لگتی تھی۔ کیبن میں آ کر بھی اس نے اپنا حجاب نہیں کھولا اور بیٹھتے ہی دھماکہ کر دیا۔

''میری شادی طے ہوگئی ہے۔ڈیڈی نے پوچھا ہے میں کب واپس آ رہی ہوں۔ شکاگو پہنچتے ہی شادی ہو جائے گی۔''

''تم منع کر دو۔'' مقصود نے دھماکے کا اثر جذب کر کے کہا۔ ''تم بالغ ہو۔امریکی ہو۔ تمھیں حق ہے۔کہہ دو تمھیں کسی اور سے محبت ہے۔تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔''

''ڈیڈی بہت ضدی ہیں۔نہیں مانیں گے۔ پاکستان آ کر مجھے زبردستی شکاگو لے جائیں گے۔''

''کہہ دو فیل ہوگئی ہو' ایک سال اور پڑھنا پڑے گا۔ میں تمھارے فیل ہونے کی

رپورٹ نکلوادوں گا۔''

''کوئی فائدہ نہیں...... وہ دولہا کو لے کر کراچی پہنچ جائیں گے۔'' زیب النساء کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھنے لگی۔ ''تم نے کہا تھا کسی مسجد کے امام تمھارے جاننے والے ہیں؟''

''ہاں! مگر......''

''ہم خاموشی سے شادی کرلیں گے۔ اسلام آباد جا کر ایمبیسی میں تمھارے پیپر فائل کروں گی۔تم امیگریشن ملتے ہی شکاگو آ جانا۔''

''تمھارے ڈیڈی؟''

''تیر کمان سے نکل جائے گا تو کیا کریں گے؟ مان جائیں گے۔ ہنگامہ کریں گے، غصہ کریں گے لیکن ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ ان کا داماد آوارہ نہیں ہے۔ اچھے خاندان کا ہے اور ڈاکٹر ہے۔''

''میں۔ آوارہ ہوں۔ ہوں آوارہ ہوں۔'' مقصود زیب النساء کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر شرارتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گنگنانے لگا۔

''شٹ اپ!'' زیب النساء نے کہا اور مسکرا کر اپنا حجاب کھولنے لگی۔

ایک ہفتے بعد مقصود کے بمبئی ہوٹل والے کمرے میں چند قریبی دوستوں کی موجودگی میں ان کی شادی ہوگئی۔ مقصود کے جاننے والے امام نے نکاح پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ مقصود کا ایک دوست اپنے محلے کی مسجد کے پیش امام کو لے آیا تھا، جنھوں نے نکاح پڑھایا تھا اور خاموشی سے اپنی فیس لے کر چلے گئے تھے۔

ایک مہینے کے اندر مقصود کی یہ دوسری شادی تھی۔

○ ○ ○

مقصود نے جب کلینک شروع کیا تو پہلے ایک کمپاؤنڈر رکھا تھا۔ جلد ہی اسے تبدیل کر

کے ایک نوجوان نرس رکھ لی۔ روزینہ اسی محلے میں رہتی تھی۔ دن میں کورنگی کے سرکاری ہسپتال میں اور شام کو مقصود کے کلینک میں کام کرتی تھی۔ خوش شکل اور سیدھی سادھی تھی۔ چند ہی ہفتوں میں مقصود کی باتوں پر ہنستے ہنستے اس کی بانہوں میں آ گئی۔ جب کھانستے اور کراہتے مریض چلے جاتے اور دروازہ اندر سے بند ہو جاتا تو کلینک میں محبت کے ساز بجنے لگتے۔ دیر تک فضا مترنم رہتی۔ یہ ہنی مون چند مہینوں میں ختم ہو گیا۔ ایک دن کلینک بند ہونے کے بعد روزینہ نے ''میں ماں بننے والی ہوں'' کا دھماکہ کیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ مقصود جو ایسی صورت حال سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا' گھبرا گیا۔

''تمھیں یقین ہے؟''

''ہاں!''

''لیکن کیسے؟ ہم تو احتیاط کرتے تھے۔ پھر بھی......''

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ محلے والے جلوس نکالیں گے' گھر والے ٹکڑے کر دیں گے۔''

مقصود نے یہ مکالمے کتنی بار فلموں میں سنے اور کتابوں میں پڑھے تھے۔ یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ خود ان کا مخاطب ہو گا۔ اس کے بعد جو مکالمے ہوئے وہ بھی ایسے ہی تھے جیسے عشق کی کسی نصابی کتاب سے لیے گئے ہوں۔ اسے بچہ نہیں گرانا تھا' شادی کرنی تھی۔ شادی نہیں ہوئی تو خودکشی کر لے گی' ٹرین کے نیچے آ جائے گی۔ مقصود اسے تسلی دے کر واپس آیا تو سوچ رہا تھا جلد ہی کلینک کسی کے حوالے کر کے بھاگ جائے گا۔

اگلے دو دنوں تک کلینک بند تھا۔ تیسرے دن آیا تو مریضوں کا ہجوم تھا۔ روزینہ خلاف توقع خوش نظر آ رہی تھی۔ سب مریض دوا لے کر چلے گئے صرف عبداللہ قصائی رہ گیا تھا۔ مقصود اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ڈاکٹر صاب! آپ سے سسٹر روزینہ کے بارے میں بات کرنی ہے۔'' عبداللہ

اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''سسٹر روزینہ اپنی بہن کے جیسی ہے۔ میرا چھوٹا بچہ اسی نے جنا تھا۔ وہ کہتی ہے آپ دونوں کو شادی کرنی ہے۔ آپ کو مدد چاہیے۔ مدد میرے مولا کی۔ آپ بولو۔ جو بھی بولو عبداللہ قریشی حاضر ہے۔''

''عبداللہ بھائی! مجھے شادی کرنی ہے لیکن میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں اور ہاسٹل میں رہتا ہوں۔ میں اپنا گھر لے لوں تو اس کے بعد......''

''ڈاکٹر صاب! آپ کو پتا ہے ٹیم نئیں ہے۔ سسٹر روزینہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ کے واسطے اس نے اپنا مذہب بھی چھوڑ دیا ہے۔ مولوی صاب کے ہاتھ پر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر صاب! آپ بھی قریشی، ہم بھی قریشی۔ آپ ہمارے بھائی ہو لیکن یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ ادھر گھٹالا نہیں چلے گا۔'' عبداللہ کے لہجے میں دھمکی تھی۔

''ٹھیک ہے عبداللہ بھائی۔'' مقصود نے سر جھکا کر کہا۔ اسے معلوم تھا آج اس کلینک میں اس کا آخری دن ہے۔ آج کے بعد وہ اس محلے میں نہیں آئے گا۔ ''میں جلد کچھ انتظام کرتا ہوں۔''

''آپ فکر نہ کرو۔ سب انتظام پورا ہے۔ میں نے مولوی صاب کو بول کر رکھا ہے۔ میں انھیں اور گواہوں کو لینے جا رہا ہوں۔ میرا لونڈا ہار اور لڈو لینے گیا ہے۔''

''ابھی؟''

''مولوی صاب بولتے ہیں نیک کام میں دیر اچھی نئیں۔ آپ نے ایک کافر کو مسلمان کیا ہے وہ بولتے ہیں آپ سیدھا جنت میں جاؤ گے۔''

ایک گھنٹے کے اندر اندر مقصود سیدھا جنت میں چلا گیا۔ محلے کے چند آدمیوں کی موجودگی میں محلے کی مسجد کے مولوی نے مقصود اور روزینہ کا نکاح پڑھا دیا تھا۔ سب چلے گئے تو روزینہ اس طرح شرمائی جیسے اسے پہلے بار دیکھ رہی ہو لیکن مقصود کو لگا تھا اس کے جذبے ہمیشہ کے لئے سرد ہو گئے ہیں۔

○ ○ ○

زیب النساء سے نکاح ہو گیا تھا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ نہ ان کے بیکٹیریا ایک ہوئے تھے اور نہ زیب النساء نے اسے گائنا کالوجی پڑھنے دی تھی۔ کالج کا آخری سال تھا۔ سیشن ختم ہونے میں ایک دو مہینے باقی تھے۔ زیب النساء اور مقصود دونوں امتحانوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ امتحان ختم ہوتے ہی انھوں نے مری اور نتھیا گلی میں ایک ہفتہ گزار کر سہاگ رات اور ہنی مون منایا۔ اسلام آباد میں زیب النساء نے امریکی سفارت خانے جا کر اپنے شوہر کی امیگریشن کے کاغذات جمع کرائے اور کراچی آنے کے ایک ہفتے بعد شکاگو چلی گئی۔

مقصود کورنگی کے کلینک کے لیے گاہک تلاش کر رہا تھا۔ روزینہ کا پھولتا ہوا پیٹ دیکھ دیکھ کر اس کی سانس رکنے لگتی۔ روزینہ اس پر نیا مکان لینے کے لیے دباؤ ڈال رہی تھی اور مقصود رسی تڑانے کے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا۔ ایک حادثے کے نتیجے میں یہ موقع خود بخود ہاتھ آ گیا۔

ایک صبح روزینہ اسے تلاش کرتی ہوئی بمبئی ہوٹل پہنچ گئی۔ وہ سخت پریشان تھی۔ ایک دن پہلے مقصود نے کسی بچے کو پنسلین کا انجکشن لگایا تھا۔ بچے کو پنسلین سے الرجی تھی، وہ رات کو مر گیا۔ اس کے ماں باپ سخت مشتعل تھے۔ انھیں پتا چل گیا تھا کہ مقصود پورا ڈاکٹر نہیں ہے۔ وہ پولیس میں کیس کر کے اسے تلاش کر رہے تھے۔ روزینہ چاہتی تھی جب تک معاملہ دب نہ جائے وہ سیالکوٹ میں اس کے رشتہ داروں کے پاس جا کر رہے۔ وہاں اسے کوئی نہیں ڈھونڈھ سکے گا۔

''میں پاکستان میں کہیں بھی جاؤں، پولیس مجھے ڈھونڈھ لے گی۔'' مقصود سچ مچ پریشان ہو گیا تھا۔ ''میں اپنی خالہ کے پاس ہالینڈ چلا جاؤں گا۔''

''میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گی۔'' روزینہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

''ویزا لگوانے میں مشکل ہوگی۔ میرا ویزا پہلے سے لگا ہوا ہے۔'' مقصود نے اسے تھپکیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمھیں جاتے ہی بلوا لوں گا۔ جب تک کلینک چلاؤ۔ اس سے تمھارا خرچ چلتا رہے گا۔ میں کلینک کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر کے جاؤں گا۔ اس وقت

تک ہمارے پیار کی نشانی بھی باہر آ جائے گی۔'' مقصود نے روزینہ کا پھولا ہوا پیٹ سہلایا۔
''ہالینڈ پہنچتے ہی خط لکھوں گا۔''

روزینہ کچھ دیر ہچکیاں لیتی رہی پھر سامان سمیٹنے اور پیک کرنے میں مقصود کی مدد کرنے لگی۔

مقصود ایک ہفتے تک ایک دوست کے گھر چھپا رہا اور پھر کراچی سے تمام معاملات نمٹا کر اسلام آباد چلا گیا۔ اسلام آباد میں کئی دوست تھے' اسے ہسپتال میں ہاؤس جاب لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ تکریم اسے وہیں ملی تھی۔ وہ حجاب نہیں پہنتی تھی' پھر بھی زیب النساء کی طرح تھی۔ شادی کے بغیر ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دینے والی۔ مقصود نے تکریم کو پہلے شادی اور بعد میں والدین کو بتانے والا زیب النساء کا فارمولا سمجھا دیا تھا۔

شکاگو سے زیب النساء کے خط باقاعدگی سے آ رہے تھے۔ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا جیسا زیب النساء نے سوچا تھا۔ اس کے باپ نے بہت ہنگامہ کیا تھا۔ 'کبھی منہ نہ دیکھوں گا' کا ڈائیلاگ بولا تھا اور گھر سے نکال دیا تھا۔ چچا کے گھر رہنے لگی تو باپ نے اپنے بھائی سے بھی تعلقات ختم کر لیے لیکن ماں کے رونے اور سمجھانے پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ زیب النساء کو واپس گھر لے آیا تھا اور گلے لگا کر دیر تک رویا تھا۔ زیب النساء نے یہ خوش خبری بھی بھیجی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس کا باپ نانا بننے کی خبر سے خوش اور داماد سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔

امیگریشن منظور ہونے اور کاغذات آنے میں سال لگ گیا تھا۔ کاغذات ملتے ہی مقصود امریکہ پرواز کر گیا۔ پرواز نیویارک کے لیے تھی۔ فلائٹ پلان میں شکاگو شامل نہیں تھا۔

اس پرواز میں مقصود کی ایئر ہوسٹس محبوبہ بھی ساتھ تھی۔ پی آئی اے سے یہ اس کی آخری مفت پرواز تھی۔ ایک کروڑ پتی سیٹھ سے شادی طے کر کے اس نے ایئر ہوسٹس کی

ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور مقصود کے ساتھ اپنے عشق کا الوداعی جشن منانے نیویارک جارہی تھی۔ جس دن مقصود نیویارک جارہا تھا اسی روز روزینہ اس کی بچی کو گود میں لیے ہالینڈ کے سفارت خانے میں ویزا لینے والوں کی قطار میں بیٹھی تھی۔ اسے اپنے شوہر کو ڈھونڈنا تھا جو اپنی بچی کی شکل دیکھے بغیر ہالینڈ جا کر گم ہو گیا تھا۔

6

نیویارک

تکریم اقوام متحدہ کی عمارت کے نزدیک پہنچ گئی تھی لیکن وہ عمارت ابھی نہیں ملی تھی جہاں اسے جانا تھا۔ اسے چرچ سنٹر کی تلاش تھی جس کی تیسری منزل پر پاکستانیوں کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس نے جلسے کی خبر ایک پاکستانی اخبار میں پڑھی تھی۔ پتہ نوٹ کیے بغیر اخبار پھینک دیا اور اب پچھتا رہی تھی۔

انکل رحمان نے کہا تھا کہ ڈھونڈنا مشکل نہیں ہوگا۔ اقوام متحدہ پہنچ کر کسی سے بھی پوچھے گی وہ بتا دے گا۔ تکریم نے ایک راہ گیر سے پوچھنے کی کوشش کی تھی، وہ کندھے اچکا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے بعد کسی اور سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

مقصود کی بے وفائی نے جو خلا چھوڑا تھا وہ اسے مختلف طرح کی مصروفیات سے بھرنے

کی کوشش کر رہی تھی۔ پڑھائی شروع ہونے میں ابھی کئی ہفتے باقی تھے۔ تکریم کو جب پتا چلا تھا کہ مقصود اسے چھوڑ کر میکسیکو بھاگ گیا ہے' اس کے دوسرے ہی دن وہ سیّد کے تہہ خانے سے انکل رحمان کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئی تھی۔ تکریم نے انکل رحمان کو فون کیا تھا اور انھوں نے اسے اپنا سامان ٹیکسی میں ڈال کر فوراً گھر آنے کے لیے کہا تھا۔ انداز حکم دینے کا تھا۔ اتنی سختی اور اصرار سے نہ کہتے تب بھی تکریم کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔

سرجن رحمان مین ہیٹن میں براڈوے اور ۹۶۔ اسٹریٹ کے پاس ویسٹ اینڈ ایونیو پر رہتے تھے۔ باوردی ڈورمین نے دروازہ کھولا تھا' سامان اندر لے کر آنے میں مدد دی تھی اور انٹرکام پر سرجن رحمان کو فون کر کے تکریم کی آمد کا اعلان کیا تھا۔ شاید یہی وہ سچ مچ کا نیویارک تھا جہاں رہنے کی مقصود باتیں کیا کرتا تھا۔ انکل رحمان سے بات کر کے پتا چلا سچ مچ کا نیویارک یہ بھی نہیں تھا۔

تکریم نے انکل رحمان کو بہت پہلے دیکھا تھا جب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان آئے اور ان کے گھر رہے تھے۔ وہ تکریم کے باپ سے بہت مختلف تھے۔ دیکھنے میں بھی اور طبیعتاً بھی۔ سجاد احمد چھوٹے قد کے' کم گو اور بہت سنجیدہ تھے۔ جبکہ سرجن رحمان دراز قد' خوش باش اور ہر وقت قہقہے لگانے والے۔ تکریم انھیں مشکل سے پہچان سکی۔ دبلا ہونے کی وجہ سے ان کا قد اور لمبا لگنے لگا تھا۔ شاید کئی دن سے شیو نہیں کیا تھا اس لیے ہلکی سفید داڑھی نے پورا چہرہ چھپا لیا تھا۔ مسلی ہوئی کارگو پینٹ اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ تکریم انھیں ان کے قہقہے لگانے کے انداز سے پہچانی تھی۔

''نالائق باپ کی نالائق بیٹی اتنے دنوں سے نیویارک میں ہو مجھے فون تک نہیں کیا۔ سجاد فون کر کے تمھاری خیریت مجھ سے پوچھتا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ اس کی بیٹی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔'' انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''نہیں، نہیں میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ یہ تمھارا پراوٹ معاملہ ہے۔'' انھوں نے آنکھ مار کر ایک اور قہقہہ لگایا۔

''تمھارا باپ کیسا ہے؟ اس کی حب الوطنی کا بھوت اترا یا نہیں۔''

''وہ اچھے ہیں۔ کہوٹہ کی لیب میں ہیں۔ بہت مصروف رہتے ہیں۔''

''مجھے پتا ہے۔ ایٹم بم پھوڑ کر چھوڑے گا' لاشوں کے مینار بنائے گا۔ چنگیز خان کی اولاد...... ایڈیٹ!'' کچھ دیر بعد غصہ کم ہوا تو کہنے لگے۔ ''یہیں رہتا تو اب تک فل پروفیسر ہوتا' لیکن اس پر پاکستان واپسی کا بھوت سوار تھا۔ جانے سے پہلے امریکی پاسپورٹ واپس کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے روکا تھا۔ تمھارا واسطہ دیا تو مان گیا تھا' ورنہ تمھیں بھی امریکہ آنے کے لیے ویزا آفس کے دھکے کھانے پڑتے۔''

تکریم خاموش بیٹھی رہی۔ اسے معلوم تھا دوست کی محبت بول رہی ہے۔ سرجن رحمان نے اٹھ کر ریفریجریٹر سے جوس نکالا اور دو گلاسوں میں انڈیل کر ایک تکریم کو دیا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ تکریم چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔

''تمھیں راز کی بات بتاؤں؟ سجاد کو نہ بتانا۔'' انھوں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ ''آج کل سجاد والا بھوت مجھ پر بھی سوار ہونے لگا ہے' لیکن ڈر لگتا ہے...... واپس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ سب کہیں گے بڈھے کو آخری عمر میں وطن یاد آیا ہے۔''

''کوئی ایسا نہیں سوچے گا۔ سب بہت خوش ہوں گے۔ آپ کا دل چاہتا ہے تو ضرور جائیے۔ ضرور۔'' تکریم پرجوش ہوگئی۔ اسے اچانک کچھ یاد آ گیا۔ ''آنٹی کہاں ہیں؟''

''آنٹی؟ تمھاری آنٹی کو شادی کے ۲۸ سال بعد یاد آیا کہ انھوں نے طلاق نہیں لی تو ان کا امریکی ہونا ثابت نہیں ہوگا۔'' سرجن رحمان نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ ''انھیں شبہ ہو گیا تھا کہ میں اپنی سیکرٹری سے افیئر کر رہا ہوں۔ وہ طلاق اور میری آدھی جائیداد لے کر چلی گئیں۔''

''آئی ایم ساری۔ نینی آپا کہاں ہیں؟''

''نینی فیشن ڈزائنر ہوگئی ہے اور ایسٹ سائڈ کے ایک پینٹ ہاؤس میں اپنے امریکی

شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے، وہ آپ کے اتنے نزدیک ہیں۔''

''نزدیک نہیں بہت دور۔ وہ ایک دوسری دنیا میں رہتی ہے۔'' سرجن رحمان نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا۔ ''وہ کہتی ہے اگر اسے 60th street سے اوپر کی طرف ویسٹ سائڈ میں آتے جاتے دیکھ لیا گیا تو اس کا سوشل پروفائل خراب ہو جائے گا۔ میں بھی اس کا باپ ہوں، اس کی دنیا میں نہیں جاتا۔ کبھی کبھار ہم لنچ پر مل لیتے ہیں، وہ کرسمس سسرال میں اور عید اپنی ماں کے ساتھ مناتی ہے۔ مجھے اب تہوار یاد تک نہیں رہتے۔''

تکریم کچھ نہیں بولی۔ وہ سوچ رہی تھی اس عمر میں تنہائی کا عذاب سہنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔

''نینی کا کمرہ آج بھی اسی طرح ہے جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔'' سرجن رحمان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم اسی کے کمرے میں رہوگی، آؤ تمھارا سامان وہاں رکھ دوں۔''

کمرہ بہت کشادہ تھا۔ باتھ روم بھی متصل تھا۔ ایک کونے میں چھوٹے بڑے ٹیڈی بیئر اور کارنس پر گڑیاں سجی تھیں۔ سائڈ کی میز پر نینی کی مختلف عمروں والی تصویروں کے چھوٹے چھوٹے فریم رکھے تھے، دیوار پر ڈگری لیتے ہوئے اس کی ایک بڑی سی تصویر لگی تھی۔ سرجن رحمان نے ایک کونے میں سامان رکھ کر بستر کے سرہانے رکھی ہوئی گڑیا ہاتھ میں اٹھالی۔

''نینی کی ماں نے یہ گڑیا اس کے لیے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ نینی بڑی ہو کر بھی گڑیا کے بغیر سو نہیں سکتی تھی۔ جب سے فیشن کی دنیا میں گئی ہے، یہ گڑیا آؤٹ آف ڈیٹ ہو کر اپنے گھر واپس آ گئی ہے۔ پچھلی بار ملی تو شکایت کر رہی تھی کہ نیند نہیں آتی۔ میں نے کہا گڑیا لے جاؤ تو کہنے لگی گڑیا نہیں مجھے نیند کی گولیوں کا پرسکرپشن لکھ دیجیے۔'' انھوں نے قہقہہ لگایا اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئے۔

''فریج میں ضرورت کی سب چیزیں بھری ہیں۔'' ڈرائنگ روم میں واپس آ کر اسٹینڈ

سے خاکی رنگ کی بھاری جیکٹ اتار کر پہنتے ہوئے بتانے لگے۔ ''شہر کے اس حصے میں ہر مزے کے ریسٹورنٹ ہیں۔ چائنیز' تھائی' اٹالین' انڈین' افغانی' میکسیکن۔ سب کے Take away مینو دروازے کے پاس دیوار پر لگے ہیں۔ سب کے پاس میرا اکاؤنٹ کھلا ہے۔ بل پر دستخط کر کے کھانا لانے والے کو دو ڈالر ٹپ دینا۔ یہاں ڈبے میں ٹپ دینے کے لیے ایک ایک ڈالر کے کھلے نوٹ رکھے ہیں۔ ہاؤس کیپر صبح نو بجے آئے گی' اس کے پاس چابی ہے۔ میں اسے فون کر کے بتا چکا ہوں۔ تمھاری چابیوں کا سیٹ اس ہک پر ٹنگا ہے۔''

''انکل! آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''کیتھی کے پاس۔ میری سیکرٹری! رات وہیں سو جاؤں گا۔''

''میری وجہ سے......''

''نہیں! مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے اس لیے۔'' وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''رات کو آنکھ کھل جاتی ہے۔ لگتا ہے ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے۔ مر گیا تو پتا بھی نہیں چلے گا۔ لاش سڑ گئی تو بد بو پھیلے گی اور بلڈنگ والے پریشان ہوں گے۔'' انھوں نے قہقہہ لگایا۔

''اکثر راتوں کو کیتھی کے فلیٹ میں سو جاتا ہوں۔ اس نے مجھے الگ کمرہ دے رکھا ہے۔''

تکریم سوچنے لگی آنٹی کا شک غلط نہیں تھا۔

''میں غلط پروفیشن میں ہوں۔ مجھے سرجن نہیں بننا تھا۔'' انھوں نے اپنی آرٹسٹوں جیسی لمبی انگلیوں کو دیکھ کر کہا۔

''ایسا کیوں کہتے ہیں۔ آپ اتنے مشہور سرجن ہیں۔ پپا کہتے ہیں آپ کے ہاتھوں میں جادو ہے۔''

''جادو نہیں خون! دن بھر جسموں کی کاٹ پیٹ کرنے کے بعد میں انسان نہیں رہتا۔ ہر انسانی جذبے سے رشتہ کٹ جاتا ہے۔ دستانے اتار کر پھینک دیتا ہوں پھر بھی ہاتھوں میں

خون بھرا رہتا ہے۔ دوبارہ انسان بننے کے لیے کوشش کرنا پڑتی ہے۔ انسان بنانے میں کیتھی بہت مدد کرتی ہے۔ وہ ایک سمفونی لگا کر اور ریڈ وائن کا گلاس میرے ہاتھ میں دے کر چلی جاتی ہے۔ میں آہستہ آہستہ' جیسے کوئی غائب ہو جانے والی شبیہہ کیمیکل لگاتے ہی ابھرنے لگے' دوبارہ انسان بننے لگتا ہوں۔'' سرجن رحمان نے اپنا ہاتھ ہلایا جیسے جام گھما رہے ہوں۔ ''کیتھی سے میرا افیئر نہیں تھا۔ وہ صرف دوست تھی۔ ایک اچھی دوست۔ طلاق کے بعد میں نے شادی کے لیے پروپوز کیا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کہتی تھی جھوٹ سچ ثابت ہو جائے گا۔''

سرجن رحمان شاید بہت عرصے بعد اپنے دل کا غبار نکال رہے تھے۔

''سجاد کہتا ہے میں پاکستان آ جاؤں تو میری شادی کرا دے گا۔'' سرجن رحمان نے قہقہہ لگایا۔ ''اس نے میرا جوڑا بھی لگا دیا ہے۔ وہ ایک ایسی عورت کو جانتا ہے جسے کلاسیکی موسیقی کا شوق ہے اور جو ریڈ وائن پیتی ہے۔ اپنی امی کو نہ بتانا ورنہ تمھارے گھر میں ایٹمی دھماکے ہونے لگیں گے۔'' سرجن رحمان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تکریم کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سرجن رحمان نے اسے غور سے دیکھا اور جاتے جاتے رک گئے۔ ''یہ پاکستان نہیں امریکہ ہے جو کہنا چاہتی ہے کہو۔ کھل کر کہو۔ میں تمھارا انکل ہی نہیں دوست بھی ہوں۔''

''انکل کیا آپ مجھے پارٹ ٹائم جاب دلوا سکتے ہیں؟''

''کیوں؟ تمھیں پیسوں کی ضرورت ہے تو میں......''

''نہیں! پیسے نہیں! مجھے مصروفیت چاہیے۔''

''تم کیا کر رہی ہو؟''

''کلینکل سائیکیاٹری۔''

''سرجری میں انٹرسٹ ہوتا تو اپنے پاس لگا لیتا۔'' وہ کچھ دیر سوچ کر کہنے لگے۔

''نرسنگ ہوم میں کام کرو گی؟ سوشل ورک والوں کا ایریا ہے، لیکن میڈیکل اور سائیکاٹری کا بیک گراؤنڈ بھی کام آ جائے گا۔''

''میں تیار ہوں، لیکن وہ مان جائیں گے؟''

''ماننا پڑے گا۔'' سرجن رحمان نے قہقہہ لگایا۔ ''میں اس نرسنگ ہوم کا شیئر ہولڈر ہوں۔'' وہ فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر گھمانے لگے۔

تکریم دو دن بعد ڈابس فیری کے نرسنگ ہوم میں کام کرنے لگی تھی۔

○ ○ ○
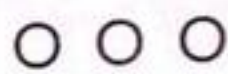
نرسنگ ہوم کی دنیا ہسپتالوں سے مختلف تھی۔ تکریم نے اسلام آباد کے ہسپتال میں ہاؤس جاب کے دوران مریضوں کو اچھا کرنے کے لیے دن رات ایک کیے تھے، کتنی بار موت کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ ہسپتال وہ رزم گاہ تھا جہاں درد و غم اور موت سے لڑا جاتا تھا۔ نرسنگ ہوم موت کی انتظار گاہ تھا۔ وہ سرحد جہاں موت اور زندگی ہم آغوش کھڑی تھیں۔ تھکی تھکی سانسیں کسی بھی وقت اپنا سفر تمام کرنے کے لیے تیار تھیں۔

Weschester کاؤنٹی میں ڈابس فیری Dobbs Ferry کے پرفضا مقام پر دریا کے کنارے بنا ہوا نرسنگ ہوم اندر سے ہسپتال جیسا ہی تھا۔ سامنے ایک بڑے لان کے گرد پھولوں بھری کیاریاں تھیں۔ اونچے اونچے درخت دریا کے کنارے تک چلے گئے تھے۔ پارکنگ لاٹ سے لوہے کا پل صاف نظر آ رہا تھا۔ تکریم کی ٹرین اسی پل سے گزر کر نیویارک سے ڈابس فیری آتی تھی۔ ٹرین اسٹیشن نرسنگ ہوم سے دس منٹ کے پیدل راستے پر تھا۔ تکریم دس بجے پہنچتی تھی۔ اس وقت تک نرسیں وہاں رہنے والوں کو تیار کر کے وہیل چیئر پر بٹھا کر قطار میں لگا دیتیں۔ عجیب منظر تھا، جھریوں والے بے رونق چہرے، گال غاروں کی طرح اندر کو دھنسے ہوئے، آنکھیں ادھ کھلی یا بند، منہ پورا کھلا ہوا۔ صرف دھونکنی کی طرح چلتا ہوا سینہ سانسوں کی

موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ سب کی عمریں اسّی اور نوے کے درمیان تھیں یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ جو کم عمر تھے یعنی ستر، پچھتر کے، ان میں سے اکثر ابھی تک اپنے پیروں پر تھے۔ چھوٹے قد کی ایک بوڑھی عورت جس نے اپنے سر پر سفید بالوں کا بڑا سا جوڑا سجایا اور بہت شوخ میک اپ کیا ہوتا، سب کی خیریت پوچھتی ہوئی ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی۔ کسی سوپ آپیرا کا المناک منظر ہوتا تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر لیتی لیکن منظر بدلتے ہی قہقہے لگانے لگتی۔

تکریم کا کام نرسنگ ہوم کے انھی باسیوں کے ساتھ وقت گزارنا تھا۔ وہ انھیں کتاب پڑھ کر سناتی، ان کے ساتھ کوئی بورڈ گیم، شطرنج، ڈرافٹ یا اسکریبل کھیلتی۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ قہقہے لگاتی یا المیہ مناظر پر ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ وہ ان کی پہیوں والی کرسی دھکیلتی ہوئی انھیں باغ کی سیر کو لے جاتی۔ نرسنگ ہوم کے باسیوں کے لیے یہی وقت سب سے خوش گوار ہوتا۔ رنگ رنگ کے پھول کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں زندگی چمکنے لگتی۔ تازہ خنک ہوا اور ہلکی ہلکی دھوپ سے رخساروں پر لالی کی باریک سی تہہ چڑھ جاتی۔ وہ اپنی زندگی کو پلٹ کر دیکھنے لگتے۔ تکریم کچھ ہی دنوں میں ان کی زندگی کی کہانیوں اور ان کہانیوں کے ایک ایک کردار سے واقف ہوگئی تھی۔ انھیں تکریم سے اچھا سامع مل نہیں سکتا تھا۔ مریضوں کی باتیں صبر، تحمل اور توجہ سے سننا اس کی پیشہ ورانہ مہارت کا حصہ تھا۔

تکریم کو ہنری پورٹر سب سے دلچسپ کردار لگا تھا۔ تکریم صرف چند ہفتوں کے لیے کام کرنے آئی تھی۔ اس کا کام نرسنگ ہوم میں رہنے والوں کا نفسیاتی علاج کرنا نہیں تھا، پھر بھی ہنری کو اپنا مریض سمجھنے لگی تھی۔ کالج شروع ہونے سے پہلے ہی اپنا سبق یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہنری کے بارے میں اسے خبردار کیا گیا تھا کہ وہ Sucidal ہے۔ مرنے کے لیے بے چین ہے، خود ڈاکٹر ہے اس لیے اسے دواؤں اور سرجری کے اوزاروں سے دور رکھا جائے۔ تکریم اسے لے کر باہر کی سیر کرانے گئی تو ہنری نے پہلی ہی ملاقات میں اپنا دل کھول دیا۔ اس کی باتیں ذہانت سے بھرپور لیکن اداس کرنے والی تھیں۔

''سب مجھ سے ڈرتے ہیں کہ میں اپنی جان نہ لے لوں۔'' ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تکریم کو حیرت ہوئی کہ وہ جانتا ہے۔ ''سب گدھے ہیں۔ مجھے خودکشی کرنا ہوتی تو سو طریقے تھے۔ انھیں پتا بھی نہ چلتا' لیکن میں نے زندگی میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا۔ جان بھی سویڈن جا کر قانونی طور پر دوں گا۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جیسے جان لینے کا نہیں ہنی مون کا پروگرام بنا رہا ہو۔

''سویڈن کیوں؟''

''سویڈن میں اجازت ہے۔ بڑھاپے کے عذاب اور درد کی اذیت سے بچنے کے لیے ڈاکٹروں کی مدد سے زہریلا انجکشن لے کر اطمینان کی نیند سویا جا سکتا ہے۔ ویسٹرن آسٹریلیا بھی جا سکتا ہوں' لیکن وہ بہت دور ہے۔ میں نے سویڈن میں سب انتظام کر لیا ہے۔ اگلے مہینے وہاں جاؤں گا اور ڈاکٹر مجھے انجکشن دے کر ہمیشہ کے لیے سلا دیں گے۔''

''آپ کو دوسری دنیا دیکھنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟''

''دوسری دنیا! ہاہاہا......'' ہنسنے کی کوشش میں وہ کھانسا تو تکریم اس کا سینہ سہلانے لگی۔ ''جو کچھ ہے یہی ہے' کوئی دوسری تیسری دنیا نہیں۔'' اس نے کھانسی پر قابو پا کر کہا۔ ''ہے بھی تو مجھے دل چسپی نہیں ہے۔ یہ دنیا کتنی دنیائیں دکھا چکی ہے۔ اتنی جنتیں اور دوزخیں دیکھی ہیں کہ اب جنت کی تمنا ہے نہ کسی دوزخ کا خوف!''

''دوسری دنیا پر یقین نہ رکھنے والے اس دنیا کا ایک ایک لمحہ پکڑے رہنا چاہتے ہیں۔ آپ کیوں......؟''

''ڈارلنگ! لمحہ نہیں وہ اپنی اپنی کرسی کا پہیہ پکڑے بیٹھے رہنا چاہتے ہیں۔'' اس نے کھانسی کے ڈر سے ہنسی روک لی۔ ''تم نے صبح کے وقت ہماری کرسیوں کی قطار دیکھی ہے؟ ہماری پوری زندگی قطاروں میں کھڑے ہوئے گزری ہے۔ ہمیں قطار میں کھڑے ہونے کی عادت ہے۔ آج کل ہم میکڈانلڈ کا برگر یا ٹرین کا ٹکٹ لینے کے بجائے موت کی قطار میں بیٹھے

ہیں۔ موت کا فرشتہ تہذیب سے پہلے کے دور کا ہے۔ وہ قطار کا ڈسپلن نہیں جانتا۔ درمیان سے کسی کو بھی اچک لیتا ہے۔ ہمیں غصہ آ جاتا ہے' یہ کون قطار توڑ گیا! ہاہا......''

ہنری ہنستے ہوئے پھر کھانسنے لگا۔ کھانسی ختم ہوئی تو تکریم نے اسے وہیل چیئر سے اتارا اور کیاریوں کے پاس رکھی ہوئی لکڑی کی بنچ پر بیٹھنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

''آئینہ مجھے دیکھتے ہی حملہ کر دیتا ہے۔ سوال سے میرے ضمیر کا چہرہ کھرچ دیتے ہیں۔'' سانس بحال ہوتے ہی ہنری نے پھر موت کا فلسفہ شروع کر دیا۔ ''میں کیوں زندہ رہوں؟ میرا کیا مصرف اور کیا مقصد ہے؟ خود اپنے کام کا نہیں ہوں تو دوسروں پر بوجھ بن کر کیوں زندہ رہوں؟ ہوا کیوں لے رہا ہوں؟ مجھے آکسیجن استعمال کرنے کا کیا حق ہے؟ کیوں فضا آلودہ کر رہا ہوں؟''

''آپ کا فلسفہ ہے کہ بوڑھوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں' انھیں رٹائر ہوتے ہی مر جانا چاہیے؟ بہت ظالم ہیں آپ!'' تکریم اسے ظالم کہتے ہوئے مسکرائی۔

''یہ فلسفہ نہیں ہے' مجھے فلسفیوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ وہ بے عمل لوگ ہیں۔ میں نے جان لینے کے بارے میں افلاطون سے لے کر کانٹ تک سب کے فلسفے پڑھے ہیں۔ وجودیت پسندوں کو بھی پڑھا ہے۔ امریکہ میں موت کی اخلاقیات پر جو بحث ہو رہی ہے وہ بھی سنی ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ عام انسانوں کی سمجھ میں آنے والی سیدھی سی منطق ہے۔ کامن سینس! جب زندگی سے مصرف' مقصد' سرگرمی' رشتے اور جذباتی تعلق کی سب ڈوریں ٹوٹ جائیں تو سانس کی ڈور بھی کاٹ دو۔ جگہ خالی کرو۔ بہت بھیڑ ہو گئی ہے۔''

''آپ کا کسی سے کوئی جذباتی رشتہ نہیں ہے؟ تعلق کی کوئی ڈور نہیں ہے؟''

''سب ڈوریں ٹوٹ گئیں۔ سب ساتھ چھوڑ گئے۔'' چہرے کی جھریوں میں اداس سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ''میری بیوی مجھ سے زیادہ تیز تھی۔ وہ ہمیشہ زندگی کی فاسٹ لین میں چلتی تھی۔ جس تیزی سے جیتی رہی اسی تیزی سے مر بھی گئی۔ کمرے میں آؤ گی تو اس کی

تصویریں دکھاؤں گا۔'' ہنری کچھ دیر بیوی کی یاد میں کھویا رہا۔ ''میرے دو بیٹے ہیں۔ ان کے بچے اور پھر ان کے بچے۔ شروع میں سب آتے تھے۔ شاید اس ڈر سے کہ میں وراثت بانٹتے ہوئے انھیں نہ بھول جاؤں۔ پھر وہ میرے مرنے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ آہستہ آہستہ آنا کم ہوا۔ صرف کرسمس پر آنے لگے۔ اب کرسمس پر بھی صرف کارڈ آتے ہیں، وہ بھی کسی کسی کے۔ میں نے ان کی تصویریں البم سے نکال کر پھینک دی ہیں۔ انھیں وراثت سے خارج کر دیا ہے۔ سب کچھ چیریٹی کے نام لکھ دیا ہے۔ ہاہاہا......'' ہنستے ہوئے اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ ''انھیں پتا نہیں ہے۔ انھیں یہ بھی نہیں پتا کہ میں زندگی ختم کرنے سویڈن جا رہا ہوں۔''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے گرد پتوں سے مس کرتی ہوا کی سرسراہٹ گونج رہی تھی، جیسے موت کے بھوت کیاریوں میں بیٹھے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

''ہم سب کی یہی کہانی ہے، سوائے اُس کے۔''

تکریم نے اس کی طرف دیکھا جس کی طرف ہنری نے اشارہ کیا تھا۔ وہ ایک خوش لباس شخص تھا۔ عمر پچاس سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ قلمیں اور مونچھیں سفید تھیں۔ براؤن جیکٹ پر خاکی رنگ کا اوورکوٹ، گردن میں فیروزی رنگ کا مفلر، سر پر گہرے نیلے رنگ کی چے گیوبرا کے طرز کی ٹوپی تھی۔ وہ وہیل چیئر دریا کی طرف دھکیلتا ہوا کرسی میں سوار عورت سے مستقل باتیں کر رہا تھا۔ تکریم انھیں روز دیکھتی تھی۔ عورت نرسنگ ہوم میں رہنے والے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بہت کم عمر تھی۔ چالیس پینتالیس سال کی ہو گی۔ رخسار سیبوں کی طرح سرخ تھے۔ پورا جسم صحت مند تھا لیکن گہری سبز آنکھیں بالکل ویران تھیں۔ صرف ان کی حرکت زندگی کا احساس دلاتی تھی۔ آنکھوں کی یہ حرکت پلاسٹک کی ان گڑیوں جیسی تھی جن کی آنکھیں خودکار طور پر دائیں بائیں گھومتی رہتی ہیں۔ تکریم کو پتا تھا وہ brain dead ہے۔ صرف جسم زندہ ہے۔ سوچنے سمجھنے، دیکھنے سننے، محسوس کرنے اور پہچاننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔

اسے حیرت ہوتی کہ وہ شخص گھنٹوں اس سے کیا اور کیوں باتیں کرتا ہے۔

''تم انھیں جانتی ہو؟'' ہنری نے تکریم کو خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ ''والٹر اور جینا ڈیوس! جینا کی کہانی بھی کوئنلن Quinlan جیسی ہے۔ تمھیں کوئنلن کی کہانی معلوم ہے؟''

تکریم نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''ایک حادثے میں کیرن این کوئنلن اس گہری بیہوشی میں چلی گئی تھی جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ وہ صرف لائف سپورٹ سسٹم کی وجہ سے زندہ تھی۔'' ہنری نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بتانا شروع کیا۔ ''اسے صرف اس قدر ہوش تھا کہ روشنی، شور یا درد کی لہر تیز ہوتی تو چہرے کا تاثر بدل جاتا۔ جماہی لیتی، آنکھیں جھپکاتی، منہ بناتی۔ کبھی کبھار بے معنی چیخ بھی نکل پڑتی ورنہ خالی منہ چلاتی رہتی۔ کسی کو پہچان سکتی تھی نہ اسے اپنے اردگرد کی کچھ خبر تھی۔ چھ مہینے جان کنی کی حالت میں رہی، جس کے بعد نیوجرسی کی عدالت نے اسے قانونی طور پر مردہ قرار دے دیا۔ چھ مہینے کی مزید قانونی لڑائیوں کے بعد اس کا لائف سپورٹ سسٹم نکال دیا گیا۔ تمھیں پتا ہے مشینیں نکال لی گئیں تو کیا ہوا؟

''کیا ہوا؟''

''وہ مری نہیں زندہ رہی۔ وہ نہیں، اس کا جسم۔ وہ بہت برسوں تک زندہ رہی۔ قانونی طور پر اور عملی طور پر مر گئی تھی، لیکن قانون اسے زہریلا انجکشن دے کر موت کی نیند سلانے کی اجازت نہیں دے سکا۔ میڈیکل ہسٹری میں وہ اب بھی زندہ ہے۔ Euthnasia کے ہر اہم مقدمے میں اس کی اور نینسی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ نینسی کی کہانی بھی سنو گی؟''

''وہ میں پڑھ لوں گی۔'' تکریم نے جینا اور والٹر کو دیکھا جو دریا کے رخ پر کھڑے تھے۔ والٹر ابھی تک اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی بہت غور سے سن رہا ہو۔ ''جینا کی کیا کہانی ہے۔ وہ سنائیں۔''

''جینا کو بارہ سال پہلے اسٹروک ہوا اور وہ گہری بیہوشی میں چلی گئی۔ دماغ کا آدھا حصہ آپریشن کر کے نکال دیا گیا۔ بہت عرصے مشینوں پر رہی۔ مشینیں نکال دی گئیں، پھر بھی زندہ ہے۔ صرف جسم کی حد تک۔ سب کو پتا ہے کبھی بیدار نہیں ہوگی، لیکن والٹر بارہ سال سے اس لاش کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔''

''کیوں؟''

''اسے یقین ہے کہ ایک دن جینا جاگ جائے گی۔ آج انسان انسان سے نہیں کمپیوٹر کی اسکرین سے جڑا ہوا ہے، لیکن والٹر دنیا کو ایک دو صدی پیچھے لے گیا ہے۔ اس زمانے میں جب وفا نباہنے والے جان پر کھیل جاتے اور تاجِ شاہی کو ٹھوکر مار دیتے تھے۔ والٹر نے اپنا کیریر تج دیا ہے۔ وہ بک ایڈیٹر بن گیا ہے۔ رات بھر کام کرتا ہے اور دن جینا کے ساتھ نرسنگ ہوم میں گزارتا ہے۔ جینا کو ہوش میں لانے کی ساری دنیاوی ترکیبیں آزما چکا ہے۔ اب روحانیت پر مائل ہے۔ ایک دن کسی ہندو سادھو کو لے آیا تھا جو ایک ہفتے دھونی جمائے بیٹھا رہا۔ پچھلے ہفتے مسلمانوں کا کوئی پیر آیا تھا جو تین دن بیٹھا کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتا رہا۔ والٹر کو یقین ہے کہ معجزہ ہوگا اور جینا جاگ جائے گی۔ کوئی اس کی تردید نہیں کرتا۔ سب والٹر سے محبت کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے جینا سے بھی۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں، والٹر جینا کو لے کر سویڈن چلا جائے؟'' تکریم کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی طنز آ گیا تھا۔

''نہیں! کبھی نہیں!'' ہنری زور زور سے سر ہلانے لگا۔ ''وہ دونوں تعلق کی مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ ڈور کوئی نہیں توڑ سکتا۔ کون جانے انسانی دماغ کیا جنجال ہے، کیا پتا جینا سب کچھ سن رہی ہو، سمجھ رہی ہو۔ کیا پتا ایک دن وہ جاگ جائے اور بولنا شروع کر دے۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ہنری بنچ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''مجھے میرے کمرے میں چھوڑ دو۔''

تکریم ہنری کو واپس لے جانے لگی۔ والٹر ابھی تک دریا کے کنارے، وہیل چیئر میں بیٹھی ہوئی جینا سے باتیں کر رہا تھا۔

ہنری نے غلط نہیں کہا تھا۔ نرسنگ ہوم میں سب کی کہانیاں تقریباً ایسی ہی تھیں۔ سب کے رشتوں کی ڈوریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کبھی کوئی کسی سے ملنے آ جاتا تو کئی دنوں تک چرچا رہتا۔ آہستہ آہستہ پھر وہی اداسی طاری ہو جاتی۔ کون کب تک آ سکتا ہے، سب جانتے تھے، پھر بھی منتظر رہتے تھے۔ تکریم نے ہنری کی فائل پڑھ کر فون کرنے شروع کر دیے تھے۔ ایک دن اس کی کوشش بارآور ہوئی اور ہنری کا پوتا اپنی دس سالہ بیٹی کو اس کے پردادا سے ملانے نرسنگ ہوم لے کر آ گیا۔ خود اس کے پاس وقت نہیں تھا، اسے کسی میٹنگ میں جانا تھا اس لیے اپنی بیٹی کو چھوڑ کر اور ہنری سے ملے بغیر چلا گیا۔

دس سالہ ڈیبی آتے ہی ہنری سے گھل مل گئی۔ وہ دیر تک گیمز روم میں Monoplay کھیلتے اور جائیداد خریدنے اور ان کے کرائے دینے پر جھگڑتے رہے۔ باہر کا موسم اچھا ہوا اور دھوپ نکل آئی تو ڈیبی ہنری کو باغ میں لے آئی۔ ہنری اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا ڈیبی کو تتلیاں پکڑتے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ وہ تتلی پکڑ کر ایک شیشی میں بند کرتی اور اسے ہنری کے پاس لے کر آتی۔ ہنری خوش ہو کر تالیاں بجاتا اور پھر تتلی کو شیشے سے نکال کر آزاد کر دیتا۔ ڈیبی کچھ دیر کے لیے جھوٹ موٹ ناراض ہوتی اور پھر دوبارہ تتلیوں کے پیچھے بھاگنے لگتی۔ ڈیبی دیر تک تتلیاں پکڑتی اور ہنری انھیں آزاد کرتا رہا۔ تکریم کسی اور کو وہیل چیئر میں گھما رہی تھی اور دور سے ہنری اور ڈیبی کو کھیلتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ لنچ کا وقت ہوا تو ہنری اور ڈیبی نے اندر جا کر ساتھ لنچ کیا۔ ڈیبی اپنا لنچ گھر سے لے کر آئی تھی۔ لنچ کے بعد نرس ہنری کو آرام کے لیے اس کے کمرے میں اور ڈیبی کو اس کا باپ آ کر لے گیا۔

تکریم کام ختم کر کے واپس جانے سے پہلے خدا حافظ کہنے ہنری کے کمرے میں گئی تو وہ البم میں تصویریں لگا رہا تھا۔

''تم نے ڈیبی کو دیکھا؟'' اس نے تکریم کو دیکھتے ہی مسرت بھری آواز میں کہا۔ ''وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی ہے۔ تم اس کی باتیں سنتیں تو حیران ہو جاتیں۔ اسے میری طرح ڈاکٹر بننا ہے۔ میرے خاندان میں کوئی نہیں بنا۔ مجھے یقین ہے وہ میرا نام روشن کرے گی۔ وہ بہت ذہین ہے۔ کرسمس میرے پاس آ کر منائے گی۔ میں نے سانتا کلاز بننے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کی سالگرہ بھی یہیں ہوگی۔ پورا خاندان آئے گا۔ میرا بیٹا اور پوتا بھی اور......''

تکریم سنتی اور خوش ہوتی رہی۔ ہنری نے ایک بار بھی سویڈن جانے کا نام نہیں لیا تھا۔

O O O

تکریم فرسٹ ایونیو پر کھڑی سوچ ہی رہی تھی کہ دائیں طرف جائے یا بائیں' اتنے میں اسے ملیشیا کی شلوار قمیص میں ملبوس ایک شخص اپنے پاس سے گزرتا نظر آیا۔ چمڑے کی کالی جیکٹ پہنے تھا' جس کے کالر پر اس کے بڑے بڑے بال لہرا رہے تھے۔ تکریم نے سوچا لیڈر ٹائپ ہے' یقیناً پاکستانیوں کے جلسے میں جا رہا ہوگا۔ تکریم نے دوڑ کر سڑک پار کی اور اسے جا لیا۔ تکریم کا خیال غلط نہیں تھا۔ اسے پتا تھا جلسہ کہاں ہے' اسے جلسے میں جانا تھا' لیکن پہلے اسے چند منٹ کے لیے اقوام متحدہ کی عمارت میں کوئی کام تھا۔ تکریم اونچی اور پتلی اینٹ جیسی مستطیل شکل کی اونچی سی عمارت کے باہر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ چاروں طرف کیمرہ بردار سیاح گھوم رہے تھے۔ شیشے کے پار عمارت کی لابی کے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا۔ وہ اس دروازے سے داخل ہوا جو عملے کے ارکان کے لیے تھا اور استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک کو کچھ دے کر واپس آ گیا۔

''آپ اقوام متحدہ پہلی بار آئی ہیں؟'' اس نے تکریم کے ساتھ عمارت سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔ تکریم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں اکثر آتا ہوں...... فاتحہ پڑھنے!''

''فاتحہ پڑھنے؟''

''یہ منافقت کا مقبرہ ہے۔ گوئبلز جھوٹ کو سچ بناتا تھا' اقوام متحدہ سچ کو جھوٹ بنانے کی فیکٹری ہے۔ امریکہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اپنی فتح کے پھریرے لہراتا ہے۔ ہم وہ قراردادیں منظور کرتے ہیں جن کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور سرکاری خرچ پر امریکہ کی سیر کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ میں صرف فاتحہ پڑھ سکتا ہوں۔''

''میں سمجھی تھی آپ اقوام متحدہ میں کام کرتے ہیں۔''

''نہیں! یونیورسٹی میں اقوام متحدہ کے کردار پر ایک سیمینار رہا تھا' اس کی خبر اقوام متحدہ کے صحافیوں کو پہنچانے آیا تھا۔ ابھی جو ڈائیلاگ سنایا ہے وہ اسی سیمینار میں ایک دل جلے مقرر کی تقریر میں شامل تھا۔'' وہ مسکرایا۔ تکریم کو اس کی مسکراہٹ اچھی لگی۔ پورا چہرہ کھل گیا تھا۔

''میں این وائی یو میں پڑھتا ہوں' انٹرنیشنل ریلیشنز میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔ میرا نام ساحل ہے۔''

تکریم اپنے بارے میں بتاتی رہی۔ وہ اس عمارت کے پاس پہنچ گئے جو چرچ سنٹر کہلاتی تھی۔

''کیا آپ بھی صدر ایمان علی کے مخالفوں میں سے ہیں؟'' ساحل نے عمارت میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ نہیں! بالکل نہیں! کوئی ایمان علی کا مخالف کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ایمان علی کے مخالفوں کا جلسہ ہے۔ جن کی عیاشیوں کے وسیلے بند ہو گئے ہیں وہ شور مچانے جمع ہوئے ہیں۔''

''پاگل ہو گئے ہیں یہ لوگ' یہ پاگلوں کا جلسہ ہے۔ کیا آپ بھی......''

''نہیں میں ابھی پاگل نہیں ہوا۔'' ساحل مسکرایا۔ ''میں ہر جلسے میں جاتا ہوں' سب کو سنتا ہوں۔ خود کچھ نہیں بولتا۔''

''کیوں؟''

''کوئی فائدہ نہیں' یا شاید وقت نہیں آیا۔''

''بزدل!'' تکریم نے دل میں کہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ملی تھی' بلند آواز میں نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے سوچا واپس چلی جائے' لیکن پھر کندھے اچکا کر عمارت میں داخل ہوگئی۔

وہ لفٹ سے تیسری منزل پر پہنچے۔ ایک چھوٹے سے ہال میں تیس چالیس لوگ جمع تھے۔ اسٹیج پر درمیان میں صدر کی کرسی پر بیٹھی عورت معتبر نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دائیں جانب ایک نوجوان لڑکی اور بائیں طرف درمیانی عمر کا کھچڑی بالوں والا آدمی تھا۔ تکریم اور ساحل سب سے پیچھے کی خالی رو میں بیٹھ گئے۔ ایک نوجوان اپنا زورِ خطابت دکھا رہا تھا۔

''ایمان علی دو سال کے لیے آیا تھا' آج پورے تین سال ہوگئے۔ اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ نیا آئین بنانا چاہتا ہے۔ نہیں بنا سکتا! آئین کو ہاتھ لگانے کی سزا موت ہے۔ ایمان علی کی سزا بھی موت ہوگی۔ ہم اسے پھانسی پر چڑھا دیں گے۔ پھانسی! پھانسی! پھانسی!......'' مجمع میں سے بھی کچھ لوگوں نے پھانسی پھانسی کے نعرے لگائے۔

''اس کا باپ اس کابینہ میں وزیر تھا جو پچھلی فوجی حکومت نے آئین توڑ کر بنائی تھی۔'' ساحل نے تکریم کے کان میں سرگوشی کی۔ ''صدارت کی کرسی پر جو عورت بیٹھی ہے وہ امریکہ میں سفیر تھی۔ اس کے بھائی پر ڈیفنس کے سودے میں کمیشن لینے کا الزام ہے۔ دوبارہ سفیر بننا چاہتی تھی لیکن ایمان علی نے دھتکار دیا۔''

تکریم کو یقین تھا کہ یہ وہی عورت تھی جو سیّد کے دفتر آئی تھی اور جسے سیّد نے کتیا کہہ کر دفتر سے نکال دیا تھا۔

''اس کے پاس جو مونچھوں والا بیٹھا ہے وہ کروڑوں روپے کھا کر پانچ سال پہلے پاکستان سے بھاگ آیا تھا'' ساحل نے اپنی سرگوشیاں جاری رکھیں۔ ''ایمان علی کا دوست تھا لیکن مجرم کی حیثیت سے اسے پاکستان کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو ناراض ہے۔

کمپیئرنگ کرنے والی لڑکی فوزیہ، بیوروکریٹس کے کھاؤ پیو خاندان کی بیٹی ہے۔ پورا خاندان گرفتاری سے بچنے کے لیے امریکہ بھاگ آیا ہے۔ سب سے آگے کی لائن میں نیلے سوٹ اور پیلی ٹائی والا سندھ کے ایک جاگیردار کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ ہر حکومت میں وزیر ہوتا تھا، لیکن آج کل پریشان ہے۔ اس کے برابر گہرے رنگ کی جیکٹ میں ایڈمرل حق کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ بھی ڈیفنس کے سودے میں پھنسا ہوا ہے۔ تیسری رو میں جو اونچا سا آدمی بیٹھا ہے، اس کا باپ ریٹائرڈ جنرل ہے۔ باپ کے نام پر روزویلٹ ہوٹل میں ڈیرا لگا کر شکار پھانستا تھا۔ آج کل حقہ پانی بند ہے۔ ہوٹل سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ سر پر چارخانے کا رومال باندھے سنہری عینک اور داڑھی والا امریکہ کے ایک چہیتے مولوی کا بیٹا ہے۔ امریکہ میں بیٹھ کر جہاد فنڈ جمع کرتا ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا نہ پوچھ سکتا ہے کہ فنڈ کہاں جاتا ہے۔ اس کے برابر میں اس سے ہنس ہنس کر بات کرنے والا نامی گرامی اسمگلر ہے۔ اسی کے بغل میں ایک اخبار کا مالک بیٹھا ہے جو ان سب کو بلیک میل کرتا ہے۔"

ساحل تکریم کے کان میں سرگوشی کرتا ہوا اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ اس کے پاس سے آتی ہوئی خوشبو اچھی لگ رہی تھی۔ مقرر کی شعلہ بیانی نے انھیں خاموش کر دیا تھا۔ تکریم کا چہرہ ہر جملے پر سرخ ہونے لگتا۔

"ایمان علی نے ہمارا دفاع کمزور کر دیا ہے۔ وہ ایٹمی پروگرام پر سمجھوتا کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ہماری شان و شوکت خاک میں ملا دی ہے۔ ایوان صدر کو کچی بستی کے کسی جھونپڑے میں لے جانے والا ہے۔ اسے قذافی بننے کا شوق ہے۔ اس قذافی کا جو دنیا بھر کا اچھوت ہے۔ قذافی اچھوت نہیں بن سکتا۔ اس کے پاس تیل کی دولت ہے۔ ہمارے پاس کیا ہے؟ ہمارے پاس تیل نہیں ہے، لیکن اس سے بڑی دولت ہے۔ ہماری غیرت! ہماری عزت! ہماری انا! ایمان علی نے ہماری انا پر چوٹ لگائی ہے۔ ہمارے سفارت خانے بھکاریوں کے خیمے بن گئے ہیں۔ ہماری جاگیریں کنگال ہو گئی ہیں۔ سڑکوں پر مٹی کے دیے جلتے ہیں۔

شاہراہیں اداس ہوگئی ہیں۔ اس نے ہمیں کمزور کر دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دشمن ہم پر قبضہ کر لے۔ ایمان علی دشمن سے ملا ہوا ہے۔ وہ غدار ہے۔ غدار! غدار! غدار......'' حاضرین میں سے بھی کچھ لوگ غدار غدار چلانے لگے۔

''آدمی گھٹیا ہے لیکن تقریر اچھی کرتا ہے۔'' ساحل نے پھر سرگوشی کی۔

''بکواس! کتوں کی طرح بھونک رہا ہے۔''

''یہاں سب ایسے ہی ہیں۔ کچھ وقت گزارنے یا شوق میں آ گئے ہیں، باقی اندھے کانے اور چیچک زدہ ہیں۔''

''یہ لوگ امریکہ میں کیا کرتے ہیں، ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے؟''

''باسٹرڈ! انھوں نے بہت لوٹ مار کی ہے۔ ان کا لائف اسٹائل دیکھ کر امریکی بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ لاکھوں ڈالر کا انوسٹمنٹ ہے۔ امریکہ کی شیئر مارکیٹ انھی کی وجہ سے کریش ہوگی۔''

''انشاءاللہ!'' تکریم کے لہجے میں اتنا خلوص تھا کہ ساحل کو ہنسی آ گئی۔

''یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔'' تکریم بہت سنجیدہ تھی۔ ''یہ ڈاکو ہیں، انھیں پھانسی لگنی چاہیے۔ پھانسی! پھانسی! پھانسی!......'' اس کی آواز سرگوشی کی حد سے بڑھ گئی تھی۔ جذباتی ہو کر کنٹرول کھو بیٹھی تھی۔ اگلی نشست سے کسی نے پلٹ کر دیکھا تو خاموش ہوگئی۔ ساحل تکریم کو دل چسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت کمپیئر نے کسی نئے مقرر کو آنے کی دعوت دی۔ مقرر کا لباس اور انداز پاکستانی سیاست دانوں جیسا تھا۔ شلوار قمیص، اونی بنڈی اور بنڈی کی دل والی جیب میں ٹھنسا ہوا سرخ رنگ کا رومال، مدبّر نظر آنے کے لیے گول شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ پہلے اس نے میز پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا، مائک کو اپنے منہ کی سطح کے برابر لایا، چشمہ اتار کر رکھا، بنڈی کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور پھر گلا صاف کر کے پیشہ ورانہ انداز میں تقریر کرنے لگا۔ ''صدر صاحبہ، محترم خواتین و حضرات......''

''یہ سردار کا چمچہ ہے۔'' ساحل نے سرگوشی کی۔ ''سردار جب صدر تھا تو اس کا ایڈوائزر تھا۔ سردار دوبارہ صدر بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور یہ سردار کی امریکی سینیٹروں سے ملاقاتوں کی جھوٹی خبریں چھپوا رہا ہے۔ سردار صدر بنا تو یہ اس بار وزیر لگے گا۔''

''کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔'' تکریم نے کہا اور ایک گہری سانس لے کر ساحل کے پاس سے آتی ہوئی خوشبو سمیٹنے لگی۔ ''کیا سحر ہے اس خوشبو میں۔'' اس نے دل میں سوچا۔

ساحل سرگوشی کرنے کا فن جانتا تھا' آواز آس پاس کی خالی کرسیوں سے آگے نہیں جاتی تھی۔ تکریم نے بھی اس بار آواز آہستہ رکھی تھی' اس لیے کسی نے پلٹ کر نہیں گھورا۔ دونوں خاموش ہو کر تقریر سننے لگے۔

''سردار صاحب نے ایمان علی سے صاف صاف کہہ دیا ہے دوستی الگ' سیاست الگ۔ ایمان علی ملک کو تباہ کرنے کی سازش کر رہا ہے' وہ اس کا حصہ نہیں بنیں گے۔ کبھی نہیں بنیں گے۔ امریکی سینیٹروں نے یقین دلایا ہے کہ وہ جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد میں سردار صاحب کے ساتھ ہیں۔ ایمان علی کا زوال اب قریب ہے۔ پچھلے چودہ برسوں میں پاکستان میں کسی نے لگاتار تین سال حکومت نہیں کی۔ ایمان علی نے تین سال پورے کر لیے ہیں۔ اس کی حکومت اس سے آگے نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی۔''

''نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی۔'' حاضرین نے کورس گایا۔

''چلے گی۔ چلے گی۔ چلے گی۔'' تکریم زیرِ لب گنگنائی۔ ساحل صرف مسکرا کر رہ گیا۔

تقریر کے لیے آنے والی اگلی شخصیت سفید رنگ کی پگڑی اور لمبی سیاہ داڑھی والے مولانا کی تھی۔ انھوں نے ''میری بہنو اور بھائیو'' کہہ کر ایک حدیث سنائی' جہاد کی فضیلت بیان کی اور ایمان علی کو لتاڑنا شروع کر دیا۔

''یہ مولوی ایک مدرسہ چلاتا تھا۔'' ساحل نے ایک بار پھر منہ تکریم کے کانوں سے لگا دیا۔ ''پولیس نے تلاشی لی تو سو سے زیادہ کلاشنکوف' رائفلیں نکلیں۔ ایمان علی نے مدرسہ بند کر

دیا۔ مولوی گرفتاری کے ڈر سے بھاگ کر عمرہ کرنے سعودی عرب چلا گیا اور وہاں سے کسی طرح ویزا لے کر امریکہ آ گیا ہے۔''

''آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟''

''آپ نیویارک میں نئی آئی ہیں، سال گزار لیں، آپ بھی جان جائیں گی۔'' مولانا انھیں سرگوشیاں کرتے دیکھ کر براہ راست ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ دونوں خاموشی سے سننے لگے۔

''میرے دوست غور سے سنیے۔ یہ دنیا کا نہیں دین کا معاملہ ہے۔ یہ سیاستوں کی نہیں عبادتوں کی بات ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ مذاق نہیں ہے۔ اللہ کی راہ میں جان دینے والے شہیدوں کو یاد کیجیے۔ ہمارے غازی دریاؤں، جنگلوں، صحراؤں اور برف کے طوفانوں میں فتح کا پرچم لہراتے آگے بڑھ رہے ہیں، ان کی مشکلوں اور سختیوں کا اندازہ کیجیے۔ ان کی قربانیوں سے کشمیر، فلسطین، چیچنیا، الجزائر، سوڈان، مصر، بوسنیا، کوسووا اور وسط ایشیا کے ہر ملک میں حقیقی اسلامی انقلاب کا پرچم لہرانے والا ہے۔ اسلامی انقلاب کا یہ پرچم پاکستان میں بھی لہرائے گا۔''

صف اول میں بیٹھے داڑھی والے ایک نوجوان نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ جواب میں اللہ اکبر کی گونج سنائی دی۔

''ایمان علی اسلامی انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتا۔ اس نے جہادیوں سے ان کے ہتھیار چھین لیے ہیں۔ دینی مدرسے بند کر دیے ہیں۔ مسجدوں کو اماموں سے خالی کر دیا ہے۔ جہادی فنڈ جمع کرنے والے مرکز توڑ دیے ہیں۔ سرحدوں پر جہادیوں کی آمد و رفت کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ ہمارے غازیوں کو جیلوں میں قید کر دیا ہے، انھیں مصر اور الجزائر کے حوالے کر دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کیوں؟ اس لیے، اس لیے کہ ایمان علی یہودیوں کا ایجنٹ ہے۔ ایجنٹ ہے! ایجنٹ ہے! ایجنٹ ہے!''

حاضرین نے بھی ایجنٹ ہے' ایجنٹ ہے کے نعرے دہرائے۔

مولانا ایمان علی پر گولہ باری کر کے اور حقیقی اسلامی انقلاب کے آنے کی نوید دے کر چلے گئے تو کمپیئر نے، جس نے مولانا کی تقریر کے دوران اپنے سر پر دوپٹا اوڑھ لیا تھا' اعلان کیا۔ ''ہمارے پاس ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے' آپ میں سے کوئی اظہار خیال کرنا چاہے تو مائک پر آ جائے۔''

تکریم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساحل بھی اٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ تکریم واپس جانے کے لیے اٹھی ہے، لیکن تکریم اسے نظر انداز کرتی ہوئی سیدھی مائک کی طرف جانے لگی۔ ساحل سر کھجاتا ہوا بیٹھ گیا۔ جلسے کے شرکاء نے تالیاں بجا کر تکریم کی حوصلہ افزائی کی۔ ساحل تالیاں بجائے بغیر تکریم کو تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اسے پتا تھا کیا ہونے والا ہے۔ تکریم وقتی جوش میں مائک پر پہنچ گئی تھی، لیکن اب خاموش کھڑی تھی۔ شاید اپنے خیالات اور ان کے اظہار کے لیے الفاظ جمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سب نے ایک بار پھر ہمت بڑھانے کے لیے تالیاں بجائیں۔ اس بار ساحل نے بھی زوردار تالیاں بجا کر ساتھ دیا۔ اس نے سوچا جب تک تالیاں بج رہی ہیں ساتھ دینا چاہیے' جب بھگدڑ مچے گی تو دیکھا جائے گا۔

''مجھے تقریر کرنا نہیں آتی۔ میں نے کبھی تقریر نہیں کی۔ میں چاہتی بھی نہیں تھی، لیکن آپ سب کی تقریریں سن کر مجبور ہوئی ہوں۔ سب نے تصویر کا ایک رخ دکھایا ہے' میں آپ کو تصویر کا دوسرا رخ دکھانا چاہتی ہوں۔''

تالیاں بجانے والے حاضرین میں' بھن بھن شروع ہوگئی۔

''آپ پاکستان سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں اس لیے آپ کو صاف نظر نہیں آ رہا۔'' تکریم کا اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہو رہا تھا۔ حاضرین بے چین ہونے لگے تھے۔ ''میں ابھی ابھی پاکستان سے آئی ہوں۔ صدر ایمان علی کی حکومت جو انقلاب لے کر آئی ہے وہ میں نے قریب سے دیکھا ہے۔ پاکستان میں رہنے والے پہلی بار سکھ کا سانس لے رہے ہیں۔ وہ

ایمان علی کو غدار اور دشمن کا ایجنٹ نہیں' نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ غدار اور دشمن کا ایجنٹ کہنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے ملک کو لوٹ کر اس حال میں پہنچایا تھا۔ جو......"

"یہ حکومت کی ایجنٹ ہے' نہیں سنیں گے' نہیں سنیں گے۔" ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر مُکا لہرایا۔ دو تین لوگ اور کھڑے ہو گئے۔ پورے ہال میں شور مچنے لگا۔

"ایجنٹ ہے! ایجنٹ ہے!"

"نہیں سنیں گے' نہیں سنیں گے۔"

صدر کی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے کھڑے ہو کر ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کیا۔ "یہ ڈیموکریٹک لوگوں کا جلسہ ہے۔ اپوزیشن کو بھی بولنے کا حق ہے۔ آپ کو جواب دینے کا ٹائم ملے گا۔ صبر سے کام لیجیے۔" پھر وہ تکریم کی طرف مڑ گئی۔ "بی بی! احتیاط کیجیے' لوگوں کو اشتعال نہ دلائیے۔"

سیاہ فام نسل کا ایک لحیم شحیم گارڈ جس نے نیلے رنگ کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی' شور سن کر ہال کے دروازے پر آ گیا تھا' لیکن حالات کو پر سکون ہوتا دیکھ کر واپس چلا گیا۔

"یہ پاکستان نہیں امریکہ ہے۔ میں اس آزاد ملک کی آزاد شہری ہوں۔ مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" تکریم نے تنبیہہ نظر انداز کر کے غصے سے کہا' لیکن پھر غصے پر قابو پا کر لہجہ نرم کر لیا۔ "میرا مقصد اشتعال دلانا نہیں ہے۔ میں بحث کرنے نہیں' یہ بتانے آئی ہوں کہ ایمان علی نے کیا کیا ہے اور اس کا کیا اثر ہوا ہے۔"

صدر نشین خاتون کے اشاروں' دیوہیکل گارڈ کی شکل' تکریم کے مصالحانہ لہجے اور اس کے امریکی ہونے کے اعلان نے حاضرین کو خاموش کر دیا تھا۔ ساحل نے غلط نہیں کہا تھا' ان میں سے زیادہ تر اندھے اور کانے تھے۔ ان کی اکثریت ٹورسٹ' بزنس یا اسٹوڈنٹ ویزے پر امریکہ آئی ہوئی تھی۔ وہ اپنی حدود جانتے تھے۔ ساحل کو معلوم تھا اب کچھ دیر خاموشی رہے گی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ یہ خاموشی زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔

''ایمان علی نے Status - quo توڑ دیا ہے۔'' تکریم ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ ''فیوڈلزم' بیوروکریسی اور سیاست کے سائیکل کو شارٹ سرکٹ کر دیا ہے۔ طاقت کا توازن بدل کر عوام کے حق میں کر دیا ہے۔ ٹیکسوں کا بوجھ کم کیا ہے' لیکن ملک کی آمدنی بڑھا دی ہے۔ صرف تین سالوں میں لٹریسی ریٹ پانچ فیصد بڑھ گیا ہے۔ پہلی بار ایسا جمہوری ڈھانچہ دیا ہے جو ملک میں سچ مچ کی جمہوریت قائم کر دے گا۔ پہلی بار فوج میں ریفارمز ہوئی ہیں' فوج ایک گلے سڑے ہوئے نظام کی نہیں' عوام کی حفاظت کرنے والی طاقت بن گئی ہے اور اس نے پہلی بار شہری حکومت کا اختیار دل سے تسلیم کیا ہے۔ ملک کی سرحدیں مضبوط کی ہیں' کلاشنکوف کلچر کی کمر توڑ دی ہے۔ پہلی بار ایگری کلچرل سیکٹر کی آمدنی جاگیرداروں کی عیاشیوں کے بجائے ملک کی ترقی پر خرچ ہو رہی ہے۔ آپ کو پتا ہے صدر ایمان علی نے ناممکن کو ممکن کیسے بنایا؟''

تکریم خاموش ہو کر ایک ہاتھ سے اپنے بلاؤز کا کالر مسلتی ہوئی حاضرین کو دیکھنے لگی' شاید ان میں سے کوئی اس کی مشکل آسان کر دے اور اس کی جگہ آ کر وہ سب کچھ کہہ دے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔ اس نے ایک نظر سب سے پچھلی صف میں بیٹھے ہوئے ساحل پر بھی ڈالی۔ اسے خاموش بیٹھا دیکھ کر دل میں بزدل کا لفظ گونجا تھا۔ اس نے گہری سانس لی تو ساحل کے پاس سے آتی ہوئی خوشبو یاد آئی۔ دل صاف ہو گیا جیسے ہوا نے گرد اڑا دی ہو' یا سمندر کی لہر ساحل کا کچرا سمیٹ کر لے گئی ہو۔

''میں بتاتی ہوں' ایمان علی نے ناممکن کو ممکن کیسے بنایا۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد تکریم کی تقریر پھر شروع ہو گئی۔ اس نے ایمان علی کے کارنامے بیان کرنے شروع کر دیے۔

ساحل پہلے سے معتقد تھا' نہ ہوتا تو تکریم کو سن کر ایمان علی کا کلمہ پڑھنے لگتا۔ تکریم کا انداز سادہ اور دل میں اترنے والا تھا' لیکن ساحل کے دل میں تو خود تکریم اترتی جا رہی تھی۔ دل خالی تھا' تکریم کو سمانے کے لیے جگہ بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کچھ سن نہیں رہا تھا' صرف تکریم کے ہونٹوں کی جنبشیں دیکھ رہا تھا۔ ہر لفظ زبان پر آنے سے پہلے پڑھ سکتا تھا۔

تکریم کا چہرہ تھا بھی کتاب کی طرح۔ گردن ایسی جسے شاعر صراحی دار کہا کرتے ہیں، گورا رنگ جو اس کے آباؤ اجداد شاید اصفہان یا بدخشاں سے لائے ہوں گے۔ ناک منگولی حسب نسب کی چغلی کھا رہی تھی۔ ہلکی بھوری آنکھیں، اونچی پیشانی، بغیر مانگ نکالے پیچھے سمٹے اور صرف شانوں تک پہنچے ہوئے بال جن میں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد انگلیوں سے کنگھی کرنے لگتی۔ یہ شاید اس کی عادت تھی۔ ساحل کے پاس بیٹھی تھی تو اس وقت بھی بار بار اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

ساحل تکریم کا genetic map بنانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ چہرے کا تاثر بدلتے ہی کسی دوسرے بَرِاعظم کی ہو جاتی۔ غصے میں آئی تھی تو چنگیز خان کی تلوار بن کر چمکنے لگی تھی۔ نرمی آئی تو چہرہ صحرائے عرب کا نخلستان بن گیا تھا۔ اداسی کے ساتھ ہی چہرے پر یورپ کے سرد موسم کی سانولی شام پھیل گئی تھی۔ ساحل کا خیال تھا محبت کرتی ہوگی تو چہرے پر تاج محل کھل اٹھتا ہوگا۔ موسم کوئی بھی ہو چہرے کی کشش میں کمی نہیں آئی تھی۔

ساحل دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ گھنٹے بھر پہلے ملا تھا اور اس کے چہرے پر شاعری کرنے لگا تھا۔ وہ تکریم کی تقریر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایمان علی کے کارنامے بیان کرتے ہوئے اس کے لہجے میں روانی آ گئی تھی۔ ماحول میں کشیدگی اور تناؤ تھا۔ ایمان علی کے مخالفوں کے صبر کا پیمانہ کسی وقت بھی چھلک سکتا تھا۔ ساحل نے سوچا تکریم کی ہر بات صحیح تھی، لیکن سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں ہوا تھا جس سادگی سے وہ بیان کر رہی تھی۔ حکمران طبقوں کی کمر توڑ کر انھیں اپنی پیٹھ سے اتارنا آسان نہیں تھا۔ ایمان علی کے نئے پاکستان کا پہلا سال شورشوں اور ہنگاموں کا سال تھا۔ امریکہ میں رہتے ہوئے بھی ساحل کو ایک ایک تفصیل یاد تھی۔

7

نیا پاکستان

ایمان علی نے بیک وقت کئی شیروں پر سواری کی تھی۔ نوکر شاہی' فوج شاہی'
جاگیرداری' مذہبی جنونیت' سب سے ایک ساتھ نمٹنے کی کوشش کی تھی۔ دوستوں نے کہا تھا آہستہ
آہستہ۔ ایمان علی نے ان کی بات نہیں مانی تھی۔ اسے آہستہ چلنا نہیں آتا تھا۔ اس نے کہا تھا
سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ سب پر ایک ساتھ' فوری اور سنبھلنے کا موقع دیے بغیر حملہ
کرنے کی ضرورت ہے۔ جو طوفان اٹھنے ہیں ایک ساتھ اٹھ جائیں۔ بار بار گرد اٹھتی رہی تو
مطلع کبھی صاف نہیں ہوگا۔ خراب ہونے والی نسوں کو ایک ہی بار سینہ چیر کر بدلنے کی ضرورت
تھی۔ بار بار کے آپریشن سے دل کمزور ہوسکتا تھا' رک سکتا تھا' مریض مر سکتا تھا۔ ایمان علی جانتا
تھا اچانک حملہ کر کے دشمن کو حیران کرنے کی حکمت عملی سے دشمن کی صفیں بکھر جائیں گی' اس کا

جوابی وار کاری نہیں ہوگا۔

ایمان علی نے نئے پاکستان کا منصوبہ فائلوں میں سجانے کے لیے نہیں بنایا تھا۔ صدارت صرف صدر بننے کے لیے نہیں' ایک نیا پاکستان بنانے کے لیے حاصل کی تھی اور صدارت کے عہدے تک پہنچانے والوں سے مکمل اختیارات لیے تھے۔ اختیار دینے والے نئے پاکستان کے منصوبے پر مکمل ایمان رکھتے تھے۔ انھوں نے منصوبے کے ایک ایک جزو پر گھنٹوں بحث کی تھی۔ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مریض کی صحت کے لیے کڑوی گولیاں نگلنا ضروری ہیں۔ اطمینان حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ کڑوی گولیاں بااختیار لوگوں کو خود نگلنا تھیں۔ ایمان علی کی گولیاں عام لوگوں کے لیے نہیں' ان کے لیے تھیں جو عوام کو کڑوی گولیاں کھلا کر آپس میں مٹھائیاں بانٹتے اور کھاتے رہے تھے۔ اختیار دینے والوں کو یہ اطمینان بھی حاصل کرنا تھا کہ ایمان علی اختیار استعمال کرنے کا ہنر جانتا ہے یا نہیں؟ اس کی ٹیم کتنی اہل ہے؟ ڈٹی رہے گی یا طوفان اٹھتے ہی بھاگ جائے گی؟ انھوں نے سوچ سمجھ کر اور ہر طرح تسلی کر کے ایمان علی کو اختیار دیا تھا اور نئے پاکستان کی طاقت بن گئے تھے۔

طاقت کی بنیاد اقتدار مافیا کا ٹوٹا ہوا گروپ تھا جو حکومتیں توڑنے اور بنانے کا کھیل کھیلتا رہا تھا اور اب اپنے گناہوں کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ گروپ کا سربراہ اور نوکر شاہی کا بے تاج بادشاہ کرم قریشی' جاگیرداروں کا جاگیردار فلک پیر' خفیہ ایجنسیوں کا ماہر شفیع رضا' سیکیورٹی کے امور کا ماہر جنرل سعید ملک اور اسلحے کا سب سے بڑا تاجر عارف علی' یہ سب تھے لیکن اقتدار مافیا کے اس گروپ سے زیادہ بڑی اور ایمان علی کی اصل طاقت فوج کا سربراہ جنرل منصف خان تھا۔ جنرل منصف نئے پاکستان پر اس حد تک یقین رکھتا تھا کہ ایمان علی نہ ہوتا تو وہ خود نئی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کرتا۔ تجویز پیش بھی ہوئی تھی کہ جنرل منصف کو صدر بنا کر سامنے رکھا جائے تاکہ کسی کو مخالفت کی جرأت نہ ہو اور ایمان علی جنرل منصف کی ٹیم کے طور پر نئے پاکستان کی تعمیر کرے۔ ایمان علی سے پہلے خود جنرل منصف نے منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا

نئے پاکستان کا چہرہ فوجی ہو جائے گا اور اسے ملک میں اور ملک سے باہر اعتبار حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ ایمان علی جنرل منصف کے رِٹائر ہونے سے پہلے نئے پاکستان کا ایجنڈا مکمل کرنا چاہتا تھا۔ ضروری نہیں تھا نیا آنے والا بھی جنرل منصف کی طرح نئے پاکستان پر اس حد تک ایمان رکھتا ہو۔

سب سے مشکل کام فوج کی اصلاح کرنا تھا۔ فوج کی اصلاح کا ایجنڈا ناممکن اور خواب قرار دیا گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ فوج اصلاحات پر تیار نہ ہوگی، لیکن ایمان علی نے جنرل منصف کی مدد سے یہ ناممکن کام کر دکھایا تھا۔ اس نے غلامی کی نوآبادیاتی دور کی مٹی میں اٹی ہوئی فوج کی گرد جھاڑ کر اسے آزاد پاکستان کی فوج بنا دیا تھا۔ جنرل منصف نے ہر کام ضابطے اور ترتیب کے ساتھ کیا تھا۔ حاضر اور رِٹائر جنرلوں پر مشتمل ریفارمز کمیشن بنایا تھا جس نے اصلاحات کی پرانی سفارشوں کو کھنگالا تھا۔ فوج کی صفیں اور اس کے ادارے کو نئے سرے سے منظم کرنے کے لیے نئی اصلاحات تیار کی تھیں۔ بھرتی کے قواعد اور تربیت کے مراکز بدل دیے تھے۔ نیا ضابطۂ اخلاق بنا تھا۔ جنرل منصف نے ایک کام فوری کیا تھا' اس نے بیٹ مین کا نظام ختم کر دیا تھا۔ فوجی افسروں کو ان کے جوتے پالش کرنے اور پیٹیوں کے بکل چمکانے کے لیے جو دو دو فوجی دیے جاتے تھے وہ واپس لے لیے تھے۔ اس نے کہا تھا اسے جوتے پالش کرنے اور فوجی افسروں کی بیگمات کا حکم ماننے والی فوج نہیں چاہیے۔ امریکہ کے فوجی افسر اپنے جوتے خود صاف کر سکتے تھے تو ایک غریب ملک کے فوجی افسروں کو کیوں شرم تھی۔ سپاہی غلامی کے بندھن سے آزاد ہو کر خوش ہوئے تھے۔ ان کے لیے جوتے صاف کرنے کے بجائے اپنے شہر کی گلیاں صاف کرنا زیادہ فخر کی بات تھی۔ پاکستان کی فوج اس ڈھانچے سے باہر نکل آئی تھی جو لارڈ اولیور کرامویل نے ۱۶۴۵ء میں فیوڈل عہد کی برطانوی فوجوں کے لیے بنایا تھا۔

ایمان علی کو ملک کے منظمِ اعلیٰ کے تمام اختیارات حاصل تھے۔ وہ اب آئینی طور پر ہی

نہیں عملی طور پر بھی فوج کا سپریم کمانڈر تھا۔ اسے فوج کی اعلیٰ کمان میں تبدیلی اور تقرری کا اختیار تھا۔ اس نے پالیسیوں پر حکومت کا کنٹرول مستحکم کیا تھا۔ کشمیر، ایٹمی پروگرام اور دفاع کی پالیسیوں پر فوج کی اجارہ داری ختم کر کے فیصلے کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ملک کے آئینی، عدالتی اور انتظامی اداروں میں کام کرنے والے فوجی افسروں کو فوج میں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ سرکاری خزانے سے ایک وقت میں ایک تنخواہ لینے کا اصول سختی سے نافذ کر دیا گیا تھا۔ سرکاری نوکری کرنے والے رِٹائر فوجیوں کو پنشن سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ شہری انتظامیہ میں عہدہ حاصل کرنے والے حاضر فوجی افسروں کو بھی فوج سے ملنے والی تنخواہ اور سہولتیں چھوڑنا پڑی تھیں۔ فوجی افسر شہری انتظامیہ سے الگ ہو کر اپنی صفوں میں واپس جانے لگے تھے۔ جو رِٹائر ہو چکے تھے، پرائیویٹ سیکٹر میں ملازمتیں تلاش کر رہے تھے۔

مشیروں نے کہا تھا کہ سرکاری کارپوریشنوں کے انتظام پر فوج کے افسروں کو قائم رکھا جائے۔ ایمان علی نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا ڈسپلن اور مینجمنٹ دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ فوجی افسر مارکیٹنگ، بازاری معیشت اور کاروباری مصلحتیں نہیں سمجھتے۔ وہ صرف ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں۔ ان میں وہ لچک اور وژن نہیں ہوتا جو صنعتی اور تجارتی ادارے چلانے کے لیے ضروری ہے۔ ان کی تربیت شہری دفتروں کی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے نہیں، میدانِ عمل میں کام کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ ایمان علی نے ان سے میدانوں میں کام لیا تھا۔ وہ سڑکیں بنانے اور نہریں کھودنے کے کام میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ سیکیورٹی کے اندرونی نظام کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے گلیاں، سڑکیں، بازار، گھر اور عبادت گاہیں محفوظ ہو گئی تھیں۔ نئے پاکستان کے جو خطوط نکھر رہے تھے ان میں فوج کی کارکردگی بھی نمایاں تھی۔ فوج کو عوامی محبتوں کا مرکز بنانے کے لیے کسی اشتہاری مہم کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

فوج کے لیے اصلاحات کا عمل اور اختیارات اور سہولتوں سے محروم ہونا آسان نہیں

تھا۔فوج نفسیاتی طور پر خود کو ملک کا حکم ران اور حکومت کرنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ یہ ذہنیت کئی دہائیوں کی پیدا کردہ تھی۔اس کی حالت انیسویں صدی کے جرمنی کی تھی جس کی فوج ملک کے وسائل سے زیادہ پھیل گئی تھی اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جرمنی ایک فوج ہے جس کے پاس ایک ملک ہے' نہ کہ ایک ملک جس کے پاس فوج بھی ہے۔حاکمیت کے یہ انداز بدلنا مشکل ثابت ہوا تھا۔جنرل منصف نے نرمی اور سختی دونوں طریقے آزمائے تھے۔ایک ایک رجمنٹ اور ایک ایک میس میں جا کر سمجھایا تھا کہ اصلاحات کیوں ضروری ہیں۔ملک جس حالت میں تھا اس کا چہرہ دکھایا تھا' اعداد وشمار بتائے تھے' گراف دکھائے تھے جو تیزی سے نیچے جا رہے تھے۔ سمجھایا تھا کہ انگلیاں اٹھا کر الزام دینے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت ہے۔آپریشن تکلیف دہ ہے لیکن مریض کو بچانے کے لیے ضروری ہے۔سب کچھ اسی طرح چلتا رہا تو بچانے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔ جنرل منصف نے بہت تحمل سے اختلاف کی آواز سنی تھی' بہت نرمی سے جواب دیے تھے۔لیکن جب اصلاحات پر عمل شروع کیا تھا تو رویے کی نرمی غائب ہو گئی تھی۔خلاف ورزی پر کورٹ مارشل کا حکم تھا۔ساتھی جنرلوں سے کہا تھا اگر انھیں اختلاف ہے تو وہ رِٹائرمنٹ لے سکتے ہیں۔سب سر جھکا کر اپنے سپہ سالار کی قیادت میں اصلاحات کا عمل پورا کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔پاکستان کی فوج اپنے جس ڈسپلن کی وجہ سے مشہور تھی اس کی وجہ سے یہ مشکل مرحلہ طے پا گیا تھا۔فوج میں بے چینی کی خبریں صرف اخباروں میں چھپی تھیں' حقیقت نہیں بن سکتی تھیں۔

سب سے زیادہ ہنگامہ اس وقت ہوا جب ایمان علی نے دفاعی بجٹ میں ایک دو نہیں دس فیصد کمی کر دی تھی۔اس نے فوج کا ایک سپاہی بھی کم نہیں کیا تھا۔کہا تھا وہ بے روزگاری بڑھانے نہیں' کم کرنے آیا ہے۔اس نے ایٹمی پروگرام اور ایٹمی ہتھیاروں کو لے جانے والا میزائل پروگرام برقرار رکھا تھا لیکن فوج کا ہارڈ ویئر کا بجٹ کم کر دیا تھا۔ بھاری اسلحے کی خریداری میں پیسہ بچایا تھا۔ملکی دفاعی پیداوار پر انحصار بڑھانے اور باہر سے سستا اسلحہ خریدنے

کی پالیسی اپنائی تھی۔ شور مچا تھا کہ ایمان علی نے ملک کا دفاع کمزور کر دیا ہے۔ ایمان علی کا کہنا تھا کہ روایتی جنگ میں دشمن سے نہیں جیتا جا سکتا۔ پچھلی کئی جنگوں کا یہی سبق تھا۔ دشمن کی معیشت کا سائز بڑا تھا۔ اس سے اسلحے کی دوڑ میں بھی مقابلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک طرف ایمان علی دشمن سے صلح کر کے اسے دوست بنانے کی کوشش کر رہا تھا' دوسری طرف اس نے چین سے دفاعی معاہدہ کر کے جنگ کی صورت میں پاکستان کا ساتھ دینے کی ضمانت حاصل کی تھی۔ بڑی طاقتوں سے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ دشمن کو پاکستان پر حملہ کرنے سے باز رکھیں گے۔ ایمان علی نے کہا تھا دشمن نے دوست بن کر دغا دی' بڑی طاقتیں دشمن کو حملہ کرنے سے نہ روک سکیں اور دوست مدد کرنے نہیں آئے تو ہم اپنی انشورنس پالیسی استعمال کریں گے۔ ایٹمی جنگ چھیڑ دیں گے' ماریں گے اور مر جائیں گے۔

نوکر شاہی پر قابو پانا مشکل نہیں ہوا تھا۔ اس کی لگام کھینچنے کا کام کرم قریشی کے سپرد تھا۔ فوج کو شہری انتظامیہ سے الگ کیا تو نوکر شاہی خوش ہوئی تھی۔ انھیں اپنے سر پر بندوق تان کر کھڑے ہوئے فوجی افسر پسند نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا ان کی حکم رانی کا زمانہ واپس آ گیا ہے' لیکن جب ایمان علی نے ان کے گرد لپٹا ہوا سرخ فیتے کا جال کھولنا شروع کیا تو بے چین ہونے لگے۔ ایمان علی کو تھکی ہوئی اور فائلوں میں پھنسی ہوئی نوکر شاہی نہیں چاہیے تھی۔ کرم قریشی نے ان کی کارکردگی بڑھانے کے لیے کام کے طریقے بدل دیے تھے۔ وہ فائلوں کی جس لمبی زنجیر میں بندھے تھے' اسے توڑ دیا تھا۔ ایک تازہ دم نوجوان بیوروکریسی بھرتی کی تھی۔ ملک میں آئی ٹی کے ماہرین کی کمی نہیں تھی' وہ ملک کو دنیا کی رفتار سے ہم آہنگ کرنے کے کام میں لگ گئے تھے۔

نوکر شاہی کو اپنے اخراجات کی کمی سے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ ان کے الاؤنس کم اور گاڑیاں چھوٹی ہو گئی تھیں۔ ان سے ڈرائیور اور گھروں میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین واپس لے لیے گئے تھے۔ ملک کا صدر بھی چھوٹے گھر میں رہتا اور چھوٹی گاڑی استعمال کرتا تھا'

اس لیے ان کے پاس شکایت کا جواز نہیں تھا۔ ایمان علی نے جب غیر ضروری سفارت خانے بند اور باقی رہ جانے والے سفارت خانوں کا عملہ اور ان کی سہولتیں کم کیں تو اسے سمجھایا گیا تھا کہ وزارت خارجہ ناراض ہو جائے گی' ان سے کام لینا مشکل ہو جائے گا۔ ایمان علی کا ایک ہی جواب تھا' جسے اصلاحات قبول نہیں اور جو نئے حالات میں کام نہیں کرنا چاہتا وہ ملازمت چھوڑ سکتا ہے' اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ایمان علی کا کہنا تھا تیں سالوں سے وزارت خارجہ کا چارج وزارت خارجہ کی نوکر شاہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر تک اسی کے تھے۔ لیکن انھوں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جس پر وہ فخر کر سکیں اور جس کی وجہ سے ان کا نخرہ برداشت کیا جا سکے۔ پاکستان بتدریج سفارتی میدانوں میں تنہا ہو گیا تھا۔ صرف وہی دوست رہ گئے تھے جنھیں اپنے کسی مفاد کے لیے پاکستان کی ضرورت تھی۔ سفارت کار پاکستان کا امیج بہتر کر سکے نہ اس کی تجارت کو فروغ دے سکے تھے۔ غیر ملکی سرمایہ کاری بڑھنے کے بجائے ۷۵ فیصد کم ہو گئی تھی۔ ایمان علی کو یہ صورتِ حال بدلنا تھی۔ نیا پاکستان بنانے کے لیے ملک میں تازہ دم نوجوانوں اور ان کے ساتھ باہر سے پڑھ کر آئے لوگوں کی کھیپ موجود تھی۔ غیر ممالک میں کام کرنے والے بہت سے ماہرین وطن واپس آنا چاہتے تھے۔ رضا کارانہ طور پر کام کے لیے ریٹائرڈ افسروں کی قطار بھی لگی تھی۔ لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ ایمان علی نے احتجاج کرنے والوں کے تبادلے کر دیے یا انھیں فارغ کر دیا تھا۔ جراحت کے لیے چیرا لگانا ضروری تھا۔

جنرل سعید ملک کو امن و امان قائم کرنے کی ذمہ داری دی تھی۔ اس نے فوج کی مدد اور اپنے آہنی ہاتھ استعمال کر کے ملک کو اسلحے سے پاک کرنے کے لیے بے رحمانہ آپریشن کیا تھا۔ چپہ چپہ کھود کر اسلحہ برآمد کیا تھا۔ سرحدیں اس طرح سیل کی تھیں کہ ایک پستول بھی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ سب سے مشکل کام مذہبی جنونیوں اور فرقہ پرستوں کو غیر مسلح کرنا تھا۔ جنرل سعید ملک اسلام کے نام پر بلیک میل نہیں ہوا تھا۔ اس نے مذہبی تنظیموں کے دفاتر' مراکز اور مدارس پر چھاپے مار کر اسلحہ برآمد کیا تھا۔ کڑا فوجی پہرہ لگا دیا تھا۔ ایمان علی کے خلاف فتوے جاری

کرنے والی فیکٹریاں جنرل سعید ملک کے خلاف فتویٰ جاری نہیں کرسکی تھیں۔ سخت گیری کے ساتھ بوڑھے جنرل کی مذہب سے گہری عقیدت پورے ملک میں مشہور تھی۔

ایمان علی نے جنرل سعید ملک کے مشورے پر دینی مدرسوں کو سرکاری تحویل میں لیا تو ملک میں طوفان آ گیا تھا۔ دوستوں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی' آہستہ آہستہ' لیکن ایمان علی کو جنرل سعید ملک پر بھروسہ تھا۔ جنرل نے روسی فوجوں کے خلاف افغان مجاہدین کی جنگ کے دوران اسلامی گروپوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور رِٹائر ہونے کے بعد بھی ان سے تعلق رکھا تھا۔ اسے پتا تھا دینی مدرسوں اور مراکز کو قومی کرنٹ میں شامل نہ کیا تو وہ جہادی تنظیموں کو روبوٹ فراہم کرنے والی فیکٹریاں بن کر رہ جائیں گے۔ ان سے پڑھ کر نکلنے والے محض چندوں پر پلنے والے پیش امام بنیں گے یا فرقہ پرستی کا ایندھن۔ جنرل سعید ملک پورے ایمانی جذبے سے کام کر رہا تھا۔ اسے ایمان علی کی مکمل تائید حاصل تھی جس نے مخالفت کی ہر لہر سختی سے کچل دی تھی۔ ایمان علی نے جنرل سعید ملک کے مشورے پر مدرسوں کے نصاب میں دینی تعلیم کے ساتھ دوسرے علوم بھی داخل کر دیے تھے تاکہ اسلامی تعلیم حاصل کرنے والے دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی اہلیت حاصل کرسکیں۔ دینی مدرسوں میں جب پہلی بار کمپیوٹر آیا تو اسے کفر کا شیطانی کارخانہ سمجھا گیا۔ شاگردوں نے ہاتھ لگانا گناہ سمجھا تھا' لیکن جب اسکرین پر قرآنی آیات ابھرتے دیکھیں تو آہستہ آہستہ قریب آ گئے اور نئے عہد سے اپنا رشتہ جوڑنے لگے۔

جاگیرداری کا عفریت دنیا سے تقریباً نصف صدی پہلے ناپید ہو گیا تھا۔ اس کی نسل صرف پاکستان جیسے پس ماندہ معاشرے میں پھل پھول رہی تھی۔ ایمان علی نے اس بھینسے کو بھی دونوں سینگوں سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ بھینسے نے بہت پاؤں چلائے تھے' پھنکاریں ماری تھیں' لیکن اسے لے جا کر اس کے باڑے میں بند کر دیا گیا تھا۔ پاکستان کو ایسی زرعی اصلاحات کی ضرورت تھی جو صرف قانون کی کتابوں میں نہ رہیں۔

زراعت کے شعبے میں انقلابی تبدیلیوں کے بغیر ترقی کا تصور بھی محال تھا۔ آبادی کی اکثریت زرعی معیشت سے منسلک تھی، برآمدات کا سارا دارومدار زراعت پر تھا' آبادی کے بڑھتے ہوئے دیو کے لیے اجناس کی ضرورت تھی' لیکن پورا زرعی شعبہ اٹھارہویں انیسویں صدی کے فیوڈل عہد میں سو رہا تھا۔ جگانے کے لیے زور زور سے جھٹکے دینے پڑے تھے۔

ایمان علی نے زمین داری مکمل طور پر ختم کر کے تمام زرعی زمینوں پر حکومتی قبضے کی تجویز رد کر دی تھی۔ یہ انتہائی قدم اٹھانے کے لیے ضروری ڈھانچہ موجود نہیں تھا۔ اس انقلابی عمل سے جو افراتفری پیدا ہوتی اور جو بھونچال آتا اس کے اثرات بہت دیر تک رہتے اور مطلوبہ نتائج حاصل ہونے میں کئی سال لگتے۔ ایمان علی کو فوری نتائج درکار تھے۔ ایمان علی کی اصلاحات کسی انقلاب سے کم نہیں تھیں۔ ذاتی اور خاندانی ملکیت محدود کر دی گئی تھی۔ مقررہ حد سے زائد زمینیں بلا معاوضہ لے لی گئی تھیں۔ غیر آباد یا اچھے اصولوں کے تحت کاشت نہ کی جانے والی زمینیں حکومت کی تحویل میں لینے کا قانون بنا دیا گیا تھا۔ غیر حاضر زمیندار کا حقِ ملکیت برقرار رکھا گیا تھا لیکن زمینیں پٹے پر دینے کا نظام ختم کر کے ان کی زمینیں حکومت نے لے لی تھیں۔ حکومت کی تحویل میں لی جانے والی زمینیں بے زمین ہاریوں میں تقسیم کی جا رہی تھیں یا انھیں کاشت کرنے کے لیے دے دی گئی تھیں۔ غیر آباد زمینوں پر بھی ہریالی اگنے لگی تھی۔ بٹائی کا اختیار زمین دار کے پاس نہیں تھا جو فصل اگاتا تھا وہی حصہ بھی دیتا تھا۔

کسانوں کی مدد کے لیے کوآپریٹوز قائم کر دی گئی تھیں۔ کوآپریٹوز زرعی کالجوں کے پڑھے ہوئے نوجوانوں' زرعی ماہرین' ہاریوں' کاشت کاروں' زمین داروں اور حکومت کے نمائندوں پر مشتمل تھیں۔ ایمان علی نے چین سے مدد کی درخواست کی تھی۔ ان کے ماہرین اور رضاکار پاکستان آ کر کوآپریٹوز کا نظام اور ڈھانچہ بنانے میں مدد دے رہے تھے۔ کوآپریٹوز نے سرکاری قبضے میں لی گئی زمینیں کسانوں میں تقسیم کرنے کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ کوآپریٹوز کسانوں کو بیج اور کھاد حاصل کرنے' فصلوں کو بازار تک پہنچانے اور آمدنی کا حساب کتاب

رکھنے میں مدد کرتیں، ٹریکٹر اور دوسری مشینری کے استعمال کرنے کی تربیت دیتیں اور پانی کی تقسیم کے نظام کی نگرانی کرتیں۔

زرعی آمدنی پر ٹیکس لگا دیا گیا تھا۔ کم آمدنی پر کم اور زیادہ آمدنی پر زیادہ شرح سے۔ زرعی آمدنی چھپانے کا مطلب تھا فصل اچھی نہیں ہو سکی، جس کا مطلب تھا کاشت کاری کے طریقوں میں خرابی ہے۔ ایسی زمینیں کوآپریٹوز کی تحویل میں دینے کا قانون تھا۔ زمین دار ٹیکس چوری کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ زرعی ٹیکس سے ہونے والی آمدنی کا ایک چوتھائی کوآپریٹوز کے اور ایک چوتھائی اس علاقے کے ترقیاتی کاموں کے لیے وقف تھا جہاں سے ٹیکس وصول ہوتا جبکہ نصف حکومت کے خزانے میں جمع ہو جاتا۔

ایمان علی کا خیال تھا اصلاحات کے نفاذ کا پہلا سال ہنگاموں کا اور دوسرا سال تجربات سے سیکھنے کا ہوگا، تیسرے سال میں نیا زرعی نظام مستحکم ہو جائے گا اور چوتھے سال میں نتائج سامنے آئیں گے۔ نتائج تیسرے سال میں سامنے آ گئے۔ کوآپریٹوز کا تجربہ کامیاب رہا تھا، کسانوں میں کاشت کاری کے مشینی طریقے مقبول ہو رہے تھے۔ فصلیں اچھی ہوئی تھیں۔ ٹیکس بھی مقررہ ہدف سے زیادہ وصول ہوا تھا۔ بڑی وجہ اصلاحات کا سختی سے نفاذ تھا۔ پرانی اصلاحات میں بھی کوئی خرابی نہیں تھی، لیکن وہ ان حکومتوں نے نافذ کی تھیں جن پر جاگیرداروں کا غلبہ تھا، اس لیے وہ عملاً نافذ نہ ہو سکیں۔ ایمان علی کے دور میں جاگیرداروں کے پاس سیاسی اور ریاستی طاقت نہیں رہی تھی۔ نوکر شاہی کے پاس اب ان سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کرم قریشی نے دیہی علاقوں میں ایسے اہل کار مقرر کئے تھے جن کا جاگیرداروں سے کوئی ناتا نہیں تھا۔ ان پر کڑی نگاہ رکھی گئی تھی۔ پٹواری، مختار کار اور تحصیل دار کوآپریٹوز کے تابع کر دیے گئے تھے۔ سب جانتے تھے کہ ایمان علی رعایت کرنا نہیں جانتا تھا۔ سب کو اپنی ملازمتیں پیاری تھیں۔

۱۹۹۲ء کا جبری مشقت کے خاتمے کا ایکٹ سختی کے ساتھ نافذ کیا گیا تھا۔ زمین داروں

نے ہاریوں کو جو قرضے دے رکھے تھے وہ ایک قانون کے ذریعے سود سمیت معاف کر دیے گئے تھے۔ ہیومن رائٹس کمیشن کے رضا کار پولیس کی مدد سے جاگیرداروں کی نجی جیلوں اور خرکار کیمپوں پر چھاپے مار کر ہاریوں کو آزاد کرا رہے تھے۔ انھیں آزاد ہی نہیں، کوآپریٹیوز کی اسکیموں میں آباد بھی کیا جا رہا تھا۔ انھیں قید رکھنے والے جیلوں میں تھے اور ان پر مقدمے قائم کر دیے گئے تھے۔ زمین داروں نے عدالتوں میں درخواستیں دائر کر دی تھیں۔ ڈاکوؤں کی سرپرستی کر کے لوٹ مار شروع کرا دی تھی۔ ہاریوں کو باندھے رکھنے کے لیے دھونس، دھاندلی اور پیری مریدی کا سہارا لیا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایمان علی سے رشتے قائم کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ سفارشیں لے جا کر گڑگڑایا جا رہا تھا کہ ان کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ ایمان علی نے کہا تھا ہاریوں کے ساتھ برسوں سے جو ناانصافیاں ہوئی ہیں، قرضوں کی معافی ان کا بہت معمولی معاوضہ ہے۔ انھیں شکایت تھی کہ ان سے بلا معاوضہ زمینیں لے کر انھیں مفلس بنایا جا رہا ہے۔ ایمان علی نے کہا تھا پانچ سو زمین داروں کے غریب ہونے سے پانچ لاکھ ہاری خوش حال ہوتے ہیں تو یہ برا سودا نہیں ہے۔

ایمان علی نے جاگیرداروں کی مدافعت سختی سے کچل دی تھی۔ جنگلوں میں گھس کر ایک ایک ڈاکو کا تعاقب کیا تھا۔ زمین داروں کے خلاف ہاریوں کا جوش انتقام بھی قابو میں رکھا تھا اور ان کا ابال اچھی فصلیں اگانے کی طرف موڑ دیا تھا۔ فلک پیر نے جاگیرداروں کے جرگے کیے تھے، انھیں سمجھایا تھا کہ وہ اصلاحات کا عمل قبول کر کے اس کا حصہ بن جائیں نہیں تو اٹھارویں صدی کے شکستہ حال مغل جاگیرداروں کی طرح اپنی حویلیوں کے ملبوں پر گریبان تار تار کیے بیٹھے ماضی کی بوسیدہ روایتوں کا نوحہ پڑھ رہے ہوں گے۔ فلک پیر نے انھیں ڈرایا تھا کہ وہ نہ مانے تو ایمان علی ان سے ان کی باقی بچی ہوئی زمینیں بھی چھین لے گا۔ جاگیرداروں کی مدافعت جلد ہی دم توڑ گئی تھی۔

ایمان علی کو تین سال کے لیے حکومت ملی تھی۔ مسائل ایسے نہیں تھے کہ تین برسوں میں

حل ہو جاتے۔ توڑ پھوڑ کر کے ملبہ جمع کرنے میں نصف صدی لگی تھی۔ اسے تین برسوں میں سمیٹنا آسان نہیں تھا۔ ایمان علی نے لیپاپوتی کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ بنیادیں ٹھیک کر کے اداروں کی تعمیرِ نو کر رہا تھا۔ مشکلات کے باوجود تین سالوں میں نئے پاکستان کا صاف ستھرا سا ڈھانچہ نظر آنے لگا تھا' جیسے قلعی کیا ہوا اجلا چمک دار برتن۔ اجڑا ہوا چمن آرائش کے بعد ایک مزیّن باغ بننے لگا تھا۔ ایمان علی کو پتا تھا باغ کی تزئین قائم رکھنے کے لیے ایک نئے پائے دار نظام کی ضرورت ہے۔ نیا سیاسی ڈھانچہ بنا کر منظور کرانے اور نئے سیاسی نظام کے تحت انتخابات کرانے کے لیے سپریم کورٹ نے مزید چھ مہینوں کی مہلت دی تھی۔ سیاسی ڈھانچہ تیار تھا' تین مہینوں کے اندر اس پر عوامی ریفرنڈم کرا کر اگلے تین مہینوں میں نئے سیاسی ڈھانچے کے تحت انتخابات منعقد ہونا تھے۔ ایمان علی اور اس کے ساتھیوں نے طے کیا تھا کہ وہ انتخابات سے پہلے مستعفی ہو جائیں گے۔ حکومت چیف جسٹس کے حوالے کر دی جائے گی جو فوج کی مدد سے انتخابات منعقد کرائیں گے۔ ایمان علی اپنا دامن دھاندلی' جانب داری اور انتخابات میں حکومتی مشینری استعمال کرنے کی تہمتوں سے صاف رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس نے جن مفادات پر ضرب لگائی ہے وہ پوری طاقت کے ساتھ اس کے خلاف انتخاب لڑیں گے۔ وہ بھی حکومت چھوڑ کر ساری توانائیاں انتخاب پر صرف کر دینا چاہتا تھا۔ وہ نامزد نہیں' منتخب حکم ران بننا چاہتا تھا۔

آئینی اور قانونی ماہرین نے نیا سیاسی ڈھانچہ بند کمروں میں بیٹھ کر نہیں بنایا تھا۔ نیا ڈھانچہ بنانے کے عمل میں عوام کو براہ راست شریک کیا گیا تھا۔ ایمان علی نے بند پڑی ہوئی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے دروازے کھول کر انھیں کھلی کچہریوں میں بدل دیا تھا۔ شام کے دو گھنٹے عوامی سیشن کے لیے مخصوص تھے۔ سب کو شرکت کی اجازت اور اظہار خیال کی آزادی تھی۔ نیا سیاسی ڈھانچہ بنانے والے ماہرین کی کمیٹی کا کم از کم ایک رکن ہر سیشن میں شریک ہوتا اور وہی اجلاس کا نظم و نسق برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہوتا۔ پاکستان میں اس طرح کی کھلی جمہوریت

کی روایت نہیں تھی، اس لیے شروع میں ہنگامہ آرائیاں ہوئیں۔ سیاسی جماعتوں نے اسٹیج پر قبضے کیے، پورا اجلاس اغوا کرلیا۔ جو غیر سنجیدہ اور تفریح باز تھے، ہلڑ مچا کر خوش ہوتے رہے۔ صبر و تحمل کی کمی اور بحث کو جھگڑنے میں بدلنے کی عادتیں معقولیت کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ رکاوٹیں آہستہ آہستہ دور ہوئیں، سخت سے سخت بات کہنے اور اختلاف کرنے والا قابل تعزیر نہیں تھا لیکن کارروائی میں رخنہ ڈالنے اور جسمانی یا مالی نقصان پہنچانے والے پولیس کے حوالے کر دیے جاتے۔ قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں ہونے والے اجلاس ہفتے کے ساتوں دن چھ مہینوں تک جاری رہے۔ لوگ آہستہ آہستہ عادی ہو گئے تھے۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ انھیں اپنی بات کہنے کا موقع ملے گا۔ ان کی بات سنی جائے گی۔ شروع شروع کا ابال اور سیاسی عمل نہ ہونے سے جمع ہونے والی بھاپ نکل گئی اور بے چینی دور ہو گئی تو عوامی جلسوں میں نظم و نسق بحال ہو گیا تھا۔ ہنگامے کرنے والے روز روز کی پولیس، حوالات، سزاؤں اور جرمانوں سے تنگ آ کر الگ ہوئے تو ہنگاموں کے ڈر سے الگ تھلگ رہنے والے سنجیدہ لوگ شریک ہو کر اپنی رائے دینے لگے تھے۔ معقولیت راہ پا رہی تھی۔

ایمان علی کی بنائی ہوئی آئینی کمیٹی میں گلے سڑے پرانے نظام کے وہ محافظ نہیں لیے گئے تھے جو حکمرانوں کے مفادات کے مطابق آئین اور قوانین ڈھالنے میں کمال رکھتے تھے۔ کمیٹی میں اعلیٰ عدالتوں کے سابق جج، الیکشن کمیشن کے کئی سابق چیئرمین، سابق وزرائے قانون اور سپریم کورٹ میں وکالت کرنے والے ممتاز بیرسٹر شامل تھے۔ وہ آئینی معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے سیاسی ڈھانچے بنتے اور ٹوٹتے دیکھے تھے۔ وہ اس نظام کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چھ مہینوں کے دوران عوامی مشاورت کے عمل سے جو تجربہ حاصل ہوا تھا وہ بھی انمول تھا۔ وہ عدالتوں کے اعلیٰ ایوانوں میں پیچیدہ قانونی گتھیوں کو سلجھانے والے لوگ تھے، لیکن اسمبلیوں میں ہونے والی عوامی کچہریوں میں عوام نے جس سادگی سے سیاسی نظام کی خامیوں کی نشاندہی کی تھی اور جو سیدھے سادے حل پیش کیے تھے اس نے ان کی

نگاہوں کے زاویے بدل دیے تھے۔ نیا سیاسی ڈھانچہ بنانے والوں کو یقین تھا کہ ان کے بنائے ہوئے سیاسی ڈھانچے کو عوام کی اکثریت قبول کرلے گی۔

ایمان علی تین سال سے ایک با اختیار صدر کی حیثیت سے حکومت کر رہا تھا' اس لیے سب کا خیال تھا نئے سیاسی ڈھانچے کے ذریعے صدارتی نظام رائج کیا جائے گا۔ نئے سیاسی ڈھانچے میں پارلیمانی نظام حکومت برقرار رکھا گیا تھا لیکن بھارتی پارلیمانی جمہوریت کی مثال رد کر دی گئی تھی۔ ان کا خیال تھا بھارت نے نو آبادیاتی آقاؤں کی پارلیمانی جمہوریت کا جو چربہ اٹھایا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ توازنِ اقتدار بدل گیا تھا' ہندوستان کی مرکزیت علاقائیت کی نالیوں میں بہہ رہی تھی۔ اقتدار کی مصلحتوں کی وجہ سے قومی سطح کی پالیسیاں بھی چھوٹے اقلیتی گروپوں کے مفادات کی بھینٹ چڑھ رہی تھیں۔ ایک ارب کی آبادی کا غریب ملک بار بار ہونے والے انتخابات اپنے وسائل پر ضائع کر رہا تھا۔ ماہرین کا خیال تھا پاکستان میں جمہوریت کو مستحکم کرنے کے لیے پرانے سیاسی ڈھانچے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر کے نئی حقیقتوں کے تابع کرنا ضروری تھا۔

اسمبلیوں کی مدت چار سال مقرر کر دی گئی تھی۔ سیاسی جماعتیں کڑے قوانین کے تابع کر دی گئی تھیں۔ انھیں اپنے چندوں' چندہ دینے والوں اور اخراجات کا حساب رکھنا ضروری تھا۔ الیکشن کمیشن کی آڈٹ ٹیمیں ان کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کر سکتی تھیں۔ سیاسی جماعت کی حیثیت سے رجسٹریشن کرانے اور سیاسی جماعت کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کے لیے ضروری تھا کہ پارٹی کے کم از کم ایک ہزار باضابطہ ارکان ہوں۔ ہر دو سال بعد پارٹی کے انتخابات ہونا ضروری تھے۔ ملک کے انتخابات میں پارٹی کا ٹکٹ اسی امیدوار کو مل سکتا تھا جسے اپنے حلقے کے پارٹی اراکین کی اکثریت حاصل ہو اور جو کم از کم ایک سال سے پارٹی کا رکن ہو۔ آزاد حیثیت سے انتخاب لڑنے والے امیدواروں کی نامزدگی کے لیے حلقے کے کم از کم ایک فیصد ووٹروں کی تائید ضروری تھی۔ ہر امیدوار کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنے حلقے میں پچھلے

ایک سال سے رہتا ہو۔ انتخابی اخراجات کی حد مقرر تھی۔ الیکشن کمیشن آڈٹ ٹیمیں جانچ پڑتال کر سکتی تھیں۔ خلاف ورزی کی صورت میں نشست سے محروم ہونے کے علاوہ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی لگ سکتی تھی۔ اپنا حلقۂ انتخاب چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کرنے اور پارٹی بدلنے کی صورت میں رکنیت ختم ہو سکتی تھی۔ ایک امیدوار صرف ایک نشست کے لیے انتخاب لڑ سکتا تھا۔

ووٹ دینا لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ ووٹ نہ دینے والوں کے لیے جرمانے کی سزا تھی۔ صرف کسی مجبوری یا ناگزیر وجہ سے ووٹ نہ دے سکنے والے جرمانے سے مستثنیٰ تھے۔ لازمی ووٹ کے مسئلے پر بہت بحث ہوئی تھی۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ پاکستان جیسی گنجان آبادی والے ملک میں جہاں تعلیم کی شرح بہت کم ہے' لازمی ووٹ کے قانون کا اطلاق مشکل ہو گا۔ لازمی ووٹ کی تجویز پیش کرنے والوں نے کہا تھا انتخاب سے قبل ووٹ دینے کا شعور پیدا کرنے کے لیے مہم چلا کر' ووٹنگ کے طریقے کو سادہ اور زیادہ پولنگ سٹیشن قائم کر کے اور ووٹنگ کا وقت بڑھا کر مشکلات کم کی جا سکتی ہیں۔ جرمانے کا خوف بھی لوگوں کو ووٹ دینے پر آمادہ کرے گا۔ ایک دو انتخابات کے بعد لوگ عادی ہو جائیں گے۔ ماہرین کا خیال تھا انتخابی عمل میں سب کی شرکت ضروری ہے۔ اس طرح منتخب ہونے والی حکومت زیادہ مستحکم ہو گی۔ اسے یہ اعتماد ہو گا کہ وہ پچاس فیصد سے کم ووٹوں سے منتخب ہونے والی اقلیتی حکومت نہیں بلکہ اسے عوام کی اکثریت کی تائید حاصل ہے۔

صدر ملک کا آئینی سربراہ تھا' اسے انتخابی عمل سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ صدر نامزد کرنے کا حق وزیر اعظم کے پاس تھا جس کی تصدیق سینٹ سے حاصل کرنا ضروری تھی۔ صدر صرف اعلیٰ عدالتوں کے کسی موجودہ یا ایسے سابق جج کو چنا جا سکتا تھا جس کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رہا ہو۔ آئین کی حفاظت کرنا صدر کی ذمہ داری تھی۔ اس کے خیال میں اسمبلیاں ایسا قانون بنا رہی ہیں جو آئین سے متصادم ہے یا حکومت تنبیہ کے باوجود حدود سے تجاوز کر رہی

ہے تو وہ سپریم کورٹ کو ریفرنس بھیج سکتا تھا۔ سپریم کورٹ کے ججوں کی اکثریت صدر کی رائے سے اتفاق کرے تو حکومت اور اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرائے جا سکتے تھے۔ یہی ڈھانچہ صوبوں کے لیے بھی طے کیا گیا تھا جہاں وزیر اعلیٰ کو اپنے صوبے سے تعلق رکھنے والے کسی موجودہ یا سابق جج کو گورنر مقرر کرنے کا حق تھا۔

ایمان علی کو یقین تھا نئے سیاسی ڈھانچے سے پاکستان کی جمہوریت مستحکم ہو جائے گی۔ وہ ماہرین سے متفق تھا کہ سیاسی جماعتوں میں جمہوریت لائے اور انھیں کڑے ضابطوں کا پابند کیے بغیر صحت مند جمہوری روایات نہیں پنپ سکیں گی۔ شخصیتوں کو اوتار سمجھنا ایشیائی نفسیات کا حصہ تھا، لیکن پارٹی میں کارکنوں کی طاقت بڑھا کر پارٹی کے اندر شخصی آمریت کے رجحانات کم کیے جا سکتے تھے۔ نئے سیاسی ڈھانچے میں مشروم کی طرح اگنے والی ایسی جماعتوں کی روک تھام بھی کر دی گئی تھی جو کارکنوں کے بغیر صرف اخباری بیانات کے ذریعے زندہ تھیں۔ ایمان علی نے اصلاحات کو آئین کا حصہ بنانے کے لیے ریفرنڈم میں شامل کر دیا تھا تا کہ آنے والی کوئی اور حکومت انھیں تبدیل نہ کر سکے۔ آئین میں ترمیم صرف ریفرنڈم ہی کے ذریعے ممکن تھی۔

ایمان علی کو انتخابات میں اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ اس کی اصلاحات نے ملک پر اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ لوگ خوش تھے۔ خوش نہ ہونے والوں کی تعداد کم تھی۔ ناراض وہی تھے جن کے سیاسی عزائم، معاشی مفادات اور نسلی ورثوں کو نقصان پہنچا تھا۔ انھوں نے جو شورشیں برپا کی تھیں انھیں دبا دیا گیا تھا، لیکن یہ اندرونی طوفان تھے۔ ایمان علی نے ابھی ان طاقتوں کی مخالفت کا مزا نہیں چکھا تھا جن کے سامنے اقتدار اعلیٰ سرنگوں اور حکمران گھٹنوں کے بل کھڑے رہا کرتے تھے۔ اس چیلنج کا سامنا کرنا ابھی باقی تھا۔

8

نیویارک

ساحل نئے پاکستان کی سوچوں سے نکل کر دوبارہ چرچ سنٹر کی تیسری منزل کے ہال میں آ گیا۔ نئے پاکستان کے اس سفر میں اس نے شاید دس منٹ گزارے تھے۔ اس عرصے میں تکریم کی تقریر جاری تھی۔ اس کی باتوں میں ربط تھا۔ کبھی کبھی اپنی بات پر زور دینے کے لیے سر کو ذرا سا ٹیڑھا کر کے ہلاتی تو ساحل کے دل کی دنیا میں زلزلہ آ جاتا۔ اس کے رخساروں پر شفق کا بسیرا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ذرا ابھری ہوئی تھیں جن کی وجہ سے بات کرتے ہوئے اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ ساحل ان گڑھوں کو بھرنے کی کوئی رومانی ترکیب سوچنے لگا۔ وہ بالوں کی ان لٹوں کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتا تھا جو سر کی جنبشوں کے ساتھ بار بار تکریم کے ماتھے پر آ جاتیں۔ آگے کی صف میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے جماہی کے ساتھ

بڑی سی انگڑائی لی تو ساحل چونک پڑا۔ انگڑائی لینے والا شاید ایمان علی کے خلاف ہونے والی تقریریں سننے آیا تھا اور اب تکریم سے نئی حکومت کے کارنامے سن کر بور ہو رہا تھا۔ باقی لوگ بھی پہلو بدل رہے تھے یا ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ صدر نشین عورت برابر میں بیٹھے ہوئے مونچھوں والے شخص سے کچھ کہہ رہی تھی جو زور زور سے سر ہلاتا ہوا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ساحل نے سوچا غبارہ پھٹنے ہی والا ہے۔ اسے انتظار نہیں کرنا پڑا۔

تکریم نے صرف ایمان علی کے کارنامے بیان کیے تھے' اس کے مخالفین پر نکتہ چینی کرنے سے گریز کیا تھا' لیکن اس کا آخری وار کاری اور حملہ براہ راست تھا۔

''آپ کہتے ہیں صدر ایمان علی نے اسلامی انقلاب کا راستہ روکا ہے؟ کس اسلامی انقلاب کا؟ جو افغانستان میں آیا تھا؟ جس نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی' صرف بھوک بیماری اور پیاس دی تھی' لوگوں کو بے گھر کیا تھا۔ اس اسلامی انقلاب کا چہرہ مہاجروں کے کیمپوں میں جا کر دیکھیے جہاں لاکھوں افغان ان لوگوں کی مدد سے زندہ ہیں جنھیں آپ کافر کہتے ہیں۔ اسلام ترقی کی نشانیاں مٹانے کا نام نہیں۔ یہ بت شکنی نہیں بدترین بت پرستی ہے۔ اسلام کائنات کی تسخیر کا سبق دیتا ہے' آپ دنیا کو پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو سماجی انقلاب کی ضرورت ہے۔ وہ مذہب اپنا سر اونچا نہیں کر سکتا جس کے ماننے والوں کی کمر غربت اور پس ماندگی سے جھکی ہوئی ہو۔ صدر ایمان علی نے سماجی انقلاب لانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے......

''چپ کرو کافر کا بچی! چپ کرو!'' اگلی صف میں بیٹھا ہوا مولوی' جس نے سر پر چار خانے کا رومال باندھا ہوا تھا' کھڑے ہو کر ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ کئی لوگ کھڑے ہو کر اس کا ساتھ دینے لگے۔ ''کافر ہے' کافر ہے۔'' اور ''باہر نکالو' مارو'' کے نعرے گونج رہے تھے۔ سنہرے چشمے والے ایک جوشیلے نوجوان نے ہاتھوں میں کرسی اٹھا لی تھی۔ خاتون صدر خاموش بیٹھی دیکھتی رہی' اس نے ہنگامہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ تکریم سکتے میں آ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ

سحر زدہ سی خاموش کھڑی تھی۔ ساحل اپنی نشست سے اٹھ کر تیزی سے اسٹیج کی طرف گیا اور تکریم کا بازو پکڑ کر اسے ہال سے باہر لے جانے لگا۔ کسی نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ موٹا سیاہ فام گارڈ ہال کے اندر آیا تو کافر کافر کے نعرے لگانے والے خاموش ہو گئے' ہاتھوں میں اٹھی ہوئی کرسی بھی زمین پر واپس آ گئی۔

تکریم تقریباً گھسٹتی ہوئی ساحل کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ لفٹ میں سوار ہوئے تو تکریم کے پاؤں کپکپا رہے تھے۔ چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ ساحل نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔ وہ چرچ سنٹر سے باہر نکل کر دائیں ہاتھ کی گلی میں مڑے اور سامنے نظر آنے والے پہلے ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ پانی کا پورا گلاس پینے اور کافی کے دو گھونٹ لینے کے بعد تکریم کے رخساروں پر شفق واپس آنے لگی۔

''آپ نے کمال کر دیا۔'' ساحل نے خاموشی توڑی۔

''میں نے؟ میں نے کیا کیا؟'' تکریم شاید اب تک حقیقت کی دنیا میں واپس نہیں آئی تھی' لیکن پھر آنکھوں کے سامنے کچھ دیر پہلے کا منظر گھوم گیا۔ ''آپ کا شکریہ' آپ مجھے بچا کر نکال لائے۔ آپ نہ ہوتے تو شاید......''

''کچھ نہیں ہوتا۔'' ساحل نے ہنس کر کہا۔ ''سب کاغذی شیر ہیں۔ گارڈ کو دیکھ کر سب کی ہوا نکل گئی تھی۔''

''میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ یہ میری کم زوری ہے۔'' تکریم پہلی بار مسکرائی۔ ''میری امی نے کئی وظیفے یاد کرائے ہیں' جنھیں پڑھ کر خود پر قابو پایا جا سکتا ہے' لیکن وہ کام نہیں آ رہے۔''

''غصے کی انرجی بہت سوچ سمجھ کر اور ایسی جگہ استعمال کرنا چاہیے جہاں کوئی فائدہ ہو۔''

''کیا یہ اختیار کی بات ہے؟ ہو بھی تو اظہار کرنا ضروری ہے ورنہ غصہ اندر ہی اندر

کاٹ کاٹ کر زخمی کر دے گا۔ درد رات کو سونے نہیں دے گا۔''

''آج آپ کو بہت اچھی نیند آئے گی۔'' ساحل ہنسا۔ ''لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آپ کے غصے کا اظہار بے کار گیا۔ وہ سب کسی نہ کسی ذاتی وجہ سے ایمان علی کے مخالف ہیں' آپ انھیں قائل نہیں کر سکتیں۔''

''انھیں معلوم ہونا ضروری ہے کہ انھیں کوئی ٹوکنے اور جھوٹا کہنے والا ہے۔ کوئی کچھ نہیں بولا تو ان کی ہمت بڑھے گی۔ وہ جھوٹ کا نقارہ پیٹیں گے اور لوگ ان کے گرد جمع ہوتے رہیں گے۔ آپ بہت بہادر ہیں جو خود پر جبر کر سکتے ہیں۔''

''بہادر نہیں بزدل!'' ساحل ہنس پڑا۔ ''میرے خاموش ہونے کی ایک وجہ میرے ڈیڈی ہیں۔''

''وہ منع کرتے ہیں؟''

''نہیں' نہیں' وہ منع نہیں کر سکتے۔ میرے اور ان کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔''

''تو پھر؟''

''وہ بیوروکریٹ ہیں اور ایمان علی کے لیے کام کرتے ہیں۔ سب انھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں بولوں گا تو سمجھا جائے گا اپنے باپ کا حق نمک ادا کر رہا ہوں۔''

''آپ کے ڈیڈی کیوں ناراض ہیں؟ کیا وہ آپ کو بھی بیوروکریٹ بنانا چاہتے تھے؟''

''نہیں! ان کا خیال ہے مجھ میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔'' ساحل پھر ہنس پڑا۔ ''وہ کہتے ہیں سرکاری افسر کو آگے بڑھنے کے لیے بہت چوکنا' ہوشیار اور منصوبہ بند ہونا چاہیے۔ مجھ میں سازشیں کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ وہ چاہتے تھے میں ایم بی اے کر کے کارپوریٹ ورلڈ میں نام کماؤں۔ میں اکیڈمک بننے پی ایچ ڈی کرنے لگا۔''

''انھیں تو خوش ہونا اور فخر کرنا چاہیے۔''

''ان کا خیال ہے زیادہ پڑھنے والے کسی کام کے نہیں رہتے اور پڑھانے والے سست اور کام چور ہوتے ہیں۔ آیئے چلیں' آپ کو گھر بھی چھوڑنا ہے۔'' ساحل ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ شاید اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے گھر کا راستہ آتا ہے' میں چلی جاؤں گی۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''۱۸۶ اسٹریٹ پر۔ Spanish Harlem میں۔''

تکریم کے منع کرنے کے باوجود ساحل اسے چھوڑنے اس کے گھر تک آیا۔

''کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟'' ساحل نے تکریم کی گلی میں پہنچ کر عمارت اور اس کے محل وقوع سے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں! یہ میرے انکل سرجن رحمان کا اپارٹمنٹ ہے' میں ان کے پاس رہتی ہوں۔''

''سرجن رحمان طارق؟''

''کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟''

''کبھی ملا نہیں۔ پچھلے سال ہم نے پاکستان کے ایک خیراتی ہسپتال کے لیے فنڈز ریزنگ ڈنر کیا تھا' کوئی چپکے سے پچیس ہزار ڈالر کا چیک دے کر چلا گیا۔ بہت تلاش کے بعد پتا چلا وہ سرجن رحمٰن تھے۔''

''میرے انکل ایسے ہی ہیں۔'' تکریم نے بہت فخر سے سر اٹھا کر کہا اور خدا حافظ کہہ کر بلڈنگ کے اندر داخل ہو گئی۔

بلڈنگ کا گارڈ اسے پہچاننے لگا تھا اور ہمیشہ ''ہیلو مس احمد'' کہہ کر استقبال کرتا تھا۔ تکریم لفٹ میں چڑھ کر اوپر آئی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو ڈرائنگ روم میں ذرا اونچے سے قد کی ایک دبلی پتلی عورت کھڑی دیوار پر لگی ہوئی تصویر دیکھ رہی تھی۔ وہ یقیناً نینی تھی۔ انکل رحمان کی فیشن ڈیزائنر بیٹی۔ تکریم کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ تکریم نے اسے آخری بار کوئی پندرہ برس پہلے دیکھا تھا' جب نینی انکل رحمان کے ساتھ پاکستان آ کر ان کے گھر رہی

تھی۔اس وقت نینی کے بال بہت گھنے اور لمبے تھے' ہر وقت جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوا کی طرح آزاد پھرا کرتی تھی۔اس نے اپنے بال اب لڑکوں جیسے چھوٹے کروا لیے تھے۔ ہلکے سے سبز رنگ کا بزنس سوٹ اور ایک بٹن کے کوٹ کے نیچے سوٹ کے رنگ سے ملتا جلتا ہائی نیک سویٹر پہنے ہوئے تھی۔کانوں میں زمرد کے چھوٹے چھوٹے ہرے ٹاپس کے سوا جسم پر کوئی زیور نہیں تھا۔سب انگلیاں خالی تھیں' شادی کی انگوٹھی بھی نہیں تھی۔ وہ برسوں پہلے اسلام آباد کی گلیوں میں سائیکل چلانے والی لاابالی لڑکی نہیں تھی' ایک بااعتماد اور پروقار بزنس وومین نظر آتی تھی۔عورتوں کے فیشن میگزین میں چھپی ہوئی اپنی تصویر کی طرح۔تکریم اس کی شخصیت کے سحر میں کھوگئی۔

نینی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے چونک گئی۔ایک لمحے کے لیے کھڑی اسے دیکھتی رہی' جیسے نگاہ کا زاویہ درست کر رہی ہو۔ پھر ''تکریم'' کہہ کر بہت گرم جوشی سے آگے بڑھی' لیکن اس احتیاط سے گلے لگایا کہ لباس پر شکن نہ پڑے اور اسے اپنے ساتھ صوفے پر لے کر بیٹھ گئی۔

''میں صرف تمھارا انتظار کر رہی تھی۔'' نینی نے تکریم کا ہاتھ چھوڑے بغیر کہا۔''ڈیڈی نے بتایا تھا تم کسی پاکستانی ریلی میں گئی ہو۔خوب زندہ باد مردہ باد کیا ہوگا۔''

''تھینک یو نینی آپا' تھینک یو۔ مجھے کتنی حسرت تھی آپ سے ملنے کی۔ میں کتنی خوش ہوں۔ کتنے برسوں بعد دیکھا ہے۔کتنی گریٹ لگ رہی ہیں! So impressive''

''مجھ پر میری ماڈلز کا سایہ پڑ گیا ہے۔'' نینی نے قہقہہ لگایا۔اس کے قہقہہ لگانے کا انداز بالکل انکل رحمان جیسا تھا۔''تم بالکل ایسی ہو جیسے دس سال پہلے تھیں۔ ایک دم آریجنل۔صرف قد بڑھ گیا ہے' اور کچھ ویٹ بھی۔ میری ماڈل بننے کے لیے تمھیں کئی کلو جھٹکنے پڑیں گے۔'' نینی نے ایک اور قہقہہ لگایا۔''مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ نیویارک میں کیا کر رہی ہو۔''

تکریم اسے بتانے لگی۔ نینی اتنی توجہ سے سن رہی تھی جیسے ایک ایک لفظ اپنے اندر جذب کر رہی ہو۔ تکریم خاموش ہوئی تو نینی اداس ہوگئی۔ وہ تکریم کا ہاتھ چھوڑ کر صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''میں نے ڈیڈی کو بہت مایوس کیا۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ ہم پاکستان میں رہتے تو شاید بن جاتی۔ یہاں کی دنیا بالکل الگ ہے۔ کوئی خود اپنا نہیں بن پاتا۔'' اداسی گہری ہوگئی تھی۔

''ایسا نہ کہیں۔ ہمیں کتنا فخر ہے آپ پر! میں جب میگزین میں چھپی ہوئی آپ کی تصویریں دکھا کر بتاتی ہوں کہ آپ کو جانتی ہوں تو لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ آپ تو آئیڈیل ہیں۔ کتنی کامیاب ہیں آپ!''

''کامیاب نہیں دولت مند!'' نینی نے اداسی جھٹک کر اپنا مخصوص خاندانی قہقہہ لگایا۔ ''دولت کمانا بہت آسان ہے۔ جذبات کو تالا لگا دو' بے حس' بے رحم اور مشین بن جاؤ۔ چٹکی بجاتے کروڑ پتی بن جاؤ گے۔ کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔ تمھیں پتا ہے میری کامیابی کیا ہے؟ مجھے کپڑے پہنا کر ننگا کرنے کا فن آتا ہے۔ اسے کامیابی نہیں کہتے۔ ایک مرتے ہوئے آدمی کو زندگی دینا کامیابی ہے۔ یہ کام ڈیڈی اور تم جیسے لوگ کرتے ہیں۔ کتنا فخر ہے مجھے۔''

''نینی آپا ایسا نہ کہیں۔''

''میں نے تمھیں پہلی بار دیکھا تھا تو اس وقت تمھاری عمر اتنی تھی جتنی آج میری بیٹی کی ہے۔'' نینی نے تکریم کی بات سنی ان سنی کر کے اس کا ہاتھ دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ''تم نے اپنے سارے کھلونے مجھے کھیلنے کے لیے دے دیے تھے۔''

''آپ بھی تو میرے لیے باربی کا پورا سیٹ لے کر آئی تھیں۔''

''وہ کچھ نہیں' صرف پلاسٹک تھا۔ گفٹ ریپ پارسل۔ تمھارے کھلونے تمھاری محبت تھے۔ تم نے مجھے اپنی محبت دی تھی۔''

''آپ نے بدلہ چکا دیا ہے۔'' تکریم نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے یہاں آپ کے گھر

میں آپ کے کمرے پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

''تمھارا قبضہ یہاں اس دل پر ہے۔'' نینی نے تکریم کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا۔ تکریم کی سمجھ میں نہیں آیا نینی اتنی جذباتی کیوں ہو رہی تھی۔ اس نے نینی کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی دیکھی تھی۔ نینی نے تکریم کا ہاتھ ابھی تک اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ تکریم اس کے سینے کی نرمی محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ نینی کے سینے سے واپس کھینچ لیا۔

اسی وقت کمرے سے سرجن رحمان نکل کر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں نینی کی گڑیا تھی جو نینی نے ان سے لے کر اپنی گود میں رکھ لی۔

''میرا پرسکرپشن کام نہیں کر رہا اس لیے نینی اپنی گڑیا واپس لینے آئی ہے۔'' سرجن رحمان نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے قہقہہ لگایا' لیکن پھر سنجیدہ ہو گئے۔ ''نینی نیو یارک چھوڑ کر لاس اینجلس جا رہی ہے۔ وہاں اس نے کوئی فیشن بوتیک خرید لی ہے۔''

''کیوں نینی آپا! بگ ایپل چھوڑ کر اتنی دور۔''

''ہالی ووڈ کے اسٹارز میں میرے ڈیزائنوں کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ خود نہیں گئی تو مارکیٹ ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

''یہ میل گبسن کو شلوار قمیص اور جولیا رابرٹس کو غرارہ پہنائے گی۔'' دونوں باپ بیٹی نے ایک ساتھ اور ایک جیسا قہقہہ لگایا۔ نینی جانے کے لیے اٹھ گئی' سرجن رحمان کھونٹی سے اس کا اوورکوٹ اتارنے لگے۔

''نینی آپا کھانا کھا کر جایئے نا! ہم تھائی آرڈر کرتے ہیں۔ انکل رحمان بتا رہے تھے آپ کا فیورٹ ہے۔'' تکریم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''پھر کبھی' سومی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ مجھے گڈ نائٹ کہے بغیر نہیں سوتی۔ صبح صبح میری پیرس کی فلائیٹ ہے' اس کی تیاری کرنا ہے۔ سال میں چھ بار جاتی ہوں' لیکن اٹلانٹک کراس کرتے ہوئے نروس ہونے لگتی ہوں۔ مجھے ہوا میں Sea Sickness ہو جاتی ہے۔'' نینی

نے الوداعی قہقہہ لگایا۔ تکریم کے قریب جا کر لباس پر شکن پڑنے کی پروا کیے بغیر اسے زور سے بھینچ کر گلے لگایا اور گالوں پر رخصتی بوسہ دے کر چلی گئی۔ سرجن رحمان بیٹی کو چھوڑنے نیچے تک گئے تھے۔

تکریم دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا آج شام چرچ اسٹریٹ کے ہنگامے کی دھمک درد بن کر سر میں رہے گی، لیکن نینی کی ملاقات نے سر درد ایک دم غائب کر دیا تھا۔ وہ خوشبو کے جھونکے کی طرح تھی۔ کیسی چھا جانے والی شخصیت تھی۔ تکریم خود کو بچہ محسوس کرنے لگی تھی۔ انکل رحمان کو بیٹی سے توجہ نہ ملنے کی شکایت تھی۔ تکریم سوچنے لگی یہ کیسے ممکن تھا کہ جس میں اتنا پیار بھرا ہو وہ اپنے باپ کو محروم رکھے۔ شاید ماں کی وجہ سے باپ کے ساتھ تلخ ہو گئی ہو گی، لیکن امریکہ میں طلاق تو ایک معمول کی بات تھی۔ نینی بھی تو امریکہ کی اسی دنیا میں رہتی تھی۔

سرجن رحمان نینی کو نیچے چھوڑ کر واپس آئے تو بہت تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ وہ تکریم کے سامنے صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔ بار بار انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر رہے تھے۔ لگتا تھا کچھ کہنا چاہتے ہوں، لیکن الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ بیٹھے کئی منٹ ہو گئے تھے، ایک قہقہہ تک نہیں لگایا تھا۔

''سب خیریت ہے؟ آپ ٹھیک ہیں؟'' تکریم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''نینی نے جیمز سے طلاق لے لی ہے۔'' انھوں نے ذہن کا بوجھ ایک دم ہی اتار دیا۔

''اسی لیے نیویارک چھوڑ کر ایل اے move کر رہی ہے۔''

''اوہ!'' سناٹے میں آئی ہوئی تکریم کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ اس نے سوچا آج کا دن دھوپ چھاؤں کی طرح تھا۔ بار بار اپنا رنگ بدل رہا تھا۔

''اس نے ابھی تک اپنی ماں کو بھی نہیں بتایا ہے۔ تمھاری آنٹی بہت کم زور دل کی ہیں۔ ان کا بلڈ پریشر ایک دم بڑھ جائے گا۔''

''آنٹی ہیں کہاں؟''

''شکاگو میں اپنے بھائی کے پاس۔'' سرجن رحمان اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ تکریم نے سوچا

آج وہ کیتھی کے گھر جا کر ہی پرسکون ہو سکیں گے۔ صوفے پر دوبارہ بیٹھ کر انھوں نے حیران کرنے والی ایک اور خبر سنائی۔ ''میں اگلے مہینے پاکستان جا رہا ہوں۔''

''اتنی جلدی؟ اچانک؟''

''سومی کے لیے۔ نینی کا خیال ہے، جیمز بیٹی کی کسٹڈی کے لیے کیس کر سکتا ہے۔ نینی چاہتی ہے جب تک عدالت میں طلاق کے معاملات طے نہ ہو جائیں، سومی میرے ساتھ پاکستان میں رہے۔''

''سومی ابھی صرف چھ سات سال کی ہے۔ ماں کے بغیر رہ سکے گی؟''

''رہنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے اسے نئی نانی بھی مل جائے۔ تمھارے باپ کا پرانا وعدہ ہے۔'' سر جن رحمان نے زوردار قہقہہ لگا کر موڈ بدل لیا۔ ساتھ ہی موضوع بھی۔

''تمھارا صدر واقعی اتنا اچھا ہے جتنا سجاد اس کی تعریف کرتا ہے؟''

''پاکستان میں ایسی حکومت پہلے کبھی نہیں آئی۔''

''مجھے تو کریزی لگتا ہے۔ سنا ہے تمھارے گھر کے برابر بنگلہ لے کر رہتا ہے اور اسی کو پریذیڈنٹ ہاؤس بنا دیا ہے۔''

''وہ کہتے ہیں جس ملک کے عوام کی اکثریت غریب ہو اس کے حکمرانوں کو محلوں میں نہیں رہنا چاہیے۔'' تکریم کو اپنی تقریر یاد آ گئی جو آج اس نے چرچ سنٹر میں کی تھی۔

''سجاد بتا رہا تھا وہ آج کل پریشان ہے۔''

''کون؟ ڈیڈی!''

''نہیں! صدر ایمان علی۔''

''کیوں؟''

''نیا آرمی چیف اسے ہارڈ ٹائم دے رہا ہے۔'' تکریم کو لگا جیسے اس کے دل کی ایک دھڑکن کم ہو گئی ہو۔

9

اسلام آباد

دو بنگلوں کے اپنے چھوٹے سے ایوان صدر کے ٹیرس پر صدر ایمان علی خزاں کے پیلے چاند پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ آسمان بہت دنوں بعد صاف ہوا تھا' ہوا بادل کو اڑا کر لے گئی تھی۔ پھر بھی چاند شفاف نہیں تھا۔ دھندلا دھندلا سا تھا۔ کنارے صاف کیے ہوئے نہیں تھے' لگتا تھا سردی میں سکڑ گئے ہیں۔ ایمان علی نے کندھوں پر پڑی ہوئی شال جسم پر مضبوطی سے کس لی۔ ہلکی سی جھرجھری آئی تھی۔ سردی تھی' ہوا بھی ٹھنڈی تھی' لیکن کپکپاہٹ کی وجہ سرد موسم نہیں تھا۔ وہ یورپ کی سردیوں میں پلا بڑھا تھا' اسے عادت تھی۔ شاید خوف کے احساس نے جسم میں انگڑائی لی تھی۔ کیا پچھلے تین سالوں کی محنت برباد ہو جائے گی؟ کیا پھر کوئی بیک اسپیس دبا کر پچھلا حرف مٹا دے گا؟

ایمان علی سر جھٹک کر چاند کی کرنوں سے توانائی حاصل کرنے لگا۔ اس نے چاندنی جذب کر کے ذہن صاف کرنے کی یہ ورزش چند سال پہلے شروع کی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب چاند راتوں میں محبت کی قندیلیں جلاتا تھا۔ کسی چھت، بالکونی یا ٹیرس پر اتری ہوئی چاندنی، کوئی حسین ساتھ، ہاتھوں اور آنکھوں میں چھلکتے ہوئے جام، ایک رومانی رات کی اس سے اچھی ترتیب ممکن نہیں تھی، لیکن وہ چاند سے متعلق رومانی علامتیں برسوں پہلے بھول چکا تھا۔ زندگی میں رومانس کی فرصت نہیں رہی تھی۔ ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جو کرنا چاہتا تھا کر رہا تھا۔ اب یہی اس کا رومانس تھا۔

نتائج اطمینان بخش تھے۔ ایمان علی مطمئن تھا۔ وہ ہر بڑی مہم سے پہلے اس کے سب سے خراب نتیجے کی منظر کشی کرتا تھا۔ کوئی نتیجہ اتنا برا نہیں نکلا جتنا سوچا گیا تھا۔ ترازو میں اچھے نتائج کا پلّہ بہت بھاری تھا، لیکن آج شام ہونے والے اجلاس نے خطرے کی گھنٹیاں بجادی تھیں۔ ایمان علی کے کانوں میں جنرل اکبر کی باتیں گونج رہی تھیں۔ کیا ایک شام میں سب کچھ برباد ہو جائے گا؟ اسے پھر کپکپی آئی۔ نظریں چاند سے ہٹ کر گلی کے سامنے بڑے سے ویران میدان میں پھیلے ہوئے سناٹے پر جمی تھیں کہ ٹیرس کا دروازہ کھلنے اور بھاری بوٹوں کی دھمک نے چونکا دیا۔ تین رائفل بردار فوجی تیزی سے آئے اور انھوں نے ایمان علی کو اپنی اوٹ میں لے لیا۔ صدر کا اے ڈی سی کرنل افتخار ان کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ ایمان علی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے سب کچھ توقع کے مطابق ہوا ہو۔ خطرے کی گھنٹیاں تین سال سے بج رہی تھیں۔ پھر بھی اسے امید نہیں تھی کہ فوج اتنی جلدی حرکت میں آجائے گی۔ وہ صرف ایک گھنٹہ پہلے میٹنگ کر کے گئے تھے۔ انٹیلی جنس کی رپورٹوں میں ایسا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ فوج اس کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے۔ جنرل منصف صرف چار مہینے پہلے رِٹائر ہوا تھا۔ نئے فوجی سربراہ جنرل غلام اکبر نے ایمان علی کی انقلابی اصلاحات کے لیے جنرل منصف کی قیادت میں پوری تن دہی سے کام کیا تھا۔ کیا چار مہینے میں سب کچھ بدل گیا

تھا؟ کیا آئی ایس آئی آج بھی اتنی طاقت ور تھی۔

کرنل افتخار ایمان علی کا بازو پکڑ کر تیزی سے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ اس نے اپنے پیچھے ٹیرس کا دروازہ بند کر کے پستول واپس ہولسٹر میں رکھ لیا تھا۔ ایمان علی کو لگا طوفان گزر گیا ہے۔ اندر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کوئی غیر معمولی نقل و حرکت نہیں تھی۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ وہ اتنا وہمی کیوں ہو گیا تھا؟ اسے اپنی صدارت کا پہلا دن یاد تھا۔ وہ اتنا پر اعتماد تھا کہ پوری دنیا بدلنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ اب تین سال بعد' جب کئی چنگھاڑتے شیروں کو چپ کرا چکا تھا تو ایک ہلکے سے کھٹکے سے اچھل پڑا تھا۔

''کرنل افتخار یہ سب کیا ہے؟''

''سر! آپ ٹیرس پر بالکل ایکسپوز تھے۔ کرنل شفقت کا خیال ہے آپ بہت آسانی سے ٹارگٹ ہو سکتے تھے۔''

''آمنے سامنے کے دو دو بنگلے ہمارے ہیں' کرنل شفقت نے چھتوں پر مورچے لگائے ہوئے ہیں' اس کے بعد بھی؟''

''آپ ٹیلی اسکوپک رائفل کی رینج میں تھے۔ کوئی شارپ شوٹر آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔''

''نشانہ بنانے والے کو آپ نہیں روک سکیں گے۔ آج کل ریموٹ کنٹرول بموں کا زمانہ ہے۔ دور سے کوئی بٹن دبائے گا اور سب مورچے ڈھیر ہو جائیں گے۔''

''ممکن نہیں ہے۔ ہر چار گھنٹے بعد پورے علاقے کی اسکیننگ ہوتی ہے۔ کچرے کے ڈبے' گاڑیوں کے اندر اور نیچے' اسکوٹریں اور سائیکلیں ڈیٹکٹر سے دیکھی جاتی ہیں۔ اندر آنے والوں کی پوری تلاشی ہوتی ہے۔ بم اندر نہیں آ سکتا۔''

''آپ کو انڈیا اور سری لنکا کے پرائم منسٹر یاد ہیں؟''

''سر! وہ سوسائیڈ بامبرز کا کام تھا۔ فریڈم فائٹرز جان دے سکتے ہیں۔ آپ کے

مخالفین جان پر کھیلنے والے نہیں ہیں۔ وہ کسی سولجر آف فارچون کو تلاش کریں گے۔ کرائے کے قاتل جان لینا جانتے ہیں دینا نہیں۔ کرنل شفقت نے ہر امکان پر نظر رکھی ہے۔ کوئی مشکوک آدمی قریب نہیں آ سکتا۔''

ایمان علی خاموش ہو گیا۔ اسے پابندیوں اور سیکورٹی کے نام پر قید رہنا پسند نہیں تھا' لیکن جنرل منصف نے اسے مجبور کیا تھا۔ ایمان علی خود بھی سمجھتا تھا۔ اس نے جن طاقتوں کو چھیڑا تھا وہ انتہائی قدم اٹھا سکتے تھے۔ احتیاط ضروری تھی۔ کرنل شفقت کو بہت سوچ سمجھ کر چنا گیا تھا۔ وہ سیکوریٹی کے کام کا ماہر اور بہت ہوشیار افسر تھا۔ جنرل منصف نے کہا تھا کہ وہ ایمان علی کی جان ہی نہیں' ملک کا مستقبل اس کے ہاتھ میں دے رہا ہے۔ کرنل شفقت نے اس چیلنج کو قبول کر کے ایمان علی کے گرد فولاد کی چہار دیواری کھڑی کر دی تھی۔

''سر! کرنل شفقت نے ٹیرس پر پہرہ مستقل کر دیا ہے۔'' کرنل افتخار نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''!Nonsense میں پہلے بھی منع کر چکا ہوں۔'' ایمان علی نے سر جھٹک کر کہا۔ ''اس ملک کے صدر کو چند لمحے کھلی ہوا میں گزارنے کا حق ملنا چاہیے۔''

''کرنل شفقت نے......''

''کرنل شفقت کا بس چلے تو وہ ایک فوجی میرے باتھ روم کے اندر بھی کھڑا کر دے۔''

''سر یہ کرنل شفقت کا قصور نہیں ہے۔ آج جنرل اکبر میٹنگ کے لیے آئے تھے تو انھوں نے سیکورٹی ٹائٹ کرنے کے لیے کہا ہے۔ کرنل شفقت کا خیال ہے ٹیرس کا ہول cover کرنا ضروری ہے۔ میں نے آپ کی طرف سے او۔ کے دے دی ہے۔''

ایمان علی نے غصے سے کرنل افتخار کی طرف دیکھا لیکن پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''میری طرف سے صدارتی حکم جاری کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیا کیجیے۔'' اس

نے مسکرا کر کہا۔

''آئی ایم سوری سر!''

''It's O-K!' آپ نے چاندنی پر پہرہ لگایا ہے' اس ملک کے شاعر آپ کو معاف نہیں کریں گے۔''

''سر میں خود شاعر ہوں......''

''خدا کے لیے نہیں! شاعری کے میدان میں فوجی پریڈ ہونے لگی تو کوئی بے وفا محبوب زندہ نہیں بچے گا۔'' ایمان علی نے ہنس کر کہا۔ کرنل افتخار نے بھی عادتاً قہقہہ لگانے کی کوشش کی لیکن درمیان میں رک گیا۔ صدر کا ادب لازم تھا۔

کرنل افتخار قہقہے لگانے والا خوش باش آدمی تھا۔ صدر کے سامنے اے ڈی سی کا قہقہے لگانا پروٹوکول کی خلاف ورزی تھا اس لیے محتاط رہتا تھا۔ اسے ایک طرح سے ایمان علی کے آل راؤنڈ اسسٹنٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اس سے حالات حاضرہ سے لے کر شاعری تک ہر موضوع پر تبادلۂ خیالات کر سکتا تھا۔ وہ باتیں چباتا نہیں تھا' اپنی سوچیں کھول کر سامنے رکھ دیتا۔ ایمان علی کو اس کی یہ بات پسند تھی۔

''کرنل شفقت کو میرے پاس بھیجیے۔'' ایمان علی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''یس سر!'' کرنل افتخار سیکیورٹی چیف کی اچانک طلبی پر حیران ہوا۔ ایمان علی کرنل شفقت کو دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کرنل شفقت خود بھی سامنے آنے سے گریز کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ صدر سیکیورٹی کی سختیوں سے خوش نہیں ہیں۔

ایمان علی اپنے کمرے میں گیا جہاں اللہ داد نے اس کی شال لی اور کوٹ پہننے میں ایمان علی کی مدد کرنے لگا۔ دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ایمان علی کے رسمی اور غیر رسمی لباس میں صرف کوٹ اور شال کا فرق تھا۔ جب سے صدر بنا تھا کسی نے اسے شلوار قمیص کے علاوہ دوسرے لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ اپنے دفتر میں' ملاقاتوں' اجلاس اور سرکاری کام کے دوران'

سردی ہو یا گرمی، کوٹ ضرور پہنتا۔ دفتر کی حدود سے نکل کر رہائشی حصے میں آتا تو کوٹ اتار دیتا۔ سردی ہوتی تو شال لپیٹ لیتا ورنہ کچھ نہیں۔

اللہ داد ایمان علی کا ذاتی خدمت گار اور محافظ تھا۔ وہ ان کے خاندان کا آبائی ملازم تھا جسے ایمان علی اپنے ساتھ گاؤں سے لے کر آیا تھا۔ وہ ہر رات ایمان علی کے سونے کے بعد اس کے کمرے کے باہر ایک کوچ پر بستر لگا کر سو جاتا۔ ذرا سا کھٹکا ہوتے ہی اچھل پڑتا اور پستول ہاتھ میں لیے گہرے گہرے سانس لینے لگتا جیسے خطرہ سونگھ رہا ہو۔ اس کے اندر خطرہ سونگھنے کی وہی حس تھی جو شکاری کتوں میں ہوتی ہے۔ ایمان علی کو کئی بار تجربہ ہو چکا تھا۔ اسے صدر بننے سے پہلے جنگلوں میں شکار کھلانے اللہ داد ہی لے کر جایا کرتا تھا۔ کرنل شفقت نے ایمان علی کے کمرے کے باہر ایک فوجی متعین کرنے پر اصرار کیا تھا لیکن ایمان علی نے منع کر دیا تھا۔ خواب گاہ کی حفاظت کے لیے اللہ داد کافی تھا۔

کرنل شفقت کرنل افتخار کے ساتھ صدارتی دفتر میں داخل ہوا اور سیلیوٹ کر کے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایمان علی نے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیٹھا تو بالکل اکڑ کر۔ جسم کا کوئی عضو حرکت نہیں کر رہا تھا۔

''ایٹ ایز کرنل!'' ایمان علی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میرے ٹیرس پر جو فوجی پہرہ دے رہے ہیں ان کا کھانا اور چائے پانی میرے کچن سے جائے گا۔ میں نے اللہ داد سے کہہ دیا ہے۔''

''سر......''

''مجھے معلوم ہے آپ کا اپنا انتظام ہے۔'' ایمان علی نے کرنل شفقت کو بولنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ ''وہ میرے گھر کی حفاظت کر رہے ہیں، ان کا خیال رکھنا میری ذمہ داری ہے۔ یہ میرے گھر کی روایت ہے۔''

''یس سر!''

''مجھے ڈر ہے آپ کی ساری توجہ مجھ پر ہے۔ آپ میری کابینہ کو بھول گئے ہیں۔ میرے ایڈوائزرز کو بھی اتنا ہی خطرہ ہے جتنا مجھے۔''

''ان کی سیکیورٹی بھی اتنی ہی ٹائٹ ہے جتنی آپ کی۔ ہم غافل نہیں ہیں۔''

''تھینک یو!'' ایمان علی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ کرنل شفقت بھی فوراً اٹھ گیا۔

''میں نے آپ کو اسی لیے بلایا تھا۔ آپ میری اور میرے ساتھیوں کی حفاظت کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں میں اس کا ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

''It's my duty sir!'' کرنل شفقت نے ایمان علی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا اور سیلوٹ کر کے کمرے سے چلا گیا۔

''کرنل افتخار! جنرل منصف کو فون کر کے پوچھیے کیا وہ ڈنر سے آدھے گھنٹے پہلے آسکتے ہیں۔''

کرنل افتخار سر ہلا کر باہر اپنے دفتر میں چلا گیا تو ایمان علی کچھ دیر پہلے جنرلوں سے ہونے والی میٹنگ کے بارے میں سوچنے لگا۔ جنرل غلام اکبر کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ وہ چار مہینے پہلے والا جنرل نہیں تھا۔ وہ ایئر فورس' نیوی اور آئی ایس آئی کے سربراہوں کے ساتھ دفاعی صورت حال کا جائزہ لینے والے ہفتہ واری اجلاس کے لیے آیا تھا۔ نیوی اور ایئر فورس کے چیف اپنی بریفنگ دے چکے تو اس نے دھماکہ کیا تھا۔

''انٹیلی جنس نے جموں کشمیر سیکٹر میں انڈین آرمی کی موومنٹ رپورٹ کی ہے۔ ایک پورا ڈویژن حرکت میں ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس اور آئی ایس آئی نے کنفرم کیا ہے۔'' جنرل غلام اکبر نے آئی ایس آئی کے چیف جنرل حفیظ کی طرف دیکھ کر کہا جو زور زور سے سر ہلا رہا تھا۔

''کیوں؟ کسی اشتعال کے بغیر؟'' ایمان علی کو واقعی سخت حیرت ہوئی تھی۔

''وہ روٹین کی فائرنگ کو بہانہ بنا رہے ہیں۔''

''روٹین کی فائرنگ؟ آپ نے مجھے کبھی روٹین کی فائرنگ رپورٹ نہیں کی۔''

''کبھی کبھی خون گرم رکھنے کے لیے ہوائی فائرنگ کرنا پڑتی ہے۔ وہ بھی کرتے ہیں اور ہم بھی...... سرحدوں پر چلنے والی ہر گولی کا حساب رکھنا مشکل ہے۔''

''رکھنا پڑے گا۔'' ایمان علی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ گولی اس ملک کے غریب عوام کے دیے ہوئے ٹیکسوں سے خریدی جاتی ہے۔ اس گولی کا حساب رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔''

''مسٹر پریذیڈنٹ! اس وقت ہماری ذمہ داری باڈرز کی سیکیوریٹی ہے۔'' جنرل کا لہجہ بھی سرد تھا۔ ''دشمن اچانک ہمارے سر پر آ گیا تو ہمیں وقت نہیں ملے گا۔ ہمیں فوری تیاری کرنا ہوگی۔''

''تیاری؟ کیسی تیاری؟''

''ہمارا بجٹ ناکافی ہے۔ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' نیول اور ایئر چیفس بھی اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔ ''یوکرین سے جو پرانے ٹینک خریدے تھے انھیں زنگ لگ گیا ہے۔ spares نہ ہونے کی وجہ سے جہاز ہینگرز میں کھڑے ہیں۔ فریگیٹ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ہم دشمن سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ وہ کسی وقت بھی ہم پر چڑھائی کرسکتا ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ کیوں؟''

''امریکہ چین کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے۔ ہندوستان اس موقع سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ براہ راست چین کو انگیج نہیں کرنا چاہتا اس لیے پاکستان سے جنگ کی ہوگی کھڑا کر کے دنیا بھر سے اسلحہ خریدے گا۔ روس پہلے بھی اس کے ساتھ تھا' سرد جنگ ختم ہونے کے بعد امریکہ بھی اس کی طرف جھک گیا ہے۔''

''انڈیا کو پتا ہے چین سے ہمارا دفاعی معاہدہ ہے۔ وہ ہماری مدد کو آئے گا۔''

''شاید نہیں! چین فل اسکیل وار کے بغیر جنگ میں نہیں کودے گا۔ انڈیا لمیٹڈ وار کی اسٹریٹیجی اپنائے گا۔ ہمارے پاس جنگ پھیلانے کی طاقت نہیں ہے۔ ہمیں اسی کے بنائے ہوئے میدان میں لڑنا پڑے گا۔''

''ہم جانتے ہیں پھر بھی اس جال میں پھنسنا چاہتے ہیں؟''

''کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ یہ domino ایکشن ہے۔ ایک کے اوپر ایک گرنے کا عمل' اسے روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ہمیں جنگ کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔''

''میرا خیال ہے ہم اس ڈومینو ایکشن میں کہیں موجود نہیں ہیں۔'' ایمان علی نے اس ضدی لہجے میں کہا جس کے لیے وہ مشہور تھا۔ ''نئی سرد جنگ شروع کرنا امریکہ کا economic imperitive ہے۔ اس کی معاشی مجبوری' اپنی ڈیفنس انڈسٹری کا سب سے بڑا گاہک خود امریکہ اور اس کے اتحادی ہیں۔ اسے چین جیسا بڑا دشمن چاہیے۔ امریکی میڈیا اور انالسٹ ڈرا رہے ہیں کہ امریکیوں کے سر پر کسی بھی وقت چینی' کوریائی اور ایرانی میزائل برسا سکتے ہیں۔ امریکی عوام اپنے کھربوں ڈالر ڈیفنس پر خرچ ہوتے دیکھ کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہم اس تماشے میں کہیں موجود نہیں ہیں۔''

''خلا اور زمین دونوں جگہ امریکہ کی بادشاہت ہے۔'' جنرل غلام اکبر نے جو اس طرح کے تجزیے کئی بار سن چکا تھا' متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ''ہمارے تجزیے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اپنے ڈالر' وار مشینری اور میڈیا کے ذریعے امریکہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہمیں پتا ہے وہ چین سے براہ راست جنگ نہیں کرے گا لیکن آس پاس خندقیں کھودے گا۔ اردگرد بھٹیاں دہکائے گا۔ روس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے نہ بھولیے۔''

''مجھے یاد ہے۔ اسی لیے میں کسی اور کی بھٹی کا ایندھن بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ ہم دہانے پر کھڑے ہیں۔ وقت آیا تو ہمیں کودنا پڑے گا۔ ہم نہیں کودے تو کوئی دھکا دے کر ہمیں اس بھٹی میں جھونک دے گا۔''

''جنرل اکبر! آپ کیا چاہتے ہیں؟ تین سال میں جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے رول بیک کر دیں' ہیلتھ' ایجوکیشن اور ڈویلپمنٹ کے بجٹ دوبارہ ڈیفنس کی بھٹی میں ڈال دیں؟''

''مسٹر پریذیڈنٹ! نیا پاکستان بنانے کے پروسیس میں فوج نے آپ کا ساتھ دیا

ہے۔ اپنے بجٹ اور سہولتوں کی قربانی دی ہے۔ ہم اب بھی اپنے لیے کچھ نہیں مانگتے‘ صرف سرحدوں کی حفاظت کرنے کی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

ایمان علی خاموشی سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے چاروں فوجی افسروں کو دیکھتا رہا۔ وہ چہروں پر کوئی تاثر سجائے اور پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہے تھے۔ ایمان علی نے ہتھیار ڈال دیے۔

’’آپ اپنی ضروریات کی مکمل رپورٹ بھجوایئے۔ سورسز اور تخمینوں سمیت‘ میں حبیب الحق کو الرٹ کرتا ہوں۔ وہ آپ کے لیے فنڈز تلاش کریں گے۔‘‘ حبیب الحق وزیر خزانہ تھا۔

’’مسٹر پریذیڈنٹ! رپورٹیں بنانے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں وہیل فوراً رول کرنے کی ضرورت ہے۔‘‘

’’آپ کا خیال ہے فنڈز ملتے ہی ٹینک گولے اگلنے اور جہاز اڑنے لگیں گے؟‘‘ ایمان علی نے جنرل کو سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’آپ کو معلوم ہے ڈیفنس بجٹ بلینکٹ میں لپیٹ کر دینے کی روایت ختم ہو چکی ہے۔ رپورٹیں آپ کو بنانا پڑیں گی۔ جنرل منصف آپ سے کوآرڈینیٹ کریں گے۔ رپورٹ ملتے ہی ۲۴ گھنٹے میں ایکشن کی گارنٹی دیتا ہوں۔‘‘ جنرل منصف کو ریٹائر ہونے کے بعد قومی سلامتی اور دفاع کا وزیر بنا دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے یہ وزارت خود ایمان علی کے پاس تھی۔

سب جانے کے لیے اٹھنے لگے‘ لیکن ایمان علی کی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جنرل غلام اکبر کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔ ’’اپنے ٹروپس کو کنٹرول میں رکھیے۔ ہماری طرف سے کوئی پرووکیشن نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے پکچر میں رکھیے اور پلیز مس گائیڈ مت کیجیے گا۔ میں غلط بیانی کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔‘‘

’’جناب صدر! ہم پر اعتماد کیجیے۔ ہمارے لیے سب سے مقدم سرحدوں کی سیکیورٹی

ہے۔'' جنرل نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

ایمان علی نے کچھ نہیں کہا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔ چاروں فوجی افسر اٹھ کر جانے لگے تو ایمان علی نے جنرل حفیظ کو روک لیا اور باقی تینوں کو دروازے تک چھوڑنے گیا۔ اپنی نشست پر آنے سے پہلے اس نے دفتر کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

''جنرل حفیظ! انٹر سروسز انٹیلی جنس کس کو جواب دہ ہے۔'' ایمان علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سپریم کمانڈر آف دی آرمز فورسز''

''یعنی!''

''To you Mr. President!''

''ملٹری انٹیلی جنس نے انڈین فورسز کی موومنٹ کے بارے میں بتایا' آپ نے مجھے رپورٹ نہیں کیا۔ آپ نے اپنی سورسز سے ایم آئی کی رپورٹ کنفرم کی' لیکن مجھے رپورٹ نہیں کیا۔ ملک کی سرحدوں پر اتنا بڑا خطرہ منڈلا رہا ہے' آپ نے اس سے اس ملک کے صدر اور سپریم کمانڈر کو آگاہ نہیں کیا۔ آپ براہ راست آرمی چیف کو رپورٹ کرتے رہے' میں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟''

''میرا خیال تھا کہ جنرل اکبر سرحدوں کی سیکیوریٹی کے ذمہ دار ہیں۔ انھیں فوری رپورٹ کرنا ضروری ہے۔ آپ کو ہم آج کی میٹنگ میں بریف کرنے والے تھے۔''

''جنرل! ملک کی حفاظت کا ذمہ دار یہ دفتر ہے۔ یہ دفتر!'' ایمان علی نے اپنی میز پر زور زور سے گھونسے مارتے ہوئے کہا' لیکن پھر اپنے غصے پر قابو پا لیا۔ ''آپ آؤٹ آف لائن تھے' یہ Insubordination ہے۔''

''میرا استعفیٰ صبح آپ کی میز پر پہنچ جائے گا۔'' جنرل حفیظ نے مزید گفتگو بے کار سمجھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' ایمان علی بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ ''مجھے آپ کا استعفیٰ منظور کرتے ہوئے خوشی ہو گی۔''

ایمان علی آئی ایس آئی کے مستعفی ہونے والے سربراہ کو بھی دروازے تک چھوڑنے آیا۔ جنرل حفیظ کا چہرہ سرخ تھا۔ وہ حکم دینا جانتا تھا' اسے ڈانٹ سننے کی عادت نہیں تھی۔ جنرل حفیظ کو چھوڑ کر ہی ایمان علی نے اپنے رہائشی حصے میں آ کر کوٹ اتارا تھا اور شال اوڑھ کر چاندنی کا مزا لینے ٹیرس پر آ گیا تھا' لیکن کرنل شفقت کے پہرے داروں نے اسے چاندنی کا لطف نہیں لینے دیا تھا اور اسے ٹیرس سے کھینچ کر لے گئے تھے۔

کرنل افتخار نے اندر آ کر جنرل منصف کا اپائنٹ منٹ کنفرم کیا۔ اسی وقت فیاض منگی صدر کے دفتر میں داخل ہوا۔ کرنل افتخار جانتا تھا یہ دن بھر کے معاملات کو سمیٹنے اور اگلے دن کا ایجنڈا بنانے کا وقت ہے۔ اب کسی کی مداخلت ممکن نہیں تھی۔ وہ باہر اپنے دفتر میں آ گیا۔ گھڑی دیکھی تو ساڑھے چھ بجے تھے۔ وقت کی ترتیب بالکل صحیح تھی۔ فیاض منگی ایک گھنٹے ایمان علی کے ساتھ رہے گا۔ ساڑھے سات بجے جنرل منصف کے آنے کا وقت تھا۔ آٹھ بجے ڈنر کے لیے کابینہ کے ارکان آنا شروع ہوں گے۔ کھانے کے بعد دس بجے تک کابینہ کا اجلاس چلے گا۔ جس کے بعد ایمان علی اپنے اقامتی حصے میں چلا جائے گا۔ اس کے بعد ایمان علی سے رابطہ صرف اللہ داد یا ایمان علی کے سرہانے رکھے ہوئے سرخ فون کے ذریعے ممکن تھا۔

ایمان علی کی انتظامی مشینری مختصر لیکن بہت تیز رفتار تھی۔ فائلوں کی نقل و حرکت کم سے کم کر دی گئی تھی۔ برقی ڈاک اور نیٹ ورکنگ نے کام کی رفتار کئی گنا بڑھا دی تھی۔ ایوان صدر کے دونوں بنگلوں کے اوپری حصے ایمان علی کے پاس تھے۔ ایک میں ایمان علی کا دفتر تھا۔ دوسرا حصہ ایمان علی کے ذاتی استعمال کے لیے تھا جہاں وہ رہتا' سوتا اور اپنے ذاتی دوستوں سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ بنگلوں کے دونوں نچلے حصوں میں صدارتی عملے کے دفاتر تھے۔ یہ صدر کے چیف آف اسٹاف اور پرنسپل سیکرٹری فیاض منگی کی عمل داری تھی۔ ایک کمرہ کرنل شفقت کا

کنٹرول روم تھا جہاں بیٹھ کر وہ ایمان علی اور اس کی کابینہ کی سیکیوریٹی کی نگرانی کرتا تھا۔ نچلے حصے میں پیچھے کی طرف ایک چھوٹا سا لان تھا۔ موسم اچھا ہوتا تو ایمان علی کرنل شفقت کی مخالفتوں کے باوجود' مشیروں کے ساتھ اسی لان میں بیٹھ کر اپنے اجلاس کرتا تھا۔

ایوان صدر کے ان دو بنگلوں کے سامنے والے دونوں بنگلے بھی حکومت کے پاس تھے۔ ان دو منزلہ مکانوں میں ایمان علی کے مشیروں اور ان کے ذاتی عملے کے دفاتر تھے۔ کام کرنے کا جو نظام ترتیب دیا گیا تھا اس میں تین برسوں کے دوران چند موقعوں کے علاوہ کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ صوبوں میں جہاں گورنر راج تھا وہاں کے گورنر ہاؤس بھی چھوٹے بنگلوں میں آ گئے تھے۔ صوبائی کابینہ کا اجلاس ہوتا تو اس کی بریفنگ اجلاس ختم ہونے کے آدھ گھنٹے کے اندر ایمان علی اور فیاض منگی کے کمپیوٹرز میں پہنچ جاتی تھی۔ تمام وفاقی وزارتوں کی روزانہ کارگزاری کی مختصر رپورٹیں بھی شام چھ بجے تک پہنچنا ضروری تھیں۔ سات سے آٹھ بجے کے درمیان فیاض منگی ایمان علی کے ساتھ اس کے دفتر میں بیٹھ کر ضروری احکامات اور ہدایات حاصل کرتا اور فائلیں نمٹاتا۔ ایمان علی کے مشیر اور کابینہ کے جو ارکان بھی اسلام آباد میں ہوتے وہ آٹھ بجے تک ایوان صدر پہنچ کر ایمان علی کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوتے۔ ڈنر کی غیر رسمی گفتگو کے بعد دس بجے تک اہم معاملات پر بحث اور فیصلے کیے جاتے جس کے بعد ایمان علی مزید ایک گھنٹہ اپنے دفتر میں گزارتا جو سوچ بچار اور کسی بھی اہم معاملے پر فیصلہ کرنے کا وقت ہوتا۔

دیر سے سونے کے باوجود وہ صبح سات بجے اٹھتا اور نو بجے تر و تازہ اپنے دفتر میں موجود ہوتا۔ کرنل افتخار کو یاد نہیں تھا کہ اس نے تین سالوں میں ایمان علی کو کبھی بیمار دیکھا ہو۔ اسے حیرت تھی اپنے زمانے کا خوش باش' کھلنڈرا اور پلے بوائے کس طرح ایک مشین بن گیا تھا۔ شاید تاریخ میں زندہ رہنے والوں کے لیے ضروری تھا کہ ان کا ہر فعل اور عمل ان کے فیصلوں کے تابع ہو اور وہ اپنی سوچوں کو ایک محور پر مرکوز رکھ سکتے ہوں۔ کرنل افتخار کا خیال تھا کہ

ایمان علی میں وہ تینوں خوبیاں تھیں جو ہنری کسنگر کے مطابق امریکی صدر میں ہونا ضروری تھیں۔ کسنگر کے مطابق امریکی صدر کے لیے ضروری تھا کہ وہ صاحب کردار ہو یعنی اس کی ذات سے کوئی اسکینڈل وابستہ نہ ہو اس میں مشکل فیصلے کرنے کی ہمت ہو اور وہ کسی بھی اہم سے اہم شخص کو پلک جھپکائے بغیر برطرف کرسکتا ہو۔ کسنگر نے ذہانت کو امریکی صدر کی خوبی میں شمار نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا ذہانت ڈھیروں کے حساب سے خریدی جاسکتی تھی۔ ریگن اور جونیئر بش کسنگر کے اس بیان کی تفسیر تھے۔ کرنل افتخار کا خیال تھا ایمان علی میں امریکی صدر والی تینوں خوبیوں کے علاوہ ذہانت بھی موجود تھی، وہ نڈر اور بے باک تھا اور ہفتے میں ساڑھے چھ دن کام کرنے والی مشین بھی! کرنل افتخار دل میں دعا کرتا تھا کہ کبھی کوئی ایسا مقام نہ آئے جہاں ایمان علی ضائع کردیا جائے۔ وہ جانتا تھا ایمان علی کا بدل ملنا آسان نہیں تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا دعائیں اکثر قبول نہیں ہوتیں۔

ایمان علی اتوار کا نصف دن اپنے آبائی گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ گزارا کرتا۔ ایمان علی کا گاؤں اسلام آباد سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ وہ صبح ہی صبح نکل جاتا۔ آگے پیچھے فوجی محافظوں کی جیپیں اور درمیان میں ایمان علی کی کار جو ایمان علی خود ڈرائیو کرتا تھا۔ کرنل شفقت کے لیے یہ سب سے زیادہ اعصابی تناؤ کا دن تھا۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھے ہوئے صدر کی حفاظت کرنا آسان تھا، لیکن سڑک پر ڈرائیو کرنے کے دوران اور گاؤں کی کھلی فضا میں حفاظتی انتظامات کرنا مشکل تھا۔ کرنل شفقت نے گاؤں میں ہیلی پیڈ بنا کر ہیلی کاپٹر سے آنے جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایمان علی نے منع کردیا تھا، لیکن کرنل شفقت نے خود ساتھ رہنے پر اصرار کیا تو منع نہیں کرسکا تھا۔ نتیجتاً ایمان علی کی گاؤں میں موجودگی کے دوران حویلی کے آس پاس کا علاقہ فوجی چھاؤنی کا منظر پیش کرتا۔

ایمان علی کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔ تین بہنیں تھیں، دو ملک سے باہر تھیں، ایک بیوہ تھی اور اپنے بچوں کے ساتھ ماں کے پاس گاؤں میں رہتی تھی۔ ایمان علی کی آمد پر حویلی میں تہوار کا

سماں ہوتا۔ ملنے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ ایمان علی کی ماں کا سب سے بڑا مسئلہ ایمان علی کی شادی تھا۔ ہر اتوار کو وہ دو تین ایسی لڑکیاں مدعو کرتی جن کے بارے میں اس کا خیال تھا وہ ایمان علی کی بیوی بننے کی اہل ہیں۔ لڑکیاں جانتی تھیں کہ ایمان علی ان سے شادی نہیں کرے گا، لیکن ان کے لیے ایمان علی کے امیدواروں کی فہرست میں شامل ہونا اور ایمان علی کا مہمان ہونا بھی اعزاز کی بات تھی۔ سب چلے جاتے تو ماں اور بہن کے ساتھ دل بھر کے باتیں ہوتیں۔ سیاست پر بات کرنا منع تھا۔ ماں بیٹی کو سیاست سے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ ان کے پاس سنانے کے لیے بے شمار گھریلو قصے تھے۔ باہر رہنے والی بہنوں کو پتا تھا بھائی گھر آیا ہوگا، باری باری ان کا فون آجاتا تو گفتگو کے نئے عنوان مل جاتے۔ باتوں سے دل بھرتا تو ایمان علی اکیلا کھیتوں میں گھومنے نکل جاتا، وقت ہوتا تو اللہ داد کے ساتھ قریب کی جھیل میں مرغابیوں کا شکار کرتا۔

چھ بجے سے پہلے واپس اسلام آباد پہنچنا ضروری تھا۔ اتوار کے دن فیاض منگی سے چھ سے سات والی میٹنگ کے علاوہ باقی تمام سرکاری مصروفیات کی چھٹی تھی۔ آٹھ بجے تک وہ اپنے اقامتی علاقے میں آجاتا۔ اتوار کی رات دوستوں کے ساتھ ڈنر کے لیے مخصوص تھی۔ وہ دوست جن کے سامنے اپنی عادت کے مطابق میز پر پاؤں پھیلائے زور زور سے قہقہے لگا سکتا اور غصے یا محبت کا اظہار کر سکتا تھا۔ اتوار کی رات وہ ''صدر محترم'' نہیں صرف ایمان علی تھا۔ مسز چنائے اپنے شوہر کے پاس بحرین نہ گئی ہوتی تو ڈنر کا انتظام اس کی ذمہ داری تھا۔ بحرین کے کروڑ پتی شیخ علی سے شادی کرنے کے باوجود وہ اپنے مرحوم شوہر کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ ایمان علی کی اس زمانے سے دوست تھی جب وہ دونوں آکسفورڈ میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ بھی نئے پاکستان کے خواب کی اسیر تھی اور اپنے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے ایمان علی پر سرمایہ کاری کر رہی تھی[1]۔ اسلام آباد کے حلقوں میں ایمان علی اور مسز چنائے کے درمیان عشق کی افواہیں گرم تھیں۔ دونوں کو قریب سے جاننے والے ان افواہوں پر صرف ہنس دیا کرتے تھے۔

۱۔ مسز چنائے کی کہانی کے لیے ''بے وطن'' اور ''وزیراعظم'' پڑھیے۔

فیاض منگی ٹھیک ساڑھے سات بجے ہاتھوں میں فائلوں کا انبار اٹھائے صدر ایمان علی کے دفتر سے باہر نکلا۔ جنرل منصف کے آنے کا وقت ہو گیا تھا' اس کے استقبال کے لیے کرنل افتخار بھی فیاض منگی کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔ جنرل منصف جو اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر کے آیا تھا' اب اتر کر دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ پتلون قمیص اور اس پر خاکی جیکٹ' دانتوں میں آدھا پیا ہوا بے جلا سگار۔ کرنل افتخار نے آگے بڑھ کر سیلیوٹ کیا۔ جنرل منصف ریٹائر ہو چکا تھا لیکن کرنل شفقت اور کرنل افتخار اسے آج بھی حاضر جنرل کا پروٹوکول دیتے تھے۔ جنرل منصف کرنل افتخار کی پیشوائی میں اوپر آیا تو ایمان علی اپنے دفتر کے دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں کے اندر جاتے ہی دفتر کا دروازہ بند ہو گیا۔

کھانے کے کمرے سے برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خانساماں اور بیرے کابینہ کے اجلاس کے لیے کھانا لگا رہے تھے۔ کھانے کے دوران بیروں کو کمرے کے اندر ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایمان علی کی طرح اس کی کابینہ کے وزیروں کو بھی اپنی مدد آپ کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ کرنل افتخار کچھ دیر کھڑا صدر ایمان علی کے دفتر کے بند دروازے کو گھورتا رہا جیسے اس کے پار ہونے والا منظر دیکھ رہا ہو' پھر تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے بھی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ایمان علی اپنے دفتر میں جنرل منصف کو بھارتی فوجوں کی نقل و حرکت اور اس بارے میں جنرل اکبر کا تجزیہ بتا رہا تھا۔

''چین کے حوالے سے انڈیا امریکہ تعلق کی یہ پرانی تھیوری ہے۔'' جنرل منصف نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بھارت کو چین کے خلاف تیاری کے لیے بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اعلانیہ کہتا ہے کہ اسے ہم سے نہیں چین سے خطرہ ہے۔ جنرل اکبر کی منطق الٹی ہے۔''

''انٹیلی جنس نے انڈین ٹروپس کی موومنٹ کنفرم کی ہے۔ جنرل اکبر کی تشویش غلط

نہیں ہے۔'' ایمان علی کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''جنرل اکبر کو بہانہ مل جائے گا۔''

''بہانہ؟ کس بات کا؟''

''جنرل اکبر نوجوانی کے زمانے سے کشمیر فتح کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ کارگل جیسا ایڈونچر شروع کرسکتا ہے۔''

''کشمیر فتح کرنے کے خواب میں بھی دیکھتا ہوں۔ آپ بھی دیکھتے ہیں۔ ہم سب دیکھتے ہیں، لیکن خواب اور حقیقت میں فرق ہے۔ ہم جنگ کے ذریعے کشمیر نہیں لے سکتے۔ کشمیر کی جنگ سفارتی محاذ پر جیتنا ہوگی۔''

''فوج میں کچھ لوگوں کا خیال ہے ہم ایٹمی حملے کے ذریعے کشمیر فتح کر سکتے ہیں۔ بھارت ویسٹرن سیکٹر پر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ کشمیر باقی بھارت سے کٹ جائے گا تو ہم کنٹرول لائن توڑ کر اندر گھس سکتے ہیں۔ کشمیری seperatists ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہوں گے۔''

''انڈیا خاموشی سے یہ وار سہہ لے گا؟ وہ جواب میں ایٹمی حملہ نہیں کرے گا؟''

''اسٹرائک فرسٹ! دشمن کو حیران کر کے مارنے کی حکمت عملی۔ جس نے پہلا حملہ کیا اسی کو سبقت حاصل ہوگی۔ ان کا خیال ہے کہ جوابی وار کاری نہیں ہوگا۔ ہوا بھی تو collateral damage! فائدے کے لیے نقصان اٹھانے کی تھیوری۔''

''یہ لوگ پاگل ہیں یا جنونی۔ انھیں ہیروشیما یا ناگا ساکی بھیجیے۔ انھیں دکھایئے ایٹمی حملے کے زخم نسلوں تک تازہ رہتے ہیں، نسلوں تک!'' غصے سے ایمان علی کی آواز اونچی ہوگئی۔

''وہ جاپان کی مثال بھی دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے جاپان کی طرح تباہی کے ملبے سے نیا پاکستان ابھرے گا۔''

''مکھی کے برابر دماغ ہے ان کا، مکھی کے برابر!'' ایمان علی نے اپنی پسندیدہ تشبیہہ دہرائی۔ ''جاپان کی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی فوج ختم ہوگئی تھی۔ اس کے وسائل

کا کوئی پیسہ ڈیفنس پر خرچ نہیں ہوا۔ آپ بھی اپنی فوج سمیٹ لیجیے' ڈیفنس کا بجٹ دو فیصد کر دیجیے' آپ کا نیا پاکستان بھی جگمگانے لگے گا۔''

''مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔'' جنرل منصف نے کہا۔ لہجے میں شرمندگی تھی۔

''آپ کو سروس چیف بدلنے کا اختیار ہے۔ آپ چاہیں تو جنرل اکبر کو تبدیل کر سکتے ہیں۔''

''فوج پورس کے ہاتھیوں کی طرح اپنی ہی حکومت کو روند ڈالے گی۔ آپ کی یہی تاریخ ہے۔''

''جنرل اکبر کے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں۔ وہ ایک سپاہی ہے اور اس کے خواب بھی سپاہیوں جیسے ہیں' مار دھاڑ سے بھرپور۔'' جنرل کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''اس ملک کے دو سب سے پاور فل پرائم منسٹرز کا تختہ ان کے اپنے وفادار سپہ سالاروں نے الٹا تھا' جن کے بارے میں خیال تھا ان کے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں۔'' ایمان علی ابھی تک تلخ تھا۔

''اس وقت اور آج کے حالات میں بہت فرق ہے' وہ بدعنوان حکومتیں تھیں۔ ان کے خلاف عوامی ابھار تھا۔ پورا ملک بے چین تھا۔ آج لوگوں کو ریلیف ملا ہے۔ اکنامی بہتر ہوئی ہے۔ سیکیوریٹی کی حالت بہت اچھی ہے۔ شہر اور دیہات دونوں آپ کے ساتھ ہیں۔ فوج ایک پاپولر حکومت کا تختہ الٹ کر نفرت کا نشانہ نہیں بننا چاہے گی۔ میری بات کا یقین کیجئے۔''

''یہ جنرل اکبر کو برطرف کرنے کا وقت نہیں ہے۔'' ایمان علی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت دوسرے کام زیادہ اہم ہیں۔'' ایمان علی نے سامنے رکھا ہوا کاغذ اٹھایا جس پر اس نے اہم نکات درج کیے ہوئے تھے۔ ''آپ اپنا آفس شفٹ کر کے جی ایچ کیو لے جایئے۔ انٹیلی جنس رپورٹیں تفصیل سے اسٹڈی کرایئے۔ جنرل اکبر سے مل کر فوری ضرورت کے ہارڈ ویئر کی تفصیل اور تخمینے بنوایئے۔ کرم قریشی آپ کی مدد کریں گے۔ برازیل میں ان کی ایک اہم سورس ہے۔ جنیوا میں عارف علی کو الرٹ کیجئے۔ وہ ہمیں سستی ڈیل دلا سکتے ہیں۔

ضرورت ہوئی تو میں ٹینک ایئر لفٹ کرانے کے لیے تیار ہوں۔''

''ہم جلد بازی سے تو کام نہیں لے رہے؟'' جنرل منصف نے محتاط انداز میں کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ ہم بے خبری میں مارے جائیں۔ جنرل اکبر کا خیال غلط نہیں ہے۔ ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ جب تک ہندوستان کے عزائم واضح نہیں ہوتے ہمیں پنجوں کے بل کھڑا رہنا ہوگا۔'' ایمان علی نے دوسرا کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آغا شاہ رخ کل سفارتی چینل کھولیں گے۔ ہمیں دیکھنا ہے انڈیا ٹروپس موومنٹ کی کیا وجہ بتاتا ہے۔ میں چین اور امریکہ کے سفیروں کو لائن اپ کرنے کی کوشش کروں گا۔ کل ساڑھے پانچ بجے سروسز کے تینوں چیف اور آئی ایس آئی کے ڈی جی کی میرے دفتر میں میٹنگ بلایئے۔ آغا شاہ رخ، حبیب الحق اور کرم قریشی بھی اس اجلاس میں شریک ہوں گے۔ اگر خطرہ اتنا سنگین ہے جتنا جنرل اکبر کا خیال ہے تو یہ اجلاس مستقل وار کونسل میں تبدیل ہو جائے گا۔'' آغا شاہ رخ وزیر خارجہ اور کرم قریشی صدر کا خصوصی معاون تھا۔

''مجھے یقین ہے یہ فالس الارم ہے۔'' جنرل منصف نے سگار دانتوں میں دبا لیا لیکن جلانے کی کوشش نہیں کی۔

''آپ کو ایک اور مسئلے سے نمٹنا ہے۔'' ایمان علی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''میں نے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کا استعفیٰ منظور کر لیا ہے۔''

''جنرل حفیظ؟'' جنرل منصف کا سگار دانتوں سے نکل کر دوبارہ انگلیوں میں آ گیا۔ ''وہ تو جنرل اکبر کے بہت قریب ہے۔''

''قربت اور دوری ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ انھوں نے انٹیلی جنس کی رپورٹیں مجھے اور آپ کو نہیں بھیجیں، صرف جنرل اکبر تک محدود رکھیں۔ میں نے وضاحت طلب کی تو استعفیٰ دے دیا۔''

''جنرل اکبر اسے وارننگ سمجھے گا۔''

''ان کا خیال غلط نہیں ہوگا۔'' ایمان علی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''آپ جنرل اکبر سے مشورہ کر کے صبح تک نئے ڈائریکٹر جنرل کی نامزدگی کے پیپر بھیج دیجیے۔ ہم یہ عہدہ ایک دن کے لیے بھی خالی نہیں رکھ سکتے۔''

''مجھے ڈنر کے لیے ایکسکیوز کر دیجیے۔ مجھے فوری جی ایچ کیو جانا ہوگا۔'' جنرل منصف اٹھ کھڑا ہوا۔

کرنل افتخار جنرل منصف کو کار تک چھوڑ کر آیا تو فیاض منگی ابھی تک اپنے کمرے میں تھا۔ منگی کے علاوہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والا مختصر سا اسٹاف بھی موجود تھا۔ کرنل افتخار کو اوپر جا کر اپنے کاغذات سمیٹنے تھے اور ایمان علی کو گڈ نائٹ کہہ کر چھٹی کرنی تھی۔ کابینہ کے ڈنر اور اجلاس میں اس کی موجودگی ضروری نہیں تھی۔ اسے پتہ تھا فیاض منگی کا دفتر اسی وقت بند ہوگا جب ایمان علی اپنے دفتر سے اٹھ کر سونے کے لیے جائے گا۔ فیاض منگی کا یہ سات دن کا معمول تھا۔ کرنل افتخار کو اس کی توانائی دیکھ کر حیرت ہوتی۔ وہ فوجی نہیں تھا پھر بھی فوجیوں کی طرح ہر وقت مستعد، تر و تازہ اور تیار نظر آتا۔ کرنل افتخار فیاض منگی کو پہلے سے جانتا تھا۔ دونوں اقتدار مافیا کے کارندے رہے تھے۔ دونوں کا رابطہ کرم قریشی سے تھا اور کرم قریشی ہی نے ایمان علی کے اے ڈی سی اور چیف آف اسٹاف کے طور پر دونوں کا انتخاب کیا تھا۔ فیاض منگی کے تقرر کی بہت مخالفت ہوئی تھی۔ ایمان علی سے پہلے جب سردار صدر تھا تو فیاض منگی اس کا بھی مشیر اور چیف آف اسٹاف تھا۔ سردار کے زوال کی کہانی لکھی جا رہی تھی تو کرم قریشی اور جنرل منصف کا سب سے بڑا مددگار بھی فیاض منگی ہی تھا۔ کرم قریشی کو فیاض منگی کی وفاداری اور فرض شناسی پر کوئی شبہ نہیں تھا۔

فیاض منگی کے بارے میں کرنل افتخار کے اپنے شبہات تھے۔ فیاض منگی اس کے پسندیدہ لوگوں کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ کرنل افتخار ترکی میں ملٹری اتاشی تھا اور فیاض منگی ہنگری میں سفارت خانے کا فرسٹ سیکریٹری۔ کئی معاملوں میں انھیں رابطہ رکھنا پڑتا تھا اور ہر

رابطے نے ان کے درمیان دوریاں بڑھائی تھیں۔ لیکن کرنل افتخار کو دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا تھا کہ چیف آف اسٹاف کے عہدے کے لیے فیاض منگی سے بہتر انتخاب ممکن نہیں تھا۔ فیاض منگی بہت فخر سے کہا کرتا تھا کہ اس کے سر کے چاروں طرف آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ اس کا کہنا تھا اس کی کوئی آنکھ ایک دن کے لیے بھی بند ہوگئی تو اندھیرا چھا جائے گا۔ کرنل افتخار اس کی تعلی پر صرف مسکرا دیا کرتا تھا۔

فیاض منگی اس وقت دفتر میں بیٹھا اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی کھڑکی سے آنے جانے کا منظر دیکھ سکتا اور آوازیں سن سکتا تھا۔ پچھلے چند گھنٹوں کی آمدورفت دیکھ کر اسے یقین تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے جس کا اسے علم نہیں ہے۔ اس نے دیکھا تھا جنرل حفیظ باقی فوجی سربراہوں کے ساتھ واپس نہیں گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اترا تھا تو پاؤں پٹختا ہوا' گاڑی کا دروازہ اس زور سے بند کیا تھا کہ منگی کے دفتر میں بھی گونج سنائی دی تھی۔ جنرل منصف بھی ڈنر سے آدھے گھنٹے پہلے آیا تھا اور ڈنر شروع ہونے سے پہلے بہت تیزی سے واپس چلا گیا تھا۔ ایمان علی نے فیاض منگی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ دفاعی معاملات فیاض منگی کے دائرۂ اختیار سے باہر تھے۔ ایمان علی دفاعی معاملات پر صرف جنرل منصف اور اس کی ٹیم کو اعتماد میں لیتا تھا۔ فیاض منگی کو معلوم تھا ایمان علی اس وقت بتائے گا جب فیصلوں کا پہیہ پورا گھوم چکا ہوگا۔ فیاض منگی کو ابھی معلوم کرنا تھا۔

اس نے کچھ سوچ کر کالے رنگ کے فون پر نمبر ڈائل کرنا شروع کیے۔ سیاہ فون فیاض منگی کے اپنے اور براہ راست استعمال کے لیے تھا۔ سفید فون ایکسچینج سے منسلک تھا۔ سبز فون صدر سے متعلق کالوں کے لیے اور بے نمبر کا سرخ فون بہت خاص موقعوں کے لیے تھا۔ فیاض منگی کو دو مختلف نمبروں پر بات کر کے شاید اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی۔ تیسرا نمبر ملانے کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ کچھ دیر تک جاری رہی' فیاض منگی خود کم بولا تھا اور زیادہ دیر تک سنتا رہا تھا۔ ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

بصارت ابھی کمزور نہیں ہوئی تھی، جسم پر اُگی ہوئی آنکھیں اب بھی دیکھ سکتی تھیں۔ فیاض منگی کو یہ احساس ہمیشہ خوش رکھتا تھا کہ وہ کچھ بھی جان سکتا ہے۔ خوشی کا یہی احساس اس کی محنت کا پھل اوراس کی طاقت تھا۔ زیادہ دیر خوش رہنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ دوبارہ میز پر جھک گیا۔ اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا اسے آگے پہنچانا تھا۔ اس نے سرخ فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا اور کسی کو جلدی جلدی کچھ بتانے لگا۔

اوپر اپنے دفتر میں کرنل افتخار میز سے کاغذات اور فائلیں سمیٹ رہا تھا۔ اس نے کمپیوٹر کھول کر آخری بار برقی ڈاک کے پیغامات دیکھے' ایمان علی کو گڈ نائٹ کہہ کر باہر آیا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی جیب سے موبائیل فون نکال کر نمبر دبانے لگا۔ اسے بھی کسی کو پیغام پہنچانا تھا۔

فیاض منگی نے کھڑکی سے کرنل افتخار کو جاتے ہوئے دیکھا تو فون کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ روک لیا اور کرنل افتخار کے گیٹ سے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے کئی کالیں کرنا تھیں' کراچی کے لیے نائٹ کوچ بک کرانا تھی' سردار کو نصف شب کی ملاقات کے لیے جگائے رکھنا تھا۔ سب سے پہلے اسے اپنے بیٹے کو فون کرنا تھا' شاید اسے عقل آ گئی ہو' لیکن پھر وہ اپنی خوش فہمی پر مسکرا دیا۔ عقل کے راہ پر آنے کے لیے جھٹکے لگنا ضروری تھے۔ اس کے بیٹے نے سب کچھ اچھا ہی اچھا دیکھا تھا۔ اچھا شہر' اچھا گھر' اچھا اسکول' اچھا کالج' نیویارک کی اچھی سی ایک یونیورسٹی اور ایک اچھی پڑھی لکھی ڈاکٹر ماں...... اس نے اپنی اس دیہاتی ماں کو نہیں دیکھا تھا جس نے اسے پیدا کیا تھا۔ وہ گاؤں میں پیدا ہوا تھا نہ گاؤں کی اس حویلی کی منڈیر پر کوا بن کر بیٹھا تھا جہاں فیاض منگی نے وہ جھٹکا کھایا تھا جس نے اس کی پوری زندگی بدل دی تھی۔

10

شہداد پور

فیاض منگی کو اپنے گاؤں کی وہ حویلی اچھی طرح یاد تھی جو شہر کے مہمانوں اور میر ساون کی آمد پر توجہ کا مرکز بن جاتی۔ میر ساون کے شہری مہمان کبھی کبھی دیہی زندگی کا رنگ دیکھنے گاؤں آتے تو اسی حویلی میں ٹھہرتے جہاں صبح ہی صبح گاؤں کے سب بچے بڑے سے احاطے کی کچی اور نیچی دیواروں کے چاروں طرف اکڑوں بیٹھ جاتے جیسے کسی منڈیر پر قطار میں بیٹھے اور کائیں کائیں کرتے ہوئے کوے۔ مہمان اپنے کمروں سے نکل کر احاطے میں آتے تو سناٹا چھا جاتا۔ سب بچوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتیں اور ننھے ننھے دماغ سوچنے لگتے یہ کن آسمانوں سے آئی ہوئی مخلوق ہے۔ ان کا لباس' ان کی شکل وصورت' ان کے بال' بول چال کا انداز سب کچھ کسی جادوئی دنیا کے کرداروں کی طرح تھا۔ مہمان مست ہاتھیوں کی طرح گنے

کے کھیتوں میں چہل قدمی کرتے ہوئے گنے اکھاڑ کر دانتوں سے چھیلتے' گنڈیریاں بنا کر چوستے اور مدد کرتے ہوئے بچوں کا غول ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ گنا بیلنے والی مشینوں کی چرخیاں گھومتیں اور مہمان تازہ نکلا ہوا رس پیتے یا گرم گرم گڑ بنتے ہوئے دیکھ کر اس کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں اس شوق سے کترنے لگتے جیسے جنت کا میوہ کھا رہے ہوں۔ بچے اپنے منہ میں آیا ہوا پانی پیتے ہوئے اپنی پکنک ختم کر کے اپنے اپنے گھر لوٹ جاتے۔

فیاض منگی کے معصوم ذہن پر مہمانوں کا ہر انداز اور ان کی ایک ایک جنبش نقش ہو جاتی۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں' آنکھ ناک اور بالوں کو دیکھتا اور سوچتا وہ بھی انھی مہمانوں کی طرح ہے تو وہ اس منڈیر پر کیوں بیٹھا ہے؟ وہ مہمانوں کے پیچھے ان ہی کی طرح چلنے کی کوشش کرتا' لیکن جلد ہی اس کا خواب ٹوٹ جاتا اور اس کی ماں اسے تلاش کرتی ہوئی آتی اور اسے بچوں کے غول سے نکال کر گھر لے جاتی۔ اسے بتاتی وہ گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح نہیں ہے' اس کا مستقبل اور اس کی منزل ان بچوں سے الگ ہے۔ فیاض منگی کے بارے میں اس کی ماں کے خواب بہت واضح تھے۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ پڑھانا اور کم از کم تحصیل دار بنوانا چاہتی تھی جس سے میر ساون بھی احترام کے ساتھ بات کرتا تھا۔

فیاض منگی کا باپ نورل منگی گاؤں کے دوسرے لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ مڈل پاس تھا اور اپنے زمانے میں گاؤں کا سب سے پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ وہ گاؤں میں اپنا اسکول کھول کر تعلیم دینے کے خواب دیکھتا تھا۔ میر ساون کی اجازت نہ ملنے سے اس کے خواب حقیقت نہ بن سکے' پھر بھی وہ چوپال میں بیٹھ کر ہر شام کھیتوں سے لوٹ کر آنے والے تھکے ہارے ہاریوں کو اخبار پڑھ کر سناتا اور سیاست پر تبصرے کرتا۔ نورل منگی منشی تھا لیکن اسے منشی کہلوانا پسند نہیں تھا۔ وہ خود کو کلرک کہلواتا۔ گاؤں والوں کو کلرک کا تلفظ یاد کرنے میں کئی سال لگے تھے۔ فیاض منگی اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بارے میں نورل جو خواب دیکھتا تھا اس کی بیوی نے انھی خوابوں کو اپنا مشن بنا لیا تھا۔ دونوں میں یہی فرق تھا۔ نورل صرف خواب دیکھنے والا

تھااوراس کی بیوی خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ فیاض منگی پانچ سال کا ہوا تو اس کی بیوی نے الٹی میٹم دیا کہ وہ اب گاؤں میں نہیں رہیں گے۔ نورل کئی ہفتوں تک ٹال مٹول کرتا رہا تو ایک دن اس کی بیوی سامان باندھ کر بیٹھ گئی۔ نورل دوسرے ہی روز نوکری تلاش کرنے شہداد پور چلا گیا۔

نورل آڑھتیوں کا پسندیدہ منشی تھا۔ فرض شناس، محنتی اور دیانت دار۔ انھوں نے اسے اپنی شہر کی دکان پر بٹھا دیا۔ رہنے کے لیے دکان کے پیچھے ایک کمرے کا مکان بھی دے دیا۔ نورل کو لگا جیسے وہ کلرک سے ہیڈ کلرک ہو گیا ہو۔ شہر گاؤں نہیں تھا جہاں وہ اکیلا پڑھا لکھا تھا۔ اب اس کے چاروں طرف اس سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کا ہجوم تھا۔ پھر بھی اسے اخبار اور سیاسی تبصرے سنانے اور روٹی کپڑا مکان کا خواب دکھانے کے لیے گاہک مل جاتے تھے۔ وہ کام ختم ہونے کے بعد دیر تک دکان کے تختے پر چوپال لگائے بیٹھا رہتا۔ اس کی بیوی کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اسے پتا تھا بیٹے کو تحصیل دار بنانے کے لیے بہت پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ پیسے ابھی سے جمع کرنا تھے۔ اس نے کونڈوں میں دہی جما کر دکانداروں کو بیچنے کا کام شروع کر دیا۔

فیاض منگی جب پہلے دن اسکول گیا تھا تو لگتا تھا کوئی شہزادہ اپنی تخت نشینی کی رسم میں شرکت کرنے جا رہا ہو۔ اس کی ماں اسے آئندہ چودہ سال تک اسی سج دھج سے اسکول اور کالج بھیجتی رہی۔ وہ ہمیشہ صاف دھلے اور استری کیے ہوئے کپڑے پہنتا۔ اس کے سر کا ایک ایک بال اپنی جگہ جما ہوا اور جوتے پالش سے چمکے ہوئے ہوتے۔ اس کا بستہ اور بستے میں ایک ایک کتاب، کاپی، قلم اور پنسل سلیقے اور ترتیب سے رکھی ہوتی۔ پانچویں جماعت میں آتے ہی اس کے باپ نے انگریزی پڑھانے کے لیے ٹیوشن شروع کرا دیا۔ نورل کو پتا تھا انگریزی اچھی نہ ہوئی تو اس کا بیٹا بڑا افسر نہیں بن سکے گا۔ فیاض منگی انگریزی پڑھتا تو اسے لگتا وہ میر ساون کی حویلی کی منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا نہیں بلکہ شہر سے آیا ہوا شاہی مہمان ہے جس کے حلق سے نکلی ہوئی

ہر آواز پر تحسین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ اس کی چال میں ابھی سے افسروں والی شان آ گئی تھی۔

بی اے میں فیاض منگی کی فرسٹ ڈویژن آئی۔ اس روز نورل اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر دیر تک خوشی کے آنسو بہاتا رہا۔ اس کا ایک خواب پورا ہو گیا تھا۔ اس کا باپ چوتھی جماعت پاس تھا' خود اس نے آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں۔ اس کے بیٹے نے زیادہ بڑی چھلانگ لگائی تھی۔ ایک نسل پہلے شروع ہونے والا تعلیم کا سفر کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا اس کا پوتا ہوگا تو وہ تعلیم کے اور بڑے مدارج طے کرے گا۔ اس کی بیوی نے کوئی آنسو نہیں بہایا۔ اس کے خواب ابھی ادھورے تھے۔ اسے بیٹے کو تحصیل دار بنوانا تھا۔ افسر بنے بغیر اس کی ڈگری بے کار تھی۔ تحصیل دار بنوانے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ رات کو نورل گھر آیا تو اس نے فیصلہ سنایا کہ وہ صبح گاؤں جا رہے ہیں۔

اس روز میر ساون گاؤں آ کر اپنی حویلی میں دربار لگاتا تھا۔ میر ساون فیاض منگی کو تحصیل دار بنوا سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ وہ حکومت کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس کی حویلی میں وزیر اور بڑے بڑے سرکاری افسر آ کر مہمان ہوا کرتے تھے۔ فیاض منگی اس کے گاؤں کا لڑکا تھا' تحصیل دار بن کر میر ساون کے کام آ سکتا تھا۔ فیاض منگی کی ماں جتنا سوچتی اتنا ہی اسے اپنے بیٹے کے تحصیل دار بننے کا یقین ہونے لگتا۔ نورل گاؤں جانے کے خیال سے خوش تھا۔ وہ گاؤں والوں کو اپنے گریجویٹ بیٹے سے ملانا اور انھیں دکھانا چاہتا تھا کہ ان کے کلرک سائیں کا بیٹا افسر بننے والا ہے۔

وہ علی الصبح پہلی بس لے کر گاؤں روانہ ہو گئے۔ فیاض منگی نے پہلی بار اپنا نیا سفاری سوٹ پہنا تھا اور جوتے پالش کر کے اچھی طرح چمکائے تھے۔ بس نے جہاں اتارا تھا وہاں سے حویلی دور تھی۔ نورل رستے میں ہر ملنے والے ہاری کو گرم جوشی سے گلے لگاتا' اپنے بیٹے سے ملواتا اور ایک لڈو کھانے کے لیے دیتا۔ ہر بار اس کی گردن فخر سے اونچی ہو جاتی۔ ان کے

پیچھے چلتا ہوا فیاض منگی ان کا بیٹا نہیں، حویلی میں آیا ہوا کوئی مہمان لگ رہا تھا۔ اس کی چال میں بھی افسروں والی شان تھی۔ جوتوں پر گرد جم گئی تھی لیکن گاؤں کی تازہ ہوا سے اور ملنے والوں کی آنکھوں میں اپنے لیے عزت دیکھ کر اس کی ورح جھومنے لگی تھی۔ اسے اپنے تحصیل دار بننے کا یقین ہونے لگا تھا۔

حویلی میں ابھی لوگوں کی آمد ورفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ میر ساون اپنی کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے اردگرد رکھی ہوئی کرسیاں خالی تھیں۔ کافی فاصلے پر کچھ پھٹے حال ہاری زمین پر بیٹھے اپنے ان داتا کی نگاہِ کرم کے منتظر تھے۔ نورل، اس کی بیوی اور بیٹے کا قافلہ نزدیک آیا تو اس نے اخبار سے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ نورل اور اس کی بیوی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔

''اچو بابا۔ کیر خبر۔ کیا گوٹھ واپس آیا ہے کوئی کم وم ہے۔'' میر ساون نے اخبار ایک طرف رکھ کر کہا۔

''یہ میرا پٹر ہے فیاض۔ آپ کا خادم۔ سائیں آپ کی مہربانی سے بی اے پاس کیا ہے اس سال۔ اے جی مٹھائی لے کر آیا ہے۔''

نورل نے بیوی کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبا لے کر دیا تو میر ساون نے ایک طرف رکھ دیا۔ نورل اور اس کی بیوی پیٹھ کیے بغیر چند قدم پیچھے ہٹ گئے اور فیاض منگی کو میر ساون کے سامنے کر دیا۔ فیاض منگی نے سلام کر کے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میر ساون نے اس کا ہاتھ نہیں لیا اور سر کے اشارے سے جواب دے دیا۔ فیاض منگی گاؤں سے جانے کے پندرہ سال بعد پہلی بار واپس آیا تھا۔ وہ اس وقت ہاری کا بیٹا نہیں حویلی کا مہمان تھا۔ ہاری وڈیرے کا رشتہ بھول کر وہ خالی پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ایسا لگا جیسے میر ساون کو کرنٹ لگ گیا ہو۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اٹھ بھینڑاں اٹھ۔'' میر ساون غصے سے دھاڑا۔ ''تیرے باپ دادا ہمارے پیر

چاٹتے تھے۔ تو چودہ جماعت پاس کر کے وڈیرہ بن گیا ہے۔ ہمارے برابر بیٹھے گا۔ مٹی کا کیڑا۔ ہٹ! بھینڑاں ہٹ!''

فیاض منگی کو بھی جھٹکا لگا اور وہ اپنے ماں باپ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ نورل خوف سے کانپتے ہوئے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور بیوی کا ہاتھ کھینچ کر اسے بھی نیچے بٹھا لیا۔ دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ نمستے کے انداز میں جوڑ لیے تھے۔ فیاض منگی کو لگا جیسے ایک شعلے نے بھڑک کر اس کے اندر کی ہر چیز جلا کر راکھ کر دی ہو۔ شعلہ سرد ہونے سے پہلے اس کے چہرے پر اپنی سرخی چھوڑ گیا تھا۔ وہ زمین پر نہیں بیٹھا بس اپنے ماں باپ کے پاس کھڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔ اسی وقت میر ساون کے ایک کارندے نے اسے فون لا کر دیا تو میر ساون کرسی پر بیٹھ گیا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ شاید کسی قریبی دوست کا فون تھا۔ دیر تک قہقہے لگتے رہے۔ فون رکھا تو اس کا موڈ خوش گوار ہو گیا تھا۔

''چو۔ نورل چو۔ کوئی کم کار ہو تو بول۔'' وہ کچھ دیر پہلے آنے والے غصے کو شاید بھول گیا تھا۔

نورل اور اس کی بیوی کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے ہاتھ اسی طرح جڑے ہوئے تھے۔

''نہ سائیں بس......'' نورل نے کہنا شروع کیا لیکن اس کی بیوی نے کہنی مار کر اسے چپ کر دیا۔

''وڈیرا سائیں آپ کی مہربانی۔ ہم بس مٹھائی دینے آئے تھے۔ آپ کی گھنڑی مہربانی۔ اللہ خیر۔''

نورل کی بیوی یہ کہہ کر اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر واپس چلنے لگی۔ نورل نے بھی اللہ خیر کہہ کر سلام کیا اور اپنی بیوی اور بیٹے کے پیچھے گھسٹنے لگا۔ اس کی گردن نیچی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار پلٹ کر سائیں کو دیکھا تھا جو پھر کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا قہقہے لگا رہا تھا۔ نورل دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ ان قہقہوں کے درمیان ان کی واپسی بھول جائے۔ سائیں سے کچھ مانگے

بغیر چلے آنا ان داتا کی توہین کرنا اور یہ بتانا تھا کہ اس کے ہاری سائیں کی مہربانیوں کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے تھے۔

شہر پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ نورل میں ہمت نہیں تھی کہ گھر کے اندر بیٹھ کر بیوی اور بیٹے کے مایوس چہرے دیکھے۔ وہ باہر آ کر دکان کے تختے پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں گاؤں سے آنے والے کئی ہاری اس کے پاس آ کر خیر خبر پوچھنے لگے۔ اس روز روٹی کپڑا مکان کی تقریر کرتے ہوئے نورل کی آواز میں کچھ زیادہ ہی جوش آ گیا تھا۔ اس روز اس کے سامعین کی تعداد بھی معمول سے کچھ زیادہ تھی۔

گھر کے اندر بیٹھے ہوئے فیاض منگی کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس نے کالج میں اپنی توجہ صرف پڑھائی پر مرکوز رکھی تھی۔ اس کے اکثر دوست کسی نہ کسی تحریک سے وابستہ تھے۔ کوئی سندھو دیش چاہتا تھا' کوئی روٹی کپڑا مکان کے خواب دیکھ رہا تھا اور کسی کا آئیڈیل وہ ڈاکو تھے جو وڈیروں کو لوٹتے اور جنگلوں میں رہتے تھے۔ سب کی نفرتوں کا ہدف وڈیرے تھے۔ فیاض منگی نے پہلی بار وڈیرہ شاہی کا مزا چکھا تھا۔ پہلی بار اس کے اندر بھی طبقاتی نفرت جاگی تھی۔ تحصیل دار بننے کے خواب ٹوٹ چکے تھے۔ اب اسے بھی کوئی ایسا راستہ چننا تھا جو وڈیروں سے انتقام کی آگ بجھا سکتا۔

صرف اس کی ماں ٹھنڈے دماغ سے سوچ رہی تھی۔ اس نے ذہن سے نفرت اور غصہ جھٹک دیا تھا۔ بیٹے کو تحصیل دار بنانے کا ایک ذریعہ ختم ہوگیا تھا' اسے نئے ذریعے ڈھونڈنے تھے۔ بہت دیر سوچنے کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ صبح وہ ان آڑھتیوں کے پاس جائے گی جن کے پاس نورل کام کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی نورل خود بات نہیں کرے گا' اسے خود ہی جانا پڑے گا۔ آڑھتیوں کے وسیع تعلقات تھے۔ ان کے پاس بڑے شہر سے بھی لوگ آتے تھے۔ وہ کسی کو ضرور جانتے ہوں گے جو تحصیل دار بننے میں ان کے بیٹے کی مدد کر سکے۔ وہ مطمئن ہوکر اپنے کاموں میں لگ گئی' لیکن اس کا اطمینان زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ کسی نے آ کر خبر دی

کہ پولیس نورل کو نقص امن کے اندیشے میں پکڑ کر تھانے لے گئی ہے۔

رات بھر نورل کی بیوی تھانے کے باہر کھڑی واویلا مچاتی رہی۔ رات بھر فیاض منگی ان جاننے والوں کے دروازے کھٹ کھٹاتا رہا جو تھانے جا کر اس کے باپ کو رہا کرا سکیں۔ رات بھر تھانے والے نورل کی پٹائی کرتے رہے۔ نورل صبح تھانے سے چھوٹ کر گھر آیا تو بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ باہر سے زیادہ اندر ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ سر جھکا کر بیٹھے ہوئے خستہ حال باپ کو دیکھ کر فیاض منگی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ سب سے پہلے میر ساون کی حویلی لوٹے گا اور اس کی لاش کے ٹکڑے کر کے اسے اس کی کرسی سمیت نہر میں بہادے گا۔

اس کی ماں اس وقت بھی ٹھنڈے دل سے سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ فیصلہ کر کے اٹھی اور سامان باندھنے لگی۔ ''ہم یہاں نہیں رہیں گے، بڑے شہر جائیں گے۔'' اس نے فیصلہ سنا دیا۔

نورل نے پندرہ سال پہلے اپنا گاؤں چھوڑا تھا تو اس کا دل وہیں رہ گیا تھا۔ بیٹے کے مستقبل کے لیے وہ اپنی زمین سے الگ ہوا تھا۔ پھر بھی یہ اطمینان تھا کہ شہداد پور اپنی زمین کا حصہ ہے۔ گاؤں زیادہ دور بھی نہیں تھا، لیکن بڑے شہر اتنی دور! نورل زمین سے دوری کا خیال سر سے جھٹک کر اٹھا اور بیوی کا فیصلہ ٹالنے کی بجائے سامان باندھنے میں پوری تن دہی سے بیوی کی مدد کرنے لگا۔

فیاض منگی کے لیے ماں کے سر کی ہلکی سی جنبش حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ماں غلط فیصلہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ماں نے بڑے شہر جانے کا فیصلہ کر کے اسے ڈاکو بننے اور پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس نے اطمینان کی گہری سانس لی اور کراچی جانے والی اگلی ٹرین کا پتا کرنے اسٹیشن چلا گیا۔

کراچی کی ایک بستی ملیر میں نورل کے گاؤں کے کچھ لوگ رہتے تھے۔ نورل بھی وہیں

آدھا کواٹر کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ شہداد پور کے آڑھتیوں نے اسے سفارشی خط دیے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں اسے غلے کے ایک گودام میں منشی کی نوکری مل گئی۔ اس کی بیوی بھی دہی بیچنے کے کاروبار میں لگ گئی۔ فیاض منگی کراچی کی سڑکوں اور عمارتوں سے شناسائی حاصل کرنے لگا۔ وہ صبح بس پکڑ کر صدر جاتا اور ہجوم میں گم ہو جاتا۔ فیئر رروڈ اور پھر بندر روڈ سے ہوتا ہوا ٹاور تک پیدل مارچ کرتا۔ میکلوڈ کے راستے پیدل ہی واپس آتا اور پانچ ستاروں والے ہوٹلوں اور گورنر ہاؤس کو دیکھتا ہوا صدر سے بس لے کر دوبارہ ملیر پہنچ جاتا۔ کچھ ہی دنوں میں اسے لگا وہ اسی شہر کا رہنے والا ہے۔ گاؤں اور شہداد پور ایک بھولی ہوئی یاد بن گئے۔ ملیر کی بستی شہداد پور سے ملتی جلتی لگتی لیکن یہ عارضی پڑاؤ تھا۔ شہر بدلتے ہی اس کی ماں کے خواب بھی بدل گئے تھے۔ تحصیل داری چھوٹی افسری تھی۔ یہ شہداد پور جیسے چھوٹے شہر کا خواب تھا۔ وہ اب بڑے شہر میں آئے تھے۔ اس کے بیٹے کو اب بڑا افسر بننا تھا۔

فیاض منگی کے ساتھ شہداد پور کے کالج میں پڑھنے والا ایک لڑکا بھی کراچی آ گیا تھا۔ اس کا باپ سرکاری افسر تھا جس کا تبادلہ کراچی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو مقابلے کے امتحان میں بٹھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے فیاض منگی کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ پاکستان میں پہلی بار ایک سندھی وزیر اعظم کو حکومت ملی تھی۔ سندھی نوجوانوں کے لیے اچھی ملازمتوں کے راستے کھل گئے تھے۔ فیاض منگی کا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا۔ انگریزی لکھنا اور بولنا جانتا تھا۔ چھوٹے گاؤں کا تھا اس لیے دیہی کوٹے سے امیدوار بن سکتا تھا۔ فیاض منگی کو لگا وہ کراچی کی سڑکوں پر جس راستے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا وہ خود چل کر اس کے سامنے آ گیا ہے۔

دوست کی مدد سے فیڈرل پبلک سروس کمیشن میں کاغذات اور درخواستیں جمع کرانے کے بعد فیاض منگی امتحان دینے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ سڑکوں پر جوتیاں توڑنے کے بجائے دن بھر شہر کی بڑی لائبریری میں بیٹھا انسائیکلوپیڈیا حفظ کرنے کی کوشش کرتا۔ سب نے انگریزی بہتر بنانے پر زور دیا تھا۔ صبح سب سے پہلے انگریزی اخبار پڑھتا۔ پہلے لفظ

سے آخری لفظ تک۔ انگریزی فلمیں دیکھتا اور کہانی، ڈرامہ اور ایکشن بھول کر صرف انگریزی بولنے کا انداز اور لہجہ ذہن پر نقش کر لیتا۔ دوست کے ساتھ انگریزی بولنے کی مشق کرتا۔ چھ مہینے بعد جب امتحان اور انٹرویو دینے کا وقت آیا تو فیاض منگی پوری طرح تیار تھا۔

انٹرویو دینے اسلام آباد گیا تو اس کی ماں نے اپنی ساری بچت نئے سوٹ اور ہوائی جہاز کے کرائے پر خرچ کر دی۔ فیاض منگی نے کہا تھا کہ وہ ٹرین سے چلا جائے گا۔ لیکن اس کی ماں کا خیال تھا ٹرین کے سفر میں کپڑوں کے ساتھ روح میں بھی سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ وہ بلندی کے سفر پر جا رہا تھا۔ اسے اڑ کر ہی جانا تھا۔ امتحان اور انٹرویو دونوں بہت اچھے ہوئے۔ انٹرویو لینے والے اس کی انگریزی کی استعداد اور بولنے کے انداز سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے انگریزی بولنے کے انداز میں سندھی لہجے کی لٹک نہیں تھی۔ شخصیت بھی متاثر کن تھی۔ چہرہ نوجوانوں کی طرح کھلنڈرا نہیں، افسروں کی طرح کرخت تھا۔ انٹرویو لینے والوں کو یقین تھا وہ انگریزی اسکولوں میں پڑھا ہوا سندھ کے کسی بڑے زمین دار کا بیٹا ہے جس کا باپ وزیراعظم کو ذاتی طور پر جانتا ہوگا۔

فیاض منگی کی کامیابی کی خبر آئی تو اس کی ماں نے اسے گلے لگا کر پہلی بار خوشی کے آنسو بہائے۔ اس کا خواب پورا ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس کا بیٹا اب صرف اوپر اور اوپر ہی کی طرف جائے گا۔ اس دن نورل نے گودام کے تمام ملازموں اور بستی کے لوگوں کو جنہیں وہ روزانہ انقلاب آنے کی نوید دیتا تھا، مٹھائی کھلانے اور چائے پلانے پر اپنی آدھے مہینے کی تنخواہ خرچ کر دی، لیکن اس کی بیوی نے دہی کے کونڈے کی قیمت بڑھا دی تھی۔ فیاض منگی کو ٹریننگ اور پہلی پوسٹنگ ملنے میں چھ مہینے لگ گئے۔ بستی چھوڑ کر اسلام آباد جانے سے پہلے اس کی ماں نے دہی کا ایک ایک کونڈا، ہر برتن اور ٹوٹی ہوئی چارپائی تک بیچنے کی کوشش کی تھی۔ نورل نے پہلے کی طرح اپنی تنخواہ مٹھائی کے ٹوکرے خرید کر بانٹنے میں خرچ کر دی تھی۔

اسلام آباد پہنچ کر فیاض منگی اپنے کیریر کی عمارت بلند کرنے کے کام میں دن رات

ایک کرنے لگا۔ اس کی ماں کو دہی کے کونڈے بنانے سے فرصت مل گئی تھی اور اب اس کی زندگی کا محور فیاض منگی کے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا خیال رکھنا تھا۔ فیاض منگی کا موڈ اچھا دیکھ کر کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتی ''پٹر ترقی جی چھا خبر اے؟'' نورل بیٹے کو ترقی کرتا دیکھ کر خوش اور مطمئن تھا لیکن اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بیٹے نے اردو کے سارے اخبار لگوا دیے تھے، لیکن آس پاس کوئی ایسا نہیں تھا جسے اخبار پڑھ کر سنا سکتا یا سیاسی تبصرے کر سکتا۔ کبھی ٹہلتا ہوا آب پارہ میں پان کی دکان تک چلا جاتا۔ پان کی دکانیں چوپال کا کام کرتی ہیں، لیکن یہاں اونچی آواز میں گانوں کے کیسٹ لگے ہوئے تھے۔ لوگ کاروں، اسکوٹروں اور سائیکلوں پر آتے، پان کی پڑیا بندھواتے اور چلے جاتے۔ نورل کچھ دیر یہ سب کچھ دیکھتا اور خاموشی سے واپس آ جاتا۔ اس کی خواہش تھی ایک بار بیٹے کو لے کر گاؤں جائے اور گردن اونچی کر کے سب کو بتائے کہ اس کا بیٹا افسر بن گیا ہے۔ وہ جس بنگلے میں رہتا ہے اس کا فرش اور دیواریں میر ساون کی حویلی سے زیادہ مضبوط اور چمک دار ہیں۔ عید کی چھٹیاں آنے لگیں تو اس نے بیٹے سے خواہش بیان کر دی۔

''نہ بابا نہ!'' فیاض منگی نے سختی سے کہا۔ ''گاؤں میں پہلے میر ساون جیسی حویلی بنائیں گے، پھر جائیں گے۔''

نورل بیٹے کو بتانا چاہتا تھا کہ میر ساون کے گاؤں میں میر ساون جیسی حویلی کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ حویلی صرف دولت کی نہیں اختیار اور طاقت کی علامت تھی، لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ اپنے بیٹے کا غصہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہا۔ ایک دن دل کا دورہ پڑا اور خاموشی سے مر گیا۔ مرتے وقت آنکھوں میں اطمینان، ساتھ ہی گاؤں نہ جانے کا ملال بھی تھا۔

فیاض منگی نے ترقی کی منزلیں بہت تیزی سے طے کیں اور جلد ہی اکبر خان اور کرم قریشی کی نظروں میں آ گیا۔ وہ ایک اہل، محنتی اور فرض شناس افسر تھا اور بدعنوان نہیں تھا۔ وفاداری اس کی سب سے اہم خوبی تھی۔ کرم قریشی نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تو اس کی

تمام وفاداریاں اقتدار مافیا کو منتقل ہوگئی تھیں اور وہ دس بارہ سالوں میں ترقی کر کے گریڈ بیس تک پہنچ گیا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ دفاع کی اہم وزارت میں جوائنٹ سیکریٹری اور پھر پشاور کا ڈپٹی کمشنر رہا۔ انٹیلی جنس بیورو میں متعین ہوا۔ یہ روس کے خلاف افغانستان کی جنگ کا زمانہ تھا۔ کرم قریشی کے کہنے پر جنرل سعید ملک نے فیاض منگی کو ایجنسیوں سے رابطے کے لیے استعمال کیا۔ غیر ملکی ایجنسیوں سے فیاض منگی کے رابطے اسی زمانے میں قائم ہوئے تھے۔ وہ ان رابطوں کو پارٹ ٹائم ملازمت سمجھتا تھا۔ اس نے کبھی سرکاری خزانے کا ایک پیسہ چوری نہیں کیا تھا' لیکن پارٹ ٹائم ملازمت اتنے پیسے دیتی تھی کہ اسے بدعنوانی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فیاض منگی کئی سال ہنگری رہ کر واپس آیا تو گریڈ بائیس کا افسر اور ملک کے اس وقت کے صدر کا دایاں ہاتھ تھا اور اپنی ملازمت کے صرف پچیس چھبیس سال بعد ملک کی سب سے طاقت ور شخصیتوں میں سے ایک تھا۔

فیاض منگی ترقی کے اس سفر میں میر ساون کے ہاتھوں ہونے والی اپنی اور اپنے ماں باپ کی توہین نہیں بھولا تھا۔ اس کی نظروں میں میر ساون کے سامنے ہاتھ جوڑ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے ماں باپ کی تصویر آج بھی نقش تھی۔ باپ مر گیا تھا لیکن اسے گاؤں جا کر باپ کا نام اونچا کرنا تھا۔ گاؤں میں میر ساون جیسی حویلی بنانا تھی۔ ربع صدی گزر گئی تھی فیاض منگی کو وقت اور موقع نہ مل سکا۔ میر ساون کی طاقت اور اختیار کسی دور میں کم نہیں ہوا۔ وہ ہر دور کی حکومت کا لاڈلا تھا۔ سردار کے دور صدارت میں بھی جب فیاض منگی انتہائی بااختیار شخص تھا' میر ساون سندھ کی صوبائی کابینہ کا اہم وزیر تھا۔ فیاض منگی اس وقت اسے نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن وہ سانپ کو اس طرح مارنا چاہتا تھا کہ اس کی اپنی لاٹھی نہ ٹوٹے۔ اسے موقع کا انتظار تھا۔

فیاض منگی کو یہ موقع ایمان علی کے دور صدارت میں اس وقت ملا جب زرعی اصلاحات نے بڑے زمین داروں کی کمر توڑ دی تھی۔ میر ساون بہت دنوں سے فیاض منگی سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فیاض منگی نے اس کا فون سننے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک دن میر ساون

اسلام آباد آ کر بیٹھ گیا۔ فیاض منگی کتنا بھی بڑا افسر سہی' اس کے ہاری کا بیٹا تھا۔ اسے یقین تھا وہ ملنے سے انکار نہیں کرے گا۔ فیاض منگی نے اسے ایک شام اپنے گھر پر ملنے کا وقت دے دیا۔ میر ساون آیا تو فیاض منگی ڈرائنگ روم سے متصل چھوٹی بیٹھک میں اپنی اونچی کرسی پر بیٹھا تھا۔ آس پاس چھوٹے اور نیچے مونڈھے رکھے تھے۔ میر ساون کا قد کاٹھ ہی نہیں اس کی یادداشت بھی ہاتھی جیسی تھی۔ اسے بہت برسوں پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ اسے پتا تھا فیاض منگی اپنی پرانی ہزیمت کا بدلہ لے گا۔ لیکن اس نے کندھے جھٹکے اور فیاض منگی سے ملنے آگے بڑھا۔ وہ زمینیں بچانے آیا تھا۔ ضرورت پڑی تو فیاض کے پاؤں بھی پکڑ سکتا تھا۔ فیاض اس سے کرسی سے اٹھ کر ملا۔ میر ساون مونڈھے پر بیٹھنے لگا۔

''کیوں گناہ گار کرتے ہو سائیں۔'' فیاض منگی نے میر ساون کو اونچی کرسی پر بٹھاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''آپ حاکم ہو سائیں' آپ کی جگہ ادھر ہے۔ ہمارے باپ بھی سائیں کے پاؤں کی خاک تھے' ہم بھی خادم ہیں۔ ہم زمین کھوٹنے والے ہاری ہیں سائیں' ہم زمین پر بیٹھیں گے۔''

فیاض منگی خود ایک نیچے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ میر ساون دل میں خوش ہوا۔ اس کا غرور واپس آ گیا۔ فیاض منگی بڑا افسر سہی' اس کا باپ دادا ان کا ہاری تھا۔ میر ساون جانتا تھا طبقاتی درجے اتنی جلدی ختم نہیں ہوتے۔ یہ نسلوں کا ورثہ ہیں' کئی پیڑھیوں تک چلتے ہیں۔

''سائیں حکم کرو۔''

میر ساون اسے اپنی مشکلات بتاتا رہا۔ اس کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی۔ اس کی زمینیں چھینی جانے والی تھیں۔ ٹیکس کے نوٹس آ گئے تھے۔

''سائیں ہم برباد ہو جائیں گے' کچھ کرو سائیں' کچھ کرو۔'' میر ساون اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا بھی بہت نیچا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاری کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔

''تواں کھے معلوم ہے صدر صاحب سفارش نہیں سنتے۔''

''تو اں جی بدھیں گے سائیں' تو اں جی ضرور سنیں گے۔ میں نے سردار کے وقت میں دیکھا ہے۔ آپ کچھ بھی کر سکتے ہو سائیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہو۔''

''میں وعدہ نہیں کرتا' کوشش کروں گا۔''

میر ساون نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ وہ جانتا تھا فیاض منگی جیسے بااختیار افسر کی کوشش کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ سکون سے چائے پینے لگا جو اسی وقت نوکر لا کر میز پر رکھ گیا تھا۔

''آم کی دو پیٹیاں لایا ہوں۔ ایک آپ کے ایک صدر صاحب کے واسطے۔ آپ ہماری طرف سے ان کو سوغات دینا۔ سندھڑی ہے سائیں' ایک ایک دانہ اپنے ہاتھ سے چن کر رکھا ہے۔''

''صدر صاحب نہیں لیں گے۔ وہ اسے رشوت سمجھیں گے۔''

''یہ رشوت نہیں آم ہیں سائیں آم۔ رشوت میں ہم گٹھلیاں دیتے ہیں۔ گٹھلیاں۔''

میر ساون نے اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ لگایا اور چائے ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کوئی خدمت ہو سائیں کوئی بھی خدمت ہو تو بولو۔''

''مجھے گوٹھ میں تھوڑی زمین چاہیے۔'' فیاض نے مونڈھے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''زمین؟ سائیں شہر چھوڑ کر اب کھیتی باڑی کرو گے کیا؟''

''نہیں سائیں۔ مجھے گھر بنانا ہے۔''

''میری حویلی ہے ادھر۔ آپ کا گھر ہے' ادھر آ کر رہو۔ جب چاہو۔ جب تک چاہو۔''

''نہیں سائیں' مجھے گوٹھ میں چھت چاہیے۔''

میر ساون دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کا کام ہو جائے گا۔ فیاض منگی کام کی قیمت مانگ رہا تھا۔ اسے رشوت چاہیے تھی۔ میر ساون کو ایسے

لین دین کی عادت تھی۔

''آپ میری حویلی خریدلو۔'' میر ساون نے کچھ دیر سوچنے کے بعد فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''زمینیں کم ہوگئی ہیں، حویلی سونی پڑی ہے۔ بیٹے شہر میں کام کرتے ہیں، وہ بھی گوٹھ نہیں آتے۔ میرے لیے بے کار ہے۔ آپ خریدلو۔ میں کل اسٹامپ پیپر لکھ لاتا ہوں۔''

''کل نہیں دو دن بعد۔ پیپرز میں خود بنوالوں گا۔''

میر ساون دو دن بعد آیا تو حویلی کی فروخت کے کاغذات تیار تھے۔ دستخطوں کے بعد فیاض منگی نے اسے قیمت کا چیک دیا تو میر ساون حیران رہ گیا۔ بازار میں حویلی کی آج جو قیمت تھی فیاض منگی اس پوری قیمت کا چیک دے رہا تھا۔

''حویلی آپ کو ہمارا تحفہ ہے۔'' میر ساون نے چیک واپس کر کے فخر سے اکڑ کر کہا۔ ''میر ساون کی طرف سے نورل منگی کے بیٹے کے لیے۔ چیک پھاڑے چھڈو سائیں۔''

''آپ کی بڑی مہربانی سائیں۔ آپ چیک نہیں لو گے تو میں حویلی نہیں لوں گا۔ پیپر پھاڑ دوں گا۔''

میر ساون اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ رشوت کیوں نہیں لے رہا تھا؟ میر ساون نے فیاض منگی کی آنکھوں میں سختی اور اصرار دیکھا تو چیک لے کر جیب میں رکھ لیا اور رسید پر دستخط کر دیے۔ واپس جاتے ہوئے اسے پہلی بار شک ہوا تھا کہ فیاض منگی اس کا کام نہیں کرے گا۔

دوسرے دن فیاض منگی نے حویلی خریدنے کے کاغذات ایمان علی کو دکھائے تو ایمان علی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''میر ساون کے خلاف انکم ٹیکس بچانے اور زمینوں کی ملکیت چھپانے کے نوٹس جاری ہوئے ہیں۔'' فیاض منگی نے ایک فائل سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرے گاؤں کا وڈیرہ اور میرے مرحوم باپ کا دوست ہے۔ میں نہیں چاہتا کسی کو غلط فہمی ہو کہ میں نے اسے بچانے کے لیے حویلی رشوت میں لی ہے۔ میں چاہتا ہوں میر ساون کی زمینوں کے معاملات کی اچھی طرح

تحقیقات ہو۔ اس نے زمینوں کی ملکیت بدلی ہے اور ٹیکس چوری کیا ہے تو اسے پوری سزا دی جائے۔ اس طرح میرا دامن صاف رہے گا' کسی کو میرے خلاف انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔''

''سمری بنوا کر بھجوا دیجیے۔'' ایمان علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا تو فیاض منگی نے دستخط کے لیے کاغذ بڑھا دیا۔ وہ سمری پہلے سے تیار کر کے لایا تھا۔ فیاض منگی واپس جانے لگا تو ایمان علی اسے تشویش کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا فیاض منگی بدعنوان نہیں ہے لیکن پہلی بار اس کے دل میں شک پیدا ہوا۔ ایمان علی ایمان داری کا ڈھول پیٹنے والوں سے بہت ڈرتا تھا۔

میر ساون بہت دنوں تک فیاض منگی سے ملنے کی کوشش کرتا رہا لیکن فیاض منگی کے پاس اس سے ملنے کا وقت نہیں تھا۔ مصروفیات میں سے کسی طرح دو دن نکال کر گاؤں گیا تو اسے میر ساون کے کارندوں سے حویلی خالی کرانے کے لیے پولیس کی مدد حاصل کرنا پڑی۔ قبضہ حاصل کر کے فیاض منگی نے حویلی کے باہر ''نورل منگی یادگاری اسکول'' کا بورڈ لگایا جو وہ اپنے ساتھ تیار کرا کے لے گیا تھا' گاؤں کے سب لوگوں کو بلا کر حویلی میں دعوت دی اور دوسرے دن یہ حویلی میدانی اسکولوں کی اسکیم کو عطیے میں دے کر چلا آیا۔ اسے اطمینان ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کے ایک باب کی تکمیل کر دی ہے اور اپنے باپ کا قرض چکا دیا ہے۔ اسے یقین تھا اس کے باپ کی روح مطمئن ہو گئی ہو گی اور مرتے وقت اس کی آنکھوں میں گاؤں نہ جانے کا جو ملال تھا وہ ختم ہو گیا ہو گا۔

○ ○ ○

نورل کے مرنے کے بعد فیاض منگی کی ماں بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ گرتی پڑتی فیاض منگی کی دیکھ بھال کرتی یا نوکر کے سر پر سوار رہتی لیکن مطمئن نہیں تھی۔ ایک دن اس نے فیصلہ سنایا

کہ وہ فیاض منگی کی شادی کر رہی ہے۔ فیاض منگی نے ہمشیہ کی طرح سر جھکا دیا۔ اسے پتا تھا اس کی ماں جو بھی کرے گی اس کے لیے اچھا کرے گی۔ وہ جو کچھ بھی تھا اپنی ماں کی وجہ سے تھا۔

فیاض منگی کی ماں کو ایسی لڑکی چاہیے تھی جو ہاتھ پاؤں کی مضبوط اور صورت شکل کی اچھی ہو۔ جو خدمت کرنا جانتی ہو لیکن زبان نہ ہلا سکے۔ ایسی لڑکی گاؤں میں ہی مل سکتی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن گاؤں روانہ ہو گئی۔ کئی دن تک گاؤں کی ایک ایک لڑکی کی ہڈیاں ناپتی اور پسلیاں گنتی رہی۔ وہ بچھیا لینے آئی تھی، خریدنے سے پہلے پورا اطمینان کرنا چاہتی تھی۔

قرعۂ فال ممتا کے نام نکلا۔ ماں باپ نے شاید ممتاز نام رکھا تھا لیکن پورے گاؤں میں ممتا کہلاتی تھی۔ سترہ سال کی، ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھوں والی، بھرے بھرے بدن کی لڑکی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتی تو سست نظر آتی لیکن بہت تیزی سے کام کرتی تھی۔ ماں باپ مر گئے تھے صرف ایک بھائی تھا جو کسی زمین دار کے لیے کھیتی باڑی کرتا تھا۔ فیاض منگی کی ماں بہن بھائی کو اسلام آباد لے کر آئی اور گھر میں چند لوگوں کو بلا کر اپنے بیٹے سے ممتا کا نکاح پڑھوا دیا۔ ممتا کا بھائی چھوٹی بہن کو چھوڑ کر خوشی کے آنسو بہاتا ہوا گاؤں واپس چلا گیا۔ اسے اپنی بہن کی قسمت پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ ایسے گھر میں بیاہ کر گئی تھی جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

ممتا ایسی ہی نکلی جیسا فیاض منگی کی ماں نے سوچا تھا۔ دودھ دینے والی بے زبان گائے کی طرح۔ وہ صرف گائے ہی نہیں تھی کتے کی طرح وفادار بھی تھی۔ ساس کے پیچھے ہر وقت دم ہلاتی ہوئی۔ اس کے ہر اشارے کو سمجھتی اور ہر ڈانٹ پر شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتی۔ دن بھر کام کرتے کرتے اس کی ہڈیاں درد کرنے لگتیں، لیکن شکایت نہ کرتی۔ رات آتی تو فیاض منگی کے بستر میں سکڑ کر لیٹ جاتی اور اس کا انتظار کرتی۔ اس وقت پہلی بار اسے فیاض منگی کی بیوی ہونے کا احساس ہوتا۔ رات کی اس مشقت سے اس کی دکھتی ہوئی ہڈیوں کو آرام آ جاتا۔ فیاض منگی بھی خوش تھا۔ ممتا اس کے لیے چابی سے چلنے والی گڑیا کی طرح تھی۔ چابی بھرتے ہی حرکت

میں آ جاتی اور چابی بند کرتے ہی ساکت ہو جاتی۔ جو کبھی پلٹ کر جواب نہ دے سکتی تھی۔

ممتا کے بھائی کی شادی ہونے والی تھی۔ ایک دن وہ اسلام آباد آ کر ممتا کو گاؤں لے گیا۔ فیاض منگی کی ماں نے بہت منتوں کے بعد صرف چند دنوں کے لیے جانے دیا تھا۔ زیور پہن کر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بس ہاتھوں میں کانچ کی وہ چوڑیاں پہن لی تھیں جو اس کے بھائی نے شادی پر دی تھیں یا کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں جنھیں وہ ہر وقت پہنے رہتی تھی۔ گاؤں میں سب کی توجہ کا مرکز دلہن سے زیادہ ممتا تھی۔ سب کو اس کی قسمت پر رشک آتا تھا جو اتنے بڑے شہر کے اتنے بڑے گھر میں اتنے بڑے افسر کی بیوی بن کر گئی تھی۔ سب کو یقین تھا کہ وہ اپنی بھابی کو دینے کے لیے کوئی زیور لائی ہوگی' لیکن اس کی ساس نے ٹرین کے کرائے کے علاوہ منہ دکھائی کے لیے صرف ایک سو روپے دیے تھے۔ سلامی دے کر سب کی آنکھوں میں مایوسی دیکھی تو اس نے اپنے کانوں کی بالیاں اتار کر نئی نویلی دلہن کو پہنا دیں۔ یہ اس کے بڑے گھر کی عزت کا سوال تھا۔

اس کا بھائی ممتا کو اسلام آباد پہنچا کر اسی روز واپس چلا گیا۔ فیاض منگی کی ماں نے دوسرے دن غور سے دیکھا تو کانوں میں بالیاں نہیں تھیں۔ ممتا نے بتایا وہ منہ دکھائی میں اپنی بھابی کو دے آئی ہے تو چور کہہ کہہ کر گالیاں بکیں' تھپڑ مارے اور گھر سے نکال دیا۔

''گھر میں آنا ہے تو بالیاں لے کر آ۔'' فیاض منگی کی ماں نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ ممتا دیر تک دہلیز پر بیٹھی روتی اور سوچتی رہی کہ کیا کرے' کہاں جائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو گھر کے پیچھے چوکی دار چاچا کی کوٹھری کا دروازہ کھٹ کھٹانے لگی جہاں چوکی دار اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

رات کو فیاض منگی گھر آیا تو ممتا نظر نہیں آئی۔ اسے پتا تھا کسی کونے میں کام کر رہی ہو گی۔ رات گئے تک بستر میں نہیں آئی تو وہ کمرے سے نکل کر ماں سے پوچھنے گیا جو ابھی تک جاگ رہی تھی۔

''ہوا چور تھی۔ میں نے گھر سے کڈھ دیا ہے۔'' ماں نفرت انگیز لہجے میں اسے بتانے لگی۔ ''میرے سے غلطی ہوگئی تھی کہ غریب کی چھوری لے آئی۔ میرے مرتے ہی تیرا سب کچھ بیچ کر اپنے فقیر بھاؤ کو دے دے گی۔'' وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر فیصلہ سنا دیا۔ ''کل صبح طلاق ہاتھ پر رکھ اور ریل پر بٹھا دے۔''

''وہ تیرے پوتے کی ماں بننے والی ہے۔'' فیاض کے انکشاف نے اس کی ماں کے سر پر بم کا دھماکہ کر دیا۔ وہ سکتے میں آ گئی۔

''کتی جی بچی۔ مجھے نہیں بتایا۔'' اس نے سکتے سے نکل کر کہا۔

''تجھے پتا ہے اس کے منہ میں زبان نہیں ہے۔ گاؤں جانے سے پہلے مجھے بتا کر گئی تھی۔''

''کیڑو مہینو لگو تھئی۔''

''تیسرا۔''

''ونجھ! ونجھ! چوکی دار کی کوٹھڑی سے اسے کڈھ کے لے آ۔'' وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ''بچہ ہو جائے تو گوٹھ بھیج دیں گے۔ تیرا بیٹا ملک کا حاکم ہوگا۔ اسے چور ماں نہیں چاہیے۔'' اس نے نیا فیصلہ سنا دیا۔ اسے پوتا پیدا ہونے کا یقین تھا۔ یہ بھی یقین تھا کہ وہ بڑا ہو کر ملک کا سب سے بڑا حاکم بنے گا۔ فیاض منگی نے سر ہلا دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے افسر کے احکامات سن کر ہلاتا تھا۔

فیاض منگی کی ماں کا یقین غلط نہیں تھا۔ ممتا نے ایک صحت مند اور اپنے جیسے خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔ پیدائش کے بعد ممتا کے ہوش ٹھکانے آئے تو وہ بچے کو سینے سے لگا کر اپنی خوش بختی پر رو پڑی۔ اسے یقین تھا اس کا بیٹا اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان کبھی نہ ٹوٹنے والی زنجیر بن جائے گا۔ فیاض منگی کی ماں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کے گھر ملک کا حاکم پیدا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اسی روز ممتا کو گھر سے رخصت کر کے پوتے کو سینے سے لگا لیتی۔ اس نے

پوتے کا نام عبدل رکھا تھا۔ عبداللہ منگی۔ عبدل زیادہ تر دادی کی گود میں رہتا اس لیے اس سے بہت ہل گیا تھا۔ وہ ممتا کے کھانے پینے کا بھی خاص خیال رکھنے لگی تھی۔ ممتا اس کے پوتے کو دودھ پلا رہی تھی۔ عبدل کی صحت اور ہڈیوں کی مضبوطی کے لیے ماں کا دودھ ضروری تھا۔

عبدل ایک سال کا ہوا تو ایک صبح ممتا کا بھائی اچانک اس سے ملنے آ گیا۔ اسے فیاض منگی نے گاؤں سے بلایا تھا۔ اس صبح گھر سے نکلنے سے پہلے فیاض منگی نے ممتا کی طلاق کا کاغذ' ایک ہزار روپے مہر کے اور ایک ہزار روپے زادراہ کے اس کے ہاتھ پر رکھے اور خاموشی سے دفتر چلا گیا۔ فیاض منگی کے جاتے ہی اس کی ماں نے ممتا کی گود سے اس کے بیٹے کو چھینا اور بھائی' بہن کو گھر سے نکال کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ممتا دیر تک دروازہ پیٹتی اور پچھاڑے کھاتی رہی۔ اس روز عبدل کو بھی دادی کی گود میں چین نہیں آیا تھا۔ وہ چیخیں مار کر رو رہا تھا۔ ممتا کا بھائی بہن اور بھانجے کی گریہ وزاری سن کر روتا رہا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ اس کی نسلیں وڈیروں کے ظلم کی عادی تھیں۔ فیاض منگی بھی اس کے لیے وڈیرہ ہی تھا۔ وڈیرے گاؤں میں بہن بیٹی کو اٹھوا کر حویلی میں رکھ لیتے تھے۔ فیاض منگی تو اس کی بہن کو عزت کے ساتھ اپنے گھر بھیج رہا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ممتا کو سمجھایا اور اسے لے کر وہاں سے چل پڑا۔

فیاض منگی کی ماں نے ممتا کو گھر سے نکالتے ہی بیٹے کے لیے نئی بیوی کی تلاش شروع کر دی۔ اس نے سوچا تھا اس بار وہ ممتا والی غلطی نہیں کرے گی۔ دولت مند گھر کی ایسی پڑھی لکھی لڑکی لائے گی جسے ماں کہہ کر اس کا پوتا فخر کر سکے۔ فیاض منگی نے سمجھایا تھا کہ نئی بیوی اپنے بچوں کے بعد عبدل کو سگی ماں کا پیار نہ دے سکے گی۔ اس کی ماں کے پاس اس کا بھی حل تھا۔ فیاض منگی کا وارث پیدا ہو چکا تھا' اسے مزید بچوں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایسی لڑکی کی تلاش کرے گی جس سے بچے پیدا نہ ہو سکتے ہوں۔ اس کی تلاش جلد ہی کامیاب ہو گئی۔

ڈاکٹر کلثوم بچوں کی ڈاکٹر تھی۔ فیاض کی ماں ایک دن عبدل کو دکھانے گئی تو اسے کلثوم پسند آ گئی۔ پتا چلا بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے شادی کے دو سال بعد طلاق ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر

کلثوم نے اپنے ٹیسٹ کرائے تھے اور خود اس بات کی تصدیق کی تھی کہ وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ بانجھ ہونے کی وجہ سے اس کی کبھی شادی نہ ہو سکے گی' اس لیے جب فیاض منگی کا رشتہ آیا تو اسے حیرت ہوئی۔ رشتہ بھی ایک سی ایس پی افسر کا تھا جو بوڑھا نہیں' اسی کا ہم عمر تھا۔ گھر والوں نے اچھی طرح تحقیق کرائی تو کوئی عیب بھی سامنے نہیں آیا سوائے اس کے کہ وہ بھی طلاق یافتہ اور ایک سالہ بچے کا باپ تھا۔ ڈاکٹر کلثوم کو فیاض منگی سے زیادہ اس کے بچے میں کشش محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا اسے ماں بننے کے لیے کسی کے بچے کو گود لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ خود اپنے شوہر کے بچے کو پالے گی جو اسے ماں سمجھ کر بڑا ہوگا۔

فیاض منگی کو معلوم تھا ڈاکٹر کلثوم گاؤں کی بے زبان یتیم لڑکی نہیں ایک اچھے خاندان کی پڑھی لکھی عورت ہے۔ فیاض منگی کی تمام توجہ اپنے کیریئر کے اٹھان پر مرکوز تھی' اسے اپنی گھریلو زندگی میں کوئی پیچیدگی نہیں چاہیے تھی۔ اس نے شادی کی پہلی ہی رات بیوی کو صاف صاف بتا دیا۔

''اس گھر کی حاکم میری ماں ہے۔ میں اس کا کوئی حکم نہیں ٹال سکتا۔ وہ اگر کہے آپ کو طلاق دے دوں تو میں آپ کو طلاق دے دوں گا۔ آپ کو بھی ماں کا خیال رکھنا ہوگا۔''

کلثوم کچھ نہیں بولی' بس جھکا ہوا سر ہلا دیا۔

''مجھے اپنی بیوی اور ماتحت کا پلٹ کر جواب دینا پسند نہیں ہے۔ میں مشتعل ہو جاتا ہوں۔ میرا ذہن میرا ساتھ نہیں رہتا۔ آپ بھی یاد رکھیے گا۔''

کلثوم نے ایک بار پھر خاموشی سے سر ہلا دیا۔

''آپ اپنی پریکٹس بند کر دیجیے۔ مجھے بیویوں کا کام کرنا پسند نہیں ہے۔ خود کفالت انھیں خود مختار بنا دیتی ہے۔ آپ کو کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''میں پریکٹس نہیں چھوڑ سکتی۔'' ڈاکٹر کلثوم نے سر اٹھائے بغیر آہستگی سے کہا۔ ''میں پیسہ کمانے کے لیے ڈاکٹر نہیں بنی تھی۔ کلینک بند ہوا تو میرے بہت سے غریب مریضوں کو دوا

نہیں مل سکے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' فیاض منگی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ اس نے سوچا اس کی بیوی نوکری نہیں کر رہی تھی۔ اپنے کلینک کی خود مالک تھی۔ ''یہ یاد رکھیے گا کہ میرے گھر میں رہ کر آپ جو بھی کمائیں گی اس پر آپ کا نہیں، میرا حق ہوگا۔''

''میرا جو کچھ ہے آپ کا ہے۔ یہ گھر اب کسی ایک کا نہیں ہم دونوں کا ہے۔''

''نہیں!'' فیاض منگی کے لہجے میں سختی تھی۔ ''ہم دونوں کا نہیں میرا! یہ گھر ہمارا نہیں میرا ہے۔ اس کی ہر چیز یہ مکان، اس کا فرنیچر، سامان، اس میں رہنے والے، ماں، بیوی اور بچہ سب میرے ہیں۔ میرے!''

کلثوم نے پہلی بار سر اٹھا کر دیکھا۔ فیاض منگی کی نظریں اس پر نہیں کہیں اور تھیں۔ نگاہوں میں وہی سختی تھی جو اس کے لہجے میں تھی۔ کلثوم کو پہلی ہی رات اندازہ ہو گیا کہ اس گھر میں زندگی آسان نہیں گزرے گی۔

کلثوم کا اندازہ صحیح نہیں تھا۔ زندگی میں کوئی بڑی مشکل نہیں آئی۔ فیاض منگی کے پاس مشکل پیدا کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ وہ رات کو دیر سے گھر آتا۔ کھانا کھاتا اور سوئے ہوئے بیٹے کو پیار کر کے اپنے بیڈ روم میں بند ہو جاتا۔ چھٹی کے دن بھی دفتر یا اپنے کسی افسر کو خوش کرنے اس کے گھر جاتا۔ کلثوم چھٹی کا دن اپنے میکے میں گزارتی تھی۔ فیاض منگی کبھی کبھی اسے کسی سرکاری دعوت میں ساتھ لے جاتا۔ ایک ڈاکٹر بیوی کا شوہر ہونے کے بعد ہم عصروں میں اس کا سماجی رتبہ بڑھ گیا تھا۔ دونوں کی آپس میں گفتگو بہت کم ہوتی۔ ہوتی بھی تو صرف ان کے بیٹے کے بارے میں۔ میاں بیوی کے رشتے کی ڈور بستر سے بندھی تھی۔ کلثوم ممتا کی طرح گائے جیسی نہیں تھیں۔ اس کے اندر ہرنیاں بھری ہوئی تھیں۔ فیاض منگی کو بستر میں ہر طرح کا جانور پسند تھا۔

فیاض منگی کی ماں کا رویہ بھی اچھا رہا۔ اس پر بڑے گھر کی ڈاکٹر بہو کا جو رعب تھا اسے

کلثوم نے ضائع نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ مریضوں کی نفسیات سمجھتی تھی، اس نے اپنی ساس کو بھی اپنا مریض بنالیا تھا۔ وہ اسے دوائیں لا کر دیتی۔ اس کے درد کرتے ہوئے گھٹنوں پر مالش کرتی۔ اس کی بیماریوں اور درد کو آرام آنے لگا تھا۔ کلثوم اس کی بہو ہی نہیں معالج بھی تھی، وہ اپنے معالج کو ناراض نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی توجہ کا اصل مرکز اس کا پوتا تھا۔ وہ بیٹے کو بڑا افسر بنوا چکی تھی، اب پوتے کو حاکم بنوانا تھا۔

کلینک سے واپس آ کر کلثوم کی توجہ کا مرکز بھی عبدل ہوتا۔ اسے لگتا جیسے وہ اس کی اپنی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ سب سے پہلے اس نے عبدل کا نام بدلا تھا۔ اس نے نیا نام ساحل رکھا تھا۔

''سائل؟ منگنے والا؟'' دادی نے حیرت سے پوچھا۔

''سائل نہیں ساحل! کنارا، منزل!''

فیاض منگی کی ماں نے زور زور سے سر ہلا دیا تھا جیسے وہ اچھی طرح سمجھ گئی ہو۔ فیاض منگی کو بھی بیٹے کا نیا نام پسند آیا تھا۔

فیاض منگی کی ماں کا خیال تھا پوتے کی شکل میں اس کے شوہر نورل نے دوبارہ جنم لے لیا ہے۔ اس لیے اسے کبھی کبھی شک ہوتا کہ وہ حاکم بن سکے گا یا نہیں۔ ساحل اپنے باپ کی ضد تھا۔ فیاض منگی کی دنیا میں جذبات اور احساسات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسے اپنے اردگرد پھیلے دکھوں کو دیکھنے یا ان پر کڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ بہت عملی آدمی تھا اور صرف ایسے خواب دیکھتا تھا جن کا تعلق صرف اس کی اپنی ذات سے تھا۔ اپنی کامیابی کے لیے وہ کسی کی بھی لاش کو روند کر گزر سکتا تھا۔ اس کا بیٹا کسی کی بھی تکلیف دیکھ کر دکھی ہو جانے والا تھا۔ وہ لینا نہیں صرف دینا جانتا تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو اسکول کی چھٹیوں میں کلثوم کے ساتھ اس کے کلینک جاتا اور دوا کی پڑیاں باندھنے میں کمپاؤنڈر کی مدد کرتا۔ وہ اپنے کھلونے مریض بچوں کو دے آتا۔ دادی سے اپنی اس عادت پر ڈانٹ کھاتا۔ کلثوم کو اس کے لیے نئے کھلونے خریدنے پڑتے، وہ

بھی زیادہ عرصے اس کے پاس نہیں رہتے۔ اسے کھیلوں سے نہیں صرف پڑھنے سے دلچسپی تھی۔ وہ اسکول کی کتابیں ہی نہیں اخبار اور رسالے تک چاٹ ڈالتا۔ کالج میں آتے ہی وہ دنیا بدلنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔

ساحل نے بی اے میں پوزیشن حاصل کی تو بوڑھی اور بیمار دادی کی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک پیدا ہوئی۔ اسے ایک بار پھر یقین ہونے لگا کہ اس کا پوتا حاکم بنے گا' لیکن وہ یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہی۔ فالج کا حملہ ہوا اور کچھ عرصے بستر پر مفلوج پڑے رہنے کے بعد مرگئی۔ فیاض منگی کو پہلی بار روتے ہوئے دیکھا گیا۔ ساحل کو اس کی دادی نے ماں بن کر پالا تھا' وہ بھی بہت رویا۔ باپ بیٹے پابندی سے ہر جمعے کو اس کی قبر پر جا کر پھول چڑھاتے۔ فیاض منگی شہر میں نہیں ہوتا تو ساحل اکیلا اپنی اسکوٹر دوڑاتا ہوا جاتا' فاتحہ پڑھتا' قبر کے آس پاس کی جھاڑیاں صاف کرتا اور اداس ہو کر واپس آ جاتا۔

فیاض منگی کو اپنے بیٹے کے خواب اور مستقبل کے منصوبے جاننے کی ضرورت اور فرصت نہیں تھی۔ ساحل کے بارے میں اس کے اپنے منصوبے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو بیوروکریسی کے گورکھ دھندے میں پھنسانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے پتا تھا ساحل کو سیاست سے دلچسپی تھی اور وہ نوجوانوں کی کسی نہ کسی تحریک میں سرگرم رہتا تھا' لیکن سیاست گندا کھیل اور جھوٹ' چوری اور منافقت کا کاروبار تھی۔ اسے بیٹے کا سیاست دان بننا پسند نہیں تھا۔ وہ اسے امریکہ بھیجنا چاہتا تھا جہاں وہ ایم بی اے کر کے کسی گلوبل کمپنی میں کارپوریٹ دنیا کی سیڑھیاں چڑھتا اور آسمان تک جا پہنچتا۔ ساحل کو ماں کے ذریعے اپنے بارے میں باپ کے منصوبے معلوم ہو گئے تھے۔ وہ پڑھنا' خوب پڑھنا اور پھر پڑھانا چاہتا تھا لیکن باپ کی خوشی کے لیے ایم بی اے کرنے پر بھی تیار ہو گیا تھا۔

کلثوم ساحل کے نیویارک جانے سے پہلے سخت ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ یونیورسٹی میں ساحل کے داخلے اور امریکہ جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ وہ سردار کی صدارت کا

زمانہ تھا۔ فیاض منگی سردار کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے غیر ملکی دورے پر گیا ہوا تھا۔ اس نے دورے سے واپسی پر بیٹے کے لیے ایک بڑی الوداعی دعوت کا انتظام کیا تھا جس کے دوسرے روز ساحل کو نیویارک روانہ ہونا تھا۔ کلثوم چاہتی تھی ساحل کو جانے سے پہلے حقیقت بتا دے۔ یہ جاننا اس کا حق تھا کہ اس کی ماں کون تھی۔ یہ ممتا کا بھی حق تھا کہ زندگی میں کم از کم ایک بار اس کا بیٹا اسے گلے لگا کر اس کے آنسو پونچھے۔ ساحل جذباتی طور پر پختہ ہو چکا تھا' وہ اس انکشاف کا صدمہ سہہ سکتا تھا۔ وہ ایک نئی دنیا میں جا رہا تھا' شاید ہمیشہ وہیں رہنے کے لیے۔ جانے سے پہلے اسے بتانا ضروری تھا۔

کلثوم نے فیصلہ کرنے کے بعد سوچا بتانے کے لیے یہی مناسب وقت تھا جب فیاض منگی شہر سے باہر تھا۔ اسے معلوم تھا فیاض منگی کو معلوم ہوگا تو طوفان کھڑا کر دے گا۔ لیکن وہ شادی کے ۲۰۔۲۲ برس بعد اب کسی بھی طوفان کا سامنا کر سکتی تھی۔

اس دن ساحل اپنی سیٹ کنفرم کرا کے اور ہوائی سفر کے ٹکٹ لے کر خوش خوش گھر آیا تو اسے ماں بہت اداس لگی۔ وہ سمجھ گیا اس کے جانے کے خیال سے غمگین ہے۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے بہلانے لگا۔ کلثوم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح بتائے۔ بتانے سے پہلے ہی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ بتایا تو خود ہی رو پڑی۔ ساحل کی دنیا میں بھی بھونچال آ گیا۔ حقیقت جذب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ذہن میں کیوں؟ کیوں؟ کے سوال کی تکرار ہو رہی تھی۔

''یہ کل صبح کی فلائٹ کا ٹکٹ ہے۔'' کلثوم نے سب انتظام پہلے سے کر لیا تھا۔ ''گاؤں جاؤ اور ماں کی دعائیں لے کر باپ کے آنے سے پہلے واپس آ جاؤ۔''

''میں ماں کو اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔ ماں تمھیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟'' ساحل جذباتی ہو گیا۔

''نہیں بیٹا نہیں! میں اسے اپنے سر پر بٹھاؤں گی۔'' کلثوم ایک بار پھر سسک پڑی۔

اس بار اس کے ساتھ ساحل بھی رویا تھا۔

وہ جمعے کا دن تھا جب وہ دادی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے جاتا تھا۔ اس روز وہ پھول لے کر نہیں گیا۔ فاتحہ پڑھی نہ قبر پر پڑی ہوئی جھاڑیاں ہٹائیں۔ ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

''کیوں دادی ماں کیوں؟ تم نے مجھے میری ماں کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟''

کچھ دیر کھڑا اسی طرح قبر کو گھورتا رہا جیسے جواب کا انتظار کر رہا ہو' پھر جس طرح آیا تھا اسی طرح اپنی سکوٹر دوڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

دوسری صبح ہوائی جہاز سے کراچی اور وہاں سے بس لے کر گاؤں پہنچا تو رات ہو گئی تھی۔ گاؤں کی حویلی پر ابھی تک اس کے دادا نورل کے نام کا بورڈ لگا تھا۔ ساحل ماں سے ملنے کی خوشی میں سفر کی تکلیفیں بھول کر پہنچا تو اداسی بانہیں پھیلائے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پتا چلا ممتا کئی سال پہلے اپنے بیٹے کی یاد میں تڑپ تڑپ کر مر گئی تھی۔ اس کا بھائی اپنے کنبے کو لے کر کہیں دوسرے گاؤں یا شہر چلا گیا تھا۔ گاؤں کی ایک بوڑھی نے جو ممتا کی دور کی رشتے دار تھی اپنا سینہ پیٹ پیٹ کر بالیوں' اور ان کی وجہ سے طلاق' گھر سے نکالے جانے اور ساس کے مظالم کی وہ کہانیاں سنائیں جو مرنے سے پہلے ممتا ایک ایک کو رو رو کر سنایا کرتی تھی' اس امید پر کہ شاید کوئی اسے اس کے بیٹے سے ملا دے۔ ساحل کا دل کٹ گیا۔ اسے لگا جیسے اس کے اندر کا ایک حصہ ہمیشہ کے لیے مر گیا ہو۔ وہاں کوئی تھا بھی نہیں جس کے گلے لگ کر رو سکتا اور دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا۔ اس نے سوچا ماں کی قبر پر آنسو بہا لے گا' لیکن غریبوں کی قبریں بے نشان ہوتی ہیں۔ جنازہ زمین میں گاڑا اور چلے آئے۔ زندگی میں رونے کے لیے دوسری نشانیاں بہت تھیں۔ پھر بھی کوئی اسے قبرستان تک چھوڑ آیا۔ بے نشان قبریں زمین کے بدن پر پھوڑوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ ہر طرف خاردار جھاڑیاں تھیں یا آوارہ کتے جو کسی بھی قبر پر ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنے کے لیے آزاد تھے۔

ساحل اسلام آباد واپس آتے ہی سیدھا قبرستان گیا۔ دادی کی قبر پر پڑا ہوا ایک ایک پھول نوچا' وہ سارے پودے اکھاڑ پھینکے جو پچھلے چند مہینوں میں لگائے تھے اور جھاڑیوں سے خاردار ٹہنیاں توڑ کر قبر پر بکھیر دیں۔ آنکھوں میں شدید نفرت تھی۔ وہ قبر پر زور سے تھوک کر آندھی طوفان کی طرح اسکوٹر دوڑاتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ اس وقت تک کلثوم بھی آ گئی تھی۔ وہ کلثوم کے گلے لگ کر اس طرح رویا کہ وہ ڈر گئی۔

''کیا ہوا بیٹے کیا ہوا؟''

''میری ماں مرگئی ماں' میری ماں مرگئی۔''

''میں ہوں بیٹا' میں تیری ماں ہوں' میں ہوں ابھی۔'' کلثوم دیر تک روتے ہوئے ساحل کی پیٹھ تھپکتی رہی۔ وہ جانتی تھی ساحل کا دکھ کبھی دور نہیں ہوگا۔ اس نے اپنی ماں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی' گھر میں ممتا کا فوٹو تک نہیں تھا۔

ساحل نے دوسرے ہی روز اپنے جانے کی تاریخ بدل وائی اور سامان باندھنے لگا۔ کلثوم نے روکنے کی کوشش کی تھی۔ فیاض منگی نے زندگی میں پہلی بار اپنے گھر میں اتنی بڑی دعوت کی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے مستقبل کا جشن منانا چاہتا تھا۔ کون تھا جسے دعوت نامے نہیں گئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے صدر نے بھی آنے کی حامی بھر لی تھی۔ کلثوم کو معلوم تھا فیاض منگی دعوت منسوخ کرنے کی توہین برداشت نہیں کر سکے گا' لیکن ساحل نے رکنے سے انکار کر دیا۔

''یہ دعوت کا نہیں' ماتم کا وقت ہے۔'' اس نے بہت سرد لہجے میں کہا تھا۔ ''ڈیڈی کی شکل دیکھ کر میری نفرت اور بڑھ جائے گی۔ مجھے نہ روکو۔''

ساحل فیاض منگی کے واپس آنے سے ایک روز پہلے نیویارک کے لیے اڑ گیا۔ فیاض منگی کو واپس آ کر معلوم ہوا تو اس کے دماغ میں شعلہ بھڑک اٹھا۔

''تم نے اسے روکا کیوں نہیں؟'' وہ پوری قوت سے دھاڑا۔

''کوشش کی تھی' لیکن وہ نہیں رکا۔'' کلثوم کا لہجہ بہت سرد تھا۔

''کیوں، آخر کیوں؟'' اس نے چیخ کر کہا۔ اس وقت اس کے غصے کا ہدف صرف کلثوم تھی۔

''یہ مجھ سے نہیں اپنے بیٹے سے پوچھو۔''

غصے سے فیاض منگی کا چہرہ سیاہ ہوگیا۔ غلطی کی تھی اب پلٹ کر جواب بھی دے رہی تھی۔ اس نے سائڈ کی میز پر رکھی ہوئی پتھر کی ایش ٹرے اٹھا کر اس زور سے کلثوم کو ماری کہ لگ جاتی تو کلثوم کا سر پاش پاش ہو جاتا۔ غصے نے اندھا بنا دیا تھا اس لیے نشانہ چوک گیا۔ وہ کلثوم کو مارنے کے لیے کوئی اور چیز تلاش کرنے لگا۔ کلثوم بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس بار شیشے کا گلاس بند دروازے پر لگا تھا۔ فیاض منگی دروازے پر جا کر دیر تک گھونسے برساتا رہا اور دروازہ نہ کھلنے پر واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔ غصہ دھیما ہوا تو ذہن میں کیوں کا سوال دھماکے کرنے لگا۔ فیاض منگی کو یہ ملال نہیں تھا کہ دعوت منسوخ کرنا پڑے گی۔ وہ اپنے اوپر ہنسنے والوں کے منہ توڑ سکتا تھا۔ اسے صرف اس سوال کا جواب چاہیے تھا کہ ساحل اس کے آنے سے پہلے کیوں چلا گیا تھا۔ جواب دروازے کے پیچھے بند تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو کلثوم باہر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلی تھی۔ ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ وہ فیاض کو دیکھے بغیر باہر چلی گئی۔ فیاض منگی خاموشی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ جانے والے کو کون روک سکتا تھا۔ اس نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اسے پتا تھا کلثوم نہیں رکے گی۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم سے متصل چھوٹی بیٹھک میں اپنی اس اونچی کرسی پر بیٹھ گیا جہاں اسے بہت سکون ملتا تھا۔ سامنے چھوٹے چھوٹے مونڈھے پڑے تھے اور بیٹھک سے باہر تاریک کمرے، خالی راہ داریاں، سنسان صحن اور خاموش اکیلا گھر۔ ماں مر گئی تھی، بیٹا چلا گیا تھا اور بیوی چھوڑ گئی تھی۔ اس وقت اسے ماں بہت یاد آئی۔ وہ ہوتی تو سب کچھ ٹھیک کر دیتی۔

فیاض منگی کو اپنے کیوں کا جواب تین مہینے بعد ملا۔ ساحل نے نیو یارک سے ایک چھوٹا سا پارسل بھیجا تھا' دو سطروں کا ایک خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''میں ویک اینڈ پر نوکری کرنے لگا ہوں۔ میری ماں آپ کی قرض دار مری تھی۔ اپنی پہلی تنخواہ سے اس کا قرض ادا کر رہا ہوں۔'' خط کے ساتھ پارسل میں سونے کی دو بالیاں تھیں۔

11

کراچی

سردار سفید سلکی شلوار قمیص پر ہلکے بھورے رنگ کی شال لپیٹے آتش دان کے قریب جھولنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ آتش دان میں سرخ شعلے لپک رہے تھے' شعلوں کا رقص اس کے دماغ میں بھی جاری تھا۔ فیاض منگی کے فون نے پرانا غصہ دوبارہ دہکا دیا تھا۔ لیکن جب فیاض منگی نے کہا کہ وہ اسلام آباد سے صرف اس سے ملنے آ رہا ہے' رات کو بارہ بجے کے بعد' خفیہ طور پر اور تنہائی میں' تو سردار نے غصہ ظاہر کیے بغیر ہاں کہہ دی تھی' اس امید پر کہ فیاض منگی نے جو ڈنک اسے مارا تھا اس سے اب ایمان علی کو ڈسنے والا ہو۔ شاید یہی خوش خبری سنانے آ رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا فیاض منگی کو خود ایمان علی نے اس کے پاس حکومت میں شامل ہونے کا دعوت نامہ دے کر بھیجا ہو۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے'' اس نے غصے سے سوچا۔ وہ اس ملک کا صدر رہ چکا تھا۔ اپنا درجہ کیسے گھٹا سکتا تھا، لیکن پھر اس نے سوچا اچھی وزارت ملی تو ملک کی خدمت کے لیے قبول کر لے گا۔ ایک دفعہ اقتدار میں شریک ہوا تو صدر کی کرسی بھی زیادہ دور نہیں ہوگی۔ بازی کسی وقت بھی پلٹ سکتی تھی۔ اسے اپنا صدر بننا یاد تھا۔ وہ وزیراعظم عامر نذیر کے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھا رہنے والا اس کا وفادار وزیر تھا۔ جب صدر کے لیے کسی بھروسے کے آدمی کی ضرورت تھی تو عامر نذیر کی نگاہ صرف اسی پر پڑی تھی۔

سردار نے کرسی سے اُٹھ کر کندھے پر پڑی ہوئی شال درست کی۔ ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ آتش دان میں شعلوں کی لپک کم ہو رہی تھی، پھر بھی کمرے کا درجۂ حرارت بڑھ گیا تھا۔ وہ میز سے ایئر کنڈیشنر کا ریموٹ اٹھا کر اسے تیز کرنے لگا۔ سردار کو کراچی کے موسم پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ کیسی جگہ ہے جہاں سردی نہیں پڑتی۔ جہاں آتش دان جلانے کے لیے ایر کنڈیشنر چلانا ضروری ہے۔ سردار نے اپنی جوانی کا بہترین حصہ یورپ میں گزارا تھا۔ اس کے لیے سردیوں میں شال اوڑھ کر آتش دان کے سامنے بیٹھنا شام گزارنے کا سب سے پسندیدہ طریقہ تھا۔ سردی میں سکڑا ہوا جسم حرارت پا کر آہستہ آہستہ پھیلتا تو بدن کے سارے دریچے کھل جاتے۔ آتش دان کے شعلوں میں پریاں رقص کرتی نظر آتیں۔ باہر کا منظر بھی اتنا ہی حسین ہوتا۔ برفانی موسم کی سرمئی شام میں چمنی سے نکلتا ہوا دھواں ایسا لگتا جیسے آتش دان میں ناچتی ہوئی اپسرائیں سفید اور نیلگوں پوشاکیں پہن کر آسمان پر چہل قدمی کرنے جا رہی ہوں۔

کراچی میں رہنے کا فیصلہ کیا تو ایسا مکان نہیں مل سکا جو ایک منزلہ ہو اور جس میں آتش دان بھی ہو۔ زمینیں تنگ ہوں تو مکان ہواؤں میں اٹھانے پڑتے ہیں۔ سردار کو اپنے اوپر کسی کا رہنا پسند نہیں تھا۔ سمندر کے سامنے کئی اچھے مکان دستیاب تھے۔ ''واٹر فرنٹ نو دولتیوں کا شوق ہے۔'' اس نے برا سا منا بنا کر کہا تھا۔ کراچی کا واٹر فرنٹ تو اس کے ذوقِ بصارت کے لیے امتحان تھا۔ کنارے کی پٹی پر دور تک پھیلی ہوئی کیچڑ۔ چائے اور چاٹ کے ٹھیلے یا کچے سائبان،

ہر طرح کی رینگتی، دوڑتی، ناچتی اور شور مچاتی مخلوق جیسے کوڑے پر بھن بھناتی ہوئی مکھیاں۔ غروب ہوتا ہوا نارنجی سورج بھی رعایا کے گھروں میں جلتی ہوئی لالٹین کے شعلے کی طرح تھا۔ تیل ختم ہونے پر آہستہ آہستہ بجھتا ہوا۔ اسے اپنے دوستوں پر حیرت تھی جو اس طرح کی اسکائی لائن میں غروب ہوتے ہوئے سورج کا منظر دیکھ کر بھی نشے میں آ جاتے تھے۔ سردار کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا تھا کہ سمندر کے کنارے گھومتے ہوئے لوگوں کے غول اتنے خوش کیوں تھے۔ کیا ان کے گھروں میں روشنی آ گئی تھی، ان کے بچوں کے مستقبل روشن ہو گئے تھے، وہ روٹی کی فکر سے آزاد ہو گئے تھے، ان کے مکانوں کے نلکوں میں باقاعدگی سے پانی آنے لگا تھا، گلیاں صاف ہو گئی تھیں، سفر آسان ہو گیا تھا؟

''کچھ نہیں ہو سکتا، کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اس نے افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے سوچا تھا، لیکن پھر ایک اچھا خیال بھی آیا تھا۔ ''اگر وہ ایک بار پھر صدر بن جائے تو شاید......''

سردار کو ہری بھری وادی میں رہنا پسند تھا۔ یا ایسی حویلیوں میں جن کے گرد دور تک سبز کھیت پھیلے ہوں اور یا پھر تبدیلی کے لیے کبھی کبھی اسکاٹ لینڈ کی پہاڑی اترائی میں، خاموش جھیل کے کنارے آتش دان سے دہکتی ہوئی ایسی کاٹیج میں جہاں آبشار کا ترنم کانوں میں رس گھول رہا ہو۔ سردار کو پانی کی یہی دو شکلیں پسند تھیں۔ چھوٹی سی خاموش پرسکون جھیل یا بل کھاتی ہوئی آبشار، جیسے کسی ماہر فن رقاصہ کی بل کھاتی کمر اور اوپر سے نیچے کی طرف اترتی ہوئی گولائیاں۔

کراچی میں مکان بنانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام آباد کے شہرِ اقتدار میں ایک معزول صدر کی حیثیت سے رہنا اسے پسند نہیں تھا۔ جب سے مسندِ صدارت سے اترا تھا ایک بار بھی اسلام آباد نہیں گیا تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ اس وقت جائے گا جب اس کے لیے لال قالین بچھے گا، لیکن اس وقت تک کسی بڑے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ حویلی تک محدود رہتا تو قدیم زمانے کی حنوط شدہ ممی بن کر دفن ہو جاتا۔

مکان بہت تیزی سے بنا تھا' پھر بھی ایک سال لگ گیا تھا۔ یہ عرصہ اس نے اپنی حویلی اور یورپ کے درمیان آتے جاتے گزارا تھا۔ یہ اس کے ہنی مون کا زمانہ تھا۔ رخسار سے جب شادی ہوئی تھی تو وہ بہت نازک دور تھا۔ ایک دن بھی نظروں سے اوجھل رہنا ممکن نہیں تھا۔ اقتدار کی راہ داریوں میں صبح شام موجودگی ضروری تھی۔ ہنی مون کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا تھا۔ اس کی کسر اب پوری ہوگئی تھی۔ مکان بننے کے انتظار میں انہوں نے سال بھر ہنی مون منایا تھا۔

نئے مکان میں آباد ہو کر سردار خوش ہوا تھا۔ مکان ایسا ہی بنا تھا جیسا اس نے چاہا تھا۔ کشادہ بیٹھک' ماربل کا آتش دان' اس پر رکھی ہوئی اس کے دورِ صدارت کی تصویریں۔ شام ہوتے ہی سردار ایئر کنڈیشنر کھول دیتا' جب کمرہ اتنا ٹھنڈا ہو جاتا کہ بدن کپکپانے لگے تو آتش دان میں شعلوں کا رقص شروع ہو جاتا۔ کوئی ملاقاتی نہ آیا ہو تو سردار اپنی جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر کارنر پر سجی ہوئی تصویروں پر نظریں گاڑ دیتا جن میں وہ عالمی رہنماؤں کے ساتھ بیٹھا یا کھڑا تھا۔ ان میں کسی امریکی رہنما کے ساتھ اس کی تصویر شامل نہیں تھی۔ یہ اس کے دورِ صدارت کی ناتمام حسرت تھی۔ کوششوں کے باوجود امریکی صدر سے اس کی ملاقات ممکن نہ ہوسکی تھی۔ سردار نے یہ کمی برطانوی وزیراعظم سے اپنی ملاقات کی بڑی تصویر لگا کر پوری کی تھی۔ اسے یہ ملاقات اس لیے بھی یاد تھی کہ اس میں اسے برطانیہ کا وزیراعظم بننے کی پیشکش ہوئی تھی۔

سردار کے پاس برطانوی شہریت بھی تھی جو اس کے آباؤ اجداد کو ان کی وفاداریوں کے صلے میں تحفے کے طور پر ملی تھی۔ سردار تو پیدا بھی لندن میں ہوا تھا۔ اس کے باپ نے کہا تھا وہ مستقبل کے حکمران کو گاؤں کی دائیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ سردار نے ملاقات کے دوران برطانوی وزیراعظم کو بتایا تھا کہ وہ بھی ان کی رعایا میں شامل ہے۔

''آپ اگر اب بھی برطانیہ آ کر رہیں اور یہاں کی سیاست میں حصہ لیں تو اس ملک کے وزیراعظم بن سکتے ہیں۔'' برطانوی وزیراعظم نے سردار کی برطانوی شہریت کو تعظیم دیتے

ہوئے انگریزوں والی لطیف حسِ مزاح کا مظاہرہ کیا۔

''آپ کی پیشکش کا بہت شکریہ!'' سردار نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''لیکن میں برطانیہ کا وزیراعظم بننے کے لیے اپنے وطن اور اس کے عوام سے غداری نہیں کر سکتا۔'' سردار کی تنی ہوئی گردن دیکھ کر برطانوی وزیراعظم نے اپنے ہونٹوں پر بے ساختہ آنے والی مسکراہٹ کو بڑے کمال سے روکا تھا۔

پاکستان واپس آیا تو سردار نے اپنے مشیروں کو برطانوی وزیراعظم کی پیشکش کے بارے میں بتایا تھا۔ سب کے چہروں پر مایوسی دوڑ گئی تھی۔ صدر انکار نہ کرتے تو وہ سب برطانوی حکومت کے مشیر ہوتے اور ان کے خاندان آسانی سے برطانیہ ہجرت کر سکتے تھے۔ ایک منہ لگے دانشور مشیر نے فیصلہ تبدیل کرانے کی آخری کوشش کی تھی۔

''فلسفی کہتے ہیں حب الوطنی ایک احمقانہ اور جاہلانہ جذبہ ہے۔'' اس نے تاویل دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہ صرف تنگ اور کند ذہنی کا پیدا کیا ہوا تعصب ہے۔ آج جب دنیا سکڑ کر ایک گاؤں بن رہی ہے تو انسان کی بنائی ہوئی جغرافیائی لکیروں کو پیٹنا اور ان پر خون بہانا بے وقوفی ہے۔ میں تو کہتا ہوں ہمیں کشمیر پر بھی......''

''نہیں! میرا فیصلہ اٹل ہے۔'' صدر نے بات کاٹ کر کہا اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ گھر میں رخسار بھی اس کے فیصلے سے خوش نہیں تھی۔ لندن میں گھر بنا کر وہاں کے شاہی خاندانوں کے لوگوں سے کندھے رگڑنا اور شہزادیوں کی طرح رہنا اس کی ایک پرانی حسرت تھی۔ سردار کو معلوم تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ یورپ کے کسی بھی شہر جا کر کھل اٹھتی تھی، جیسے اپنے گھر واپس آ گئی ہو۔ خول اتر جاتا تو بالکل تروتازہ ہو کر باہر نکلتی۔ پاکستان واپس آتی تو ماحول پر چھائی ہوئی دھند اس کے سراپے پر بھی چڑھ جاتی۔ سردار کو کبھی کبھی بہت بجھی بجھی سی لگتی۔ خول صرف اس وقت اترتا جب رات کو سردار کے ساتھ بستر میں ہوتی۔ شادی کو تین سال سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن سردار کے چھوتے ہی وہ ایک بار پھر پھول بن کر کھل اٹھتی۔

اس کا اصلی نام رخسانہ تھا۔ چہرے کی سب سے نمایاں خوبی اس کے گال تھے۔ وہ اس کے گال میں انگلی گاڑ کر پیلے رنگ کا گڑھا بناتا اور پھر اپنے ہونٹوں سے دوبارہ اس میں سرخی بھر دیتا۔ سردار نے اس کا نام ہی رخسار رکھ دیا تھا۔ سب اسے اب اسی نام سے پکارتے تھے۔ رخسار ماریشس میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں فرانسیسی اور باپ پاکستانی تھا۔ مشرق اور مغرب کے ملاپ نے اس کا رنگ اور نقوش بہت پُرکشش بنا دیے تھے۔ اٹھارہ سال کی ہوتے ہی ماڈل بننے کے شوق میں پیرس چلی گئی' وہاں مقابلہ بہت سخت تھا اس لیے لندن آ گئی جہاں فیشن کی دنیا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسے بڑی کامیابی اس وقت ملی جب وہ Mirror کے ٹائیٹل پر چھپی۔ یہ اس کی آخری کامیابی تھی۔ اس کا قد اچھا اور جسم بہت متناسب تھا لیکن وہ اپنا وزن اتنا کم نہ کر سکی جو فیشن ماڈلز کے لیے ضروری تھا۔ چھوٹے چھوٹے کام ملتے رہے لیکن وہ ایسے نہیں تھے کہ لندن میں اس شان سے رہ سکتی جس کی وہ عادی ہوگئی تھی۔

زندگی میں انقلاب اس وقت آیا جب اس کی ملاقات ایک پاکستانی نوجوان سے ہوئی۔ وہ لندن کے اعلیٰ طبقوں میں اٹھنے بیٹھنے والا ایک کام یاب تاجر تھا۔ اس نے تیسری ہی ملاقات میں 'ٹفنی' سے ہیرے کی انگوٹھی لا کر پہنا دی۔ شادی پاکستان میں ہونا تھی اس لیے وہ پاکستان چلی آئی' لیکن پاکستان آ کر فاروق اس طرح برتاؤ کرنے لگا جیسے وہ اسے خرید کر لایا ہو۔ وہ اس کا پہرے دار بن گیا اور اس کے ملنے جلنے پر روک ٹوک لگانے لگا۔ رخسار فیشن ماڈل نہ بن سکی تھی لیکن اس کا جسم اپنے وقت کی کسی بھی حسین ماڈل کی طرح تھا۔ وہ جب تیراکی کا لباس پہنتی تو دیکھنے والوں کی سسکیاں نکل جاتیں۔ فاروق نے اس کی تیراکی بھی بند کرا دی۔ رخسار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شادی اس کے لیے قید اور فاروق جلاد بن جائے گا۔ اس نے منگنی کی انگوٹھی واپس کی اور آزاد ہوگئی۔

پاکستان میں اس کی ایک پھوپھی بلوچستان کے ایک نواب سے بیاہی تھی۔ وہ اس کے ذریعے نوابوں' سرداروں اور جاگیرداروں کے اعلیٰ طبقے میں متعارف ہوگئی۔ ایک بلوچ سردار

کے بیٹے سے دوستی بھی ہوگئی تھی لیکن وہ جلد ہی بلوچوں کے گھیرے سے نکل بھاگی۔ اس نے بلوچ سرداروں اوران کے بے لگام بیٹوں کی بے وفائیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ وہ اپنی محبوبہ کی نظر چوکتے ہی کسی دوسری کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتے' ساتھ ہی اپنی ہر محبوبہ کو خریدی ہوئی گھوڑی سمجھ کر اصطبل میں بند رکھنا چاہتے تھے۔ بلوچستان سے بھاگی تو سردار کے ایک رشتے کے بھائی شوکت کی محبت کے جال میں پھنس گئی۔ اسے پہلی بار کسی سے سچ مچ محبت ہوئی تھی۔ شوکت کی شخصیت بہت شان دار تھی۔ حسِ مزاح ایسی کہ اس کے چاروں طرف ہر وقت قہقہے گونجتے رہتے لیکن وہ محض ایک خوش باش اور بہت لاپرواشخص تھا۔ صبح شام نشے میں دھت رہتا۔ رخسار کو یقین تھا اس کی جدّی پشتی جائیداد شراب میں گھل کر ختم ہوجائے گی۔

رخسار جو اس کے نشے میں ڈوب گئی تھی' جلد ہی سنبھل گئی۔ وہ کسی شرابی کے ساتھ زندگی برباد کرنے پاکستان نہیں آئی تھی۔ اسے اپنے مستقبل کا فیصلہ جذبات سے ہٹ کر بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ پاکستان میں اس کے طلب گاروں کی کمی نہیں تھی۔ وہ ایک ایسی ٹرافی کی طرح تھی جسے سب جیتنا چاہتے تھے۔ فہرست میں سردار بھی شامل تھا جس سے ملاقات شوکت کے گھر ہوئی تھی۔ سردار کی شخصیت بہت سپاٹ سی تھی' اس لیے رخسار نے کسی دل چسپی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ سردار کی انا زخمی ہوئی تھی۔ شوکت سردار کا رشتے دار ضرور تھا' لیکن دونوں کے خاندان سیاسی طور پر ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ جائیداد کے جھگڑے بھی تھے۔ رخسار کو بعد میں اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ سردار کامیابی کے گھوڑے پر سوار ہے۔ اس نے کوشش کر کے سردار سے ملنے کی راہ نکالی اور دو تین ملاقاتوں کے بعد ہی شوکت کا جال توڑ کر ایک بار پھر آزاد ہوگئی۔

سردار سے تعلق کی ڈور اس وقت مضبوط ہوئی جب اس نے رخسار کو فاروق سے رہائی دلائی۔ وہ فاروق کو چھوڑ چکی تھی لیکن فاروق اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اسے پاکستان لے کر آیا تھا اور اب تک اس پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ ایکسپورٹ امپورٹ کرتا تھا' لیکن

انسانی امپورٹ کے اس سودے میں ہونے والا گھاٹا اس سے برداشت نہیں ہو سکا تھا۔ وہ ہر پارٹی، ہر دعوت میں، ہر اس جگہ جہاں رخسار جاتی، سائے کی طرح رخسار کا پیچھا کرتا۔ اس نے رخسار کا ہر معاملہ بگاڑنے کی کوشش کی تھی، کوئی وار کارگر نہیں ہوا تو دھمکیاں دینے لگا تھا۔ اس کے تمام بڑے سرکاری افسروں سے تعلقات تھے، آئی جی پولیس تک پہنچ تھی۔ رخسار نے، جو اسے اب تک نظر انداز کرتی رہی تھی، سردار سے تذکرہ کر دیا۔ سردار نے ایک شام فاروق کو اپنی آبائی حویلی کی دعوت میں بلالیا۔

فاروق سمجھ گیا اس کی دھمکیاں کام کر گئی ہیں۔ سردار اس سے رخسار کا معاملہ طے کرنا چاہتا ہے۔ اس نے سوچا وہ سردار کو صاف صاف بتا دے گا کہ رخسار اس کی امپورٹ کی ہوئی جنس ہے، وہ صرف اسی کے گودام میں رہ سکتی ہے۔ سردار کی دعوت میں علاقے کے ڈپٹی کمشنر اور ایک وزیر سمیت کئی اہم لوگ آئے تھے۔ سب سے کم رتبے کا آدمی فاروق تھا۔ یہ مردانہ پارٹی تھی جس میں کسی عورت کا گزر نہیں تھا۔ وہ کھانے کے بعد دیر تک برانڈی اور سگار پیتے اور ملکی سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ بارہ بجے تک فاروق کے علاوہ سب چلے گئے تو سردار نے اعلان کیا۔ ''رات کی آخری ڈرنک ہم سوئمنگ پول کے کنارے چاندنی میں بیٹھ کر پئیں گے۔''

سوئمنگ پول کے کنارے ایک میز پر جام سجے تھے، کرسی صرف ایک تھی۔ مسلح محافظ آگے پیچھے کھڑے تھے۔ سردار نے فاروق کو اپنے ہاتھ سے جام بنا کر دیا۔

''رخسار کے نام'' سردار نے جام تجویز کر کے محافظوں کو اشارہ کیا جنھوں نے فاروق کو اٹھا کر اس کے جام سمیت سوئمنگ پول میں پھینک دیا۔ وہ غوطے کھاتا ہوا باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو محافظ اسے دوبارہ دھکا دے دیتے۔ یہ ایک خنک رات تھی۔ سردار، فاروق کی کپکپاتی ہوئی آوازیں سنتا ہوا خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھا جام سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ فاروق کے شور میں پھاٹک کے پاس بندھے ہوئے قدِ آدم شکاری کتوں کے بھونکنے کی آواز

بھی شامل ہوگئی تھی جو زنجیر توڑ کر سوئمنگ پول کی طرف آنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔

''میں تمھارے آئی جی دوست کو فون کر رہا ہوں۔'' سردار نے اپنی ڈرنک ختم کر کے اٹھتے اور اپنے کندھوں پر پڑی شال ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے آدمی صبح پانچ بجے آ کر تمھیں لے جائیں گے۔ اس سے پہلے تالاب سے نکلنے کی کوشش کی تو میرے ملازم تمھیں گولی مار دیں گے۔'' سردار جانے کے لیے مڑا' لیکن پھر ٹھہر گیا۔ ''تم میرے مہمان ہو۔ میری مجلس میں تم نے میرے ساتھ شراب پی ہے اور روٹی کھائی ہے اس لیے تمھیں معاف کر دیا ہے۔ آئندہ کبھی رخسار کے قریب نظر آئے تو سوئمنگ پول میں نہیں اینٹوں کی بھٹی میں پھنکوا دوں گا۔'' فاروق کو اس کے ایک ایک لفظ پر یقین تھا۔

فاروق نمونیہ ٹھیک ہوتے ہی واپس لندن بھاگ گیا۔ رخسار کو یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے بلوچ سرداروں کے ان بیٹوں سے بھی کہہ کر دیکھا تھا جن کی بندوقوں کے قصے بہت مشہور تھے' لیکن وہ لوگ پیسے کے کمزور تھے اور فاروق جیسی موٹی اسامی کو محض ایک عورت کی خاطر قربان نہیں کر سکتے تھے۔ شوکت نے بھی صرف ہنس کر ٹال دیا تھا۔ اس میں سرداروں والا خون تھا لیکن رقابت کا جذبہ چھو کر نہیں گزرا تھا۔ سردار نے کسی جن کی طرح چٹکی بجائی تھی اور مصیبت ہمیشہ کے لیے ٹل گئی تھی' اسی لیے جب سردار نے شادی کا پیغام دیا تو اس کے اندر اس زور سے ہاں گونجی کہ پورا بدن ہل گیا تھا۔

سردار نے رخسار سے شادی پر زبردست آتش بازی کی۔ پورا علاقہ رات بھر ہونے والی ہوائی فائرنگ سے گونجتا رہا تھا۔ سردار نے چیمپینز ٹرافی جیتی تھی' اپنے دشمن کے منہ سے نوالہ چھینا تھا۔ وہ اپنی فتح کے شادیانوں سے دشمن کے ٹھکانوں میں دھماکے کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا شوکت جو بیماری کا بہانہ کر کے شادی میں شریک نہیں ہوا تھا' کانٹوں پر لوٹ رہا ہوگا' اسے نیند نہیں آئی ہوگی۔ لیکن شوکت نے اس روز خوش ہو کر معمول سے کچھ زیادہ پی تھی اور زیادہ اونچے قہقہے لگائے تھے۔ اسے اس رات نیند بھی بہت اچھی آئی تھی۔ سردار اس کی تھوکی

ہوئی وہ گنڈیری چوس رہا تھا جس پر شوکت کے دانتوں کے نشان ابھی تازہ تھے۔ آتش بازی کے دھماکوں سے صرف سردار کی پرانی بیویاں خوف زدہ ہوئی تھیں جو شادی کے جشن کے دوران اپنے اپنے کمروں میں سہمی ہوئی اکیلی بیٹھی تھیں۔ خود ان کے اپنے بچے بھی ان کے پاس نہیں تھے، وہ اپنے باپ کی شادی کے ہنگاموں میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک تھے۔

سردار کی یہ چوتھی شادی تھی۔ عورت، محبت اور شادی۔ اس تکون کے بارے میں اس کے اپنے اعتقادات تھے۔ لندن میں اس کے ایک سائنس دان دوست نے بتایا تھا کہ حقیقی محبت کی عمر تین چار سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہر محبت اپنی مدت پوری کر کے اپنے انجام تک پہنچتی ہے یا رشتے کا بوجھ بن کر گھسٹتی رہتی ہے۔ سردار کے دوست نے سائنسی توجیہات بھی دی تھیں۔ کیمیکلز کے اخراج، ان کے توازن، عدم توازن اور ان کے سائکل، لیکن سردار کو اب یہ تفصیل یاد نہیں تھی، نہ یاد رکھنے کی ضرورت تھی۔ اس تھیوری کی سچائی سردار کے اپنے تجربوں سے ثابت ہوئی تھی۔ صرف پہلی اور دوسری شادی کے درمیان دس سال کا وقفہ تھا اور وہ بھی اس لیے کہ پہلی شادی محبت کی نہیں تھی۔ اس کے باپ نے اپنے ہم پلّہ نوابوں میں رشتہ طے کیا تھا، سردار کے لیے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے بعد کی شادیوں کے درمیان چار یا پانچ سال کے وقفے تھے۔ تین سال تک اسے اپنی بیوی کے سوا کوئی دوسری عورت اچھی نہیں لگتی۔ ان تین سالوں کی محبت کے دوران اولاد پیدا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ محبت کا ہر جذبہ صرف سردار کے لیے مخصوص تھا، لیکن تین سال گزرنے کے بعد تصویر کے نقوش آہستہ آہستہ دھندلے ہونے لگتے۔ ہر دوسری عورت اور گھر کی ملازمہ تک خوب صورت لگنے لگتی تو سردار کو اولاد کی خواہش ستاتی۔ بیوی حاملہ ہو کر ماں بننے کی خوشیوں میں مگن ہو جاتی اور سردار نئے جہان تلاش کرنے لگتا۔ بچے پیدا کرنے اور پالنے کی مستقل ذمہ داری پرانی بیویوں کی تھی۔ وہ سردار کی نئی شادی کے بعد بھی اپنے اپنے مکانوں میں منتظر رہتیں کہ ان کے دوبارہ ماں بننے کا نمبر کب

آ ئے گا۔

رخسار سے شادی کے بعد سردار کا خیال تھا کہ تین سال والی تھیوری اب غلط ثابت ہو جائے گی۔ رخسار اس کی پچھلی تینوں بیویوں کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت' پرکشش' بھرپور اور جوشیلی تھی۔ اس میں رکھ رکھاؤ بھی بہت تھا۔ کسی اہل زبان کی طرح فرانسیسی' انگریزی اور اردو بولتی تھی۔ محفل میں اٹھنا بیٹھنا اور لوگوں کو متاثر کرنا بھی جانتی تھی۔ شادی کو اب چار سال ہونے والے تھے اور اس کی تصویر ابھی تک دھندلی نہیں ہوئی تھی' لیکن جانے کیوں آج کل سردار کی نگاہوں کے سامنے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی اس امریکی صحافی کا چہرہ گھومنے لگا تھا جو پچھلے ہفتے کسی امریکی اخبار کے لیے اس کا انٹرویو لینے آئی تھی۔ کتنی پراعتماد اور ہنس مکھ تھی۔ کس ادا سے بالوں کے لہریوں میں ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے سوال کرتی تھی۔ مسکراہٹ بھی ایسی کہ زہریلے سوال بھی شہد میں ڈوبے ہوئے لگ رہے تھے۔ سردار کو اس کے سامنے رخسار کا رنگ پھیکا لگا تھا۔ وہ امریکی رپورٹر کا خیال جھٹک کر دوبارہ اپنی آنکھوں میں رخسار کی تصویر کا فریم آویزاں کرنے لگا۔ کسی کی خوب صورتی کی تعریف کرنا بے وفائی نہیں تھی۔

عورت کے بارے میں دوسرا اعتقاد اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا' لیکن یہ بھی سردار کے اپنے تجربوں سے سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اس کے باپ کا کہنا تھا پریشانیاں زیادہ بڑھیں تو ایک نئی عورت بیاہ کر گھر لے آؤ۔ اس کے باپ کو زیادہ شادیاں نہیں کرنا پڑی تھیں۔ وجہ یہ سنہرا اصول تھا کہ ہمیشہ حکمرانِ وقت کے ساتھ رہو' اس لیے اس کی سیاسی زندگی میں زیادہ اتار چڑھاؤ نہیں آئے' لیکن سردار تو ایک پارٹی کا ہو رہا تھا' پارٹی بھی ایسی جس کا ایک پاؤں حکومت میں اور دوسرا اپوزیشن کی دلدل میں رہتا۔ سردار کو شادیاں بھی زیادہ کرنا پڑیں۔

پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی جب وہ آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا اور آخری سال میں

دو سالوں سے اٹکا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ تعلیم نامکمل چھوڑ کر گھر واپس آ جاتا' اس کے باپ نے اس کی شادی کر کے بیوی کو اس کے ساتھ لندن بھیج دیا۔ باپ کا فارمولا بیٹے کے بھی کام آیا اور سردار نے اس سال گریجویشن کی ڈگری لی' پاکستان آ کر مقابلے کے امتحان میں اوّل آیا اور جلد ہی ترقی کر کے ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ اسے اپنی حکم رانی کا علاقہ مل گیا تھا۔ ایک دن جب اسے اپنے علاقے میں دورے پر آئے ہوئے اس وزیر کے استقبال کے لیے جو اس سے کم تر خاندان کا تھا' لال قالین بچھانا اور اس کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلنا پڑا تو اس نے ڈپٹی کمشنری چھوڑ دی۔ اسے اب خود وزیر بننا تھا جس کے لیے وہ عامر نذیر کے باپ کی عوامی پارٹی میں شامل ہو کر چھوٹے طبقوں کو اوپر لانے والی پر جوش تقریریں کرنے لگا۔ یہ ایک مشکل دور تھا جس میں اس نے جیل جانے کا مزا بھی چکھا۔ اس کا باپ زندہ نہیں تھا اس لیے اسے حکومت سے ٹکر لینے کی آزادی تھی' لیکن زندہ ہوتا تب بھی سردار اپنے باپ کو باور کرا دیتا کہ وہ ماضی کے نہیں' مستقبل کے حکم رانوں کی صف میں شامل ہے۔

سیاست میں آنے کے بعد سردار اسلام آباد میں رہنے لگا تھا۔ اس وقت تک وہاں اس کا اپنا مکان نہیں تھا اور وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے بنگلے میں رہتا تھا جس کی بہن پارٹی میں بہت سرگرم تھی۔ ڈاکٹر کو اپنے اسٹیتھیکوپ میں مریض کی بیماری سنائی دیتی ہو یا نہیں' وہ آنے والے وقت کی چاپ سننا جانتا تھا۔ اس نے سردار کا سیاسی مستقبل پڑھ لیا تھا اس لیے اس نے سردار اور اپنی بہن کے پروان چڑھتے ہوئے تعلق کی حوصلہ افزائی کی اور کچھ ہی عرصے میں ایک چھوٹی سی تقریب میں سردار کی دوسری شادی ہوگئی۔ سردار کا نیا لکی چارم آتے ہی کارگر ہوا تھا اور سردار نے اسلام آباد میں کوٹھی بنوانا شروع ہی کی تھی کہ حالات نے پلٹا کھایا اور سردار کی پارٹی اقتدار میں آ گئی۔ نئی کابینہ میں سردار ایک اہم وزیر تھا۔ لکی چارم کی آب و تاب زیادہ عرصے قائم نہیں رہی۔ تین سال بعد جب سردار کو بیوی کے علاوہ دوسری عورتیں بھی اچھی لگنے لگی تھیں اور دوسری بیوی کو ماں بنانے کا شوق ستانے لگا تھا' حکومت چلی گئی اور پوری پارٹی کے

ساتھ سردار بھی نئی حکومت کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ وہ اقتدار سے معزولی کا یہ وقت اپنی آبائی حویلی میں اپنی پہلی بیوی سے ہونے والے بچوں کے ساتھ گزارنے لگا۔ یہ سردار کا اپنا علاقہ تھا جہاں اس کی حکم رانی کا چراغ گل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں اس کی دل بستگی کے سامان بھی موجود تھے، پھر بھی سردار کا دل لگ نہیں رہا تھا۔

اسی زمانے میں لاہور میں عورتوں کی ایک NGO چلانے والی خاتون دست کاریاں خریدنے سردار کے علاقے میں چکر لگانے لگی۔ کسی ذریعے سے سردار تک پہنچی تو سردار اسے دیکھتے ہی اس پر فریفتہ اور اس کی مدد کے لیے دل و جان سے تیار ہوگیا۔ وہ اپنی اس پجیرو میں آتی جو اس کی NGO نے غیرملکی امداد سے خریدی تھی اور سردار کی حویلی میں اس کی مہمان بن کر کئی کئی دن گزارتی۔ علاقے کی ہنرمند عورتیں سردار کی ڈیوڑھی پر آ کر اپنا کام ڈھیر کر جاتیں جسے وہ کوڑیوں کے بھاؤ خرید کر غیرملکی سفارت کاروں اور اعلیٰ طبقات کی بیگمات کے ہاتھوں موتیوں کے مول بیچ دیتی۔ اس کا کاروبار چمک اٹھا تھا۔ NGO نے مزید دو نئی پجیرو گاڑیاں خرید لی تھیں۔ سماجی بہبود کے کاموں کے ساتھ عشق بھی پروان چڑھ رہا تھا۔ اسے بھی سردار کے شاندار مستقبل کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا اور سردار کو بھی ایک نئے لکی چارم کی ضرورت تھی۔ سردار کا زیادہ وقت اب لاہور میں گزرنے لگا۔

سردار کی دوسری بیوی ماں بننے کے بعد اسلام آباد کی کوٹھی میں محدود تھی۔ اسے کچھ نہیں پتا تھا، لیکن پہلی بیوی کو معلوم تھا کہ شادی کے شادیانے جلد ہی بجنے والے ہیں۔ سردار کی پہلی بیوی ایک نواب خاندان کی اور جہاں دیدہ عورت تھی۔ وہ یہ کھیل تماشے بچپن سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے باپ اور بھائیوں نے یہی کچھ کیا تھا، وہ خود اپنے باپ کی تیسری بیوی کی اولاد تھی۔ لیکن اسے یہ اطمینان تھا کہ سردار ہر بار طوفان گزرنے کے بعد اس کے سائے میں پناہ لینے واپس آتا تھا۔ وہ شیشے کے برتن میں نشوونما پانے والا واٹر پلانٹ نہیں تھی جس کی بیل کو اوپر چڑھنے کے لیے سردار جیسی دیوار کی ضرورت ہو۔ وہ خود ایک سایہ دار درخت تھی جس کی جڑیں

زمین میں تھیں اور بہت گہری تھیں۔ وہ سردار کی خاتونِ اوّل ہی نہیں، اس کے وارث کی ماں بھی تھی۔ دوسری بیوی نے سردار کو ایک لڑکی دی تھی۔ سردار زیادہ خوش نہیں تھا۔

سردار کی تیسری شادی لاہور میں اس کے پرانے دوست اور پنجاب کے ایک سابق گورنر کی حویلی میں ہوئی اور اس کے ساتھ ہی لاہور کے سب سے فیشن ایبل علاقے میں نئی کوٹھی کی تعمیر بھی شروع ہوگئی۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ہر شادی کے بعد ہوا تھا۔ سردار کی سیاست کا ستارا ایک بار پھر چمکا، وہ دوبارہ اقتدار میں آیا اور اس بار اسے وزارت نہیں بلکہ پنجاب کی گورنری ملی، جس کا امیدوار اس کا وہ دوست بھی تھا جس کی حویلی میں سردار کی شادی ہوئی تھی اور اس کا حجلۂ عروسی سجا تھا۔ یہ اقتدار کی سیاست تھی، اس میں ضرورت پڑنے پر دوستوں کی لاشوں پر سے بھی گزرا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی وہی تھا جو شادی کے تین سال کے اندر اندر پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اِدھر نئے لکی چارم کی چمک دمک ختم ہوئی اُدھر اسلام آباد سے سردار اور اس کی پارٹی کی معزولی کے پروانے جاری ہوگئے۔ سردار کی دل چسپی اپنی بیوی کی NGO سے کم ہونے لگی، نئی اولاد کا بیج بھی پڑ چکا تھا۔ سردار نے واپس اپنی آبائی حویلی آ کر اپنی پہلی بیوی کے سائے میں پناہ لے لی تھی جو اس کی آبائی سلطنت کی بے تاج ملکہ تھی۔ اسی زمانے میں سردار رخسار میں اپنے نئے مستقبل کے امکانات تلاش کر رہا تھا۔ اس کی پہلی بیوی نے اپنی راز دار اور منہ چڑھی ملازمہ کو جو اس کے ساتھ اس کے اپنے گھر سے جہیز میں آئی تھی، یہ بتا دیا تھا کہ اس بار شادی کسی اور شہر میں نہیں اسی حویلی میں ہوگی۔

''اب کیا ہوگا مالکن! صاحب پنجویں شادی کرے گا تو کسے چھوڑے گا۔'' ملازمہ نے تشویش ظاہر کی تھی۔

مالکن کو پروا نہیں تھی۔ اسے پتا تھا سردار نے چوتھی کے بعد پانچویں شادی کی تو شرعی ضرورت کے لیے اسے نہیں، دوسری یا تیسری بیوی کو چھوڑے گا۔ سردار اسے چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر چھوڑنا چاہتا بھی تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ سردار کو انتخاب

جیتنے کے لیے اپنی بیوی کے خاندان کے آبائی علاقے کے ووٹوں کی ضرورت تھی، جیتنے کے لیے صرف اس کی اپنی جاگیر میں رہنے والوں کے ووٹ کافی نہیں تھے۔

سردار کی بیوی کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ شادی حویلی میں ہوئی تھی، سب انتظام خود بڑی مالکن نے کیا تھا۔ اس نے اس بات کو بھی یقینی بنایا تھا کہ سردار کی دوسری بیویاں شادی کے موقع پر حویلی میں ہوں۔ یہ اس کا انتقام لینے کا طریقہ تھا۔ انھوں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ اپنی آنکھوں سے اب اپنے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ انتظام مکمل ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ اب کسی کو اسے بلانے یا اس کے پاس آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے اپنی شادی کا جوڑا نکال کر پہنا تھا اور اپنی شادی کی درجنوں البمیں کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ ہر تصویر میں یادوں کی ایک دنیا آباد تھی۔ آنکھیں نم ہونے لگیں تو البمیں واپس رکھ کر سو گئی تھی۔ علی الصبح اٹھ کر اس نے اپنے ہاتھوں سے سردار اور اس کی نئی دلہن کے لیے ناشتہ تیار کیا تھا۔

رخسار خوش قسمتی میں اس کی پہلی تینوں بیویوں سے آگے بڑھ گئی۔ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ سردار کی پارٹی تو اقتدار میں نہیں آئی لیکن سردار وزیر بن گیا اور جب انتخابات جیت کر پارٹی بھی اقتدار میں آئی تو سردار سینئر وزیر اور وزیراعظم عامر نذیر کے بعد دوسری سب سے طاقت ور شخصیت تھا۔ عامر نذیر نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اپنا صدر منتخب کرانا چاہا تو سردار کو چنا تھا۔

سردار صدر تو بن گیا لیکن اختیار اعلیٰ وزیراعظم عامر نذیر کے پاس تھا۔ عامر نذیر اور اس کی بیوی آصفہ موقع بے موقع یہ احسان ضرور جتاتے کہ اسے صدر کی کرسی پر انھوں نے بٹھایا ہے۔ سردار ایوانِ صدر میں سجا ہوا ایسا گڈا تھا جو عامر نذیر کی دی ہوئی چابی سے چلتا تھا۔ سردار کی انا بار بار زخمی ہوتی لیکن اسے اقتدار اپنی انا سے زیادہ عزیز تھا۔ پھر بھی وہ موقع کا منتظر تھا۔ اسے پتا تھا کہ اختیار اعلیٰ کی منزل ایک دن اس کے قدم چومے گی۔ اس منزل تک پہنچنے کی وجہ

بھی اس کا نیا لکی چارم، رخسار بنی۔

اسلام آباد میں خواتین کے ایک گروپ کی تقریب میں جہاں رخسار مہمان خصوصی تھی، وزیراعظم کی بیوی آصفہ بھی شریک تھی اور رخسار کے لئے تقریروں میں The First Lady کی تکرار سن کر چڑ گئی تھی۔

''She is not the First Lady, she is the Fourth Lady''

آصفہ نے چائے کے دوران اپنی ایک دوست سے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''فرسٹ لیڈی گاؤں میں بچے پال رہی ہے، یہ اس کا شوکیس ماڈل ہے۔''

آصفہ کی دوست اس کی بد مذاقی پر قہقہے لگانا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ کسی میں آصفہ کو ٹوکنے کی ہمت نہیں تھی۔ رخسار خون کے گھونٹ پیتی ہوئی گھر پہنچی تو بلک بلک کر روئی۔ اس کی اتنی توہین کبھی نہیں ہوئی تھی، لگا تھا اسے سرِ عام ننگا کر دیا گیا ہے۔ سردار کو معلوم ہوا تو اس نے عامر نذیر سے بات کی، لیکن اس نے بھی رخسار کا مذاق اڑایا۔ سردار کی قبائلی غیرت جاگ اٹھی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ عامر نذیر سے وفا کا رشتہ اب ختم ہو گیا تھا۔ وہ اب دشمن تھا۔ سردار دل ہی دل میں انتقام لینے کا عہد دہراتا رہا۔

جلد ہی وہ زمانہ آیا جب ہوائیں عامر نذیر کے خلاف چلنے لگیں۔ دوست دشمن ہو رہے تھے۔ فوج، عدلیہ اور نوکر شاہی، اقتدار کے تینوں سرچشمے کسی نہ کسی وجہ سے ناراض تھے۔ سردار کے لیے وزیراعظم عامر نذیر کو معزول کرنا مشکل نہیں ہوا۔ فیاض منگی اس کا مشیر تھا جس کی شاطرانہ چالوں نے سردار کا کام آسان بنا دیا تھا۔ سردار کو اختیارِ اعلیٰ حاصل ہو گیا تھا، ساتھ ہی اس نے آصفہ سے رخسار کا انتقام بھی لے لیا تھا۔ وہ بدعنوانی کے مقدموں کے جال میں اس طرح پھنسی تھی کہ عمر بھر نہیں نکل سکتی تھی۔

''کتے میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔'' سردار نے دانت کچکچا کر وہ دھمکی دہرائی جو صدارت سے اترنے کے بعد دن میں کئی بار دہراتا تھا اور خیال ہی خیال میں اپنے شکاری

کتوں کے ہاتھوں فیاض منگی کی چیر پھاڑ کا منظر دیکھا کرتا تھا۔ فیاض منگی نے سردار کے لیے جو بساط بچھائی تھی اسے الٹنے والوں میں خود فیاض منگی بھی شامل تھا۔ ''لیکن کیوں؟'' سردار نے یہ سوال اپنے آپ سے کئی بار پوچھا تھا۔ سردار کے دورِ اقتدار میں فیاض منگی نوکر شاہی کا سب سے بااختیار شخص تھا جو ایمان علی کے دور میں حکم کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ سردار کو یہ جواب آج تک نہ مل سکا تھا۔ آج وہ آئے گا تو پوچھے گا' اس نے سوچا۔

''تیرے آنے کی وجہ وہ نہ ہوئی جو میں نے سوچی ہے تو میں تجھے سچ مچ گاؤں لے جا کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔'' سردار نے ایک بار پھر دل ہی دل میں دھمکی دہرائی' جیسے فیاض منگی اس کے سامنے کھڑا ہو۔ فیاض منگی سے ملنے کے لیے اسے بھاری قیمت دینا پڑی تھی۔ اس نے رخسار کو ناراض کیا تھا۔

رخسار کچھ دنوں سے سخت تناؤ کا شکار تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سردار کچھ کھنچا کھنچا سا ہے۔ خاموش خاموش کھویا ہوا سا۔ پچھلے آٹھ دس روز سے سردار رات گئے تک خالی الذہنی کے عالم میں کتاب کے ورق یا ٹی وی کی اسکرین پر نظریں جمائے کرسی پر جھولتا اور رخسار اس کے انتظار میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہتی۔ سردار بستر پر آتا تو دوسری طرف کروٹ کر کے لیٹ جاتا۔ رخسار اس کے قریب ہونے یا اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی تو اس کے خراٹے گونجنے لگتے۔ رخسار کو پتا تھا یہ مصنوعی خراٹے ہیں' لیکن کیوں؟ رخسار کے دماغ کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ دوستوں کے حلقے میں آہستہ آہستہ اونچی ہوتی ہوئی یہ سرگوشیاں اسے سچ لگ رہی تھیں کہ سردار سے اس کے تعلق کی عمر اب پوری ہو چکی ہے۔

''سردار تمھیں نئے لکی چارم کی ضرورت ہے۔'' سردار کے ایک بے تکلف دوست نے ایک تقریب میں قہقہہ لگا کر کہا تو یہ پروا نہیں کی تھی کہ رخسار کچھ ہی دور کھڑی اس کی آواز سن سکتی تھی۔ رخسار نے اس وقت تو ان سنی کر دی تھی لیکن اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر

لیا تھا۔ معرکہ کل رات ہوا۔ رخسار نے کھانا ختم ہوتے ہی براہِ راست حملہ کیا تھا۔

''وہ کون ہے؟''

''کون؟''

''تمھارا نیا لکی چارم جس سے ملنے ہر شام میٹنگ کا بہانہ کر کے ڈراوَر کے بغیر خود گاڑی چلا کے جاتے ہو اور کئی کئی گھنٹے غائب رہتے ہو۔''

''اوہ وہ!'' سردار نے مسکرا کر کہا۔ ان میں سے ایک مونچھوں والا ہے' ایک داڑھی والا اور ایک کلین شیو' لیکن عمر میں مجھ سے بڑا ہے۔ وہ سچ مچ میرا لکی چارم بن سکتے ہیں۔ تمھیں پتا ہے میں اپنی نئی پارٹی بنا رہا ہوں۔''

''مذاق میں مت ٹالو۔ مجھے بتاؤ وہ کون ہے۔''

''تمھارے دماغ کا خلل۔ مجھے Jealous عورتیں بدصورت لگتی ہیں۔ تم اپنی شکل مت بگاڑو' جاؤ سو جاؤ۔''

''اور تم؟ تم میرے ساتھ سونے نہیں آؤ گے؟ پہلے ایک رات صبر کرنا مشکل تھا' اب کتنی راتوں سے منہ پھیر کر سو رہے ہو۔ کون ہے جو میرا کام کر رہی ہے؟''

''تمھارے پیریڈ شروع ہونے والے ہیں۔ اس زمانے میں تم بہت Jumpy ہو جاتی ہو۔ جاؤ ٹیبلٹ لے کر سو جاؤ۔'' سردار نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ ''مت بھولو میں سوال جواب پسند نہیں کرتا' نہ مجھے چھپ کر کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی ہوا تو سب سے پہلے تمھیں معلوم ہو گا۔''

''اور وہ شمشاد؟ تمھارے لیے گاؤں سے آئی ہوئی تازہ فصل۔ میں صبح Gym جاتی ہوں تو تمھارے پاؤں دابنے کمرے میں آتی ہے اور گھنٹوں باہر نہیں نکلتی۔ میں تم نوابوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔'' سردار حلق کے بل دہاڑا۔ ''وہ میری رعایا ہیں' میری

اولاد۔ تم اتنی گندی بات کیسے سوچ سکتی ہو۔ جاؤ اس کمرے سے فوراً چلی جاؤ۔''

رخسار اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ رونا شروع کیا تو ہچکیاں لگ گئیں۔ اس کے پاس ایک یہی ہتھیار باقی بچا تھا۔ آنسوؤں کے سامنے سردار کے غصے نے بھی ہار مان لی اور وہ رخسار کے پاس جا کر اس کے بازو اور کمر تھپ تھپانے لگا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' ہچکیاں رکیں تو رخسار نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر سردار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے چھوڑا تو میں مر جاؤں گی۔''

سردار نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اسی طرح اسے لپٹائے کھڑا رہا۔ ''آپ کو پتا ہے کل ہمارے اس گھر میں آنے کی پہلی سالگرہ ہے۔ میں نے سوچا تھا ہم ایک بڑی پارٹی کریں گے' جشن منائیں گے۔''

''ضرور منائیں گے' لیکن صرف ہم دونوں۔ کل کا دن تمھارے لیے ہے' کل کوئی میٹنگ بھی نہیں ہے' کل کی شام اور رات دونوں صرف تمھاری ہیں۔''

''Promise!''

''وعدہ!''

رخسار صبح ہی سے انتظامات میں مصروف ہو گئی تھی۔ پھولوں کے تازہ گل دستے آئے تھے۔ سردار کے پسندیدہ کھانے بنوائے گئے تھے۔ شام ہوتے ہی ٹب میں گلاب کی پتیاں اور گلابوں کی خوشبو والے صابن کی گیندیں ڈال کر گھنٹے بھر لیٹی رہی تھی۔ ٹب سے نکلی تھی تو بدن کے ہر مسام سے خوشبوؤں کے فوارے ابل رہے تھے۔ گلابی ہی رنگ کا وہ ڈریس پہنا تھا جو اس نے ایمسٹرڈم سے خریدا تھا اور جسے اس نے اپنی شادی کی سال گرہ پر پہننے کے لیے رکھا تھا۔ اب سال گرہ کا انتظار کون کرے۔ اسے اپنی جنگ آج جیتنا تھی۔

ڈائننگ ٹیبل اس نے خود سجائی۔ ایک سرے پر اس کی اور دوسرے سرے پر سردار کی نشست تھی۔ گلابی رنگ کی رائل البرٹ کی کراکری اور گلابی رنگ کے ہی نیپکن۔ دونوں کی

نشست کے درمیان چھ کرسیوں اور سرخ رنگ کی تین دراز موم بتیوں کا فاصلہ تھا۔ آج رنگوں کی تھیم (theme) یہی تھا۔ سرخ اور گلابی' جو بہاروں اور خوشبوؤں کے ساتھ سردار کے بھی پسندیدہ رنگ تھے۔ لباس کے ساتھ خود رخسار کے چہرے پر بھی یہی دونوں رنگ آ جا رہے تھے۔ رات جو کچھ کرنے والی تھی اس کے بارے میں سوچ سوچ کر شرما رہی تھی۔

سردار رخسار کی تیاریوں سے بے خبر اپنی مخصوص جھولنے والی کرسی پر بیٹھا تھائی لینڈ کی شاہی کتیا کی زندگی پر شائع ہونے والی وہ کتاب پڑھ رہا تھا جس نے تھائی لینڈ میں فروخت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ یہ ایک آوارہ کتیا کی کہانی تھی جسے تھائی لینڈ کی ملکہ گلی سے اٹھا کر محل لے آئی تھی' جس نے کمال مہارت سے شاہی آداب سیکھے تھے اور اب وفاداری اور شاہی آداب کی علامت بن گئی تھی۔ تھائی لینڈ کے بادشاہ نے یہ کتاب شائع کرا کر رعایا کو وفاداری کا سبق دیا تھا۔ سردار سوچنے لگا کہ آج رات فیاض منگی کو یہ کتاب پڑھنے کے لیے دے گا۔ اس میں سب کچھ تھا صرف وفاداری کی کمی تھی۔ سردار نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ دوبارہ صدر بنا تو اس کتاب کو تعلیمی نصاب میں شامل کرائے گا۔ پاکستانیوں کو وفاداری کے سبق کی زیادہ ضرورت تھی۔ یہ صفت آہستہ آہستہ نایاب ہوتی جا رہی تھی۔

رخسار کھانا لگانے سے پہلے ریڈ وائن کی وہ بوتل کھول رہی تھی جو سردار نے کسی خاص مہمان کے لئے محفوظ رکھی تھی۔ رخسار نے سوچا تھا سردار سے زیادہ خاص مہمان کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس نے کرسٹل کے جاموں میں شراب انڈیلنے کے بعد وہ دستی گھنٹی بجائی جو کھانا لگنے کے اعلان کے طور پر ہمیشہ بجایا کرتی تھی۔ سردار خاموشی سے اٹھ کر اپنی نشست پر آ بیٹھا۔

''آپ کو پتا ہے یہ کون سی شراب ہے؟'' رخسار نے اپنی نشست سے اٹھ کر سردار کے جام سے جام ٹکرایا۔

''کون سی؟'' سردار نے ایک گھونٹ لے کر کہا۔

''جو ہم نے پیرس سے آکشن میں خریدی تھی۔''

''اوہ وہ؟ بہت اچھی ہے۔'' سردار نے ایک اور گھونٹ لیا' لیکن شاید اس کے ذائقے کی حس سو گئی تھی۔ اسے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ رخسار اطمینان کا سانس لے کر اپنی کرسی پر واپس چلی گئی۔ سردار نے اتنی قیمتی بوتل کھولنے پر برہمی ظاہر نہیں کی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ ایک بڑا سا گھونٹ لیا جیسے سرخ انگوروں کا پورا باغ حلق میں اتار رہی ہو۔

کھانے کے بعد دونوں ٹی وی کے سامنے آ بیٹھے۔ سردار ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور رخسار سردار کے خالی ہوتے ہوئے جام کو بھر رہی تھی۔ اپنا جام خالی کر کے وہ اٹھ گئی۔

''خبریں ختم ہوں تو جلدی سے آ جایئے' میں انتظار کر رہی ہوں۔'' اس نے اٹھلا کر کہا اور سردار کے ہونٹوں پر ہلکا سا بوسہ دے کر اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ خوشبو کی ایک لکیر سی بن گئی تھی' لیکن ذائقے کی طرح سردار کے سونگھنے کی حس بھی خاموش تھی۔ وہ ذہنی طور پر ابھی تک فیاض منگی میں الجھا ہوا تھا۔ کھانے کی میز پر اس نے سوچا تھا کہ رخسار کو بتائے گا کہ کون آنے والا ہے' لیکن فیاض منگی نے رازداری کی تاکید کی تھی۔ عورتیں اپنی معصومیت یا بے وقوفی میں غلط موقع پر نہ کہنے والی بات کہہ جاتی ہیں۔ رخسار بھی ایک عورت تھی۔

رخسار نے بیڈ روم میں پہنچتے ہی شمشاد کو بلوا لیا تھا۔ رخسار کو پتا تھا سردار خبرنامہ دیکھے بغیر نہیں اٹھے گا۔ خبرنامہ ختم ہونے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے۔ رخسار کو اپنی تیاری مکمل کرنے کے لیے اتنا ہی وقت چاہیے تھا۔ شمشاد اس کے بلاوے پر بھاگی بھاگی آئی تھی۔ وہ گاؤں والی حویلی میں سردار کی پہلی بیوی کی ذاتی خادمہ تھی جسے ترقی دے کر کراچی بھیج دیا گیا تھا۔ حویلی میں شمشاد کی جگہ اس کی چھوٹی بہن نے لے لی تھی۔ شمشاد اٹھارہ انیس سال کی تھی' تازہ تازہ کھلی ہوئی کلی کی طرح۔ ہرنی کی طرح کلیلیں بھرتی اور شوخیاں کرتی ادھر سے ادھر بھاگی پھرتی۔ کبھی کبھی رخسار بھی اس کے چہرے کے رنگ اور شادابی اور اس کے بدن کی جنبشیں دیکھ کر حسد کا شکار ہو جاتی۔

شمشاد کے آتے ہی رخسار نے دروازہ بند کیا اور ایک ایک کر کے اپنے سارے کپڑے اتار دیے۔ شمشاد حیرت سے کھڑی سوچنے لگی' اسے تو بڑے مالک کی خدمت کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن کیا چھوٹی مالکن بھی بڑی مالکن کی طرح...... اس نے کندھے اچکا کر اپنی حیرت جھٹک دی۔ اسے خوشی ہو رہی تھی۔ بڑی بیگم کے بے ڈول جسم کے مقابلے میں چھوٹی مالکن کا جسم کتنا خوبصورت تھا۔ جب وہ لپٹ کر سوئے گی تو...... اس نے مزید کچھ سوچنے کے بجائے خود کار طریقے سے اپنے کپڑے اتارنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیے' لیکن رخسار کی آواز سن کر چونک پڑی۔ رخسار گلابی ریشمی بستر پر چت لیٹ کر اسے ہدایت دے رہی تھی۔

''سامنے جو پھولوں کے ٹوکرے رکھے ہیں وہ مجھ پر ڈال دے۔''

''سارے کے سارے؟''

''ہاں! سب کے سب۔''

رخسار نے یہ منظر ایک امریکی فلم سے چرایا تھا۔ وہ رات بھر سوچتی رہی تھی کہ کون سی نائٹی پہنے گی۔ سب پہلے پہنی ہوئی اور سردار کی دیکھی ہوئی تھیں۔ اچانک ہی فلم کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا وہ کچھ نہیں صرف پھول پہنے گی۔ شمشاد اسے گلاب کی پتیوں میں دفنا کر اسے حیرت سے تکتی ہوئی واپس چلی گئی۔ چہرے کے علاوہ رخسار کا پورا بدن پھولوں کی پتیوں میں ڈوب گیا تھا۔ بدن کے ساتھ پورے بستر پر بھی پھولوں کی دبیز چادر پھیل گئی تھی۔ اسے پتا تھا سردار آ کر گلابوں کو ٹوٹے گا تو پہلے حیران اور پھر پاگل ہو جائے گا۔ بس کچھ ہی دیر باقی تھی۔ خبریں ختم ہونے ہی والی تھیں۔

پھولوں کی نمی' نرمی اور خوشبو لوریاں دے رہی تھیں۔ اعصاب دن بھر تنتے رہے تھے' ڈھیلے ہوئے تو آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ آنکھ کھلی تو گیارہ بج چکے تھے۔

''کیا وہ ابھی تک نہیں آئے؟ کہیں آ کر چلے تو نہیں گئے؟'' وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

پوری طرح جاگی تو اسے سردار کے آنے کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی۔ اعصاب آہستہ

آہستہ پھر سے تن گئے' خون دماغ میں چڑھنے لگا۔ وہ بستر سے اتری تو فرش پر چاروں طرف پھولوں کی سیج بکھر گئی۔ چند پتیاں بدن کے کچھ مقامات کو الگنی سمجھ کر لٹک گئی تھیں۔ وہ اسی طرح پاؤں پٹختی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی تو ٹی وی بھی بند تھا اور کتاب بھی' سردار آنکھیں بند کیے اپنی راکنگ چیئر میں جھول رہا تھا۔ ماتھے پر لکیروں کا جال بچھا تھا۔

''آپ کے انتظار میں میری پھولوں کی نائٹی سوکھ گئی۔'' اس نے کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیز آواز میں کہا تو سردار نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

''کیا دیوانی ہوگئی ہو۔ ننگی کھڑی ہو' نوکر آ گئے تو......''

''کوئی نہیں آئے گا صرف آپ کو آنا تھا۔''

''مجھ سے ملنے ایک اہم آدمی اسلام آباد سے آ رہا ہے' مجھے اس کا انتظار ہے۔ میرے لیے بہت اہم ملاقات ہے۔''

''ہمارے تعلق سے بھی زیادہ؟ آپ نے آج کی رات مجھے دی تھی' میرے ساتھ جشن منانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''جشن مجھ پر ادھار رہا'' سردار نے کرسی سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی شال اتار کر رخسار کے بدن پر لپیٹ دی۔ ''ایسے کئی جشن اور راتیں ہماری زندگی میں آئیں گی۔ تم خوش ہو جاؤ۔ ہم ایک بار پھر پریذیڈنٹ ہاؤس میں اپنا جشن منائیں گے' اسلام آباد سے یہی پیغام آنے والا ہے۔''

''آپ شاید ایک بار پھر صدر بن جائیں' لیکن ایسی رات آپ کی زندگی میں اب کبھی نہیں آئے گی۔'' رخسار نے سردار کی شال اتار کر پھینکی اور پلٹ کر تیزی سے واپس چلی گئی۔ کمرے میں آ کر اس نے ایک جھٹکے سے وہ چادر اتار پھینکی جس پر ابھی تک پھولوں کی ایک تہہ بچھی ہوئی تھی اور ننگے بستر پر لیٹ کر سسکنے لگی۔ اسے لگا جیسے اس نے بازی ہار دی ہے۔ کانوں میں سردار کے دوست کی آواز گونج رہی تھی'' سردار! تمھیں نئے لکی چارم کی ضرورت ہے۔''

سردار کو واپس جاتی ہوئی رخسار کی برہنہ پشت پہلی بار بہت بھدّی لگی۔ اس نے زمین پر پڑی ہوئی اپنی شال اٹھا کر اوڑھی اور کرسی پر بیٹھ کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسے پہلی بار یقین ہوا تھا کہ رخسار کے ماں بننے کا وقت آ گیا ہے۔ اس نے سوچا کل اس امریکی صحافی کو جو اس کا انٹرویو لے کر گئی تھی، اپنی حویلی میں مدعو کرے گا۔ وہ گاؤں میں کچھ دن گزار کر دیہی زندگی پر ایک فیچر لکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے دکھائے گا کہ نواب کس طرح رہتے ہیں۔ اسے سمجھائے گا کہ وہ خبروں کے پیچھے پیچھے ماری ماری پھرنے کے لیے نہیں محلوں میں رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ رخسار کی جلد بازی نے اس کی قسمت پر مہر لگا دی تھی۔

○ ○ ○
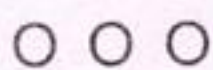
فیاض منگی نائٹ کوچ سے کراچی ایئرپورٹ پر اترا تو خوش تھا کہ جہاز میں کوئی جاننے والا نہیں ملا۔ نائٹ کوچ کے سستے ٹکٹ پر وہ لوگ سفر کرتے تھے جو پیسہ بچانا چاہتے تھے۔ فیاض منگی کو جن لوگوں کی نظروں سے بچنا تھا انھیں پیسہ بچانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط کی تھی۔ ٹوپی پہنی تھی اور آنکھوں پر بڑے شیشوں والا نظروں کا چشمہ لگایا تھا۔ اسے ایک نظر میں پہچاننا مشکل تھا۔ ٹرمنل سے باہر آیا تو اس کی بتائی ہوئی جگہ پر ایک کالی مرسڈیز پارک تھی۔ ڈرائور والی سیٹ کا دروازہ کھولے شلوار قمیص میں ملبوس فوجی ہیئر کٹ اور بڑی مونچھوں والا ایک دراز قد شخص کھڑا تھا۔ اس نے خاموشی سے گاڑی کی چابی فیاض منگی کو دے دی۔

''یہیں میرا انتظار کرنا۔ مجھے اگلی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔'' اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ گاڑی کے شیشے کالے تھے، کوئی اسے باہر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اندر رستے کا نقشہ رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر اس نے سوچا سردار کا مکان ڈھونڈنا مشکل نہیں ہوگا۔

فیاض منگی کو معلوم تھا سردار بل کھا رہا ہوگا۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ سردار نے اسے ابھی

تک معاف نہیں کیا۔ فیاض منگی کے لیے کسی کو بھی یہ سمجھانا مشکل تھا کہ اس کی وفاداریاں کسی کی ذات سے نہیں' ملک کے مفاد سے وابستہ تھیں۔ آتے جاتے لوگ پتھر اور روڑوں کی طرح تھے جنھیں چومنے اور پوچنے کے بعد ضرورت پڑنے پر ٹھوکر بھی ماری جا سکتی تھی۔ اس کے فلسفے کو صرف نوکر شاہی کا بازی گر کرم قریشی سمجھ سکتا تھا جس کے اقتدار مافیا کو چھوڑ کر فیاض منگی نے پچھلی بار سارے انڈے سردار کی ٹوکری میں ڈال دیے تھے اور شاید اپنے کیریئر کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ غلطی کی وجہ وہ اندازے تھے جو اس نے سردار کے بارے میں لگائے تھے۔

''آج پھر اندازے غلط تو نہیں نکلیں گے؟'' اس نے سوچا لیکن پھر خود ہی یہ خیال جھٹک دیا۔ صرف ایک سردار ہی بچا تھا جسے جھاڑ پونچھ کر ایمان علی کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکتا تھا اور جو اپنے سرپرستوں کا مکمل فرمانبردار رہ سکتا تھا۔ اسے یقین تھا سردار اپنے پہلے دورِ صدارت سے سبق سیکھ چکا ہوگا۔ پھر یہ بھی طے تھا کہ کرسی پر بٹھانے سے پہلے سردار کے پر کتر دیے جائیں گے۔ ساتھ ہی اس کے سر پر کسی کو بٹھایا جائے گا تا کہ غلطی کی گنجائش نہ رہے۔

فیاض منگی نے اس زمانے میں صرف سردار کو ہی نہیں' رِٹائر ہونے والے آرمی چیف جنرل برلاس اور رِٹائرڈ بیوروکریٹ اختیار رضوی کو باوسیلہ سمجھنے کی غلطی بھی کی تھی۔ ان کی مدد سے جو متوازی اقتدار مافیا بنا تھا وہ محض بے دانت کے شیروں اور چند چھوٹے چھوٹے مفاد پرستوں کا ٹولہ بن کر رہ گیا تھا جس کے پاس نہ کوئی وژن تھا اور نہ ایجنڈا۔ اس کے مقابلے میں کرم قریشی کے مافیا کو نئے آرمی چیف جنرل منصف اور ان طاقتور لوگوں کی حمایت حاصل تھی جو 'نئے پاکستان' کے ایجنڈے پر یقین رکھتے تھے اور اس کے لیے کام کرنا چاہتے تھے۔ فیاض منگی اور جنرل برلاس کے مافیا کی طاقت کا تمام تر انحصار سردار پر تھا جسے اس وقت ایک مطلق العنان صدر کی حیثیت حاصل تھی لیکن اقتدار نے اس کا بھی دماغ خراب کر دیا تھا۔ فیاض منگی کی توقع کے برعکس وہ ایک ناعاقبت اندیش اور کسی حد تک بے وقوف ثابت ہوا تھا۔ اس نے جنرل منصف سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی تھی جو اس کے اقتدار کی بِنا کسی وقت

بھی ڈبو سکتا تھا۔ اسے اس کی بیوی کے رشتے داروں اور خوشامدی مشیروں نے اپنے حصار میں لے لیا تھا اور اس کے کان ہر وقت ''سب اچھا ہے'' کی آواز سننے کے عادی ہو گئے تھے۔

سردار کے دورِ صدارت میں فیاض منگی بہت طاقت ور تھا' لیکن اسے پتا تھا یہ طاقت زیادہ دیر نہیں رہے گی۔ اس نے اقتدار کا نشہ جھٹک کر جلد ہی اپنی آنکھیں کھول لی تھیں۔ اسے ڈوبتی ہوئی کشتی کی سواری پسند نہیں تھی۔ اس نے کرم قریشی کو اپنی خدمات پیش کر دیں جو جنرل منصف سے مل کر نئے پاکستان کی بنیاد رکھنے کے لیے ایمان علی کے اقتدار کا راستہ ہموار کر رہا تھا۔ فیاض منگی کی مدد سے یہ عمل تیز ہو سکتا تھا' اور ایسا ہی ہوا تھا۔ فیاض منگی کو وہ منظر یاد تھا جب سردار کے اقتدار کا بستر لپیٹا گیا تھا۔ ایوان صدر میں جنرل منصف اور کرم قریشی کو وہی سردار کے کمرے میں لے کر گیا تھا۔ کرم قریشی نے ٹائپ کیا ہوا صدارتی مونوگرام والا کاغذ سردار کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''مسٹر پریذیڈنٹ!'' جنرل منصف نے میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر اپنی دستی چھڑی سے ٹک ٹک کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''براہِ کرم اس پر دستخط کر دیجیے۔''

''یہ کیا ہے؟''

''حکومت اور اسمبلیاں توڑنے' ملک میں ہنگامی حالات نافذ کر کے آئین معطل کرنے اور ایمان علی کی صدارت میں دو سال کے لیے عبوری حکومت قائم کرنے کا حکم نامہ اور آپ کا استعفیٰ۔''

''What?'' سردار غصے سے دہاڑا۔ ''آپ سمجھتے ہیں آپ کی یہ چھڑی جادو کی ہے جسے ہلا کر آپ مجھ سے دستخط حاصل کر لیں گے؟ آپ کو پتا ہے میں آپ کو اسی وقت برطرف کر سکتا ہوں۔''

''ایک دوسرا کاغذ بھی ہے۔'' جنرل منصف نے کرم قریشی کو اشارا کیا۔ سردار کی بات جیسے اس نے سنی نہیں تھی۔ کرم قریشی نے میز پر ایک اور ٹائپ کیا ہوا کاغذ رکھ دیا' اس پر جی ایچ کیو

کا مونوگرام تھا۔

''دوسری صورت میں یہ حکم نامہ میرے دستخطوں سے جاری ہوگا۔'' جنرل منصف نے چھڑی کا سرا دوسرے کاغذ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ صورت آپ کے لیے بہت توہین آمیز ہوگی۔ ایوانِ صدر اور ٹی وی ریڈیو اسٹیشن اس وقت فوج کے قبضے میں ہیں۔ میرا اعلان نشر ہوتے ہی آپ گرفتار کر لیے جائیں گے اور آپ پر بدعنوانیوں کے اتنے مقدمے قائم ہوں گے کہ آپ ساری عمر ضمانتیں لیتے لیتے جیل میں گزار دیں گے۔''

''Rubbish! آپ مجھ سے بلف نہیں کر سکتے۔ آپ نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے۔ میں آپ کو بری افواج کی کمان سے اسی وقت الگ کرتا ہوں۔ Your services are no longer required, General! مسٹر منگی ابھی اسی وقت لیٹر تیار کیجیے اور گارڈ کو بلا کر جنرل کے ساتھ آئے ہوئے شخص کو حراست میں لے لیجیے۔ یہ بلا اجازت ایوانِ صدر میں داخل ہوا ہے۔ اس پر غیر قانونی طور پر پریذیڈنٹ ہاؤس کی اسٹیشنری استعمال کرنے کے الزام میں مقدمہ بھی قائم کیجیے۔'' فیاض منگی اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔

''فیاض!'' کرم قریشی پہلی مرتبہ بولا تھا۔ ''صدر محترم کو ان کی فائل دکھایئے۔'' فیاض منگی کو کرم قریشی کی آواز سنتے ہی جیسے کرنٹ لگ گیا تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر بغل میں دبی ہوئی موٹی فائل سردار کے سامنے رکھ دی۔

''اس میں آپ کے دورِ صدارت کی بدعنوانیوں کا ایک ایک ثبوت ہے۔ یہ فائل آپ کے اپنے ایڈوائزر نے تیار کی ہے۔'' کرم قریشی نے کہا تو سردار نے صرف ایک نظر فیاض منگی کو دیکھا۔ نگاہوں میں ''تم بھی!'' کا مکالمہ گونج رہا تھا۔ چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔

''سر! آپ کے ایڈوائزر کی حیثیت سے میرا آخری مشورہ ہے کہ حکم نامے پر دستخط کر دیجیے۔'' فیاض منگی نے بہت ادب سے کہا۔

''شٹ اپ! صرف اس وقت بولو جب تم سے بولنے کے لیے کہا جائے۔'' سردار کے لہجے میں تحکم تھا۔ چہرے کا رنگ بھی واپس آ گیا تھا۔ ''جنرل منصف! اپنی چھڑی میری میز سے ہٹائیے۔ آپ میری نہیں اس ملک کے صدر کی توہین کر رہے ہیں۔ ابھی میں نے استعفے پر دستخط نہیں کیے ہیں۔''

''آئی ایم سوری مسٹر پریذیڈنٹ۔'' جنرل منصف نے چھڑی بغل میں دبائی اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اٹنشن کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ سردار نے اپنا قلم نکالا اور بہت باوقار انداز میں جنرل منصف کے لائے ہوئے کاغذ پر دستخط کر دیے۔

''ہو سکے تو میری ایک آخری خواہش مان لیجیے۔'' سردار نے کاغذ جنرل کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں ٹی وی پر نشری خطاب کے ذریعے ان اقدامات اور اپنے استعفے کا اعلان کروں جس پر آپ نے مجھ سے دستخط لیے ہیں۔''

''لیکن......'' کرم قریشی نے کچھ کہنا چاہا' جنرل منصف نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''مسٹر قریشی! ٹی وی کریو کو یہیں بلوا لیجیے۔ صدر محترم! آپ خطاب کی تیاری کیجیے۔ اگر اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہوئی تو ہم اسے لائیو براڈ کاسٹ کہہ کر ابھی نشر کر دیں گے۔''

''میں نے آپ کے لکھے ہوئے حکم نامے پر دستخط کیے ہیں' تقریر بھی وہی کروں گا جو آپ لکھ کر دیں گے۔'' سردار نے ہتھیار پوری طرح ڈال دیے تھے۔

○○○

فیاض منگی کی گاڑی کلفٹن کا پل عبور کر کے اس علاقے میں داخل ہو رہی تھی جس کا باقی کراچی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ فیاض منگی سوچ رہا تھا آج اس کی وفاداری کو نیا امتحان درپیش ہے۔ اسے اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوا۔ وہ آج بھی اتنا ہی مطمئن تھا جتنا اس وقت تھا

جب وہ سردار کے نیچے سے اس کے اقتدار کی کرسی کھینچنے والوں میں شامل ہوا تھا۔

''کوئی نہیں سمجھ سکے گا' کوئی نہیں سمجھے گا۔'' اس نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

وہ ایمان علی اور اس کی حکومت کا مکمل وفادار رہا تھا۔ وہ ایمان علی کو ملک کا نجات دہندہ مانتا اور اسے پوجنے کی حد تک پسند کرتا تھا۔ ایمان علی کی اصلاحات نے ان طبقوں کی حالت بدلی تھی جن سے اس کے خاندان کا اور خود اس کا تعلق رہا تھا۔ فیاض منگی نے ان اصلاحات کے نفاذ کے لیے پوری دیانت داری کے ساتھ دن رات کام کیا تھا۔ لیکن ایمان علی اب اپنے دائرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کی ضد اسے خطرناک پانیوں کی طرف لے گئی تھی۔ ایمان علی کو نہ روکا گیا تو پاکستان اپنے سرپرستوں سے محروم ہو سکتا تھا۔ اسے روکنا ضروری تھا۔ روکنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ اسے کسی طرح اقتدار سے الگ کر دیا جائے۔

یہ خطرہ بھی تھا کہ فوج معاملات اپنے ہاتھ میں لے لے گی' لیکن فیاض منگی جو دو فوجی حکومتیں دیکھ چکا تھا' جانتا تھا کہ ایسا ہوا تو ایمان علی کی اصلاحات رول بیک ہو جائیں گی۔ ملک ایک بار پھر فوجی اسٹیٹ بن جائے گا۔ وہ جو سب کچھ کرنے پر قادر تھے وہ بھی فوجی آمریت سے گریز چاہتے تھے۔ سردار ایک درمیانی راستہ تھا۔ ایمان علی کی اصلاحات محفوظ رہ سکتی تھیں اور وہ مفادات بھی جو پاکستان کے اپنے مفادات سے منسلک تھے۔ سب نے سردار پر اتفاق کیا تھا۔

''وہ!'' فیاض منگی مسکرایا' وہ پوری دنیا کے حاکم تھے۔ ایمان علی نے ان کی بات نہ مان کر ملک کے لیے خطرات کھڑے کر دیے تھے۔ ملک کو بچانا ضروری تھا۔ اس کے لیے ایمان علی کی قربانی ایک چھوٹی قربانی تھی۔ فیاض منگی کا ضمیر پوری طرح مطمئن تھا۔

سردار نے خود آ کر دروازہ کھولا' لیکن فیاض منگی کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ قبول نہیں کیا۔ ایک لفظ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے اس کی پیشوائی کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

اندر آ کر دونوں کمرے کے وسط میں کھڑے ہو گئے۔ فیاض منگی کو پتا تھا کہ سردار حملہ کرنے کے لیے پینترا بدل رہا ہے۔ فیاض منگی کے پاس ماضی میں جانے' غصے' گلے اور وضاحتوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ فیاض منگی کا پہلا جملہ ہی سردار کو ٹھیک کرنے کے لیے کافی تھا۔

''سر! کیا آپ دوبارہ صدارت قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟''

صدر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے آج تمام دن یہی ایک جملہ سننے کے انتظار میں گزارا تھا۔ دوبارہ صدر بننا ایک خواب کی طرح تھا۔ صدارت سے معزولی کے بعد وہ ہر روز یہ خواب دیکھتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں نکلتی۔ فیاض منگی کی پراسرار طریقے سے آمد نے توقعات پیدا کی تھیں۔ لیکن اوہام اور شکوک بھی گھیرے رہے تھے۔ اب جب یہ جملہ سنا تو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''صدر محترم! آپ کو واپسی کا سفر مبارک ہو۔'' فیاض منگی نے ہاتھ بڑھایا تو سردار چونک پڑا۔ اس نے اس بار بڑھا ہوا ہاتھ فوراً تھاما' ہاتھ پکڑے پکڑے فیاض منگی کو صوفے تک لے کر آیا اور خود بھی اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے انداز میں وہی صدرِ مملکت والی شان تھی۔

''میری اسلام آباد واپسی کی فلائٹ آدھے گھنٹے بعد ہے' میرا اس سے واپس جانا ضروری ہے۔ میں یہاں دس منٹ سے زیادہ نہیں رک سکتا۔ اس فائل میں سب تفصیلات موجود ہیں۔'' فیاض منگی نے ایک فائل سردار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی اسلام آباد واپسی بہت شان دار ہو گی۔ وہاں ملک کے تمام اہم سیاست دان آپ کا استقبال کرنے آئیں گے۔ سب اپنے اپنے جتھے ساتھ لائیں گے۔ آپ بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کیجیے' خواہ اس کے لیے آپ کو اپنا گاؤں خالی کرانا پڑے۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام مشکل نہیں ہو گا۔ آج کل کشمیر کا محاذ گرم ہے' وہی آپ کا ایک نکاتی ایجنڈا ہے۔ بھارت کے خلاف آپ کی زبان سخت اور لہجہ بہت جارحانہ ہونا چاہیے۔ اس مسئلے پر عوام ساتھ ہوں نہ

ہوں، فوج آپ کے ساتھ ہوگی۔ وہی آپ کے ایوانِ صدر پہنچنے کی کلید ہے۔''

فیاض منگی ایک منٹ کے لیے سانس لینے رکا تو دیکھا سردار ایک ہونہار شاگرد کی طرح بہت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ایک ایک لفظ اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔

''اسلام آباد میں ملک کے اہم سیاست دانوں کا اجلاس بلایئے۔ آپ کی دعوت پر سب آئیں گے۔ فائل میں ان کی فہرست موجود ہے۔ ان میں کئی آپ کے پرانے مخالفین بھی ہیں، لیکن سب آپ کی اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ سب کو آپ کی قیادت قبول ہے۔ پیر حقّہ کو دعوت دینے ان کے گھر خود جانا ہوگا۔ اُن کی علامتی حیثیت اہم ہے۔ جمہوریت کی چیمپئن شپ حاصل کرنے کے بعد وہ اب کشمیر کاز کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔'' فیاض منگی زیرِ لب مسکرایا لیکن سردار اسی طرح سنجیدگی سے سن رہا تھا۔

''امریکی سفیر سے ملاقات کا وقت مل چکا ہے۔ اس کی تفصیلات بھی فائل میں ہیں۔ آپ ان سے کشمیر کے مسئلے پر امریکی حمایت کی یقین دہانی حاصل کریں گے۔ آپ آرمی چیف سے ملاقات کا وقت مانگیں گے تو مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔ اس سے اگلے ہفتے آپ کا امریکہ کا دورہ طے ہے۔ وہاں آپ کانگریس کے لیڈرز اور سینیٹرز سے ملیں گے۔ کسی ایک تھنک ٹینک سے آپ کا خطاب بھی ممکن ہے۔ آپ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے امکانات پر بات کریں گے۔ آپ کی تقریر پر ابھی کام ہو رہا ہے۔ ان سب کے لیے آپ کا رابطہ جوڈی ولیمن ہے، امریکی صحافی جو آپ کا انٹرویو بھی لے چکی ہے۔ آپ اسے جانتے ہیں۔ وہ دیہی زندگی پر فیچر لکھنے کے بہانے آپ کی حویلی میں قیام کرے گی۔ آپ اسے مدعو کریں گے۔''

سردار دل ہی دل میں مسکرایا۔ کیا حسین اتفاق تھا۔ وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ پہلی بار کام اور تفریح کا ملاپ ہو رہا تھا۔

''جوڈی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک اسسٹنٹ انڈر سیکرٹری کی بیوی ہے۔ آپ کو خیال رکھنا ہوگا۔'' فیاض منگی نے نظریں جھکا کر آہستگی سے کہا۔ وہ سردار کی شکاری فطرت سے

آ گاہ تھا۔ سردار کے اندر اٹھنے والی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ لیکن پھر اس نے یہ خیال ہی جھٹک دیا۔ یہ تفریح کا وقت نہیں تھا۔ اقتدار کے لیے وہ جوڈی جیسی کئی حسینائیں قربان کر سکتا تھا۔

''آپ اب اسلام آباد میں مستقل قیام کریں گے' وہاں آپ کا سیکرٹریٹ قائم ہوگا۔ کام کرنے کے لیے دو تین ریٹائرڈ بیوروکریٹس نے والنٹیر کیا ہے۔ ان کی ٹیم میں باہر سے پڑھ کر آنے والے کچھ نوجوان بھی شامل ہوں گے۔ ان کے نام بھی فائل میں ہیں۔ آپ کو ایک بہت مؤثر میڈیا ٹیم کی ضرورت ہے۔ ان کے نام بھی آپ کو مل جائیں گے۔ یہ سب اپنے کام کے ماہر لوگ ہیں۔ انھیں اپنے گرد غیر ضروری بھیڑ پسند نہیں ہے۔ آپ اقتدار میں حصہ بانٹنے کے لیے جمع ہونے والوں کو ایک فاصلے پر رکھیے گا اور انھیں صرف مجمعے لگانے کے لیے استعمال کیجیے گا۔ سر! وقت بہت کم ہے۔ ہمیں بہت تیزی سے دن رات کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔ آپ تیار ہیں؟''

''اس ملک کے صدر کا ہر لمحہ قوم کے لیے وقف ہے۔ وہ ۲۴ گھنٹے کام کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔'' سردار نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔ فیاض منگی گھڑی دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ سردار بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

''آپ کے اسلام آباد پہنچنے تک آپ کی ٹیم کی بریفنگ مکمل ہو جائے گی۔ آپ کو ان کے ساتھ کام کرنے کا رشتہ قائم کرنے کے لیے کافی وقت دینا ہوگا۔ میں کل رات آپ کو فون کروں گا۔ اس وقت تک آپ یہ فائل پڑھ چکے ہوں گے۔ آپ کو جو وضاحتیں درکار ہوں گی وہ مجھ سے طلب کیجیے گا۔ اس کے بعد آپ سے میرا رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ آپ کبھی اور کسی قیمت پر مجھ سے رابطہ نہیں کریں گے۔ اس کام کے لیے آپ کی ٹیم میں جو لوگ مقرر ہیں انھیں معلوم ہوگا کہ انھیں کب اور کس سے رابطہ کرنا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے۔ میری فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔''

''آپ چائے پیے بغیر نہیں جائیں گے۔'' دونوں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ رخسار

اپنے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لیے آ رہی تھی۔ وہ شلوار قمیص کا سوٹ پہنے اور دوپٹہ بہت احتیاط سے لپیٹے ہوئے تھی۔ سردار اسے دیکھ کر جانے کیوں اچانک بہت خوش ہوا۔ دوپٹہ اوڑھی ہوئی رخسار اسے بہت خوب صورت لگی۔ اس نے سوچا رخسار کا لکی چارم ابھی کم نہیں ہوا۔ اسے اپنے گزشتہ رویے پر افسوس ہوا، لیکن ابھی کچھ نہیں گیا تھا' بہت رات باقی تھی۔ وہ رخسار کے ساتھ جشن منانے کا وعدہ پورا کر سکتا تھا۔

''آپ نے کسی نوکر کو کیوں نہیں بلایا۔'' سردار نے بہت خوش گوار لہجے میں کہا۔

''آج کی رات بہت مبارک ہے۔ آج میں اپنے ہاتھ سے چائے بناؤں گی۔'' رخسار نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر منگی! آپ کیسے ہیں؟ آپ کی ڈاکٹر مسز کیسی ہیں؟''

''بہت اچھی! آپ نے زحمت فرمائی۔'' وہ سوچ رہا تھا کیا رخسار نے سب کچھ سن لیا ہے۔ ممکن ہے نہ سنا ہو' وہ بہت آہستہ آواز میں بات کرتا رہا تھا۔ پھر بھی اسے تشویش ہو رہی تھی۔ یہ ہائی رسک گیم تھا۔ کسی کو سیکیوریٹی رسک بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن اس وقت کوئی نئی پیچیدگی پیدا کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی رخسار نے نہ سنا ہوتا تب بھی سردار اسے بتاتا کہ کیا ہو رہا ہے۔

رخسار انھیں چائے دے کر فوراً ہی واپس چلی گئی۔ بیڈ روم میں جا کر اس نے ایک بار پھر اپنے سارے کپڑے اتارے اور فرش سے پھولوں کی پتیاں چن کر بستر پر بچھانے لگی۔ اس نے ایک ہی رات میں بازی ہار کر دوبارہ جیتی تھی۔ اسے پتا تھا اب صدر بننے کی جدوجہد میں سردار کے شانہ بشانہ وہی کھڑی ہوگی۔ ایوانِ صدر میں اب ایک بار پھر وہی اس کے ساتھ جائے گی۔ وہ بستر پر لیٹ کر اپنا بدن پھولوں سے ڈھانپنے لگی۔

سردار فیاض منگی کو رخصت کرنے باہر تک آیا۔

''سر! یہ فائل صرف آپ کی نظروں کے لیے ہے۔ ذرا سی بھی لیک (leak) ہمارے

پلان کو ہی نہیں ہمیں بھی تباہ کر دے گی۔'' فیاض منگی نے سردار کو خبردار کرنا ضروری سمجھا۔

''یہ کھیل میرے لیے نیا نہیں ہے۔'' سردار نے فیاض منگی کو فائل دکھاتے ہوئے کہا جسے اس نے ایک منٹ کے لیے بھی خالی کمرے میں نہیں چھوڑا تھا اور اپنے ساتھ باہر لے کر آیا تھا۔

''آپ کو پتا ہے آپ کے بارے میں میرا کیا منصوبہ ہے؟'' سردار نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''میرے صدر بننے کے بعد آپ میرے چیف ایڈوائزر رہوں گے۔ مکمل اختیارات کے ساتھ۔''

''جی نہیں! میں اس بار ایڈوائزر نہیں بنوں گا۔'' فیاض منگی نے سردار کو حیران کر دیا۔ کیا وہ واقعی اتنا بے غرض ہو گیا تھا؟ فیاض منگی نے فوراً ہی اس کی غلط فہمی دور کر دی۔

''صدر بننے کے بعد آپ مجھے نئی حکومت کا وزیراعظم نامزد کریں گے۔''

''مسٹر منگی!'' سردار نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''میں آپ کو ابھی اسی وقت اس ملک کا وزیراعظم نامزد کرتا ہوں' مبارک ہو۔'' اس بار فیاض منگی سردار کا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کر کے تیزی سے گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ ابھی خواب دیکھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

12

نیویارک

ساحل رات بھراپنی تھیسیس پر کام کر کے صبح پانچ بجے سویا تھا۔ گیارہ بجے کا الارم لگایا تھا۔ الارم نے اٹھا تو دیا تھا' اب بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آدھ گھنٹے تک اور سو سکتا ہے لیکن تکریم سے ملنے کے خیال نے جیسے چابی بھردی۔ شیو کرتے' نہاتے اور کپڑے بدلتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا تکریم بھی نشاط کی طرح اسے چھوڑ کر تو نہیں چلی جائے گی؟ دل کی ایک دھڑکن درمیان سے اچانک غائب ہوگئی۔

تکریم تھی بھی نشاط ہی کی طرح۔ نڈر اور بے خوف' جو کہنا چاہتی اور کرنا چاہتی' بلا جھجک کہہ دیتی اور کر دیتی۔ لیکن دونوں میں ایک فرق تھا۔ تکریم دنیا کی حقیقتوں کو جانتی اور سمجھتی تھی' اس میں ایک ٹھہراؤ اور اطمینان تھا۔ نشاط کسی اور دنیا کی رہنے والی تھی۔ اس کی رفتار بہت تیز

تھی۔ وہ بہت جلدی میں تھی۔ ایک طوفان کی طرح آئی اور گزر گئی۔ وہ اپنے خوابوں کو پانے کے لیے جب ساحل کو چھوڑ کر جا رہی تھی تو اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

OOO

نشاط ساحل کو 'الائنس' کے اجلاس میں ملی تھی جو یونیورسٹی کے انقلابیوں کا گروپ تھا۔ ملک ملک کے لوگ تھے۔ اکثریت جنوبی امریکہ' ایشیا اور افریقہ سے تعلق رکھنے والوں کی تھی جو یونیورسٹی کے کسی کمرے میں جمع ہو کر انقلاب لانے کے خواب دیکھتے اور امریکی اجارہ داری اور سامراجیت کے خلاف اس کے قلعے میں بیٹھ کر لفظوں کے پتھر برسایا کرتے۔ وہ دنیا کو بدلنا چاہتے تھے۔ انھیں پتا تھا کہ دنیا نہیں بدل سکے گی' اس احساس نے ان کے اندر تلخی بھر دی تھی جسے وہ اپنی زبانوں سے لاوے کی طرح اگلتے یا کبھی کبھی آپس میں لڑ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیتے۔ پھر بھی بے بسی کا احساس ان پر غالب نہیں آیا تھا' ان کے خواب زندہ تھے' کوئی نہ کوئی آئیڈیل شمع بن کر روشن تھا۔

ساحل کو 'الائنس' کے اجلاس میں اسٹینلے اور ماریو لے کر گئے تھے جو اس کے ساتھ ماسٹرز کر رہے تھے۔ اسٹینلے کمانا تنزانیہ میں صحافی تھا اور کسی طرح اسکالرشپ لے کر نیویارک آ گیا تھا۔ چھوٹا قد اور گول مٹول سا تھا۔ مٹکتا ہوا چلتا' اس فٹ بال کی طرح جس کی ہوا کم ہو گئی ہو۔ ہونٹوں پر کسی گانے کی دھن ہوتی تو باقاعدہ تھرکنے لگتا۔ اس کی ہر سرگرمی کا محور لڑکی تھی' ایسی لڑکی جو آسانی سے بستر تک بھی جا سکے۔ لڑکی کا سفید فام ہونا شرط تھا۔ اس نے ایک دن ساحل کو تنزانیہ سے آیا ہوا اپنے ایڈیٹر دوست کا خط دکھایا تھا جس میں لکھا تھا:

''ہر روز ایک نئی سفید فام لڑکی فتح کرو' تمھیں کئی نسلوں کی غلامی کا انتقام لینا ہے۔''

ساحل اسے مذاق سمجھ کر ہنس پڑا تھا' لیکن اسٹینلے پوری طرح سنجیدہ تھا۔ اسے اپنے افریقی اور سیاہ فام ہونے پر بہت فخر تھا۔ ساحل کو پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ رنگ و نسل کی دراڑ کتنی

چوڑی تھی۔

''تم اتنے غیر سنجیدہ آدمی ہو' الائنس' میں تمھارا کیا کام؟'' ایک دن ساحل نے اس سے پوچھا تھا۔

''مجھے منہ لٹکا کر گھومنے والے انقلابی اور روتا سسکتا ہوا انقلاب پسند نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا تھا۔ ''وقت آئے تو لڑ پڑو۔ آگ ہو جاؤ' لیکن بے وقت کی راگنی مت الاپو۔ دارالسلام یونیورسٹی کے کسی لڑکے لڑکی سے پوچھو اسٹینلے کمانا اپنے وقت میں کیا چیز تھا۔ دہشت برادر دہشت!''

اسٹینلے نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ میٹنگ کے پمفلٹ بانٹنے اور یونیورسٹی کی دیواروں پر پوسٹرز چپکانے میں سب سے پیش پیش ہوتا۔ 'الائنس' کے لیے چندہ جمع کرنے گھنٹوں یونیورسٹی کے چوک پر کھڑے ہو کر افریقی ڈرم پیٹتا یا مائک لے کر پورے جوش و خروش سے زمین پر لوٹ پوٹ کر گانے گاتا۔

''تمھیں راز کی بات بتاؤں؟'' اس نے آواز نیچی کر کے ساحل سے کہا تھا۔ ''میں الائنس میں آیا لڑکیوں ہی کے چکر میں تھا۔ میرا خیال تھا انقلابی لڑکیاں زیادہ آزاد خیال ہوتی ہیں' لیکن بہت مایوسی ہوئی۔''

''کیوں؟ کیا دال نہیں گلی؟'

''نہیں برادر! دال تو آتے ہی گل گئی تھی۔ سنیڈرا کو جانتے ہو؟ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی جو ماتھے پر لال پٹی باندھے گھومتی ہے؟''

''وہ! وہ جو آج کل اس انڈین لڑکے راجیو کے ساتھ ہے۔''

''ہاں وہی! وہ اسے گاندھی بنا کر چھوڑے گی۔''

''گاندھی؟''

''وہ مجھے نیلسن منڈیلا بنانا چاہتی تھی۔''

''نیلسن منڈیلا؟''

''اسے درمیان میں رک کر سگریٹ پینے کی عادت ہے......''

''درمیان میں؟ کس درمیان میں؟''

''یار! اب تمھیں کیا پوری کام ستر سناؤں۔''

''نہیں میرا مطلب ہے......''

''درمیان میں سگریٹ کا وقفہ مجھے بھی پسند ہے۔'' اسٹینلے نے کہانی جاری رکھی۔'' ایک دن اس نے سگریٹ سلگایا اور بستر سے اتر کر کرسی پر جا بیٹھی۔ اسی طرح ننگی بیٹھی مجھے للچاتی رہی۔ میں بھی سگریٹ کے کش لیتا ہوا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ سگریٹ ختم کر کے اٹھی اور کپڑے پہننے لگی......''

''کپڑے پہننے لگی؟''

''نہیں! ابھی تک ننگی بیٹھی ہے۔ برادر تم......''

''نہیں نہیں وہ......''

''میں نے پوچھا کیا ہوا؟'' اسٹینلے نے ساحل کی مداخلت نظر انداز کر کے داستان پھر شروع کی۔'' کہنے لگی انقلابیوں کے لیے سیکس سے پرہیز کی تربیت ضروری ہے۔ نیلسن منڈیلا ۲۸ سال جیل میں رہا' سوچو کیا گزری ہوگی۔ ہم کم از کم ۲۸ روز تک الگ رہیں گے۔ ٹھیک ۲۸ روز بعد آؤں گی پھر ہم تمھاری تپسیا ختم ہونے کا جشن منائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ نیا سگریٹ سلگاتی ہوئی چلی گئی......''

''تمھارے یہ ۲۸ روز کیسے گزرے؟''

''بہت اچھے برادر بہت اچھے۔ میں نے ایک اجنبی بار دریافت کر لیا تھا جہاں آنے والی لڑکیوں کو پہلے کسی افریقی مرد کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔''

''اور سنیڈرا؟''

''وہ وعدے کے مطابق ٹھیک ۲۸ روز بعد' خود کو پہلی بار بنا سنوار کر اور بہت اہتمام کر کے آئی تھی۔ میرے ساتھ بستر میں ایک اسپینی لڑکی کو دیکھا تو شیمپین کی جو بوتل لے کر آئی تھی' دیوار پر مار کر پھوڑ دی' مجھے انقلاب دشمن قرار دیا اور کمرے کی چابی میرے منہ پر مار کر چلی گئی۔ میری ضد میں اب اس انڈین لونڈے کو گاندھی بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''اور اسپینی لڑکی؟ وہ تو بھاگ گئی ہوگی۔''

''نہیں' خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی۔ سنیڈرا چلی گئی تو پوچھنے لگی کیا ہوا۔ میں نے کہا نیلسن منڈیلا بنتے بنتے بچ گیا۔ کہنے لگی نیلسن منڈیلا کیا؟ یار مجھے اسپینی لڑکیوں کی یہی معصومیت پسند ہے۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہیں۔ جس وقت جو کام کرتی ہیں اس میں پوری جان ڈال دیتی ہیں۔ جوشیلی اتنی کہ فائل کو مفعول بنا دیں۔ برادر شام کو میرے ساتھ چلو۔ انھیں پاکستانی مرد کا تجربہ بھی نہیں ہے۔''

''شکریہ! مجھے مغعول بننے کا شوق نہیں ہے۔''

ماریو اسٹینلے سے مختلف تھا۔ دراز قد' پیلاہٹ لیے اور شانوں تک آئے ہوئے میلے میلے لمبے بال۔ ہلکی بھوری بجھی ہوئی آنکھیں۔ اسے کسی لڑکی کے گرد گھومتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ لڑکیاں خود اس کے گرد گھومتی تھیں۔ اس میں ایک عجیب سی لاپرواہی اور بے اعتنائی تھی۔ دو تین دن کا بڑھا ہوا شیو۔ شاید اس طرح شیو کرتا تھا کہ بڑھا ہوا دکھائی دے۔ ساحل نے اسے ہمیشہ ہلکے نیلے رنگ کی گھسی ہوئی جینز میں دیکھا تھا جو گھٹنوں سے پھٹی ہوئی اور کولھوں سے اس طرح ادھڑی ہوئی تھی کہ انڈرویئر کا رنگ نظر آتا۔ گول گلے کی ٹی شرٹ اور کمر سے اونچی ڈینم جیکٹ' سردیوں میں ایک موٹے اونی اوورکوٹ کا اضافہ ہو جاتا جس کا پھیکا ہوتا ہوا نیلا رنگ کوٹ کی عمر کی چغلی کھا رہا ہوتا۔ ساحل کو وہ کوئی خانہ بدوش لگتا یا سوئٹزرلینڈ کی پہاڑی اترائیوں میں بھیڑیں چرانے والا چرواہا جو بھیڑوں کی فکر چھوڑ کر اپنے کھانے کے لیے آگ پر پنیر پگھلا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر ساحل کے دماغ میں گانا گونجنے لگتا ''گاتا جائے بنجارہ......'' جیسے

مجیار کا کوئی آوارہ خانہ بدوش بانسری ہونٹوں سے لگا کر سب کو اپنی دھنوں سے مدہوش کرنے والا ہو۔

ماریو مجیار یعنی ہنگری ہی میں بڑا ہوا تھا۔ پیدا چلّی میں ہوا تھا جہاں اس کے ماں باپ ایلندے کی حکومت میں اہم عہدیدار تھے۔ ایلندے کے خلاف جب پینوچٹ کا فوجی انقلاب آیا تو ماریو صرف ایک سال کا تھا۔ ماریو کی ماں فوجیوں کے ہاتھوں ماری گئی لیکن باپ ماریو کو لے کر کسی طرح بچ نکلا۔ مہینوں جنگلوں میں چھپا پھرتا رہا اور کسی نہ کسی طرح چلّی کی سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ روسیوں کی مدد سے ہنگری پہنچ گیا اور پھر وہیں شادی کر کے ہنگری کا ہو رہا۔ ماریو اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو چلّی جانا چاہتا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جہاں اسے جنم دینے والی اس کی ماں قتل ہوئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے اسے امریکہ میں تعلیم حاصل کرنا تھی۔ باپ نے اپنی جمع شدہ پونجی سے ایک سال کی فیس اور خرچ دے کر نیویارک بھیج دیا تھا۔ ماریو باقی سالوں کا خرچ یونیورسٹی کے قریب ایک اسپینی شراب خانے میں بارٹینڈر کا کام کر کے پورا کر رہا تھا۔

پینوچٹ پکڑا گیا تو ماریو لندن جا کر پینوچٹ کے خلاف مظاہروں میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ اسے اپنی ماں کا قرض ادا کرنا تھا۔ دوستوں نے چندہ کر کے لندن کا ٹکٹ دلوا دیا۔ لندن سے واپس آیا تو اس کی خاموشی پہلے سے زیادہ گہری اور آنکھیں اُداس ہو کر اس کے بالوں کی طرح میلی ہو گئی تھیں۔ ایک دن دوستوں نے اکسایا تو بول پڑا۔

''مجھے ایک مرتے ہوئے شخص کے خلاف مظاہرے کرنا اچھا نہیں لگا۔ میں اب تک نہیں سمجھا ہم ایک بوڑھے نیم مردہ شخص پر اپنی توانائیاں کیوں ضائع کر رہے تھے۔''

''تاکہ عبرت ہو!'' کسی نے کہا۔

''کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا۔ وقت آتا ہے تو سب آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ ٹھوکر انھی اندھوں اور پینوچٹ پیدا کرنے والے نظام کو لگانی چاہیے۔''

''پنوچیت اسی نظام کی علامت ہے۔ اسے دفن کرنا ضروری ہے۔'' کسی اور نے کہا۔

''ہاں! لیکن مردہ علامت' وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ اسے دھکا دے کر گرانے اور پھر قبر پر ڈنڈے برسانے سے کچھ نہیں ملے گا۔ کئی نئے زندہ اور صحت مند پنوچیت موجود ہیں' گلا ان کا پکڑنا ہے۔''

ماریو کی دل چسپی پڑھائی میں کم ہوگئی تھی اور اس نے ملازمت کے اوقات بڑھا لیے تھے۔ اسے زیادہ سے زیادہ پیسے جمع کر کے جلد از جلد چلّی جانا تھا۔ دوستوں کا خیال تھا وہ ڈگری کی مدّت پوری نہیں کر سکے گا اور اپنی پرانی پھٹی جینز میں چلّی کے کس گمنام سیاسی کرّے میں گرفتار ہو جائے گا۔

'الائنس' میں آنے والے کئی لوگوں سے ساحل کی جان پہچان ہوگئی تھی۔ حارث ایتھوپیا کا تھا۔ بہت نرم مزاج' کم گو اور سنجیدہ سا' لیکن ساحل سے تعارف ہوا تو غصے میں آ گیا تھا۔

''آپ نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا؟''

''میں نے؟ میں نے کیا کیا؟''

''ہم نے ابتدائی اور مشکل زمانے میں آپ کی مدد کی تھی۔ آپ کے پیغمبر نے حبشہ کو دعائیں دی تھیں' لیکن آپ نے ہمارے سینے میں اریٹیریا خنجر گھونپ دیا۔'' اس کی شکایت میں اتنا خلوص تھا کہ ساحل کو لگا سارا قصور اسی کا ہے۔

جاسم عراق کا ایک خوش باش نوجوان تھا۔ کبھی کبھی الائنس کی میٹنگ میں آتا تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں ساحل کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔

''تم شکل وصورت سے پاکستانی لگتے ہو۔'' ساحل نے تعارف ہونے پر اپنائیت ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

''کیوں نہیں' کیوں نہیں! تمھاری زمینوں پر بھی ہمارے آباؤ اجداد نے جا کر تخم ڈالا

تھا۔'' پھر اپنے جملے پر خود ہی ہنستا ہوا چلا گیا۔ ساحل غصے سے بل کھا کر رہ گیا تھا' لیکن پھر سوچنے لگا غصہ کرنے کی وجہ کیا تھی۔ جاسم نے بے موقع سہی' ایک تاریخی حقیقت بیان کی تھی۔ جاسم کی اسٹینلے سے سخت دشمنی تھی۔ شاید کوئی نسلی جھگڑا تھا' لیکن ساحل کو یقین تھا قصور جاسم کا ہوگا۔

اسٹینلے کی سابق محبوبہ سینڈرا کے ساتھ ایک اور امریکی لڑکی ڈائنا آتی تھی جو انڈسٹریل ریلیشنز میں پڑھتی تھی اور کسی سوشلسٹ گروپ کے لیے کام کرتی تھی۔ اس کا جھگڑا گیری سے تھا جو ہسٹری پڑھ رہا تھا اور وہ کسی اور انقلابی گروپ سے وابستہ تھا۔ ڈائنا اور گیری الائنس کی میٹنگ میں اپنے اپنے گروپ کی سیاست اور فلسفے ساتھ لے کر آتے اور تاریخ کے کسی موڑ پر کھڑے ہو کر بحث کرنے لگتے۔ ایسے موقع پر نشاط انھیں آڑے ہاتھوں لیتی' انھیں کھینچ کر باہر لاتی اور آج کی دنیا میں کھڑا کر دیتی۔

ساحل نے نشاط کو پہلی بار دیکھا تھا تو نظر اسی پر ٹھہر گئی تھی۔ دل بھی پہلی بار زور سے دھڑکا تھا' لیکن دل کی دھڑکنوں کے اس راز میں دوستوں کو شریک کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ نشاط سے بھی بس ایک بار تعارف ہو کر رہ گیا تھا' بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ ہر بار الائنس کے اجلاس میں اسے دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔ سنتا تو سنتا رہتا اور جب اسے سوچتا تو سوچتے سوچتے ان دنیاؤں میں پہنچ جاتا جن کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔

ایک دن ساحل سب سے پچھلی صف میں اسٹینلے اور ماریو کے درمیان بیٹھا تھا اور نشاط سب پر برس رہی تھی۔ اس روز وہ بہت غصے میں تھی۔

''تمھیں پتا ہے اس لڑکی کا مسئلہ کیا ہے؟'' وہ تینوں اجلاس ختم ہونے کے بعد باہر نکلے تو اسٹینلے نے اپنا تھرکنا بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے سخت بانہوں والے مجھ جیسے ایک مضبوط آدمی کی ضرورت ہے۔'' اس نے مٹھی بند کر کے کلائی فحش انداز میں ہلائی۔ ''اس کے اندر جو غصہ اور تناؤ بھرا ہے' اسے نکالنا ضروری ہے۔''

''تم بہت گندے اور گھٹیا ہوتے جا رہے ہو۔'' ساحل نے بہت برا سا منہ بنایا۔ اسے اسٹینلے پر سخت غصہ آیا تھا۔

''برادر، تم بھی! کیا تم بھی اس میں سیریس ہو؟'' اسٹینلے نے ساحل کو غور سے دیکھا اور ماریو کو مخاطب کرنے لگا۔ ''ماریو! میں برادر کے حق میں دست بردار ہوتا ہوں۔ تم اس کا ٹرکش لڑکی سے جوڑ لگا دو۔ تم اسے جانتے ہو، تم کر سکتے ہو۔'' اسٹینلے نے ماریو کا بازو ہلایا جو اپنی دھن میں مست چل رہا تھا۔

''اسٹین!......'' ساحل کے احتجاج کی آواز کمزور تھی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' ماریو کے جواب سے ساحل کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

''کیوں؟ کیا وہ کسی سے انگیج ہوئی ہے؟'' اسٹینلے نے جواب نہ ملنے پر خود ہی حل پیش کر دیا۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دو دن میں ان کا ٹانکا توڑ دوں گا۔ اسٹینلے کمانا اس کام کا ماہر ہے۔''

''یہ ٹانکا توڑنے جوڑنے کا معاملہ نہیں ہے۔'' ماریو نے پہلے جیسی بے نیازی سے جواب دیا۔ ساحل ان کے ساتھ اس طرح چل رہا تھا جیسے سارے معاملے سے اس کا تعلق نہ ہو۔ ''وہ چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ بہت زخمی ہے۔ اس کی جُڑنے کی حس سرد ہو چکی ہے۔''

''بکواس!'' اسٹینلے نے اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے مکھی اڑا رہا ہو۔ ''زندگی ڈبے میں بند، روئی میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ گفٹ پارسل نہیں ہے برادر! کون ہے جو زخمی نہیں ہے۔ میرا ڈبا کھول کر دیکھو۔'' اسٹینلے رک کر اپنی قمیص کے بٹن کھولنے لگا۔ ''دیکھو کتنے زخم چھپے ہیں۔ کتنی خراشیں لپٹی ہوئی ہیں۔''

''خراشیں؟'' ماریو بھی رک گیا۔ اسے غصہ آ گیا تھا۔ وہ بھی اپنی قمیص کے بٹن کھولنے لگا۔ ''دیکھو میرے سینے میں جھانک کر دیکھو۔ مجھے پہلا زخم اس وقت لگا تھا جب میں ایک سال

کا تھا اور میری ماں قتل ہوئی تھی۔ یہ زخم ناسور بن کر اب تک تازہ ہے' لیکن نشاط نے اپنا سینہ کھول کر دکھایا تو میرا زخم ایک چھوٹی سی خراش لگنے لگا۔''

''سینہ کھول کر؟'' اسٹینلے نے آنکھ مار کر کہا۔

''تم سرکس کے بونے مسخرے ہو اور کچھ نہیں۔'' ماریو کا غصہ تیز ہو گیا۔ ''اس نے سینہ کھول کر نہیں چیر کر اور اپنا دل نکال کر دکھایا تھا جو ہر طرف سے زخمی تھا۔ کوئی خانہ خالی نہیں تھا۔''

''سیریس!'' اسٹینلے ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ماریو سر ہلانے لگا۔ غصہ اداسی میں بدل گیا تھا۔ ماریو نشاط کی کہانی سناتا ہوا ان کے ساتھ دوبارہ چل پڑا۔

نشاط کی کہانی نے رشتوں کے دکھوں سے موڑ لیا تھا۔ نشاط اور صفات استنبول کے ایک امیر خاندان کی جڑواں بہنیں تھیں۔ دونوں اپنی ماں کی طرح حسین اور ذہین تھیں' لیکن دونوں کے شوق مختلف تھے۔ نشاط کی توجہ تعلیم پر تھی اور صفات کسی انقلابی تنظیم کے لیے کام کرتی تھی۔ دونوں کے انجام بھی اپنے اپنے شوق کے مطابق ہوئے۔ نشاط نے اقتصادیات میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور اسکالرشپ لے کر ڈاکٹریٹ کرنے نیویارک آ گئی جبکہ صفات کا آنا جانا جیل میں تھا۔ باپ جب تک زندہ رہا صفات کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اور کبھی ضمانت پر رہا کرا لیتا۔

صفات کے دل میں انقلاب کے بعد جو محبت بچی تھی وہ نشاط کے حصے میں آئی تھی۔ دونوں بہنوں نے کبھی ایک دوسرے کو اپنی اپنی منزل پانے کی جدوجہد سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ نشاط کو معلوم تھا وہ بہن کو خواب دیکھنے سے نہ روک سکے گی۔ صفات نے بھی کبھی نشاط کو استحصال کرنے والی قوتوں کا کل پرزہ بننے کی کوشش کرنے کا طعنہ نہیں دیا۔

نشاط کی ذہانت نے نیویارک یونیورسٹی میں چراغ جلانے شروع کیے تو اس کی زندگی میں ایسے بھونچال آئے کہ اس کا وہ مستقبل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا جس کے شاندار ہونے کی پیش گوئیاں ہونے لگی تھیں۔ پہلے باپ کے مرنے کی خبر آئی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ وجہ

بیوی کی بے وفائی بتائی گئی تھی جس نے اپنے شوہر کو دیوالیہ کر کے بھی ساتھ نہیں نبا ہا تھا۔ ماں نے اس کے باپ کے مرنے کے ٹھیک سوا مہینے بعد ایک فوجی افسر سے شادی کر کے اپنی بے وفائی کی خبروں کی تصدیق کر دی تھی۔ دو خون ہوئے تھے۔ باپ کے ساتھ ماں کی محبت بھی مر گئی تھی۔ صفات نے تو ماں سے تعلق بالکل ختم کر دیا تھا۔ ایک فوجی سے شادی کر کے وہ اب ماں نہیں رہی تھی، دشمن بن گئی تھی۔ نشاط کا رشتہ قائم تھا لیکن اس میں سرد مہری آ گئی تھی۔ کبھی کبھی ماں کا فون بھی آ جاتا، نشاط نے ایک بار باپ کی خودکشی کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ ''وہ بزدل تھا'' کہہ کر ماں نے بات ختم کر دی تھی۔

وقت کے ساتھ نشاط کا غم کم ہو رہا تھا اور وہ اپنی ریسرچ کی راہ پر واپس آ رہی تھی کہ صدموں کے نئے پہاڑ آ کھڑے ہوئے۔ استنبول میں کسی بڑے ہنگامے میں صفات اور اس کا منگیتر پکڑا گیا تھا۔ ان کے بہت سے ساتھی بھی گرفتار ہوئے تھے۔ ان پر بغاوت جیسے سنگین الزامات تھے۔ انھوں نے جیل کے اندر آ کر جیل کے حکام کے خلاف بغاوت کر دی جسے کچلنے کے دوران حکومت نے طاقت استعمال کی جس میں صفات کا منگیتر ہلاک ہو گیا۔ صفات بھی زخمی ہوئی تھی، اس کے باوجود قیدیوں کی اجتماعی بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئی۔ کسی کو نہیں بتایا کہ اس کا ایک گردہ خراب ہو چکا ہے۔ طویل بھوک ہڑتال نے دوسرا گردہ بھی خراب کر دیا۔ ماں نے اپنا گردہ دینا چاہا تو انکار کر دیا۔ اسے دشمنوں کا احسان نہیں چاہیے تھا۔

نشاط کو معلوم ہوا تو وہ استنبول جانے کے لیے سامان باندھنے لگی۔ وہ بہن کو ایک کیا دونوں گردے دے سکتی تھی۔ جس دن اسے پرواز کرنا تھا اس سے ایک روز پہلے صفات کے مرنے کی خبر آ گئی۔ سب کو لگا جیسے اس دن نشاط بھی مر گئی ہو۔ دوستوں نے زور دیا کہ تیاری مکمل ہے استنبول چلی جائے اور ماں کے ساتھ مل کر جڑواں بہن کا غم غلط کر لے۔ اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا ''میرا اب وہاں کوئی نہیں ہے۔ میرا اس ملک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے اپنی کتابیں بھی اٹھا کر رکھ دیں اور کہا تھا کہ اسے جھوٹ، استحصال اور ناانصافیوں کو پروان

چڑھانے والا علم نہیں چاہیے۔ سب کا خیال تھا وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گی، لیکن وہ ٹھیک نہیں ہوئی۔ اس بار اس نے توازن ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ خود اس کا کہنا تھا ''میری سوچیں پہلی بار متوازن ہوئی ہیں۔''

جلد ہی یونیورسٹی سے نام کٹ گیا اور اسکالرشپ بند ہو گیا۔ ماں کبھی کبھی شوہر سے چھپا کر پیسے بھیج دیتی، لیکن وہ اتنے نہیں ہوتے کہ ہفتہ وار کرایہ دے کر کہیں مستقل ٹھکانا بنا سکتی۔ کبھی اِس دوست اور کبھی اُس دوست کے پاس رہتی، یا جو بھی اسے اپنے پاس رکھ سکتا اس کی دوست ہو جاتی۔ یہ ایک عجیب دنیا تھی جہاں ہمدردی رکھنے کے باوجود کوئی زیادہ دیر کسی کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اپنی تعلیم کا بار اٹھانے کے لیے سب کہیں نہ کہیں کام کرتے۔ نشاط کی اکثر دوست لڑکیاں اپنی شامیں اور راتیں کلینز، سیلز گرل، ویٹرس، گارڈ یا بہت خوش قسمت ہوتیں تو ٹیوٹر بن کر تعلیم کا اثاثہ خرید رہی تھیں۔ نشاط کبھی بھی نوکریوں کے اس کلچر کا حصہ نہ بن سکی۔ کوشش کی پھر بھی نہ بن سکی۔

نیویارک کی فلک بوس عمارتیں شام گئے خالی ہو جاتیں تو صفائی کرنے والے غول ان میں داخل ہوتے اور بالٹیاں اور پونچھے ہاتھوں میں لیے فرش چمکانے اور گرد جھاڑنے کا کام شروع کر دیتے۔ نشاط کے اصرار پر اس کی ایک دوست نے اس غول میں اسے بھی بھرتی کرا دیا۔ پہلی ہی رات ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی ۸۰ منزلہ عمارت میں ڈیوٹی لگی۔ وسیع و عریض اور عالی شان لابی کے چمک دار فرش سے دن بھر کی آمد و رفت کے نشان مٹانے کے لیے نشاط کے ہاتھوں میں پونچھا اور بالٹی پکڑائی گئی تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے بالٹی زور سے پٹخی، لابی میں لہراتے ہوئے امریکی جھنڈے کو بیچ کی انگلی دکھائی، جس فرش کو صاف کرنا تھا اس پر تھوکا اور یہ اعلان کر کے دندناتی ہوئی باہر نکل گئی ''اس عمارت کی غلاظت کوئی صاف نہیں کر سکتا۔ اس کے مقدر میں صرف ڈھے جانا لکھا ہے۔''

''ایک دن وہ سخت پریشان تھی۔'' ماریو نے کافی کی چسکی لے کر کہا۔ نشاط کی کہانی کے

دوران تینوں کافی شاپ میں کونے کی ایک میز پر آ بیٹھے تھے۔ ''اس نے مجھ سے کہا اگر اس نے ایک ہفتے کے اندر اپنے حصّے کا کرایہ نہ دیا تو اس کی دوست اسے اپنے کمرے سے نکال دے گی۔ میں نے اسے اپنے بار میں ویٹرس کی نوکری دلوادی۔'' ماریو کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا، پھر سر نفی میں ہلاتے ہوئے بتانے لگا۔

''دو دن اس نے بہت محنت سے کام کیا۔ بار کا مالک خوش تھا۔ وہ بہت مستعدی کے ساتھ آرڈر لیتی، گاہکوں سے اس کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ دوسری ویٹرز کی طرح بار بار سگریٹ کے وقفے نہیں لیتی تھی، لیکن تیسرے دن جب مالک کچن میں برتن دھونے والے میکسیکن لڑکے کو گلاس توڑنے پر ڈانٹ رہا تھا تو نشاط نے بھی ایک گلاس زمین پر گرا کر توڑا، ایپرن اتار کر پھینکا اور اپنی دو دن کی تنخواہ لے کر چلی گئی۔''

''سیریس؟'' اسٹینلے ابھی تک سنجیدہ تھا۔ ''لیکن اب برادر کا کیا ہوگا؟''

''الائنس کے اجلاس میں شرکت کے بہانے وہ پرانے دوستوں سے ملنے اور یونیورسٹی کی یادیں تازہ کرنے آتی ہے۔'' ماریو نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ ''ہم پر اپنا غصہ بھی نکال لیتی ہے، لیکن اس کا زیادہ وقت ایک فلسطینی گروپ کے ساتھ گزرتا ہے۔''

''ترکی کیوں نہیں؟'' اسٹینلے نے پوچھا۔

''کہتی ہے ترکی میں کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے وہاں کی اندرونی سیاست کے تضادات سے دلچسپی بھی نہیں ہے۔ وہ فلسطین کے مسئلے کو عالمی ضمیر پر ایک بوجھ سمجھتی ہے اور اس کے لیے جان تک دینے کو تیار ہے۔''

''سوری برادر!'' اسٹینلے نے ساحل کو دیکھ کر کہا۔ ''تمھاری محبت شروع ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گئی ہے۔''

اگلے ہفتے الائنس کے اجلاس میں ماریو اور اسٹینلے نہیں آ سکے تھے۔ میٹنگ ختم ہوئی تو نشاط نے اسے دیکھ کر سر ہلایا۔ دونوں ہم قدم ہو کر کمرے سے نکلے۔

''تم نے دیکھا اسرائیلی ایجنٹ بھی ہمارے اجلاس میں گھس آئے ہیں۔'' اس کے لہجے میں سخت نفرت تھی۔

''اسرائیلی ایجنٹ؟''

''ڈیوڈ' جو آج میٹنگ میں گہرا فلسفہ بگھار رہا تھا۔''

ساحل نے پلٹ کر دیکھا' ڈیوڈ ابھی تک کھڑا ایک گروپ سے بحث میں مصروف تھا۔ وہ آج پہلی بار الائنس کے اجلاس میں آیا تھا۔ قد میں ماریو جیسا ہی تھا۔ شیو بھی بڑھا ہوا تھا لیکن لمبی چونچ دار ناک یہودی ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ کپڑے مسلے ہوئے اور بے جوڑ تھے۔ آنکھوں پر چھوٹے گول شیشوں والی فلسفیوں جیسی عینک تھی۔

''وہ تو اسرائیل کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق میں بول رہا تھا۔''

''تم نہیں جانتے' گھس بیٹھیے اسی طرح ہم دردی حاصل کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ موساد کا ایجنٹ ہے اور مخبری کرنے ہم میں شامل ہوا ہے۔''

وہ کچھ دیر اسی طرح خاموشی سے چلتے رہے اور پھر جیسے اس نے ایک دم سارا غصہ جھٹک دیا۔ ''کافی پیو گے؟''

کافی ساحل نے خریدی تھی۔ نشاط نے کافی کے پیسے دینے کی کوشش نہیں کی۔

''ہم اگلے مہینے ایک بڑا جلوس نکال رہے ہیں۔'' نشاط کی آنکھوں میں کافی پینے کے ساتھ چمک آ گئی تھی۔ ''ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ نیویارک صرف یہودیوں کا نہیں' ہمارا بھی شہر ہے۔ تم بھی اپنے دوستوں کو لے کر آؤ۔ ہمیں اپنی طاقت دکھانی ہے۔ تم رہتے کہاں ہو؟''

''براڈوے اور 186۔''

''میں جانتی ہوں۔ میری ایک دوست اسی علاقے میں رہتی تھی۔ تم اکیلے ہو؟''

''میرا ایک دوست ساتھ رہتا ہے۔ وہ آرٹسٹ ہے' تصویریں بناتا ہے۔''

''جاگیردارانہ عہد سے ادھار لیا ہوا بورژوا شوق!'' نشاط نے برا سا منہ بنایا۔

''وہ آج کل امن پر ایک سیریز بنا رہا ہے۔'' ساحل نے اپنے دوست کی مدافعت کی۔

''آگ اور شعلوں کا کھیل؟''

''نہیں! اس کے کینوس پر سفید کبوتر اڑتے اور ٹھنڈے ہلکے نیلے رنگ لہریں لیتے ہیں۔''

''مجھے اپنا نمبر دو' میں تمھارے دوست کی تصویریں دیکھنے آؤں گی۔'' ساحل سے فون نمبر لے کر وہ تیزی سے کیفے سے نکل گئی۔

اگلے ہفتے اس کا فون اور پھر وہ خود آ گئی۔ ''میں دو تین روز کے لیے آئی ہوں۔'' اس نے آتے ہی اعلان کیا۔

'پی کے' اس شام گھر پر ہی تھا' کام سے جلدی آ گیا تھا۔ وہ تصویروں کے فریم بنانے والی ایک دکان پر سیلز مین تھا۔ اپنی تصویریں بھی اسی دکان کے ذریعے بیچتا تھا۔ پورا نام پرویز خان تھا جو مختصر ہو کر 'پی کے' رہ گیا تھا۔ تصویروں پر بھی 'پی کے' سائن کرتا تھا۔ نشاط کو دیکھتے ہی اس کی فنکاروں والی وہ حس بے دار ہو گئی تھی جو ہر حسین عورت پر اپنا حق سمجھتی ہے۔ نشاط نے دو تین روز ان کے ساتھ رہنے کا اعلان کیا تو خوش ہو گیا۔ رات ہونے تک اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ نشاط اس پر عاشق ہو چکی ہے۔ نشاط نے اس کی تصویروں میں گہری دل چسپی لی تھی۔ تصویر کے ایک پہلو پر باتیں کرتے ہوئے پوری شام گزار دی تھی۔ وہ تصویروں کے رنگوں پر بحث کر رہے تھے اور ساحل کچن میں قیمہ بھونتا ہوا دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ نشاط اس کی دوست تھی' اس سے ملنے آئی تھی اور 'پی کے' اس پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ کچن کی میز کے گرد بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ 'پی کے' نے بہت مہذب انداز میں نشاط سے شراب پینے کی اجازت مانگی اور اپنی پسندیدہ ریڈ وائن کی بوتل کھول کر بیٹھ گیا۔ نشاط نے بھی ایک جام قبول کر لیا تھا اور دیر دیر بعد چھوٹا چھوٹا گھونٹ لے رہی تھی۔

ساحل شراب نہیں پیتا تھا' وہ چائے کا مزہ لے رہا تھا۔ 'پی کے' تیسرے جام کے بعد ساحل سے شعر سنانے کی فرمائش کرنے لگا۔ ساحل کو پتا تھا نشے میں آ گیا ہے۔ نشے میں آتے ہی اسے شعر یاد آنے لگتے تھے۔

''ضرور سناؤ' مجھے یقین ہے تمھارے شعروں کے رنگ 'پی کے' کی تصویروں کے رنگوں سے زیادہ اچھے ہوں گے۔'' نشاط بھی اصرار کرنے لگی۔

ساحل نے تازہ کہی ہوئی چار مصرعوں کی ایک نظم سنا دی:

''آنکھ میں اس کی تارے روشن

ہونٹوں پر کچھ پھول کھلے ہیں

لیکن میری بند آنکھیں ہیں

ہونٹ سلے ہیں۔''

''کیوں سلے ہیں؟'' نشاط کو غصہ آ گیا۔ ''ساحل! چپ رہنا چھوڑو' اپنے ہونٹ کھولو اور بولو...... زور زور سے بولو......''

''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔'' 'پی کے' بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلاس میں انڈیل کر جھومنے لگا۔

''بالکل! چیخ چیخ کر بولو۔ ہونٹ بولنے کے لیے ہیں۔''

''ہونٹ پیار کرنے کے لیے ہیں۔'' پی کے گلاس خالی کر کے شعر گنگنانے لگا:

''دائرہ سا اک بنا کر رہ گئے

ہونٹ کیا کیا گُل کھلا کر رہ گئے''

نشاط اپنا غصہ بھول کر چپ ہو گئی۔ ساحل جو اپنی نظم کی مدافعت کے لیے پر تول رہا تھا وہ بھی 'پی کے' کو تشویش سے دیکھنے لگا۔ لیکن 'پی کے' اس وقت اپنے بہترین موڈ میں تھا۔

''شعر اچھا ہے لیکن دائرہ بکواس ہے۔ ایک دم غلط۔ پیار کی طلب میں ہونٹ دائرہ

نہیں بناتے۔ خفیف سا کھل کر ذرا سا سکڑ جاتے ہیں۔ نشاط تم میری ماڈل بن جاؤ۔ میں اس کیفیت کی تصویر بناؤں گا۔ لوگ مونالیزا کی مسکراہٹ بھول جائیں گے۔''

''پی کے! تمھیں نشہ ہو گیا ہے' جاؤ سو جاؤ۔'' ساحل نے سخت لہجے میں کہا۔ 'پی کے' ساحل کے اس لہجے سے بہت ڈرتا تھا۔

''ہاں' ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نشاط تم بھی سونے آ جاؤ' بہت رات ہو گئی ہے۔''

''میں ابھی ساحل سے شعر سنوں گی۔''

پی کے سر ہلاتا اور نشاط کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نشاط نے فلیٹ کا معائنہ کرنے کے بعد خود ہی کہا تھا کہ وہ 'پی کے' کے کمرے میں سو جائے گی۔ یہ بڑا کمرہ تھا' اس میں دو بستروں کو جوڑ کر ایک بنایا گیا تھا۔ تین آدمی بھی ایک ساتھ آرام سے سو سکتے تھے۔ کوئی دوست رہنے آ جاتا تو وہ 'پی کے' کے بستر کا حصہ دار ہوتا' ساحل کے بستر کی تنہائی میں مخل نہیں ہوتا۔ ''کیا نشاط بھی ......'' ساحل اس سے آگے سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

''صفات بھی ایسی ہی شاعری کرتی تھی۔''

''کیا؟'' ساحل چونک پڑا۔

''رومانی' محبت بھری' اداسی کی آنچ پر سینکی ہوئی۔'' نشاط کی اداسی ایک بار پھر غصے میں بدل گئی۔ ''تم لوگ باتیں انقلاب کی کرتے ہو' لیکن شاعری پتھر کے زمانے کی۔ تم انقلابی گیت کیوں نہیں لکھتے؟''

''میں اپنے لیے شاعری کرتا ہوں۔ یہ میری تفریح ہے۔ میں کچھ دیر کے لیے دنیا سے ناتا توڑ کر خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا ہوں۔ اندر اور باہر کی دنیائیں ایک سی ہو جائیں تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔''

''صفات بھی یہی کہتی تھی۔'' بہن کا نام لیا تو آنکھوں کے شعلے پھول بن گئے۔

''تحریکوں میں حصہ لیتے لیتے وہ پتھر کی طرح سخت ہو گئی تھی، لیکن اندر سے گلاب جیسی تھی۔ اس کی شاعری بھی خوشبو کی طرح تھی۔ ماں نے اس کی ڈائری جس میں وہ اپنی نظمیں لکھتی تھی، مجھے بھیج دی تھی۔''

''کوئی نظم یاد ہے؟''

''ایک ایک مصرع، ایک ایک لفظ۔ میری بھی یہی تفریح ہے۔ صفات کی نظمیں پڑھتی ہوں تو میں بھی کچھ دیر کے لیے خوابوں سے رشتہ جوڑ لیتی ہوں۔''

''کچھ سناؤ۔''

''سنو! پیار کا گیت! یہ اس کی بالکل شروع کی نظم ہے۔

''میں نے جنگل میں ناچتے مور سے

ایک پر لیا

اس میں چاندنی کی

روشن چمکتی ہوئی

روشنائی بھری

بلبل و مینا سے الفاظ لے کر

اپنے دل کے

سادہ ورق پر

ترا نام لکھا

جسے دیکھ کر

جھیل کے سب کنول

مسکرانے لگے

خوشبوئیں

پیار کے گیت گانے لگیں

گنگنانے لگیں۔''

نظم پڑھتے ہوئے نشاط کے چہرے پر ایک رنگ آ گیا تھا۔

''بہت اچھی نظم ہے۔''

''تم ترکی زبان میں یہ نظم سمجھ سکو تو زیادہ اچھی لگے گی۔'' اداسی نے اس کے چہرے پر اپنا رنگ ملنا شروع کر دیا تھا۔ ''صفات کا بڑا جرم یہ تھا کہ وہ ایک انقلابی کُرد سے محبت کرتی تھی۔''

''کُرد؟''

''ترکی میں کُردوں کے خلاف نفرت ہے۔ انھیں دہشت پسند اور ملک دشمن سمجھا جاتا ہے۔ شاہین بھی کُرد تھا۔ میری ماں نے بہت کوشش کی کہ وہ شاہین کو چھوڑ دے، لیکن وہ صفات کی زندگی تھا۔ وہ مر گیا تو صفات بھی زندہ نہ رہ سکی۔ مجھے نہیں معلوم کوئی کسی سے اتنی محبت کیسے کر سکتا ہے۔''

ساحل کا خیال تھا وہ اب رو پڑے گی، لیکن وہ میز پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو تکتی رہی جن کے ناخن نہ تو بڑھے ہوئے تھے اور نہ ان پر پالش کی گئی تھی۔ لیکن انگلیوں کی مخروطی بناوٹ کی وجہ سے لگتا تھا کسی نے بہت مہارت کے ساتھ کاٹے ہوں۔

''وہ شادی کرنے والے تھے۔'' اس کی خود کلامی جاری تھی۔ ''میں نے پوچھا تھا تحفے میں کیا لے کر آؤں، کہنے لگی تتلیاں۔''

''تتلیاں؟''

''وہ اندر سے ایسی ہی تھی۔ بالکل چھوٹی سی بچی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا امریکہ میں ریڈ انڈین قبائل شادی پر تتلیاں اڑاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تتلیوں کے کانوں میں کہی گئی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ تتلیاں بے زبان ہوتی ہیں۔ وہ بول نہیں سکتیں، ان کی آواز نہیں

ہوتی ۔ان کی خاموش زبان صرف دیوتا سمجھتے اور پسند کرتے ہیں ۔اب امریکی شادیوں میں بھی تتلیاں اڑانے کا فیشن ہو گیا ہے۔ میں نے فلوریڈا میں تتلیوں کے ایک فارم کے پاس آرڈر بک کر دیا تھا۔تتلیوں کا پارسل صفات کے مرنے کے بعد پہنچا تھا۔''

''تم صفات کی قبر پر جا کر یہ تتلیاں اڑا آتیں۔''

''میں نے انھیں کھلے سمندر پر اڑا دیا تھا۔اس سے پہلے کئی روز تک تتلیوں کے کانوں میں سرگوشیاں کی تھیں ۔ مجھے یقین ہے میری سرگوشیاں تتلیوں کے ذریعے دیوتاؤں اور ان کے ذریعے صفات تک پہنچ گئی ہوں گی ۔ وہ میری باتیں سن کر خوش ہو گئی ہو گی...... مجھے یقین ہے۔ پورا یقین ہے۔'' وہ چہرے کے سب رنگ جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے' میں اب سونے جاؤں گی۔''

''تم چاہو تو میرے بستر پر سو سکتی ہو۔ میں صوفے پر سو جاؤں گا۔''

''نہیں! میں تمھیں بے آرام کرنے نہیں آئی ۔تمھارا دوست نشے میں تھا' اب تو خراٹے لے رہا ہو گا۔ میں وہیں ایک کونے میں سو جاؤں گی ۔شب بخیر۔''

ساحل دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند نہیں آ رہی تھی ۔سویا تو خواب بھی ایسے آئے جیسے نشاط اس کے ساتھ سو رہی ہو۔خواب حقیقت لگ رہا تھا لیکن آنکھیں کھلیں تو لگا خواب دیکھ رہا ہو۔نشاط اس کے بستر میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی ۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کون؟ کیا ہوا؟''

''وہ تمھارا دوست! میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ میری کمر سے اپنی لکڑی ہٹا لو' لیکن وہ باز نہیں آیا۔''

''آئی ایم سوری۔''

''تم لوگ عورت کو صرف سوراخ کیوں سمجھتے ہو؟'' وہ سخت غصے میں تھی۔

''میں...... میں نے کب......''

''نہیں، تم نہیں! تم تو بہت اچھے آدمی ہو۔'' اس کا غصہ دھیما ہو گیا۔

''تمھیں اعتراض تو نہیں اگر میں یہاں......''

''نہیں! تم یہاں آرام سے رہو۔ میں ڈرائنگ روم کے صوفے پر سو جاؤں گا۔''

ساحل کشن کو تکیہ بنا کر گھٹنے پیٹ میں گھسائے چھوٹے سے صوفے پر سونے کی کوشش کرتا اور نیند آنے کے بعد رات بھر پتھروں میں کیلیں ٹھونکتا رہا۔ عجیب سے خواب تھے۔ غاروں کے دہانوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اونچے درختوں والے جنگل بونے انسانوں کا کھیت بن گئے تھے۔

صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ 'پی کے' کام پر جانے کے لیے تیار تھا اور کچن میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ ساحل نے چائے بنا کر اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ 'پی کے' نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا، نظریں میز پر پھیلے ہوئے کل کے اخبار پر جمی تھیں۔

''رات کیا ہوا تھا؟''

''that frigid bitch!'' پی کے نے اخبار ایک طرف سرکا کر دانت کچکچائے۔ ''تم یہ برف کا تودہ کہاں سے اٹھا کر لائے ہو؟''

''سالے! تم نے ذلیل کرا دیا، اس نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہو گا؟'' سالا سب سے شدید گالی تھی جو ساحل سخت غصے کی حالت میں دیتا تھا۔

''ایک انتہائی آزاد خیال لڑکی پوری شام میری مصوری کی تعریف کرتے ہوئے گزار دے، میرے ساتھ شراب کا جام پیے اور پھر میرے بستر پر سونے آ جائے تو میں تمھاری طرح نامردی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔''

''پکاسو کی اولاد! وہ تمھارا پہلو گرم کرنے نہیں، سونے آئی تھی۔''

''دیکھ میری جان! تجھے لڑکیوں کا تجربہ نہیں ہے۔ تیرے پاس کبھی چوہیا بھی سونے نہیں آئی۔ میں نے اس دیس کی بہت لڑکیاں بھگتی ہیں۔ شروع میں سب نخرہ کرتی ہیں، لیکن وہ

تو کوئی نخرہ کیے بغیر مجھے ٹھڈا مار کر چلی گئی۔''

''وہ ایسی ہی ہے۔'' ساحل کا غصہ فخر میں بدل گیا۔

''وہ جیسی بھی ہو' اسے جلدی سے چلتا کردے۔ اس نے بدّو کا اونٹ بن کر اس گھر کو فلسطینی کیمپ بنا دیا تو مجھے کہیں اور ٹھکانا ڈھونڈنا پڑے گا۔''

''وہ دو تین روز میں چلی جائے گی۔'' ساحل کے لہجے کی کمزوری چھپی نہ رہ سکی تھی' لیکن اسے پتا تھا 'پی کے' کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ فلیٹ میں ساتھ رہنا صرف ضرورت کا رشتہ نہیں تھا۔ دونوں دوستی کی پرانی اور مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔

''ایک مشورہ اور سن لو۔'' پی کے نے کرسی سے اٹھ کر اپنا کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ''میں تم جیسے افلاطونی عاشقوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ محبت کا ناسور دل میں لیے بیٹھے رہو گے تو صرف خون تھوکو گے۔ منہ کھولو اور ہاتھ بڑھاؤ ورنہ وہ کسی اور کے ساتھ ہنی مون منانے چلی جائے گی۔''

''میں عشق نہیں کر رہا' اگر کیا بھی تو وہ چوہے بلی کا کھیل نہیں ہوگا۔ بس اب جاؤ' تمھاری ٹرین چھوٹ جائے گی۔''

'پی کے' کندھے اچکاتا ہوا باہر جانے کے لیے دروازہ کھولنے لگا۔

ساحل تیار ہو کر ناشتہ بنا رہا تھا کہ نشاط جو شاید ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی' کچن میں آ گئی۔ گھنگھریالے بال کچھ اور الجھ گئے تھے۔ فلسطینی پرچم کے سبز' سرخ اور سفید رنگوں والا اسکارف ہمیشہ کی طرح گلے میں پڑا ہوا تھا۔ آنکھوں پر ابھی چشمہ نہیں چڑھا تھا۔ ساحل سوچنے لگا جاگنے کے بعد چہرہ کتنا شفاف ہو جاتا ہے۔ جیسے نومولود' جس پر کوئی کیفیت نقش نہیں ہوتی۔ شعور بے دار ہوتا ہے تو جذبے رنگ آمیزی کرنے لگتے ہیں۔ عضلات پھر سے تن جاتے ہیں' جلد سکڑنے لگتی ہے اور دکھ سکھ دوبارہ چہرے پر زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ رات میں خواب دیکھ لیے گئے تھے اس لیے آنکھیں خالی ہو کر صاف ہو گئی تھیں۔ ابھی نئے خواب آنکھوں کو میلا

کرنے نہیں آئے تھے۔

''مجھے کچھ صاف نظر نہیں آ رہا۔'' اس نے پلکیں زور سے جھپکتے ہوئے کہا۔ ''میں چشمہ لگائے بغیر اپنا چشمہ بھی نہیں ڈھونڈ سکتی۔ رات شاید تمھارے دوست کے کمرے میں رہ گیا تھا۔ پلیز ڈھونڈ دو۔''

ساحل پی کے کمرے سے اس کا چشمہ ڈھونڈ کر لایا' اسے بغیر دودھ اور چینی کی کافی بنا کر دی اور بتانے لگا وہ یونیورسٹی جا رہا ہے اور شام سے پہلے واپس نہ آ سکے گا۔

''میں تمھارا کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہوں؟ مجھے ای میل چیک کرنے اور اخباروں کو خط لکھنے ہیں۔''

''خط؟''

''کتے یک طرفہ خبریں چھاپتے ہیں۔ جنازے بھی فلسطینیوں کے اٹھتے ہیں اور دہشت پسند بھی وہی ہیں۔ آج صرف خط لکھ رہی ہوں' کل بم باندھ کر نیویارک ٹائمز کے دفتر میں کود جاؤں گی۔'' ساحل کو یقین تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔

شام کو یونیورسٹی سے لوٹ کر آیا تو نشاط فلسطینی اسکارف سر پر لپیٹے اور جینز کے پائینچے چڑھائے ہوئے پوری تن دہی کے ساتھ فلیٹ کی صفائی میں مصروف تھی۔ پسینے میں شرابور تھی' گال سرخی سے دہک رہے تھے۔ ساحل کو ایک بار نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر کچن کا سِنک رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔

''میں اپنا سامان لینے جا رہی ہوں۔'' نشاط نے صفائی ختم کرتے ہی اپنا اسکارف سر سے اتار کر گلے میں ڈالا اور کوٹ پہننے لگی۔ ''واپس آ کر نہاؤں گی۔ یہاں میرے پاس بدلنے کے لیے دوسرے کپڑے نہیں ہیں۔''

نشاط اپنا سامان لے کر آئی اور باقاعدہ ان کے فلیٹ میں رہنے لگی۔ وہ ڈرائنگ روم میں اپنا بستر بند کھول کر کیمپنگ کرنے والوں کی طرح سو جاتی۔ ساحل کے جاگنے سے پہلے اپنا

بستر لپیٹ دیتی اور کمپیوٹر پر بیٹھ کر کھٹ کھٹ کرنے لگتی۔ 'پی کے' نے ساحل سے نشاط کے رہنے یا نہ رہنے کے بارے میں پھر کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کا سامنا بھی کم ہوتا تھا۔ دیر سے گھر آتا اور سیدھا اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔ نشاط اس رات کے بعد بھی اس سے اسی طرح ملی تھی جیسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کی تصویروں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ ہاں ہوں کر کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ساحل خوش تھا کہ غصہ 'پی کے' کے کام آ رہا ہوگا۔ عموماً وہ کام سے واپس گھر آ کر بوتل کھول کر بیٹھ جاتا تھا اور ایزل پر چڑھی ہوئی نامکمل تصویر مہینوں رنگوں کا انتظار کیا کرتی۔ ساحل کو پتا تھا اب کمرے میں بند ہو کر اپنا غصہ رنگوں پر اتار رہا ہوگا۔

اگلے ہفتے الائنس کے اجلاس میں ساحل اور نشاط ایک ساتھ گئے تھے۔ اسٹینلے نے انھیں معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ نشاط اگلی نشستوں پر اپنی دوستوں کے پاس چلی گئی اور ساحل ہمیشہ کی طرح سب سے پچھلی صف میں اسٹینلے اور ماریو کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔

''مبارک ہو، سنا ہے چڑیا خود پنجرے میں آ گئی ہے۔''

''بکواس مت کرو۔''

''برادر! اسٹینلے کمانا تجربے کی زبان بولتا ہے۔ آ گئی ہے تو صرف دانش وری سے کام مت چلاؤ۔ اسے فلم دکھانے لے جاؤ۔ فلم شروع ہو جائے تو ہاتھ میں پاپ کارن کا ڈبا نہیں، اس کا ہاتھ تھام کر بیٹھو۔ دیکھو پھر چڑیا کس طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی گود میں گرتی ہے۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ قطعی کوئی فائدہ نہیں۔'' ساحل کے کچھ کہنے سے پہلے ماریو بول پڑا۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہو گئی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گئے۔ نشاط کچھ کہنے لگی تھی۔ اسی دوران ڈیوڈ، لمبی چونچ دار ناک والا دراز قد یہودی جسے نشاط موساد کا ایجنٹ سمجھتی تھی، داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی نشاط کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

ساحل نے ایک دن ہمت کر کے نشاط سے فلم دیکھنے کے لیے کہا۔ اسے حیرت ہوئی کہ نشاط فوراً ہی تیار ہو گئی تھی۔ ساحل نے اسٹینلے کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے پاپ کارن نہیں

خریدی تھی، لیکن نشاط نے پاپ کارن کا بڑا ڈبا لے کر اس پر پگھلے ہوئے مکھن کا چھڑکاؤ بھی کیا تھا۔فلم کے دوران جب بھی ساحل نے اپنا خالی ہاتھ بڑھایا، نشاط نے پاپ کارن کا ڈبا اس کے آگے کر دیا۔ ہال تقریباً خالی تھا۔ان سے اگلی صف میں بیٹھا ہوا ایک جوڑا فلم سے بے نیاز بوسہ بازی کے دور سے گزر کر اگلے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔نشاط جیسے کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔اس کی ساری توجہ فلم پر مرکوز تھی۔فلم درمیان میں تھی تو اس کے ایک منظر میں بڑا سا امریکی جھنڈا لہرانے لگا۔نشاط ایک دم کھڑی ہوئی اور درمیانی انگلی دکھا کر ڈاؤن، ڈاؤن کے نعرے لگانے لگی۔لگتا تھا دیوانی ہو گئی ہو۔ساحل بڑی مشکل سے اسے کھینچ کر ہال سے باہر لے آیا۔کسی نے توجہ نہیں دی تھی یا شاید وہ سمجھ نہیں پائے تھے، ورنہ ان کی پٹائی ہو سکتی تھی۔گیارہ ستمبر کے بعد امریکیوں کی حب الوطنی میں جارحیت آ گئی تھی۔

فلم سے نکلے تو پاپ کارن کا ڈبا آدھا ابھی بھرا ہوا تھا۔نشاط مکئی کے دانے پھانکتے ہوئے اس طرح چل رہی تھی جیسے کچھ نہ ہوا ہو۔ٹائم اسکوائر کے اسٹیشن سے ٹرین لے کر وہ واشنگٹن اسکوائر آئے اور گرینوچ ولیج کی گلیوں میں پرانی کتابوں کی دکانوں میں گھومتے رہے۔سیکنڈ اسٹریٹ کے ایک چھوٹے سے لبنانی ریسٹورنٹ میں کھانا کھا کر نکلے تو فٹ پاتھ پر مصری تاش کے پتے پڑھ کر قسمت کا حال بتانے والی ایک بوڑھی عورت کرسی میز جمائے بیٹھی تھی۔

''آؤ قسمت کا حال معلوم کرتے ہیں۔'' ساحل نے ہنس کر کہا

''کیوں؟ کیا تمھیں نہیں معلوم؟''

''نہیں! کیا تمھیں معلوم ہے؟''

''ہاں، اچھی طرح! اپنے ایک ایک لمحے کا حال معلوم ہے۔کل کا بھی اور پرسوں کا بھی۔مجھے معلوم ہے مجھے کیا، کب اور کیسے کرنا ہے۔تمھیں نہیں معلوم کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''معلوم ہے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ کر سکوں گا یا نہیں۔''

''ضرور کر سکو گے۔ صرف ایک شرط ہے۔ جنون' سودا' دیوانہ پن' دیوانگی ساحل دیوانگی!''

ساحل کا دل چاہا سچ مچ دیوانہ ہو جائے۔ توازن کھو دے اور نشاط پر گر جائے۔ اسے اس زور سے بھینچے کہ دو جسم ایک ہو جائیں۔ اس شدت سے پیار کرے کہ ہونٹ پگھلنے لگیں اور زبانیں دہن میں گھل جائیں' لیکن پھر اس نے سوچا جب چاندنی رات ہوگی...... جھیل کے کنارے جہاں کنول مسکرائیں گے اور خوشبوئیں گنگنائیں گی...... وہ اندر ہی اندر مکالمہ کر کے خوش ہوتا رہا۔ آسمان پر نکلا ہوا مکمل چاند اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ان کے ساتھ رہتے ہوئے نشاط کو ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ ساحل 'پی کے' کو دیکھ کر تشویش میں مبتلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک دو ہفتوں میں معمول پر آجائے گا لیکن وہ اسی طرح رات کو دیر سے آتا اور اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔ ساحل نادم ہو رہا تھا' فلیٹ کا آدھا کرایہ وہ بھی دیتا تھا لیکن اپنے ہی گھر میں اجنبی کی طرح رہ رہا تھا۔

ایک دن ساحل یونیورسٹی سے واپس آیا تو نشاط سامان باندھے تیار بیٹھی تھی۔

''میں نے تمھاری مشکل آسان کر دی ہے۔'' نشاط نے مسکرا کر کہا ''میری یونیورسٹی کی ایک پرانی دوست چند مہینوں کے لیے اپنے ماں باپ کے پاس ساؤتھ کیرولینا جا رہی ہے۔ میں اس عرصے میں اس کے اپارٹمنٹ میں رہ کر اس کی بلّی کی دیکھ بھال کروں گی۔''

''کہاں؟''

''57-اسٹریٹ ایسٹ۔''

''یعنی بورژواؤں کے محلّے میں' انقلاب کا کیا ہوگا؟''

''تم بھی مذاق اڑانے لگے۔''

''نہیں' نہیں! میں ہفتے اتوار کی شام 59 ویسٹ پر کام کرتا ہوں۔ بلٹن میں! جہاں تم رہوگی وہاں سے دو تین بلاک دور۔''

''تم کام سے پہلے مجھ سے ملنے آنا۔ ہم سنٹرل پارک تک چہل قدمی کریں گے، لنچ ساتھ کھائیں گے۔''

''سنٹرل پارک کی گشت مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ ہم وہاں جھیل میں کنول تیرتے دیکھیں گے اور......''

''نہیں! بس واک کریں گے، میں ہلٹن تک تمھارے ساتھ واپس آؤں گی۔ تم کام پر چلے جانا، میں گھر آ جاؤں گی۔''

ساحل نے سوچا خوشبوؤں سے گیت کب سنیں گے۔ بلبل و مینا اور وہ مور کا پر...... اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ 'پی کے' آج جلدی آ گیا تھا۔ وہ سر کے اشارے سے ہیلو کرتا ہوا اپنے کمرے میں جانے لگا۔

''پی کے! اب کمرے میں بند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' نشاط نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں جا رہی ہوں۔ اتنے روز تمھارے گھر رہی، اس کا شکریہ۔''

''یہ میرا نہیں ساحل کا گھر ہے۔ تم اس کی دوست ہو، جب تک چاہو رہ سکتی ہو۔'' پی کے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ''میرے کمرے میں بند ہونے کی وجہ تم نہیں ہو۔ میری نمائش ہونے والی ہے، میں اپنی توجہ صرف کینوس اور رنگوں پر رکھنا چاہتا ہوں۔''

''مبارک ہو۔''

پی کے نے صرف سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد اسی طرح نگاہیں نیچی کیے کہنے لگا۔

''اس رات کے لیے آئی ایم سوری۔''

نشاط نے جیسے کچھ سنا نہیں۔ وہ اپنا سامان سنبھالنے لگی۔ ساحل نشاط کو نیچے چھوڑ کر آیا تو 'پی کے' بوتل کھول چکا تھا۔ وہ رات گئے تک نمائش اور اپنی نئی تصویروں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ ساحل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ نشاط کے جانے سے خوش تھا یا اپنی تصویروں کی ہونے والی نمائش سے۔

ساحل اگلے ہی ہفتے نشاط کے فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ رستے بھر سوچتا آیا تھا کہ دونوں مل کر سنٹرل پارک میں چہل قدمی کریں گے اور...... لیکن گھنٹیوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید نشاط گھر پر نہیں تھی۔ ساحل سست قدموں سے چلتا ہوا بے ارادہ گھومتا رہا۔ نائٹ شفٹ تھی، لیکن وقت سے پہلے کام پر پہنچ گیا۔ کام ختم ہوا تو دکان کے پیچھے اخباروں کے بنڈل پر سر رکھ کر نیند پوری کی۔ واپسی میں پھر نشاط کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ صبح کے دس بج رہے تھے، جھجکتا ہوا کھڑا سوچتا رہا کہ گھنٹی بجائے یا نہیں، اسی وقت دروازہ کھلا اور نشاط برآمد ہوئی۔ اس نے کندھے پر ایک بڑا سا جھولا لٹکایا ہوا تھا۔

''تم! تم اوپر کیوں نہیں آئے، گھنٹی کیوں نہیں بجائی؟''

''میں نے کہا شاید تم نہ ہو۔''

''تم مصروف تو نہیں ہو؟'' نشاط نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا اور ساحل کے سر کو نفی میں ہلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگی۔ ''تو میرے ساتھ چلو۔ مجھے مظاہرے کے پمفلٹ باٹنے ہیں۔''

ساحل منع کر ہی نہیں سکتا تھا، نشاط کے ساتھ پورا دن گزارنے کا خیال دل میں گدگدی کرنے لگا تھا۔ وہ گرینڈ سنٹرل سے سات نمبر کی ٹرین لے کر فلشنگ پہنچے اور شام تک گھر گھر اگلے ہفتے فلسطینیوں کے حق میں ہونے والے مظاہرے کے پمفلٹ ڈالتے رہے۔

''گھر چلو کھانا ساتھ کھائیں گے۔'' واپس گرینڈ سنٹرل پر ٹرین سے اتر کر ساحل نے نشاط کو دعوت دی۔

''مجھے بروکلین جانا ہے۔ کونی آئی لینڈ، وہاں ہماری میٹنگ ہے''

''تمھیں پتا ہے وہ روسی یہودیوں کا علاقہ ہے؟''

''معلوم ہے۔ ڈیوڈ بھی وہیں رہتا ہے۔ میٹنگ اسی کے گھر ہے۔''

''ڈیوڈ کے گھر؟ لیکن تم تو اسے اسرائیلی ایجنٹ سمجھتی ہو۔''

''میرا اب بھی یہی خیال ہے' لیکن سب اس سے بہت متاثر ہیں۔ اس کی وجہ سے امریکی یہودیوں کے کئی گروپ مظاہرے میں شریک ہو رہے ہیں۔ ہم نے اسے امن مظاہرے کا نام دے دیا ہے۔ تم اپنے سب دوستوں کو یاد دلا دینا۔ اگلے اتوار کو شام چار بجے۔'' وہ خدا حافظ کہہ کر تیزی سے دوسرے پلیٹ فارم پر جانے کے لیے سیڑھیاں اترنے لگی۔

ساحل مظاہرے میں گیا تو 'پی کے' ناراض ہو گیا تھا۔ اس دن اس کی تصویروں کی نمائش کا پریویو تھا۔ ساحل نے سوچا تھا کہ مظاہرے کے بعد جائے گا' لیکن مظاہرے کے دوران جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے نہ جا سکا۔ ساحل جب مظاہرے میں شریک ہونے پہنچا تو جلوس ففتھ ایونیو آ چکا تھا۔ آدھی سڑک مظاہرین کے لیے مخصوص تھی' باقی آدھی سڑک پر ٹریفک چل رہی تھی۔ جلوس میں ہزاروں لوگ شامل تھے۔ بڑی تعداد عربوں کی تھی۔ ان کا فطری جوشیلا پن بجلیاں چمکا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف جلوس دیکھنے والے تماشائی جمع تھے۔ آگے پیچھے گھڑسوار پولیس چل رہی تھی۔ جلوس کو ففتھ ایونیو سے ہو کر اقوام متحدہ کی عمارت کی طرف جانے والی سڑک پر مڑنا تھا۔

ساحل کو ماریو' اسٹینلے اور الائنس والے سبھی چہرے نظر آئے لیکن ساحل ان سے ملنے کے بجائے اگلی صفوں تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے یقین تھا نشاط آگے آگے ہو گی۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ایک بڑی سی زنجیر بنائی ہوئی تھی۔

نشاط نے ساحل کو دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر زنجیر میں شامل کر لیا۔ نشاط کے بائیں طرف تین ہاتھ دور ڈیوڈ بھی تھا۔ نشاط نے اپنا فلسطینی رنگوں والا اسکارف ماتھے پر لپیٹا ہوا تھا اور سب کے ساتھ مل کر فلسطین' فلسطین کے نعرے لگا رہی تھی...... ساحل بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ نعرے لگانے لگا۔ خون کی گردش تیز اور چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس وقت توپ اور ٹینک بھی سامنے ہوتے تو ان سے ٹکرا سکتا تھا۔

جلوس نیو یارک لائبریری کے چوراہے پر پہنچا تو بائیں طرف سڑک سے ایک بڑا ہجوم آ کر Terrorist-Terrorist کے نعرے لگانے لگا۔ جلوس میں شامل نو جوان عربوں کا ایک گروپ فلسطین فلسطین کے نعرے لگا تا ہوا ان پر حملہ کرنے کے لیے بڑھا تو دوسری طرف سے پتھراؤ شروع ہو گیا۔ حملہ کرنے والے بہت منظم تھے' وہ پہلے سے پتھر اکٹھے کر کے لائے تھے۔ ساحل کی صف پتھراؤ کی براہِ راست زد میں تھی۔ ایک پتھر نشاط کی طرف آیا لیکن دراز قد ڈیوڈ درمیان میں آ گیا اور پتھر اس کے کندھے پر لگا۔ ایک پتھر نے ساحل کے ماتھے کا نشانہ لیا۔ اسی وقت گھڑ سوار پولیس گھوڑے دوڑا کر مظاہرین کو منتشر کرنے لگی۔ پتھراؤ کرنے والے جس طرح اچانک آئے تھے' اسی طرح واپس بھاگ گئے۔ جلوس بھی گھوڑوں کو اپنے سروں پر آتا دیکھ کر تتر بتر ہونے لگا۔ زنجیر ٹوٹ گئی تھی لیکن ساحل نے نشاط کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ وہ دیوانوں کی طرح فلسطین فلسطین کے نعرے لگاتی ہوئی آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ساحل اسے نہ کھینچتا تو گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے آ سکتی تھی۔ وہ ساحل کا ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگی۔ ساحل نے ہاتھ نہیں چھوڑا تو اس نے غصّے سے پلٹ کر دیکھا' لیکن ساحل کا چہرہ خون میں بھیگا دیکھ کر مزاحمت ترک کر دی۔ گھڑ سواروں کے ساتھ شیلڈ اور ڈنڈوں والی پیدل پولیس نے جلوس کو دوبارہ منظم نہیں ہونے دیا۔ کئی مظاہرین جو پتھراؤ کرنے والوں کا پیچھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے' پکڑے گئے تھے۔

پولیس کی زد سے باہر ہوتے ہی نشاط نے اپنے اسکارف سے ساحل کے چہرے کا خون صاف کیا اور اسکارف کس کر اس کے ماتھے پر باندھ دیا۔

''ہم نے اجازت لے کر پر امن جلوس نکالا تھا' لیکن یہ کتّے صرف بم کی زبان سمجھتے ہیں۔ میں انھیں چھوڑوں گی نہیں۔ ایسا دھماکہ کروں گی...... ایسا دھماکہ کروں گی کہ......'' نشاط غصّے میں بڑبڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ ساحل کو ایک بار پھر دیکھا تو غصّے کی جگہ تشویش نے لے لی۔ سر پر بندھا ہوا اسکارف خون میں تر ہو گیا تھا۔ خون شاید ابھی تک رس رہا تھا۔

''ہم ہسپتال نہیں جا سکتے۔ وہ چوٹ کے بارے میں پوچھ گچھ کریں گے اور پولیس کو بلا لیں گے۔ میرا فلیٹ نزدیک ہے' وہاں فرسٹ ایڈ کا سامان ہوگا۔''

فلیٹ میں پہنچ کر نشاط نے اس کے ماتھے کا زخم صاف کیا اور بینڈیج باندھی۔ سرمئی رنگ کی خوبصورت سیامی بلی ساحل کے پانو میں آ کر لوٹنے لگی تھی۔

''اس کا کیا نام ہے؟''

''آرمیڈاس! میں اس کی اتنی خدمت کرتی ہوں لیکن یہ میرے پاس نہیں آتی۔ تمھیں دیکھتے ہی محبت کرنے لگی ہے۔ تمھاری خوشبو ہی ایسی ہے کہ جانور بھی قریب آئے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' ساحل کو لگا اس کے سب زخم بھر گئے ہوں' لیکن کچھ کہہ نہیں سکا' صرف اندر ہی اندر مکالمہ کرتا رہا۔ نشاط اسے گرم دودھ کا گلاس دے کر فون کرنے بیٹھ گئی۔ وہ دیر تک مختلف لوگوں سے فون پر بات کرتے ہوئے غصّے میں چیختی رہی۔

''ہمارے تقریباً بیس ساتھی پولیس نے پکڑ لیے ہیں۔'' اس نے فون رکھ کر کہا۔ ''بارہ لوگ سخت زخمی ہیں۔ گھوڑے کی لات سے ایک کی پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ پتھراؤ کرنے والوں میں سے کوئی نہیں پکڑا گیا۔ مجھے یقین ہے یہ انھیں اسرائیلی ایجنٹوں کی سازش تھی جو ہم میں گھس آئے تھے۔ میں ڈیوڈ کو بخشوں گی نہیں۔''

''ڈیوڈ نے تمھیں بچاتے ہوئے پتھر کھایا تھا۔ میرا خیال ہے اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہو گا۔''

''اس کا بازو فریکچر ہے۔'' نشاط نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تم یہیں آرام کرو' مجھے اپنے ساتھیوں کے پاس جانا ہے' ہمیں سوچنا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔''

''نہیں! میں گھر جاؤں گا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔'' ساحل نے کھڑے ہوتے ہوئے نشاط کا خون آلود اسکارف ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ''کیا میں یہ لے لوں؟۔ میرے پاس تمھاری نشانی رہے گی۔'' ساحل بڑی مشکل سے اندر کا مکالمہ باہر لا سکا تھا۔

''نہیں!'' نشاط نے اس کے ہاتھ سے اپنا اسکارف جھپٹ لیا۔ آنکھوں میں سختی آ گئی تھی۔ ''میں یہ کسی کو نہیں دے سکتی۔'' لیکن پھر لہجہ نرم کرلیا۔ ''یہ میرے لیے زیادہ قیمتی ہو گیا ہے۔ اس میں ایک کامریڈ کا خون شامل ہے۔'' نشاط نے خون میں بھرا ہوا اسکارف اپنے گلے میں ڈال لیا۔

ساحل گھر پہنچا تو 'پی کے' غصے میں بھرا بیٹھا تھا' لیکن ساحل کے سر پر پٹی بندھی دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ساحل اسے مظاہرے اور ہنگامے کے بارے میں بتانے لگا۔

''میں نے تجھ سے پہلے بھی کہا ہے کہ اس لڑکی کا خیال چھوڑ دے۔'' پی کے نے غصے سے کہا۔ ''وہ خود تو مرے گی تجھے بھی مروائے گی۔ دیکھ اس شہر میں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے' تو اسے......''

''میں کسی لڑکی کے لیے نہیں فلسطینی کاز کے لیے گیا تھا۔''

''لڑکی ملنے سے پہلے تجھے فلسطینی کاز یاد نہیں آیا تھا۔''

''پی کے پلیز!'' ساحل اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اس کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ 'پی کے' اسے تشویش کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا ساحل کی ماں کو فون کر کے بتائے گا۔ وہی اسے ٹھیک کر سکتی تھی۔

''ماں کا فون آئے تو اسے نہ بتانا۔'' ساحل نے کہا اور کمرے میں سونے چلا گیا۔

ماتھے کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا' جلد ہی مندمل ہو گیا لیکن دل کے گھاؤ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ نشاط سے پورے ہفتے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ کام پر جاتے ہوئے کئی بار اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تھی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح نشاط کا فون آ گیا۔ اسے ساحل سے فوری ملنا تھا۔ وہ ایونیو آف امریکہ پر ملے اور میگرا ہل بلڈنگ کے سامنے ایک افغان خوانچہ فروش سے بن کباب لے کر وہیں منڈیر پر بیٹھ گئے۔

''میں ایک ہفتے کے لیے واشنگٹن جا رہی ہوں۔'' نشاط نے مرچوں سے سی سی کرتے

اور سوڈے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ ''ہم عرب ملکوں سے لابی کریں گے کہ وہ اسرائیل کو مدد دینے والے ملکوں کو تیل بیچنا بند کر دیں۔ امریکہ دس دن میں گھٹنے ٹیک دے گا۔''

''تم لوگ جذباتی جنونیوں کا ٹولہ بنتے جا رہے ہو۔'' ساحل نے نشاط کے سامنے پہلی بار غصے کا اظہار کیا۔ ''تم صرف اپنا وقت اور توانائیاں ضائع کرو گی۔ یہ ستر کی دہائی نہیں ہے۔ امریکہ آج تیل بیچنے والوں کے نرخرے پکڑے ان کے سروں پر بیٹھا ہے۔ جس دن تیل کی سپلائی بند ہوئی امریکہ کو جمہوریت یاد آ جائے گی۔ تیل پیدا کرنے والی بادشاہتوں کے تختے الٹ جائیں گے اور امریکہ کی پٹھو حکومتیں جمہوریت کے نام پر راج کرنے لگیں گی۔ امریکہ جمہوریت کا چیمپئن ہوگا اور تیل پر بھی اس کا قبضہ ہوگا۔ دنیا بھر کے اخبار ٹی وی اس کے گن گائیں گے۔ عرب حکومتوں کو پتا ہے۔ وہ فلسطین سے ہمدردی رکھنے کے باوجود خودکشی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تم کچھ دن لائبریری میں بیٹھو اور پڑھو۔ تمھیں اندازہ ہو جائے گا۔''

''لائبریری میں صرف کتابی دنیا میں زندہ رہنے والے مردہ لوگ بیٹھتے ہیں جنھیں حقیقتوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔'' نشاط نے ضدی لہجے میں کہا۔

''حقیقتیں کیا ہیں؟''

''تم لائبریری کے بجائے عرب گروپوں میں بیٹھو تو پتا چلے گا۔ پوری عرب دنیا میں امریکہ کے خلاف لاوا پک رہا ہے۔ حکومتیں سخت دباؤ میں ہیں۔ انھیں پتا ہے اگر انھوں نے کچھ نہیں کیا تو آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ جمہوریت امریکہ کے ذریعے نہیں آئے گی' عوام خود اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

ساحل نے کچھ نہیں کہا۔ اسے پتا تھا بحث کرنا بے کار ہے۔ یہ دیوانے لوگ ہیں' وہی کریں گے جو انھوں نے سوچا ہے۔

''ہوسکتا ہے تم صحیح کہتے ہو۔'' نشاط کا لہجہ بھی مصالحانہ ہو گیا۔ ''لیکن کیا ہم بس تجزیے کریں اور چپ چاپ بیٹھے رہیں؟ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ کسی امکان پر تو کام کرنا ہوگا۔''

ساحل نے سوچا وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ منطق صرف بے عملی کا راستہ تھا۔ نشاط نے اس سے ایک بار کہا تھا'' کچھ کرنا ہے تو دیوانے ہو جاؤ۔'' شاید یہی سچ تھا۔

''تمھارے ساتھ اور کون جا رہا ہے؟''

''ڈیوڈ' گیری اور ڈائنا کو تم جانتے ہو۔ باقی عرب گروپوں کے لوگ ہیں۔'' ساحل کو ڈیوڈ کے نام پر حیرت ہوئی' لیکن اس نے اظہار نہیں کیا۔

''تمھیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔'' نشاط براہِ راست اس مطلب پر آ گئی جس کے لیے اس نے ساحل کو بلایا تھا۔ ''تمھیں بلی کا خیال رکھنا ہوگا۔ دن میں صرف ایک بار جا کر اس کے کھانے کا برتن دھو کر ڈبے سے نیا کھانا نکال کر ڈال دینا اور اس کا لٹر صاف کر دینا۔ صرف ایک ہفتے کی بات ہے۔'' اس نے ساحل کی طرف فلیٹ کی چابی بڑھائی۔ ساحل نے چابی لے کر خاموشی سے جیب میں رکھ لی۔ نشاط کو یقین تھا کہ ساحل منع نہیں کر سکے گا۔

ساحل ایک نہیں دو ہفتے تک بلی کی خدمت کرتا رہا۔ دو ہفتے بعد بھی نشاط خود نہیں آئی' اس کا فون آیا' یہ بتانے کے لیے کہ جس کا فلیٹ تھا وہ واپس آ گئی ہے اس لیے اسے اب بلی کو کھانا دینے کے لیے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اور ان کا گروپ واشنگٹن سے فلاڈلفیا اور وہاں سے شکاگو اور ہیوسٹن جا رہا تھا۔ اگلے پورے مہینے نشاط سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ساحل کو بھی خیال نہیں آیا۔ امتحانات کا آخری دور تھا۔ عشق کا بھوت سر سے اتر گیا تھا۔ کام سے بھی چھٹی لی ہوئی تھی۔ سر سے امتحان کا بوجھ اترا تو نشاط کی یاد بھی ستانے لگی۔ وہ کہاں تھی؟

اسٹینلے نے ماریو کی چلی روانگی کے لیے ایک دوست کے فلیٹ میں الوداعی جشن کا اہتمام کیا تھا۔ ماریو نے دوستوں کی یہ پیش گوئی غلط ثابت کر دی تھی کہ وہ پڑھائی مکمل نہ کر سکے گا۔ اس نے بہت محنت کے ساتھ تمام امتحانات دیے تھے اور اسے یقین تھا کہ وہ امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوگا۔ اسے اب فوری چلی واپس جانا تھا۔ دعوت میں الائنس کے بیشتر لوگ آئے تھے۔ ماریو نے اپنی دعوت میں بھی بارٹینڈر کا کام سنبھالا ہوا تھا۔ اسٹینلے اور ساحل اس کے ساتھ

کھڑے تھے۔

''کیا ہوا برادر! تمھاری چڑیا اڑ گئی؟'' اسٹینلے نے آنکھ مار کر ساحل سے پوچھا۔

''وہ نیویارک سے باہر گئی ہے۔'' ساحل نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''وہ واپس آ گئی ہے۔'' ماریو نے کسی کو بیئر کا ڈبا کھول کر دیتے ہوئے کہا۔ ''کل ہی آئی ہے۔ اسے دعوت کا پتا چلا تھا تو مجھے فون کیا تھا۔ وہ آنے والی ہے۔''

ساحل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دروازہ کھلنے کی ہر آواز پر چونک کر دیکھتا۔ کئی حیرتوں کا سامنا ہوا۔ گیری اور ڈائنا جو ایک دوسرے کے کٹر نظریاتی دشمن تھے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ساتھ آئے تھے۔ سینڈرا جو اسٹینلے کو نیلسن مینڈیلا بنانا چاہتی تھی ایک دبلے پتلے چھوٹے سے قد کے ویت نامی لڑکے کے ساتھ آئی تھی۔

''راجیو کا کیا ہوا؟'' ساحل نے اسٹینلے سے کہا جو بڈوائزر کا ڈبا ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

''وہ گاندھی بن کر سینڈرا کے لیے بے کار ہو گیا ہوگا۔'' اسٹینلے نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''اب وہ اس نئے لونڈے کو ہو چی منہہ بنائے گی۔'' اس بار ساحل بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

سینڈرا ماریو کو گلے لگا کر اور اس سے وہائٹ وائن کا ایک جام لے کر ان کی طرف آئی۔

''اکیلے ہو اسٹین؟ کیا نیویارک میں اسپینی لڑکیوں کا قحط پڑ گیا ہے یا......''

''میں برہمچاری ہو گیا ہوں۔'' اسٹینلے نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''جب سے تم چھوڑ کر گئی ہو کسی کو ہاتھ لگایا نہ نظر بھر کے دیکھا۔ میں تمھارے سر کی قسم کھاتا ہوں۔'' اسٹینلے نے سینڈرا کے سر پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔

''تم ایک نمبر کے دھوکہ باز ہو۔ ایک دم بے وفا۔''

''بے وفا میں ہوں کہ تم! ایک سال میں یہ تیسرا غیر ملکی ماڈل لیے گھوم رہی ہو۔''

''اوہ وہ ہنری! تمھیں پتا ہے وہ ویت نام کا ہے۔ ویت نام! میرے خوابوں کی

سرزمین، جہاں سام راج نے پہلی بار منہ کی کھائی تھی۔‘‘

’’اوراس اہنسا کے پجاری کا کیا ہوا؟‘‘

’’راجیو؟‘‘ وہ ہنس پڑی۔ ’’میں نے ساتھ رہنے کی بات کی تو مجھے پروپوز کرنے لگا۔ کہتا تھا انڈیا چلو اگر ماں باپ نے قبول کرلیا تو وہیں شادی کرلیں گے۔ ایڈیٹ! یہ لوگ ابھی تک پانچ ہزار سال پرانی دنیا میں رہتے ہیں۔‘‘

’’پانچ ہزار سال پرانی نہیں، آج کی منافقانہ دنیا میں۔‘‘ اسٹینلے نے ایک ہاتھ ہوا میں بلند کر کے عالمانہ انداز میں ڈرامہ بولنا شروع کیا۔ ’’پانچ ہزار سال پرانی دنیا ایک ترقی یافتہ دنیا تھی، جس میں نہ کوئی ریاست تھی نہ سماج، نہ طاقت تھی نہ جبر، نہ کوئی حاکم تھا نہ محکوم، نہ جیلیں تھیں نہ قیدی، نہ سرحد تھی نہ حب الوطنی کا امتیاز، نہ نفرتوں کا زہر تھا نہ انا کی تلواریں، جذبوں میں صرف محبتیں رہتی تھیں۔ محبتیں صرف محبتیں۔‘‘ اسٹینلے نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی بلند کرلیا اور ایک گھٹنا زمین پر ٹکا دیا۔ ’’میں تمھاری عظمت کو سلام کرتا ہوں سینڈی۔ تمھارے دل میں افریقہ، ہندستان اور ویت نام کی وسعتیں سمائی ہوئی ہیں، تم پانچ ہزار سال پرانی محبت کی دیوی ہو، میرا ہاتھ تھام لو۔ مجھے پانچ ہزار سال پرانی اسی دنیا میں لے چلو۔ پلیز سینڈی۔ پلیز۔‘‘ سینڈرا ہنس رہی تھی، پھر بھی اس نے اسٹینلے کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا...... ساحل مسکراتا ہوا اسٹینلے کا ڈرامہ دیکھ رہا تھا، لیکن وہ مزید محظوظ نہ ہو سکا۔ نشاط ڈیوڈ کے ساتھ دروازے میں داخل ہوئی تھی۔ ساحل اسٹینلے اور سینڈرا کو پانچ ہزار سال پرانی دنیا میں چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ نشاط بھی ماریو سے مل کر اسی کی طرف آئی تھی۔

ساحل کے اندر بہت سے شکایتی مکالمے تڑپ کر رہ گئے۔ اس نے اپنی خبر کیوں نہیں دی، اسے فون کیوں نہیں کیا، ملنے کیوں نہیں آئی، لیکن کوئی شکوہ زبان پر نہیں آیا۔ اسے پہلی بار ڈیوڈ سے جلن محسوس ہوئی۔ دونوں ساتھ ساتھ شہر شہر گھوم رہے تھے، دعوت میں بھی ساتھ آئے تھے...... کیا وہ...... کیا وہ...... ساحل نے اپنی سوچوں کو خاموش کر دیا۔ نشاط حال چال پوچھے بغیر

اسے بتا رہی تھی کہ وہ کیا کیا کرتے رہے۔

''تم ٹھیک کہتے تھے۔'' نشاط کے لہجے میں تھکن تھی۔ ''ہم نے واشنگٹن میں ہر سفارت خانے کا دروازہ کھٹکھٹایا' لیکن ہر جگہ لوہے کی موٹی دیوار کھڑی تھی۔ بس اب ایک ہی حل ہے۔ دھماکہ...... بم باندھو اور کود پڑو۔''

''یہ حل نہیں' دیوانگی ہے۔ پاگل پن' خود کشی!''

''یہی تینوں کامیابی کے دروازے ہیں۔ آؤ تمھیں ڈیوڈ سے ملواؤں۔'' وہ شاید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ڈیوڈ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا سگریٹ رول کر رہا تھا۔ ساحل اور نشاط اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ڈیوڈ نے ساحل سے ملنے میں کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے سگریٹ بھر کر سلگایا اور ایک ہی کش میں آدھا سگریٹ ختم کر دیا۔ فضا میں چرس کی بو پھیل گئی۔ اس نے سگریٹ ساتھ بیٹھی ہوئی نشاط کو دیا۔ ساحل کو سخت حیرت ہوئی جب نشاط نے بھی سگریٹ لے کر ہلکا سا کش لیا اور کھانسنے لگی۔ شاید اسے عادت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سگریٹ ساحل کی طرف بڑھایا لیکن اس کے منع کرنے پر ڈیوڈ نے سگریٹ دو تین کش لے کر ختم کر دیا اور قریب رکھا ہوا شیلف کھول کر اس میں سجے ہوئے رکارڈ دیکھنے لگا۔

''کسی یہودی موسیقار کا رکارڈ مت لگانا'' نشاط نے غصّے سے کہا۔

''یہ موسیقی ہے نشاط موسیقی۔''

تم نے یہ رکارڈ بجایا تو اسے تمھارے سر پر توڑ دوں گی۔''

ڈیوڈ نے عینک کے گول شیشوں کے پیچھے سے غنودی سے بوجھل پلکیں اٹھا کر نشاط کو دیکھا اور رکارڈ واپس رکھ کر دوسرا رکارڈ نکالنے لگا۔

''یہ بیتھووین کی نویں سمفونی ہے' ۱۸۲۴ء کی جب وہ بہرا ہو گیا تھا۔ تم نے سنی ہے؟''

''نہیں! میں ابھی بہری نہیں ہوئی۔'' نشاط پر شاید ایک ہی کش کا اثر ہو گیا تھا۔ آواز

بھی بھاری ہوگئی تھی۔ ''تمھیں سمفونی کا مطلب معلوم ہے؟ بہت سے سازوں اور تاروں سے نکلی ہوئی آوازوں سے مل کر بنی ہوئی دھن! میرے کانوں میں چیخوں اور دھماکوں کی آوازیں ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں۔ مجھے یہ سلانے والی موسیقی نہیں چاہیے۔''

''امِ کلثوم کو سنو گی؟'' ڈیوڈ نے ایک اور رکارڈ نکال کر کہا۔ ''نزار قبانی کی کیا خوب صورت نظم ہے۔''

''مجھے مصری اور عشقیہ کلام بھی پسند نہیں ہے۔'' نشاط یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساحل بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ دونوں اس طرف آئے جہاں سینڈرا کا ویت نامی دوست ہنری ویت نام سے فرار کی داستان سنا کر ہمدردیاں سمیٹ رہا تھا۔

''میرا باپ امریکہ فرار ہوگیا تو ماں نے اپنا سارا اثاثہ بیچ کر ہم نو بھائی بہن سمیت آسٹریلیا جانے والی ایک بوٹ میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ میری بڑی بہن چودہ سال کی تھی۔ ماں نے اس کے بال کاٹ کر اسے لڑکوں کے کپڑے پہنا دیے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ کشتی والے اسے راستے میں کسی بردہ فروش کو نہ بیچ دیں۔ میں صرف دو سال کا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں راستے بھر الٹیاں کرتا آیا تھا۔ کبھی کوسٹ گارڈ کے ڈر سے ہم کشتی کے نچلے حصّے میں گودام میں رکھی ہوئی بوریوں کی طرح ایک دوسرے پر لدے ہوئے پورا دن گزار دیتے۔ سانس کی آواز ایسے لگتی جیسے سمندری بھوت چیخ رہے ہوں۔ طوفانوں میں کشتی تنکے کی طرح اچھلنے لگتی۔ ماں کہتی ہے کہ ملاّح بہت ہوشیار اور تجربہ کار تھے ورنہ ہم زندہ نہ بچتے۔ کئی دنوں کا سفر کر کے ہم آسٹریلیا کے ایک ویران جزیرے پر پہنچ سکے تھے۔''

''تم بھاگے کیوں تھے' امریکہ کو شکست ہوگئی تھی' انقلاب آ گیا تھا' تم آزاد ہو گئے تھے' پھر بھی!'' سینڈرا نے پوچھا۔

''سائیگان میں......''

''سائیگان نہیں' ہو چی منہہ سٹی۔'' سینڈرا نے اسے ٹوکا۔

''وہ کمیونسٹوں کا دیا ہوا نام ہے۔ ہم اسے سائیگان ہی کہتے ہیں۔ میرے باپ نے جنگ میں امریکیوں کی بہت مدد کی تھی' اس لیے ہم سب کمیونسٹ حکومت کا نشانہ بن سکتے تھے۔ ہمیں بھاگنا ہی تھا۔''

''سامراجی کتے!'' سینڈرا کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ ''میں تمھیں کیا سمجھی تھی تم کیا نکلے۔ نکلو یہاں سے۔ یہاں انقلاب کے غداروں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کمیونسٹ دشمن!''

''کسی بھی طرح کا ہے' کمیونسٹ تو ہے۔'' کسی نے پرانا لطیفہ دہرایا' سب ہنس پڑے لیکن سینڈرا کے غصے میں کمی نہیں آئی تھی۔ لگتا تھا ہنری کو چیر پھاڑ کھائے گی۔ معصوم صورت والا ہنری پلکیں جھپکا جھپکا کر حیرانی سے دیکھ رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اس اسپینی لڑکی کی طرح جس نے اسٹینلے سے پوچھا تھا۔ ''نیلسن مینڈیلا کیا؟''

نشاط اور ساحل وہاں سے ہٹ آئے' لیکن ہر گوشے میں کوئی نہ کوئی معرکہ گرم تھا۔ گیری اور ڈائنا کچھ دیر پہلے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آئے تھے۔ ساحل نے انھیں ایک دوسرے کو پیار کرتے بھی دیکھا تھا' وہ اس وقت لڑاکا مرغوں کی طرح ایک دوسرے پر غرّا رہے تھے۔ قربت اب بھی قائم تھی' ناکیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں لیکن منہ سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان میں ٹراٹسکی اور اسٹالن کی روحیں حلول کر گئی ہوں۔ انھیں سے ذرا فاصلے پر حارث اور جاسم میں گرما گرمی ہو رہی تھی۔ حارث نے شاید جاسم سے بھی اریٹیریا کے بارے میں اپنی شکایت دہرائی تھی جس کا جاسم نے عادت کے مطابق مذاق اڑایا ہوگا۔ بہت نرم گو حارث سخت غصے میں تھا۔ جاسم اسے مسکرا کر دیکھتا ہوا بیئر کے گھونٹ لے رہا تھا۔ ماریو ساقی گری چھوڑ کر ایک امریکی دوست پر برس رہا تھا۔

''تمھاری ایک عمارت گری ہے تو دیوانے ہو رہے ہو۔ نہیں! تمھیں مجھ سے ہمدردی نہیں ملے گی۔ تم نے بہت ملک تباہ کیے ہیں' لاکھوں کروڑوں کا خون کیا ہے' لیکن تمھارا وقت ختم ہو گیا ہے' تم عراق اور افغانستان جیسے کمزور اور لاچار ملکوں پر بم برسا کر پہلوانی کرتے رہے ہو'

تم پچاس سالوں میں چھوٹے سے کیوبا کا کچھ نہیں کر سکے۔ یہ ستر کی دہائی نہیں جب تم نے ایلندے کو گرالیا تھا' تم نے وینزویلا میں تماشا کر کے دیکھ لیا' کیا ہوا؟ لاطینی امریکہ اب اپنے پانو پر کھڑا ہو گیا ہے' وہ تمھارے ایک ایک ظلم کا بدلہ لے گا۔ میں بھی اپنی ماں کے قتل کا انتقام تم سے لوں گا' تم سے......''

اس وقت موسیقی کی جھنکار نے سب کو خاموش کر کے توجہ اپنی طرف کھینچ لی' اسٹینلے گٹار اٹھالایا تھا اور اس کے تاروں سے کھیل رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب اس کے اردگرد جمع ہو گئے تو وہ جھوم جھوم کر گانے لگا:

''آؤ میں تم کو
پیار کی دنیا میں لے کے چلتا ہوں
جہاں امن کی ملکہ راج کرتی ہے
جہاں سیاہی سفیدی ایک ہے
سب زبانیں ایک ہیں
سب نمازیں
سب اذانیں ایک ہیں
عشق کی شمعیں فروزاں ہیں
جہاں انگ انگ رقصاں ہے
جہاں خواہشیں تکمیل پاتی ہیں
لذّتوں کے گیت گاتی ہیں
جہاں
آسماں در آسماں'
خوشبوؤں کے قافلے

پرواز کرتے ہیں

اور زمینوں پر

تتلیوں اور جگنوؤں کے کارواں

آرام کرتے ہیں

جہاں بس روشنی ہی روشنی،

نغمگی ہی نغمگی،

محبت ہی محبت ہے،

محبت ہی محبت ہے،

محبت ہی محبت ہے،

آؤ میں تم کو

پیار کی دنیا میں لے کے چلتا ہوں

جہاں امن کی ملکہ راج کرتی ہے

جہاں......''

گیت ختم ہوا تو ڈیوڈ نے تیز دھنوں والا ایک رکارڈ لگا دیا۔ سب اپنے اپنے پارٹنر کا ہاتھ تھام کر تھرکنے لگے تھے۔ ساحل نے بھی کئی بار نشاط کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اس طرح کھڑی رہی جیسے اس کا کسی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ماریو کی پارٹی کے ایک مہینے بعد تک نشاط کی کوئی خبر نہیں ملی۔ وہ پارٹی سے ڈیوڈ کے ساتھ ہی گئی تھی، کہا تھا خود فون کرے گی۔ ساحل یہ سوچ کر کڑھ رہا تھا کہ ڈیوڈ کے ساتھ نشے کی دنیا میں بھٹک رہی ہوگی۔ اس پورے مہینے میں ساحل بھی مصروف رہا۔ پی ایچ ڈی میں انرولمنٹ کے لیے موضوع کا انتخاب، سپروائزر کی تلاش، سب کچھ خاصا مشکل ثابت ہوا تھا۔ پھر بھی وہ نشاط کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ ایک دن صبح ہی صبح اس کا فون آ گیا۔

''ڈاؤن ٹاؤن میں ملو۔ ٹاؤن ہال کے سامنے ٹھیک دس بجے' بہت ضروری کام ہے۔''

وہ ساحل کا جواب سنے بغیر پتا بتانے لگی۔

ساحل پہنچا تو نشاط کے ساتھ ڈیوڈ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ہمیشہ کی طرح نشے کے بوجھ سے ڈھلی ہوئی پلکیں، بکھرے ہوئے بال' بڑھا ہوا شیو' میلی سی جیکٹ اور ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب۔

''ہم شادی کر رہے ہیں۔'' نشاط نے ساحل کو دیکھتے ہی دھماکہ کیا۔ ساحل جیسے اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ''تم ہمارے گواہ ہو۔'' وہ یہ کہہ کر فوراً ہی مڑ کر تیز تیز قدموں سے عمارت کی طرف بڑھ گئی۔ نشاط نے اس کا سفید ہوتا ہوا چہرہ نہیں دیکھا تھا اور ڈیوڈ کے لیے تو وہ موجود ہی نہیں تھا۔

ٹاؤن کلرک نے ایجاب وقبول کے بعد ان کی شادی کا اعلان کیا اور انگوٹھی پہنانے کے لیے کہا تو دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ ان کے پاس انگوٹھی نہیں تھی۔ میاں بیوی کی حیثیت سے بوسہ لیا تو وہ بھی اچھلتا ہوا۔ ہونٹ ایک دوسرے سے بمشکل مس ہوئے تھے۔ ساحل اور وہاں موجود ایک سرکاری ملازم نے گواہوں کی حیثیت سے دستخط کیے اور شادی کا سرٹیفکیٹ لے کر ٹاؤن ہال سے باہر نکل آئے۔ ڈیوڈ کو کہیں جانا تھا۔ وہ نشاط کے رخسار پر بوسہ ثبت کر کے چلا گیا۔ ساحل اور نشاط خوانچے والے سے کافی لے کر سبزے پر پڑی ہوئی المونیم کی بنچ پر آ بیٹھے۔ ساحل سوچنے لگا یہ کیسی شادی ہے۔ نہ خوشیوں کا ہنگامہ' نہ جذبوں کا اظہار' نہ مستقبل کی لگن' نہ مولوی نہ پادری' ایک سرد مزاج سرکاری عہدے دار نے دو لفظ کہے' رجسٹر پر دستخط ہوئے اور دونوں اپنی اپنی راہ پر چل دیے۔

''میں نے ضرورتاً شادی کی ہے۔'' نشاط نے گرم گرم کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''میرا ویزا بہت پہلے ختم ہو گیا تھا۔ آج کے حالات میں میرا قانونی رہنا ضروری ہے۔ میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں اس کے لیے بھی میرا اسٹیٹس ٹھیک ہونا چاہیے۔''

''تو یہ صرف کاغذی شادی تھی؟'' ساحل کے چہرے کا رنگ واپس آنے لگا۔

''نہیں! مجھے فریب سے نفرت ہے۔ ضرورتاً کی ہے' لیکن سچ مچ کی ہے۔ میں اس کے فلیٹ میں اس کے ساتھ اس کی بیوی بن کر رہوں گی۔''

''مجھے یونیورسٹی جانا ہے' میں چلتا ہوں۔'' ساحل کافی کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ گیا۔ نشاط دکھ بھری آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

ساحل یونیورسٹی میں بے مقصد بھٹکتا رہا۔ لائبریری میں بیٹھ کر کتابوں میں دل لگانے کی کوشش کی لیکن ہر ورق سادہ نظر آیا۔ دماغ کی عجب کیفیت تھی۔ کئی جذبے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اداسی' دکھ' ملال' حسرت' حسد' بے زاری' سر میں دھماکے ہونے لگے۔ اسے نشاط پر غصہ آیا۔ وہ دشمنوں کو تباہ کرنے نکلی تھی لیکن بم مار کر خود اپنے ایک دوست کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ یونیورسٹی میں کوئی ایسا دوست بھی نہیں رہا تھا جس سے مل کر غم غلط کر سکتا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر سب اپنے اپنے مستقبل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ماریو ہمیشہ کے لئے چلی چلا گیا تھا۔ اسٹینلے آج کل تنزانیہ گیا ہوا تھا۔ شام کو ہلٹن میں چار گھنٹے کی شفٹ بھی کرنا تھی۔ جیسے تیسے کام ختم کر کے گھر آیا تو پی کے حسبِ دستور بوتل کھولے بیٹھا تھا۔ ساحل اس سے بات کیے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے ماں کو اسلام آباد فون کرنا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔ اس کا دکھ وہی سمجھ سکتی تھی۔

کئی مہینے گزر گئے ساحل اپنی ریسرچ کی دنیا میں کھو گیا تھا۔ نشاط کی یاد اب بھی تازہ تھی لیکن زخم مندمل ہونے لگے تھے۔ شاید وہ اسے بھول بھی جاتا کہ ایک دن صبح ہی صبح اس کا فون آ گیا۔

''میں نے ڈیوڈ کو چھوڑ دیا ہے' اس سے طلاق لے لی ہے۔'' اس نے رسمی جملوں کا تبادلہ کیے بغیر دھماکہ کیا۔

''کیوں؟ اتنی جلدی' ابھی تو......''

''ڈیوڈ اچھا آدمی ہے، لیکن وہ بوہمین قسم کا دانش ور انقلابی ہے۔ اپنی پرانی محبوبہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا جہنم میں جاؤ۔''

''تم اب کہاں ہو؟''

''کینیٹی کٹ میں، ڈیوڈ کے ماں باپ کے پاس۔''

''طلاق کے بعد بھی؟''

''وہ بہت دولت مند لوگ ہیں۔ ڈیوڈ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ انھیں ڈر ہے میں ان کی جائیداد پر دعویٰ نہ کر دوں۔ اس لیے میری خدمت کر رہے ہیں۔' اس نے قہقہہ لگایا، لیکن پھر سنجیدہ ہوگئی۔ ''مجھے ان حرامیوں کا دھیلا بھی نہیں چاہیے۔''

''نیویارک کب آؤ گی؟''

''تمھیں اسی لیے فون کیا ہے۔ میں آج آرہی ہوں، تم سے ملنے کل صبح آؤں گی، آخری بار......''

''آخری بار؟''

''میں امریکہ چھوڑ کر جارہی ہوں۔ ابھی کچھ مت پوچھو۔ ملو گے تو بتاؤں گی، میرا انتظار کرنا۔''

صبح وہ نہیں آئی، اس کا فون آیا کہ دوپہر کو آئے گی۔ ساحل کھانے کی میز سجا کر انتظار کرنے لگا۔ وہ آئی تو سفر کے لیے تیار نظر آتی تھی۔ ایک بڑے بیک پیک نے کمر دوہری کی ہوئی تھی۔ ایک تھیلا کندھے پر اور ایک ہاتھ میں تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر آئی تھی اس لیے پسینے میں شرابور تھی۔ آتے ہی کھانے پر ٹوٹ پڑی، جیسے کئی دن کی بھوکی ہو۔ کھانے کے دوران ساحل کی ریسرچ کے بارے میں بات کرتی رہی۔ ساحل نے نہیں پوچھا کہ کہاں جارہی ہے۔ سوچا تھا خود بتائے گی، لیکن کھانا ختم ہوا تو صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

''تم کہاں جارہی ہو؟''

''اسرائیل!''

''کیا؟''

''میں نے کسی کو نہیں بتایا، تمھیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ مجھے پتا ہے تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ پھر بھی میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ۔'' اس نے ساحل کا ہاتھ لے کر خود اپنے سر پر رکھ لیا۔ ساحل اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''میں نے پچھلے سال سوسائڈ بامبر کے لئے والینٹیر کیا تھا' میرا نمبر آ گیا ہے۔''

''تم دیوانی ہوگئی ہو؟''

''تم ہمیشہ یہی کہتے ہو۔ اور میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ ہاں!''

''جان دینے والے وہاں بہت ہیں' یہاں تم سا کام کرنے والا کہاں ملے گا۔ یہاں تمھاری زیادہ ضرورت ہے۔'' ساحل نے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''سب یہی کہتے تھے' لیکن میں نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا۔ کوئی فائدہ نہیں۔ صرف ایک یہی راستہ ہے کہ قیامت برپا کر دو۔ جان دینا اب آسان بھی نہیں رہا۔ میرے پاس ٹرکش پاسپورٹ ہے۔ شادی کے بعد مجھے یہودی نام بھی مل گیا ہے۔ مجھ پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔ میں ایسا دھماکہ کروں گی کہ پورا اسرائیل لرز اٹھے گا۔''

''پھر؟ اس کے بعد کیا ہوگا؟''

''اور دھماکے ہوں گے۔ اس وقت تک ہوتے رہیں گے جب تک فلسطین آزاد نہیں ہوگا۔ یہ آزادی کی جنگ ہے ساحل! اس میں قربانیاں دینا پڑیں گی' جان سے گزرنا ہوگا۔''

''یہ قربانی نہیں بزدلی ہے۔ اس بات کا اعلان کہ اب ہم تھک گئے ہیں۔ آگے نہیں بڑھ سکتے' اس لیے خدا حافظ! یہ جنت تک پہنچنے کا شارٹ کٹ نہیں' شکست کا اعتراف ہے۔''

''تم سمجھتے ہو میں یہ سب کچھ جنت میں جانے کے لیے کر رہی ہوں؟''

''نہیں! مجھے پتا ہے جنت جہنم تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمھیں یہ اطمینان بھی حاصل نہیں

ہے۔''

''تم بے حس ہو گئے ہو' بالکل بے حس۔ مردہ۔'' اسے غصہ آ گیا۔ اس کے اندر کی نشاط جاگ گئی۔ ''تم نے فلسطین میں بچوں کے جنازے اٹھتے اور ان پر ماؤں کو گریہ وزاری کرتے نہیں دیکھا۔ تمھارا دل دہل جائے گا...... تم بھی بم باندھ کر کود پڑو گے۔''

''میرے اور تمھارے دھماکے سے بھی یہی ہو گا۔ بچوں کے جنازے اٹھیں گے اور ان کی مائیں گریہ وزاری کریں گی۔''

''ہاں! انھیں پتا چلے گا کہ اپنے بچے مرتے ہیں تو کیا گزرتی ہے۔''

''بے حس تم ہو گئی ہو۔ تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

''ظلم کرنے اور ظلم سہنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟''

''تم دونوں کا کھیل ایک ہے۔ وہ ٹینکوں سے گولے اگل کر قہر برسا رہے ہیں' تم نے انسانوں کو توپیں بنا دیا ہے۔ کل تمھارے پاس ٹینکوں کی طاقت ہو گی تو تم ٹینکوں سے گولے برساؤ گی۔ آزادی مل گئی تب بھی دھماکے ہوتے رہیں گے۔ آزادیاں دھماکوں سے نہیں طویل جدوجہد سے ملتی ہیں۔''

''آدھی صدی گزر گئی ہے۔ بے وطنی میں ایک پوری نسل گزر گئی ہے۔ تم لوگوں کی تقریروں میں ایک دو صدیاں اور گزر جائیں گی۔''

''ہاں شاید! لیکن جو آزادی حاصل ہو گی وہ ہمیشہ رہنے والی ہو گی۔ تاریخ نے یہی سبق سکھایا ہے۔ نیلسن منڈیلا آج بھی زندہ ہے۔ ہو چی منہہ کے ویت نام میں روز بچوں کے جنازے اٹھتے تھے' لیکن وہ اپنی لڑائی لڑتے رہے۔ ماؤ کا انقلاب صرف توپ کے دہانے سے گزر کر نہیں آیا تھا۔''

''وہ اور زمانے تھے۔ وقت اب بدل گیا ہے' لیکن تم نہیں سمجھو گے۔ تمھاری بے عملی صرف بہانے تراشتی رہے گی۔''

''ہوسکتا ہے نہ سمجھ سکوں۔ شاید تم بھی کبھی نہ سمجھ سکو۔''

ساحل کو پتا تھا وہ اس کی بات نہیں سمجھے گی۔ وہ نشاط کو مرنے سے روک نہیں سکے گا۔ وہ کسی اور دنیا میں رہ رہی تھی۔ اس کے دماغ کا ہر خلیہ ایک الگ مرکز پر ناچ رہا تھا۔ دلیلیں' منطق اور تاریخ کا سبق اس کا علاج نہیں تھا۔ بس اب الوداع کہنے کا وقت تھا۔ اس خیال نے کہ وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی ہے' ہر دوسرے احساس کو منجمد کر دیا۔ دل دھڑکنے کی آواز آنا بھی بند ہوگئی۔ وہ خاموش ہو کر نشاط کو تکنے لگا جو اتنی لاپرواہی سے جان دینے کا ذکر کر رہی تھی جیسے پکنک پر جا رہی ہو۔

''میرے رشتوں کی دنیا پہلے ہی اجڑ چکی ہے۔ مجھے کوئی رونے والا نہیں ہے۔ کوئی نہیں جو میرا ماتم کرے گا۔''

''میں ہوں میں! تمھیں پتا ہے میں......''

''کچھ مت کہو۔ جو کہنا ہے تتلیوں سے کہنا۔ تتلیاں بے زبان ہوتی ہیں' ان کی باتیں صرف دیوتا سنتے ہیں۔ تم جو کہو گے مجھ تک پہنچ جائے گا۔ میرے مرنے کی خبر پڑھ کر تتلیاں ضرور اڑانا۔'' نشاط اٹھ کر اپنا تھیلا کمر پر لادنے لگی۔

ساحل نے سوچا دوست صحیح کہتے تھے۔ صفات کے مرنے کے بعد اس کی روح نشاط میں داخل ہوگئی تھی۔ صرف اسے صفات کی طرح محبت کرنا نہیں آیا تھا۔

''میں تمھارے ساتھ ایئرپورٹ تک جاؤں گا۔ شاید رستے میں تمھارا ارادہ بدل جائے۔'' ساحل نے اس کا سامان سنبھالتے ہوئے کہا۔

''نہیں! ایئرپورٹ پر کسی کا میرے ساتھ نظر آنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بھی نہیں آرہے جو مجھے بھیج رہے ہیں۔ تم چاہو تو ٹرین اسٹیشن تک ساتھ چل سکتے ہو۔''

اسٹیشن پہنچے تو ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر سامان رکھ کر خاموش کھڑے رہے۔ دور سے ٹرین آتی نظر آئی تو نشاط نے بڑھ کر ساحل کو گلے لگا لیا اور کچھ دیر اسی

طرح اس سے لپٹی رہی۔ الگ ہوئی تو ساحل نے پہلی بار اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھیں۔ شاید اس کی محبت صفات سے زیادہ گہری تھی، بس اس نے باہر آنا نہیں سیکھا تھا۔ ساحل کے اندر تو زلزلے آئے ہوئے تھے۔ ٹرین آتے ہی نشاط پلٹ کر دیکھے بغیر ٹرین میں سوار ہوگئی۔ ساحل دیر تک کھڑا ہوا ٹرین کی خالی پٹڑیوں کو تکتا رہا۔

خالی گھر میں واپس جانے کی ہمت نہیں تھی۔ اسٹیشن سے نکل کر گلیوں میں بھٹکتا اور دکانوں کے شوکیسوں کے سامنے کھڑا انھیں تکتا رہا۔ لائبریری نظر آئی تو اس میں گھس گیا۔ اخبار کھولا تو پہلے ہی صفحے پر ایک سوسائڈ بامبر کی خبر تھی۔ اخبار پھینک کر لائبریری سے نکل آیا۔ ایک کے بعد دوسرے کافی شاپ میں بغیر دودھ اور چینی والی سیاہ کافی، جیسی نشاط کو پسند تھی، پی کر اپنے اندر اٹھنے والے دریا خشک کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ شام گئے گھر آیا تو پی کے آچکا تھا۔

''تیری طبیعت تو ٹھیک ہے یا کسی سے مار کھا کر آیا ہے۔'' پی کے نے اسے تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! وہ چلی گئی......'' ساحل پھٹ پڑا۔ کسی کو تو اپنے غم کی کہانی سنانا تھی۔

''کون؟ نشاط! لیکن وہ تو پہلے ہی......''

''وہ اسرائیل گئی ہے، دھماکہ کرنے، اپنی جان دینے۔''

''اوہ مائی گاڈ!''

''میں اسے روک سکتا تھا، لیکن روک نہیں سکا۔ میں نے اسے جانے دیا۔ میں نے اسے جانے دیا۔''

''جانے والے کو کوئی نہیں روک سکتا۔'' پی کے نے اٹھ کر ساحل کو گلے لگا لیا۔ ''وہ ایک عظیم لڑکی ہے، اس کے لیے دعا کر۔'' پی کے بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ساحل دوست کا کندھا پا کر سسکنے لگا۔ دریا رکا تو اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گیا۔ پی کے اس کی ماں کو اسلام آباد فون کرنے لگا۔ کلثوم تین روز کے اندر ہی نیویارک پہنچ گئی تھی۔

ماں کے آنے سے قرار آ گیا تھا۔ کلثوم ایک مہینے ساتھ رہ کر واپس گئی تو اس وقت تک
ساحل کے دل کا زخم بڑی حد تک مندمل ہو گیا تھا، لیکن ہلکی ہلکی ٹیس اب بھی اٹھتی تھی۔ اخبار میں
کبھی خودکش بم دھماکے کی خبر نظر آتی تو اخبار بند کر دیتا۔ اسے نشاط کے مرنے کی خبر نہیں پڑھنا
تھی۔ اسے تتلیاں نہیں اڑانا تھیں۔

13

اسلام آباد

"Over my dead body! Over my dead body!"

صدر ایمان علی کے دماغ میں اپنا ہی کہا ہوا جملہ بار بار گونج رہا تھا۔ اسے آج یہ جملہ دو بار استعمال کرنا پڑا تھا۔ ایک بار امریکی سفیر سے ملاقات کے دوران اور دوسری بار جنرل غلام اکبر کے سامنے جب وہ کشمیر کی صورت حال کی بریفنگ دے رہا تھا۔ ایمان علی نے گھڑی دیکھی، پانچ بجنے والے تھے، آج ہر کام ایک گھنٹہ آگے چلا گیا تھا۔ اسے ایک بار پھر امریکی سفیر پر غصہ آیا جس کی وجہ سے آج سارے دن کا نظام بدلنا پڑا تھا۔ ملاقات یاد کر کے دورانِ خون ایک بار پھر تیز ہو گیا۔

"Over my dead body!" ایمان علی نے میز پر گھونسا مارا اور کھڑا ہو گیا۔

اچھے موڈ میں وہ اس بڑھئی کی تعریف کیا کرتا جس نے اس کی میز کے لیے کسی اچھی نسل کی ایسی لکڑی استعمال کی تھی جو پچھلے تین برسوں میں سینکڑوں گھونسے کھانے بعد بھی ٹوٹی نہیں تھی۔ اس کی اندرونی کابینہ کے ارکان کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ایمان علی نیچے اتر آیا جہاں لان پر میز کرسیاں لگادی گئی تھیں۔ ان سے ملاقات کھلی ہوا میں ہونا تھی جہاں کسی خفیہ کان کی موجودگی کا امکان نہ ہو۔ اسے اپنے دماغ کی گرمی بھی کم کرنا تھی۔ اہم فیصلوں کے لیے سرد مزاجی ضروری تھی۔ ایمان علی جوتے اتار کر گھاس پر ٹہلنے لگا۔ شاید ابھی ابھی پانی دیا گیا تھا۔ گھاس میں نمی باقی تھی۔ سورج کی حدت بھی کم ہوگئی تھی، ہوا خوش گوار تھی، تلووں کی ٹھنڈک دماغ تک پہنچنے لگی۔

جب ''نیا پاکستان'' بنانے کا سفر شروع ہوا تھا تو سب نے کہا تھا بہت اونچی چڑھائی ہے۔ درمیان میں بڑے بڑے پتھر ہیں، گہری کھائیاں ہیں، پھسلن بھی بہت ہے، اوپر تک پہنچنا ناممکن ہوگا۔ تین برسوں میں وہ اوپر تک تقریباً پہنچ گئے تھے۔ بس انتخابات ہونا باقی تھے جس کے بعد جمہوریت کا سفر بھی مکمل ہو جاتا۔ آئین سازی ہو چکی تھی۔ ریفرنڈم کی تاریخ کا اعلان ہوگیا تھا۔ ایمان علی انتخاب لڑنے کے لیے مستعفی ہونے کی تیاری کررہا تھا۔ پھر اچانک یہ سب گڑبڑ شروع ہوگئی تھی۔ ایمان علی نے تین سال کے دوران کشمیر کے محاذ کو خاموش رکھا تھا، بھارت کو امن مذاکرات میں انگیج کیا تھا۔ جہادیوں کو کشمیر پالیسی سے بالکل الگ کرکے تعلق کی ہر ڈور کاٹ دی تھی، لیکن اب اچانک سرحد پر تو تو شروع ہوگئی تھی۔ امریکہ نے تین برسوں میں ایمان علی کی اصلاحات کا پورا ساتھ دیا تھا۔ اس کی امدادی ایجنسیوں نے ترقیاتی منصوبوں کے لیے ہر ممکن مدد دی تھی، لیکن آج امریکی سفیر اعلانیہ بدتمیزی کرکے گیا تھا۔ جس فوج نے خود اپنی صفوں میں تطہیر قبول کرکے پوری طرح شہری حکومت کے زیرنگیں رہنا منظور کرلیا تھا، اس کا سربراہ بھی آنکھیں دکھانے لگا تھا۔ مری ہوئی اپوزیشن میں دوبارہ جان آگئی تھی۔ سردار، جس کے بارے میں ایمان علی اپنا پرانا جملہ دہراتا تھا 'مکھی کے برابر دماغ ہے اس کا' وہ اچانک مردِ میدان بن گیا تھا۔ ناکارہ ہو جانے والی توپیں ایک بار پھر سردار کے پاس جمع ہوگئی تھیں۔

امریکی اور برطانوی سفیر اور فوج کا سربراہ سردار سے ملاقاتیں کر رہے تھے' اسے امریکہ یورپ کا دورہ کرا رہے تھے' لوگ اسے جلسوں میں سننے آ رہے تھے۔

''سب ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں۔'' کرم قریشی نے کہا تھا۔ ''یہ کھیل ہم نے بھی کھیلا ہے۔ پیٹرن بہت واضح ہے۔ کوئی بہت طاقت ور ہاتھ پیچھے ہے۔''

''کون؟ اور کیوں؟'' ایمان علی نے پوچھا تھا۔

''جو بھی ہے اور جس لیے بھی ہے' ہم پر انتخابات سے پہلے چوٹ لگانا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا انتخابات ہوں۔ اسے پتا ہے ہم انتخابات کے بعد بہت طاقت ور بن کر ابھریں گے۔ ہم پر ایک یہی الزام ہے کہ ہم جمہوری طور پر منتخب ہو کر نہیں آئے۔ انتخابات کے بعد یہ دھبہ بھی مٹ جائے گا۔''

کرم قریشی نے ایمان علی کو غور سے دیکھتے ہوئے بہت پر زور طریقے سے کہا تھا۔

''آپ کو انتخابات سے پہلے مستعفی ہونے اور نگراں حکومت بنانے کا فیصلہ بدلنا ہوگا۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں......''

''نگراں حکومت کو مستقل ہونے سے کون روک سکے گا۔'' کرم قریشی نے ایمان علی کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ ''کشمیر کی جنگ کو جان بوجھ کر ہوا دی جا رہی ہے۔ ہنگامی حالات بہانہ بنائے جا سکتے ہیں۔ آئین ابھی نافذ نہیں ہے۔ سپریم کورٹ کے پاس ہماری مثال ہے۔ تین سال کسی اور حکومت کو بھی دیے جا سکتے ہیں۔ یقین جانیے ایسا ہی ہوگا۔ نگراں حکومت بنی تو انتخابات نہیں ہونے دیے جائیں گے۔''

ایمان علی نے ایک بار پھر زور زور سے انکار میں سر ہلایا تھا' لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا اس نے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مہینے بھر پہلے ہر رستہ ہموار نظر آ رہا تھا' اب اتنی ہی رکاوٹیں سامنے کھڑی تھیں۔ ایمان علی کو فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے کبھی دفاعی جنگ نہیں لڑی تھی' وہ حملہ کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ آج امریکی سفیر نے حملہ کرنے کی یہ حس بیدار کر دی تھی۔

پچھلے مہینے امریکہ کی پچھلی سفیر روتھ کینڈل تبادلہ ہونے کے بعد جانے سے پہلے آخری بار ملنے آئی تھی تو آنے والے نئے سفیر کے بارے میں خبردار کر گئی تھی۔ وہ جاتے جاتے خطرے کی کئی گھنٹیاں بجا گئی تھی۔ وہ جانتی تھی ایمان علی کے ساتھ بڑی طاقتوں کے رومانس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب دنیا کی نئی حقیقتیں اپنا عمل دہرائیں گی۔ روتھ کو خوشی تھی کہ جو کچھ ہونے والا تھا' اس کے ہاتھوں انجام نہیں پائے گا۔ آخری ملاقات ایمان علی کے دفتر میں اور اکیلے میں ہوئی تھی۔

''ایمان! میں تمھیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت رسمی نہیں رہی تھی۔ وہ اکیلے میں ایک دوسرے کو پہلے نام سے بلاتے تھے۔

''تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے؟ اگلے سال چھٹیوں میں میرے گاؤں میں مہمان رہو گی۔ میں تمھیں شکار کھلاؤں گا۔''

''مجھے شکار پسند نہیں ہے۔ تمھیں پتا ہے میں مکمل طور پر سبزی خور ہوں۔ میں معصوم پرندوں کو گولی کھا کر گرتے اور ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

''ٹھیک ہے' شکار نہ سہی گاؤں میں چند روز گزارنا۔ دیکھنا وہاں کی سادگی میں کتنا خلوص اور کتنی مٹھاس ہے۔ تم اپنی سفارت کاری بھول جاؤ گی۔''

''ہاں شاید......''

''مجھے لگتا ہے تمھارے تجزیہ نگاروں نے مجھے write off کر دیا ہے۔'' ایمان علی نے اس کی بے یقینی پر ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہے' میری حکومت نہیں رہی تو میں زیادہ آزادی کے ساتھ تمھاری مہمان نوازی کر سکوں گا۔ میری ماں تمھیں حالاتِ حاضرہ کے وہ رموز سمجھائے گی جو تمھاری کسی تھنک ٹینک کی فہم میں نہ سما سکیں گے۔''

''ایمان علی! دنیا کو اپنی ماں کی آنکھوں سے دیکھنا چھوڑ دو۔ یہ دنیا تمھاری ماں کی طرح سادہ نہیں ہے۔'' امریکی سفیر اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ جو کچھ ہونے والا تھا' بتانا مشکل تھا'

لیکن خبردار تو کرسکتی تھی۔ ''گھر سے باہر جھانک کر دیکھو' اردگرد کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔''

''کیا ہو رہا ہے' کشمیر کی جنگ؟ کیا ہونے والا ہے۔ ایک بڑی جنگ؟'' ایمان علی سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ چھوٹا کھیل ہے' آپ دونوں ساٹھ برسوں سے کھیل رہے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ ایک نیا الاؤ دہکنے لگا ہے۔ ٹھنڈے اور نظر نہ آنے والے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ دنیا ایک بار پھر سرد جنگ کی لپیٹ میں ہے۔ آزاد دنیا کو ایک بار پھر خطرہ ہے۔''

''کس سے؟ کون ہے وہ؟''

''آپ کا سب سے پیارا دوست چین!''

ایمان علی ہنس پڑا۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ''روتھ! تم لوگ سخت وہمی ہو گئے ہو۔ پتا کھڑکنے کی آواز کو بم کا دھماکہ سمجھنے لگے ہو۔ چین خاموشی سے خود کو ترقی دے رہا ہے۔ اس کی صنعتیں تمھاری منڈیاں بھرنے کے لیے دن رات کام کر رہی ہیں۔ میں پچھلے سال چین کے دورے پر گیا تھا تو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ ہر نئی ٹیکنالوجی نے ایک ایک نیا شہر بنا لیا ہے۔ اس کا ہر بڑا شہر تمھارے کسی بھی بڑے شہر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ ہندوستان کو شرم آنی چاہیے جسے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہتے کہتے آپ کے حلق سوکھتے ہیں۔ ہندوستان سے کہیے وہ ہمیں سبق سکھانے کی دھمکیاں دینے کے بجائے چین سے سبق حاصل کرے۔''

''تم لوگ اپنی ناک سے آگے دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہر معاملے کو بھارت دشمنی کے ترازو میں تولتے ہو۔ مسئلہ یہ ہے......''

''انڈیا کو چھوڑو' یہ بتاؤ چین وہ الاؤ کیوں دہکائے گا جس میں اس کی اپنی انگلیاں بھی جل سکتی ہیں۔ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے وہ ملیامیٹ ہو سکتا ہے۔'' ایمان علی نے اس کی بات

کاٹ کر کہا۔

''نظریاتی سبقت حاصل کرنے کی تمنا' دنیا پر حکومت کرنے کا خواب۔ اس نے سرد جنگ کے زمانے میں روس دشمنی میں ہم سے دوستی کی تھی۔ ہم سے بازاری معیشت ادھار لے کر اپنی معیشت کی اصلاح کی تھی۔ ہم روس کے ساتھ الجھے رہے' وہ اپنا کام کرتا رہا۔ ہم دہشت پسندی کے خلاف جنگ میں پھنسے تھے اور وہ ہماری منڈیوں کو اپنی پیداوار سے بھر رہا تھا۔ مغرب کے ہر ملک کے اربوں ڈالر کا تجارتی توازن اس کے حق میں ہے۔''

''آپ اس کی مصنوعات کے لیے اپنی منڈیاں بند کر دیجئے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ قیمتوں کا توازن بگڑ جائے گا۔ منافع کا نظام خراب ہو جائے گا۔ کوئی اور ملک بڑی مقدار میں اتنی کم قیمت اور اس کوالٹی کی مصنوعات فراہم نہیں کر سکتا۔ ہم نے پابندیاں لگائیں تو ہماری ہائی ٹیک انڈسٹری کے سستے چربے دنیا میں پھیل جائیں گے۔ ہم آزاد تجارت کے تصور کو زک نہیں پہنچا سکتے۔''

''خطرہ دنیا کی آزادی کو نہیں' بازاری معیشت اور منافع کے نظام کو ہے۔'' ایمان علی نے مسکرا کر کہا تو امریکی سفیر کی سنجیدگی میں اور اضافہ ہو گیا۔

''دنیا کی آزادی' جمہوری قدریں سب بازاری معیشت کی کوکھ سے نکلی ہیں۔ پابند معیشت صرف پابندیوں کو جنم دے گی۔ تم صدر کی حیثیت سے چین دیکھنے گئے تھے۔ تم نے وہی دیکھا ہوگا جو دکھایا گیا ہوگا۔ بیجنگ کے تیانن مین اسکوائر پر عام آدمی کی طرح جا کر دیکھو جہاں ماؤ کیپ غائب ہو گئی تھی اور سروں پر صرف بیس بال کیپ نظر آتی تھی۔ وہاں اب ماؤ کیپ دوبارہ فیشن میں ہے۔ ہر ہاکر ماؤ کے بیج اور تصویریں بیچ رہا ہے۔ بڑے بڑے بینر لگے ہیں جن پر ماؤ کا قول درج ہے کہ جس نے دیوار چین نہیں دیکھی وہ مرد نہیں ہے۔ دیوار چین پر چڑھنا حج اور دریائے یانگسی کو پار کرنا عقیدت کا سفر بن گیا ہے۔''

''ماؤ اگر چین کی نظریاتی اساس میں شامل ہے تو اس سے آپ کی کوک' پیپسی'

میکڈانلڈ اور کنٹکی فرائڈ چکن کو کیا خطرہ ہے؟ ان کے بڑے بڑے اشتہار آج بھی ماؤ کے مرقد کے پیچھے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔''

''ان پر سناٹا بڑھنے لگا ہے۔'' روتھ ایمان علی کی مسکراہٹ سے زچ ہونے لگی تھی۔ ''اب وہاں زیادہ تر باہر سے آئے ہوئے ٹورسٹ نظر آتے ہیں۔ اور یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ تمھیں اس کے دوررس اثرات کا اندازہ نہیں ہے۔ کل ہم سب روئیں گے۔ ماؤ کا ثقافتی انقلاب پھر زور پکڑ رہا ہے۔ یہ نظریہ نہیں رہا' مذہب بن گیا ہے۔ ہم نے ابھی ابھی ایک بنیاد پرستی کے خلاف بڑی جنگ لڑی ہے۔ اس بنیاد پرستی کو کسی مضبوط معیشت کی مدد حاصل نہیں تھی۔ ماؤازم کی بنیاد پر قائم ہونے والی انتہا پسندی کا مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔ ہم سب خطرے میں ہیں۔''

''ہم سب کیوں؟''

''چین نے تجارت کا ہی نہیں' طاقت کا توازن بھی بگاڑ دیا ہے۔ پہلے اس نے تمھارے ایٹمی اور میزائل پروگرام کو......''

''تمھیں پتا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ ہم نے بار بار......''

''تمھیں بھی پتا ہے اور مجھے بھی' لیکن مان لیتی ہوں۔'' روتھ نے ہاتھ اٹھا کر ایمان علی کی بات کاٹ دی۔ ''چین نے اب شمالی کوریا کو علاقے میں ہوّا بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ شمالی کوریا اپنے ایٹمی اور میزائل پروگرام کی اعلانیہ تشہیر کر رہا ہے۔ اس کے پاس روس سے بڑی فوج ہے جو دن رات پریڈ کر کے اپنی طاقت کا رعب ڈال رہی ہے۔ ہمیں معلوم ہے چین شمالی کوریا کے ذریعے جاپان اور جنوبی کوریا کو بلیک میل کر رہا ہے۔ وہ ساتھ ہی ہمیں یقین دلا رہا ہے کہ شمالی کوریا کو سمجھائے گا۔ مجرم بھی خود ہے اور منصف بھی خود! ہم اس تماشے کو سمجھتے ہیں' لیکن ابھی کچھ کر نہیں سکتے۔''

''اگر یہ صحیح ہے تو چین نے یہ تماشا کرنا آپ ہی سے سیکھا ہے۔ جب آپ اسرائیل

اور فلسطین کے درمیان مصالحت اور امن معاہدہ کرانے بیٹھتے ہیں تو اس سنگین مذاق پر مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔''

''ہم اگر مصالحت کرانے والے نہ بنتے تو آدھا مڈل ایسٹ اسرائیل کے قبضے میں ہوتا اور سارے فلسطین پر یہودی بستیاں تعمیر ہو چکی ہوتیں۔''

''روتھ! تمھاری خارجہ پالیسی میں بلوغت کب آئے گی؟'' ایمان علی نے اس کا جواب نظر انداز کر کے کہا۔ ''تمھاری خارجہ پالیسی نے ہر دور میں خود اپنے اعمال کے نتائج بھگتے ہیں۔ ایران میں جمہوریت پسند مصدق کو مارا' پھر قوم پرست شاہ کو کمزور کیا۔ جو نتیجہ نکلا اسے اب بدی کا ہرکارہ قرار دیتے ہو۔ ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے فوجی آمروں کی پرورش کی' پھر انھیں کے خلاف انسانی حقوق اور جمہوری قدروں کی بحالی کا شور مچاتے رہے۔ افغانستان میں جہاد کا جن بوتل سے نکلا' اب اس کے ہاتھوں زخمی ہو کر دوستوں کو دشمن بنا رہے ہو۔ چین میں میکنڈ انلڈ کھلا تو وہ آزاد دنیا کا حصہ بن گیا۔ اب وہی اچانک آزاد دنیا کا دشمن نظر آنے لگا ہے۔''

روتھ کینڈل کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا' لیکن ایمان علی نے اپنی بات جاری رکھی۔

''برا مت مانو۔ تمھاری خارجہ پالیسی کے آرکیٹکٹ' ریگن اور بش جونیئر جیسے کوتاہ نظر لیڈروں کے کندھوں پر چڑھ کر مہم جوئی کرتے رہے ہیں۔ کلنٹن خارجہ پالیسی کے معاملے میں دور تک دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اس نے چند سال یورپ میں گزارے تھے اور وہاں کے دانش وروں کی نئی نسل سے مکالمہ کر کے آیا تھا۔ یورپ تمھارے مقابلے میں زیادہ بالغ نظر ہے۔ تمھارے پالیسی سازوں کو ان سے تربیت لینا چاہیے۔''

''یہ انگلیاں اٹھانے اور غلطیوں کا مرثیہ پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔'' روتھ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''تمھاری خارجہ پالیسی نے تو صرف ایک رات میں اباؤٹ ٹرن لیا تھا۔ افغانستان کو یاد کرو۔ بوتل سے نکلا ہوا جن تمھارا تھا۔ پھر اس کے جنازے کو کندھا بھی تم

نے دیا۔ اباؤٹ ٹرن سے پہلے اور بعد کی پالیسیوں کے ذمے دار دونوں ایک تھے۔ تم نے کسی کو سولی نہیں چڑھایا نہ انھیں تربیت حاصل کرنے ملک سے باہر بھیجا۔ وہ گلے میں پھولوں کے ہار پہنے گھومتے رہے۔ ہر قوم کی تاریخ ایسی غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن غلطیوں کا اعتراف اور ان کا تجزیہ ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے چین کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے آپ لوگ پرانی غلطیاں نہیں دہرائیں گے۔''

''فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب عمل کا وقت ہے، پہیہ رول کرنا ہے۔'' روتھ کچھ دیر ایمان علی کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔ فیصلہ کن بات کہنے سے پہلے شاید الفاظ تول رہی تھی۔ ''یہ بات میرے ایجنڈے میں شامل نہیں ہے، میرا تبادلہ ہو چکا ہے۔ نئے سفیر نیل میکفارلین اسی کام کے لیے یہاں آرہے ہیں۔ دفتر خارجہ والے مجھے سافٹ سمجھتے ہیں، میں محبت کے زمانے کی سفیر ہوں۔ اس گفتگو سے میں صرف آپ کی اور اپنی حکومت کا وقت بچانے کی کوشش کر رہی ہوں تا کہ آپ نیل کے آنے تک اپنے ساتھیوں کو بتا اور سمجھا سکیں کہ ہمیں اپنے ایک دوست سے کیا مدد چاہیے۔''

''ہمیں اپنی دوستی کی کیا قیمت دینی ہے؟'' ایمان علی کے چہرے سے مسکراہٹ بالکل غائب ہو گئی تھی۔

''ہم چین پر اپنی گرفت مضبوط اور اس کی نگرانی سخت کرنا چاہتے ہیں۔ چین کو مانیٹر کرنے کی مرکزی پوسٹ آپ کے ملک میں قائم ہوگی۔''

''یعنی آپ سے دوستی نباہنے کے لیے ہمیں اپنے دوسرے دوست کی کمر میں چھرا گھونپنا ہوگا۔'' ایمان علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''یہ سوچنے کا منفی انداز ہے۔ اسے ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک مشترکہ دوست کو آؤٹ آف لائن جانے سے روکنے میں ہماری مدد کریں گے۔''

''آپ نے ہندوستان سے کیوں نہیں کہا۔ وہ کسی جھجک کے بغیر آپ کی خدمت انجام

دے سکتا ہے۔''

''پھر وہی ہندوستان' تم لوگ اپنی آنکھوں سے ہندوستان کی پٹی کیوں نہیں اتارتے؟ اس خطے میں ہمارا روایتی دوست اور حلیف ہندوستان نہیں' پاکستان ہے۔ ہمارے کارپوریٹ سیکٹر نے بھارت کے حق میں فیصلہ دیا تھا' اس وقت بھی ہم نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ آپ ہمارے اتحادی تھے' ہیں اور رہیں گے۔''

''مسز کینڈل! مجھے یقین ہے مستقبل میں آپ کا قیام جہاں بھی ہوگا خوش گوار ہوگا۔'' ایمان علی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ دوستی کا نقاب اتر چکا تھا' یہ رسمیات نباہنے کا وقت تھا۔ آپ نے نیا پاکستان بنانے میں جو مدد کی ہے اس پر میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں۔ آپ چاہیں تو اس ملاقات کو رسمی بنا کر رپورٹ بھی کر سکتی ہیں۔ اس طرح آپ کی حکومت اور سفیر میکفارلین کا مزید وقت بچے گا۔ آپ انھیں بتا سکتی ہیں جب تک میں برسر اقتدار ہوں' اس زمین سے چین کے خلاف کبھی کوئی کارروائی یا جاسوسی نہیں ہو سکے گی۔''

''ایمان! آپ سمجھ نہیں رہے۔'' امریکی سفیر نے بھی کھڑے ہوتے اور اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے بہت نرم لہجے میں کہا۔'' فیصلہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ آپ کے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔''

○ ○ ○

ایمان علی نے کابینہ کو اعتماد میں لیا تھا اور نئے امریکی سفیر کا ایجنڈا بتایا تھا۔ سب کلی طور پر متفق تھے کہ پاکستان چین کے خلاف امریکی آلہ کار نہیں بنے گا۔ اس پر اختلاف تھا کہ چین کو بتایا جائے یا نہیں۔

''بتانا ضروری ہے۔'' جنرل منصف نے کہا تھا۔ ''ہمارا دفاع چین دوستی اور ہماری ایٹمی طاقت کے دوستونوں پر کھڑا ہے۔ ہمارا میزائل پروگرام اب بھی ڈویلپمنٹ اسٹیج میں

ہے۔ چین نے امریکہ کے سخت دباؤ کے باوجود اپنی دوستی نباہی ہے۔ ہمیں چین کو ضرور خبردار کرنا چاہیے۔''

''ہم پر امریکہ کی سخت نگاہ ہوگی۔'' کرم قریشی نے کہا تھا۔ ''اس وقت چین سے کوئی بھی اعلیٰ سطحی رابطہ امریکہ کو خبردار کر دے گا۔ ہمارے دفاع کا ایک ستون امریکہ بھی ہے۔ ہمارا ملٹری ہارڈ ویئر اور اسپیئرز اب بھی وہیں سے آتے ہیں۔ ہم اس وقت امریکہ کی مخالفت مول نہیں لے سکتے۔ کشمیر کا معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو پھر......''

''امریکہ ہمارے دفاع کا ستون کیا چھوٹا سا کھمبا بھی نہیں ہے۔'' وزیر داخلہ جنرل سعید ملک نے کرم قریشی کی بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ ہمیں روایتی جنگ کے ہتھیار بیچنا پہلے ہی بند کر چکا ہے۔ بھارت سے جنگ کے دوران وہ دوسری دفاعی سپلائز پر بھی پابندی لگا دے گا۔ ہم اس کا مطالبہ مان کر چین کے خلاف امریکی اڈہ قائم کرنے کی اجازت دیں تب بھی وہ بھارت سے ہونے والی جنگ میں ہماری مدد نہیں کرے گا۔ جنگ بند کرانے کی کوشش کرے گا یا غیر جانبدار ہو جائے گا۔ وہ پہلے بھی یہ کر چکا ہے۔''

''ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔'' وزیر خزانہ حبیب الحق کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''چین کو ضرور بتانا چاہیے' لیکن خاموشی سے اور بیک ڈور چینل استعمال کر کے۔ اگلے مہینے واشنگٹن میں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی میٹنگز ہیں۔ ہمارے کئی پروجیکٹ ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ کم از کم قرضوں کی ری شیڈولنگ تک ہمیں امریکہ کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔''

''آغا صاحب! یہ آپ کے شعبے کا معاملہ ہے۔ آپ اس طرح خاموش بیٹھے ہیں جیسے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ایمان علی نے وزیر خارجہ آغا شاہ رخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''صاحبو! بات کچھ جم نہیں رہی۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے۔'' سب کو پتا تھا آغا شاہ رخ کم بولتا تھا اور صرف اسی وقت بولتا تھا جب بات کی گہرائی کو پہنچ جاتا۔

''آغا صاحب! بہت صاف صاف بات ہے۔'' ایمان علی کے لہجے میں ہلکی سی ترشی

لیکن احترام بھی تھا۔ ''امریکہ چین کی قوت سے خائف ہو کر اس کے گرد گھیرا تنگ کرنا اور چین کی نگرانی کے لیے ہماری زمین پر اڈہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ طے ہے کہ ہم اسے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ہم چین کو خبردار کریں یا امریکہ کی ناراضی کے ڈر سے خاموش بیٹھے رہیں۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' آغا نے بہت رک رک کر کہا۔ اس کی اردو کمزور تھی۔ ''گتھی یہ نہیں ہے کہ چین کو بولنا ہے کہ نہیں بولنا۔''

''آپ کا خیال ہے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے؟'' ایمان علی نے حیرت سے کہا۔

''امریکہ کو معلوم ہے کہ ہم چین کو ضرور بولے گا۔ اس کو پروا نہیں۔ پروا ہوتا تو وہ ہم کو ابھی نہیں بولتا۔ چین کو بھی پروا نہیں کہ ہم نے اس کو بولا کہ نہیں بولا۔ چین کو سب معلوم دنیا میں کیا ہوتا۔ امریکہ کیا سوچتا۔''

''آغا صاحب! انگریزی بولیے' آپ کی اردو سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' ایمان علی نے کہا تو سب ہنس پڑے' لیکن پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ سب وزیر خارجہ کی دل سے عزت اور اس کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ آغا بھی مسکرا دیا۔

''یہ ایک اسموک اسکرین ہے۔ حقیقت اس کے پیچھے کہیں چھپی ہے۔'' آغا شاہ رخ نے شستہ انگریزی میں اپنے ذہن کی گرہیں کھولنا شروع کیں۔'' ہو سکتا ہے امریکہ چین کو نیا ہدف بنانا چاہتا ہو۔ یہ بھی غلط نہیں کہ امریکہ چین کی اقتصادی اور دفاعی دونوں طاقتوں سے خوف زدہ ہے۔ امریکہ نے مڈل ایسٹ پر اپنا پنجہ کس لیا ہے۔ اپنے خلاف عالمی دہشت کا جال توڑ دیا ہے۔ افغانستان وہ پہلے ہی فتح کر چکا ہے۔ سنٹرل ایشیا میں تیل کے ذخائر تک اس کی رسائی ہے۔ روس تابع داری پر مجبور ہے۔ صرف چین اطاعت گزار نہیں ہے' لیکن چین کے تجارتی مفادات دنیا بھر سے جڑے ہیں۔ وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مارے گا۔ امریکہ بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔''

''امریکہ ہی نہیں سب جانتے ہیں۔'' وزیر خزانہ حبیب الحق نے آغا شاہ رخ کے تجزیے کو درمیان میں روکتے ہوئے کہا۔ ''چین کی ترقی بے مثال ہے' لیکن وہاں سب کچھ اچھا نہیں ہے۔ اس کی معیشت میں کئی بڑے بڑے سوراخ ہیں۔ وہ اپنے وسائل دریاؤں کے رخ موڑنے اور بے فائدہ کہے جانے والے بڑے منصوبوں پر ضائع کر رہا ہے۔ اشتراکی معاشرہ ہے' لیکن غریب اور امیر کے درمیان خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ دیہی علاقوں میں بے چینی ہے۔ نوکر شاہی کی بدعنوانیاں اسی طرح جاری رہیں تو معیشت کو اندر سے کھوکھلا کر سکتی ہیں۔ اس کی معیشت اس وقت کتنی بھی مستحکم اور بڑی سہی' وہ عالمی طاقت بننے کی منزل سے بہت دور ہے۔ یہ تجزیے خود امریکیوں کے ہیں۔ میں آغا صاحب سے متفق ہوں کہ چین دنیا کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے نہ مستقبل قریب میں اس کا امکان ہے۔ ہاں' یہ ممکن ہے کہ ہالی ووڈ کی فلموں کے پلاٹ کی طرح وہاں جنونی جنرلوں کا کوئی ٹولہ دنیا پر حکم رانی کا خواب دیکھ رہا ہو۔''

''ایسی کوئی شہادت نہیں ہے۔'' آغا شاہ رخ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''چین کی قیادت میں کوئی بڑی نظریاتی یا انقلابی تبدیلی نہیں آئی۔ ایسی کوئی شہادت بھی نہیں ہے کہ چین کو اچانک توسیع پسندی یا اپنے عقیدے اور نظریے کو برآمد کرنے کا سودا سما گیا ہو۔ ماؤ سے محبت کا اظہار ایک فطری قومی جذبہ ہے' کوئی چیلنج یا دھمکی نہیں ہے۔''

''امریکہ شاید پیش بندی کر رہا ہے' احتیاطی تدبیر۔ ممکن ہے وہ چین کے مستقبل کا ایجنڈا جانتا ہو' اس کی ایجنسیوں کے پاس خفیہ اطلاعات ہوں۔'' کرم قریشی نے خیال ظاہر کیا۔

''اگر امریکہ کے پاس ایسی خفیہ شہادتیں ہیں کہ چین دنیا کو سرد جنگ کے دور میں واپس لے جا رہا ہے تو یہ خطرہ پاکستان میں مانیٹرنگ پوسٹ قائم کرنے سے دور نہیں ہوگا۔ امریکہ کو مانیٹرنگ کے لیے پاکستان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ محض اسموک اسکرین ہے۔'' آغا شاہ رخ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''امریکہ کو مانیٹرنگ پوسٹ کی ضرورت ہی نہیں

ہے۔ اس کام کے لیے فضا میں اس کے سیٹلائٹ اور سمندروں میں اعلیٰ ترین مانیٹرنگ ٹیکنالوجی سے مسلح بحری جہاز گھوم رہے ہیں۔ جدید ترین آواکس مانیٹرنگ کا کام کر رہے ہیں۔ سعودی عرب کے ایک صحرا میں ایک مکمل اطلاعاتی اسٹیشن قائم ہے جو اطلاعاتی ڈیٹا پروسیس کر کے منٹوں میں پینٹا گان بھیج دیتا ہے۔ پھر بھی امریکہ کو پوسٹ چاہیے تو اس کے لیے تائیوان میں سرخ قالین بچھا ہوا ہے۔ تائیوان پر حملے کا ڈر ہے تو کوریا ہے جہاں امریکی فوجیں آج بھی موجود ہیں۔ جنوب مشرق میں لاؤس ہے۔ جنوب مغرب میں ہمالیہ کھڑا ہے' وہ نیپال کے ذریعے خاموشی سے کسی بھی چوٹی پر راڈار لے کر بیٹھ سکتا ہے۔ بھارت امریکہ کو کشمیر کی چوٹی پر بٹھا کر ایک تیر سے بیک وقت پاکستان اور چین کا شکار کر سکتا ہے۔ شمال مغرب میں سنٹرل ایشیا کے ملک امریکی اشارے پر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ چین بھی اچھی طرح جانتا ہے کتنی آنکھیں اس پر نگراں ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے روتھ مجھ سے جھوٹ بول رہی تھی۔'' ایمان علی نے اپنے وزیر خارجہ کو تیز نظروں سے دیکھا۔

''بالکل! آغا شاہ رخ نے پورے یقین سے کہا۔'' وہ آپ کے پاس اسموکنگ گن لے کر آئی تھی اور غبار چھوڑ کر چلی گئی۔''

''کیوں؟''

''روتھ بھی جانتی ہے آپ اس کرسی پر اقتدار کی محبت میں نہیں بیٹھے اور محض اقتدار بچانے کے لیے ان کا دباؤ قبول نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود وہ آپ سے ایسا مطالبہ کر رہی ہے جو وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ آپ نہیں مانیں گے۔''

''وہ کہہ کر گئی ہے کہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ آغا صاحب! یہ محض دھمکی نہیں ہے۔''

''مجھے یقین ہے فیصلہ یہ نہیں ہوا ہوگا کہ پاکستان میں چین کی مانیٹرنگ کے لیے اڈہ بنے گا۔ پاکستان وہ آخری ملک ہوگا جس پر امریکہ چین کی نگرانی کے لیے اعتماد کر سکے گا۔ مجھے

یقین ہے امریکی سفیر کی مراد یہ تھی کہ ہماری حکومت تبدیل کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ کس نے کیا ہے اور کیوں؟ بقول مسٹر قریشی پیٹرن بالکل واضح ہے۔ سردار کی مہم جس طرح چلائی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے کسی طاقت کا ہاتھ ہے۔ کس طاقت کا؟ اس کا جواب روتھ کینڈل دے گئی ہے۔ امریکہ آپ سے ایک ایسا مطالبہ کرے گا جسے آپ قبول نہیں کریں گے۔ امریکہ کو ہم سے ناراض ہونے کا جواز مل جائے گا۔''

''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کوئی انتخابات سے پہلے ہماری حکومت بدلنا چاہتا ہے۔'' کرم قریشی نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں تھا کہ کون؟۔ آپ نے گتھی سلجھا دی ہے۔''

''گتھی ابھی نہیں سلجھی۔'' آغا شاہ رخ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''گتھی یہ ہے کہ امریکہ ہماری حکومت کیوں گرانا چاہتا ہے۔ دور دور تک کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہم نے یہ تین سال اپنے اندرونی معاملات سنوارنے میں گزارے ہیں۔ ہم نے کسی بڑی طاقت کی ناراضی مول نہیں لی اور اپنے خارجہ تعلقات کو اپنے ترقیاتی کاموں میں مدد لینے کے لیے استعمال کیا ہے۔ علاقے کی صورت حال بھی نہیں بدلی۔ افغانستان کی گرد تھمی ہوئی ہے۔ ہم نے افغانستان میں امریکہ کی ہر وہ مدد کی جو اس نے مانگی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ کیوں؟''

سب خاموشی سے آغا شاہ رخ کی طرف دیکھتے رہے جیسے یہ گتھی بھی وہی سلجھائے گا۔

''امریکہ اب ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کی طرح حکومتوں کے تختے الٹنے میں ملوث نہیں ہوتا۔ اس میں بدنامی بہت ہے اور یہ آسان کام بھی نہیں رہا۔'' آغا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا تو اس کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔ ''ان حکومتوں کو بدلنا آسان نہیں ہوا جہاں بدترین اور غیر مقبول آمریتیں تھیں۔ وہ پاکستان میں ایک انتہائی مقبول حکومت کا تختہ الٹنے کی دردسری کیوں مول لے رہا ہے؟ وہ اتنا بڑا خطرہ کسی بہت بڑے گیم پلان کے لیے ہی لے سکتا ہے۔ گتھی یہی ہے کہ بظاہر ایسا کوئی گیم پلان نظر نہیں آ رہا۔''

''کوئی تھیوری؟'' صدر ایمان علی نے وزیر خارجہ آغا شاہ رخ کو دیکھا۔ اس نے نفی

میں سر ہلا دیا تو باری باری کابینہ کے باقی ارکان کی طرف دیکھا۔ ایک ایک کر کے آوازیں اٹھنا شروع ہوئیں۔

''امریکہ کو معلوم ہے ہمارے پاس تیل کے بڑے ذخائر ہیں۔ اسے شاید پتا ہے کہ کہاں۔ وہ انھیں نکالنے سے پہلے ایک ایسی حکومت چاہتا ہو جو اس کی مکمل تابعدار ہو اور وہ تیل کا زیادہ سے زیادہ حصہ وصول کر سکے۔''

''وسطی ایشیا اور افغانستان سے پاکستانی سمندروں تک امریکہ کو ایسی راہ داری چاہیے جس پر اسے مکمل اختیار ہو۔''

''امریکہ ہمارے ایٹمی پروگرام کو اپنا تابع رکھنے کے لیے ہمارے سر پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ اسے ہمارے خود مختار حکم رانوں سے ڈر لگتا ہے۔ اسے سردار جیسا حکم کا غلام چاہیے۔''

''امریکہ نے بھات سے سودی بازی کر لی ہے اور پاکستان میں ایسی حکومت چاہتا ہے جو کشمیر کی کنٹرول لائن کو سرحد مان کر بھارت کے زیرِ نگیں رہنا قبول کر لے۔''

سب اپنی اپنی تھیوریاں دے چکے تو ان پر بحث شروع ہو گئی۔ ایمان علی اور آغا شاہ رخ خاموشی سے سن رہے تھے۔

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' ایمان علی نے بحث ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''آغا صاحب آخری لفظ۔ آپ کی کیا تھوری ہے؟''

''ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی ایک یا سب تھیوریاں صحیح یا سب غلط ہوں۔'' وزیرِ خارجہ نے بہت سوچنے کے بعد کہا۔ ''لیکن ہمارے پاس امکانات پر کام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ حقائق تلاش کرنے ضروری ہیں۔ ٹھوس حقائق۔ ہمیں انٹیلی جنس کے ذرائع استعمال کرنا ہوں گے۔ کوئی Deep throat کھنگالنا' کوئی اطلاع کھوجنا اور کوئی سراڈھونڈنا ہو گا۔ ایجنسیز کو پوری طرح الرٹ کرنے کی ضرورت ہے۔''

''نو آئی ایس آئی' نو ایم آئی اینڈ نو آفیشل چینل'' ایمان علی نے سختی کے ساتھ کہا۔

''امریکہ ملوث ہے تو پھر ہمارے اپنے ادارے ڈس انفارمیشن کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔''

''ہماری حکومت جانے کے صرف دو طریقے ہیں۔'' کرم قریشی نے کہا۔ ''ایک تو یہ کہ ہم خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماریں اور حکومت چھوڑ دیں اور دوسرا یہ کہ فوج ہمارا تختہ الٹ دے۔''

''اور سردار؟'' حبیب الحق نے پوچھا۔ وہ سیاست دان نہیں تھا اور سیاسی داؤ پیچ سے ناواقف تھا۔

''سردار محض ونڈو ڈریسنگ ہے۔ ہمیں الجھائے رکھنے کی کوشش (Decoy)۔'' کرم قریشی نے کندھے جھٹک کر کہا۔ ''فوج تختہ الٹنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر کسی نہ کسی کٹھ پتلی کو کھڑا کر کے نچانا شروع کرتی ہے' ایک متبادل قیادت بنانے کی تیاری' چہرے پر لگانے کے لیے ایک سیاسی نقاب' یہ پرانی کہانی ہے۔ اس وقت اہم سوال یہ ہے کہ کیا جنرل اکبر واقعی پر تول رہا ہے؟''

''جنرل منصف! جی ایچ کیو کو آپ Assess کیجیے۔ جنرل اکبر اور کور کمانڈروں کی موومنٹس پر نظر رکھ کر اندازہ لگایئے کہ ان کے کیا عزائم ہیں۔'' ایمان علی نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ''آغا صاحب! آپ سفارتی حلقوں کو کریدیے۔ چینی سفیر کو خاموشی سے بریف بنا کر بھیجئے اور ان کی رائے پوچھیے۔ ان کے انٹیلی جنس ذرائع زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ مسٹر قریشی اور جنرل ملک آپ بھی پرانے ذرائع آزمایئے۔ مسز چنائے شیخ علی کے ساتھ امریکہ میں ہیں' انھیں بریف کر دیجیے۔ وہ پاکستانی وزیر کی حیثیت سے نہیں' ایک عرب شیخ کی بیوی کی حیثیت سے گئی ہیں۔ شاید کچھ سن گن لے سکیں۔ نیا امریکی سفیر اگلے ہفتے اپنا عہدہ سنبھال لے تو دیکھیں گے وہ اپنے تھیلے سے کیسی بلی نکالتا ہے۔ حق صاحب بھی واشنگٹن سے ہو آئیں تو ہم آئی ایم ایف کے رویے کا اندازہ بھی لگا سکیں گے۔ ہمیں ہر صورت میں معلوم ہونا چاہیے کہ امریکہ کا گیم پلان کیا ہے۔ میں بے خبری میں مارا جانا نہیں چاہتا۔''

○ ○ ○

نئے امریکی سفیر نیل میکفارلین کے رویّے نے آغا شاہ رخ کے تجزیے کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ بازومروڑنے آیا تھا۔ اس کی یہی شہرت تھی۔ ایمان علی نے اس کا بایوڈیٹا بہت غور سے پڑھا تھا۔ میکفارلین نے اپنے سفارتی کیریئر کی ابتدا امریکہ کے ایرانی سفارت خانے میں یرغمال بن کر کی تھی۔ اس نے دن رات شیطانِ اکبر کے نعرے سنے تھے جنھوں نے اس کی نفسیات پر ان مٹ نشان چھوڑے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ ترقی کر کے سفیر کے عہدے تک پہنچا تھا۔ جہاں بھی تقرری ہوئی اس نے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ وہ کبھی سفارتی آداب خاطر میں نہیں لایا نہ بدتمیزی کرنے سے گریز کیا۔ ایمان علی کو اس کا اندازہ پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا تھا جب وہ سفارتی اسناد پیش کرنے آیا تھا۔ یہ ایک رسمی تقریب تھی، لیکن میکفارلین کھلے گلے کی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ٹائی لگانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایمان علی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ لیکن جب آج وہ ''ون ٹو ون'' ملاقات کی درخواست کر کے ملنے آیا تو ایمان علی برداشت نہیں کر سکا۔

نیل میکفارلین کی انا ہی نہیں جسامت بھی ہاتھی جیسی تھی۔ کوتاہ گردن اور سر پر کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال۔ وہ کسی سفارت کار سے زیادہ نیویارک کے کسی نائٹ کلب کے باہر کھڑا ہوا باؤنسر لگتا تھا۔ ایمان علی سے ملاقات کا وقت نو بجے کا تھا لیکن وہ پندرہ منٹ دیر سے آیا۔ کرنل افتخار امریکی سفیر کو ایمان علی کے دفتر میں لے کر آیا تھا۔ ایمان علی نے اسے دیکھ کر کھڑے ہونے، مصافحہ کرنے یا معزز مہمانوں سے گفتگو کے لیے مخصوص صوفے کی طرف لے جانے کی کوشش نہیں کی، صرف ہاتھ سے میز کے دوسری طرف رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور واپس جاتے ہوئے کرنل افتخار کو روک لیا۔

''کرنل! سفیر محترم شاید لیٹ نائٹ پارٹی میں مصروف تھے اس لیے دیر سے سو کر اٹھے ہوں گے۔ انھوں نے شیو نہیں کیا، کپڑے نہیں بدلے، پھر بھی دیر سے پہنچے ہیں۔ مجھے یقین ہے انھوں نے صبح کی پہلی کافی بھی نہیں پی ہو گی۔ ان کے لیے اسٹرانگ سی کافی بھجوایئے۔ مسٹر

میکفارلین! مجھے یقین ہے آپ کو مری بریوری کی بیئر پسند آ رہی ہوگی۔''

''سر! کافی کیسی لیں گے۔'' کرنل افتخار نے امریکی سفیر سے بہت ادب کے ساتھ پوچھا' لیکن اس نے نہ تو جواب دیا نہ کرنل افتخار کو مڑ کر دیکھا۔ اس کی نگاہیں ایمان علی کے چہرے پر جمی تھیں جس پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''مسٹر علی!'' میکفارلین کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔ اس نے صدر محترم نہیں کہا تھا' ایمان علی کو نام سے مخاطب کیا تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم مری بریوری کی بیئر کیسی ہوتی ہے۔ مجھے اس کی بوتل دیکھ کر مٹی کے تیل کی بو آتی ہے۔ مجھے صرف بڈوائزر پسند ہے۔ وہ بھی چھٹی کے دن اور دوپہر کے وقت۔ میری پارٹی میں اعلیٰ ترین اسکاچ یا فرنچ شیمپین پیش کی جاتی ہے۔ میں رات کو جلدی سونے کا عادی ہوں اور ڈنر کے بعد صرف کونیک کا ایک شاٹ لیتا ہوں۔''

''یقیناً یقیناً۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ امریکہ جیسی بڑی پیداواری طاقت ابھی تک شیمپین اور کونیک کے لیے فرانس کی اور اچھی وہسکی کے لیے اسکاٹ لینڈ کی محتاج ہے۔ آپ کو اپنی جیک ڈرینیل سے مٹی کے تیل کی بو نہیں آتی؟''

''جناب صدر! میں نے آپ سے اس ملاقات کی درخواست شراب کے محاسن پر گفتگو کے لیے نہیں کی تھی۔'' امریکی سفیر نے پہلی بار کرنل افتخار کو نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ جانے لگا لیکن ایمان علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک لیا۔

''میں آپ سے آنے والی نئی ہالی ووڈ فلموں کے بارے میں بھی گفتگو کر سکتا ہوں۔'' ایمان علی نے چہرے سے مسکراہٹ کا نقاب اتار دیا۔ ''آپ جس غیر رسمی انداز سے آئے ہیں اس کے بعد آپ سے صرف غیر رسمی گفتگو ہو سکتی ہے۔ آپ کے لیے کافی کی پیشکش ابھی باقی ہے۔''

''آپ کے شہر کا موسم ایسا ہے کہ میں کوٹ پہنتا ہوں تو جسم میں چیونٹیاں کاٹنے لگتی

ہیں۔ یہی حال کافی پی کر ہوتا ہے۔''

''ہماری مسجدوں میں آج کل بارشوں کے لیے دعائیں ہو رہی ہیں۔ میں اسلام آباد کے پیش امام سے درخواست کروں گا کہ وہ موسم اچھا ہونے کی دعا کرائیں۔ کم از کم اس دن کے لیے جب آپ اس ملک کے صدر سے ملنے آ رہے ہوں۔''

''مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ غیر رسمی انداز اور لباس پسند کرتے ہیں۔'' امریکی سفیر غلط نہیں تھا۔ صدر بننے سے پہلے ایمان علی زیادہ تر جینز اور ٹی شرٹ میں دیکھا جاتا تھا' لیکن صدر بننے کے بعد اس نے یہ لباس کبھی نہیں پہنا۔ کیسا ہی موسم ہوا سے کوٹ پہنے بغیر بھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ ''میرا غیر رسمی انداز اچھا نہیں لگا تو میں معذرت چاہتا ہوں۔'' نیل میکفارلین نے کندھے اچکا کر کہا۔

''میرے ملک کا سفیر آپ کے صدر سے سلیپنگ سوٹ پہن کر ملنے جائے تو آپ کو پسند نہیں آئے گا۔'' ایمان علی نے مسکراہٹ پھر سجالی۔

''میرے ملک کے صدر کے پاس سفیروں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔ یہ کام اسسٹنٹ انڈر سیکرٹری کی سطح کے لوگ کرتے ہیں' جنھیں پروا نہیں ہوتی کہ کون ان سے کیا پہن کر ملے گا۔ شارٹس یا شلوار۔''

''ہماری وزارت خارجہ میں آدھے درجن ڈپٹی سیکرٹریز ہیں۔'' ایمان علی نے کھڑے ہو کر اور رخصتی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ آئندہ آپ کی اپائنٹمنٹ بھی آپ ہی کی سطح کے کسی افسر سے ہو۔ وہ آپ سے ملنے آپ کی نیوڈ کالونی میں بھی پہنچ جائیں گے۔''

''میری سطح......'' امریکی سفیر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید کوئی سخت جملہ تھا' لیکن پھر شاید ڈر گیا کہ ایمان علی جواب میں زیادہ سخت بات کہے گا۔ سفیر کو اپنی اہانت پسند نہیں تھی۔

''آئی ایم ساری مسٹر پریذیڈنٹ!'' اس نے ایمان علی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے ایک موقع اور دیجیے۔ میرا اپائنمنٹ دوبارہ طے کر دیجیے۔ میں یقین دلاتا ہوں آئندہ آپ کا پروٹوکول نہیں ٹوٹے گا۔''

''مسٹر ایمبیسیڈر! میں آپ کے ملک کا احترام صرف اس لیے نہیں کرتا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ہم آپ کی قدر اس لیے کرتے ہیں کہ آپ ہمارے سب سے پرانے اور سب سے اہم دوست ہیں۔ آپ بتائیے کب آسکتے ہیں۔ آپ کے لیے باقی تمام اپائنمنٹ ایڈجسٹ کیے جاسکتے ہیں۔''

دونوں نے صلح کے پرچم لہرا دیے تھے۔

''میں ایک گھنٹے میں واپس آسکتا ہوں، اگر آپ مجھے Fit in کر سکیں۔''

''ساڑھے دس بجے؟''

''ساڑھے دس بجے!''

امریکی سفیر تیزی سے ایمان علی کے دفتر سے نکل گیا۔ اس نے کرنل افتخار کا انتظار نہیں کیا تھا جو اس کے پیچھے پیچھے بھاگا تھا۔

''صدر محترم! آپ نے ہماری گردن اونچی کر دی۔'' کرنل افتخار نے واپس آ کر ایمان علی سے کہا جو اس وقت لفافے کھولنے والی چھری کو میز پر بجاتا ہوا کسی گہری سوچ میں تھا۔

''اپنی گردنیں ہم نے خود نیچی کی ہیں۔'' ایمان علی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ہمارے حکمران انھیں آقا اور ان کے سفیروں کو سر کہتے اور بادشاہ گر سمجھتے رہے ہیں۔ ان کا رویہ یہی ہوگا۔''

''اب یہ رویہ انھیں تبدیل کرنا پڑے گا۔''

''یہ بہت مشکل لڑائی ہے۔ اپنا اقتدار اعلیٰ قائم رکھنا اور ان سے اپنے منصب کی عزت کرانا آسان نہیں ہے۔'' ایمان علی نے اپنی توجہ میز پر رکھی ہوئی فائلوں پر کر دی۔ کرنل افتخار کو

پتا تھا یہ ڈس مس ہونے کا اشارہ ہے۔

امریکی سفیر اپنے وقت سے ایک منٹ پہلے ایمان علی کے دفتر کے سامنے موجود تھا۔ وہ گہرے نیلے رنگ کا سوٹ، سفید بے داغ قمیص اور گہرے سرخ رنگ کی ٹائی پہنے ہوئے تھا۔ داڑھی اچھی طرح صاف کی تھی، ابھی تک آفٹر شیو کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ بال جو صبح بے ترتیبی سے کھڑے تھے، اب چمک دار ہو کر پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ ایمان علی نے دروازے پر اس کا استقبال کیا تھا اور صوفے پر اسے اپنے ساتھ لے کر بیٹھا تھا۔ ایک باوردی بیرے نے کافی پیش کی تھی۔ نیل میکفارلین سیدھا اپنے مطلب پر آیا تھا۔

''روتھ نے آپ کو بتایا ہوگا۔ ہمیں ایک نئی سرد جنگ کا خطرہ ٹالنے کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''مسز کینڈل نے آپ کو میرا جواب بھی بتا دیا ہوگا۔''

''مجھے یقین ہے چین آپ سے کہے کہ ہماری مخبری کریں تو آپ اسے منع نہیں کریں گے۔'' میکفارلین نے ہنستے ہوئے مذاق کرنے کا تاثر دیا۔ ایمان علی کی سنجیدگی اسی طرح قائم رہی۔

''مجھے یقین ہے چین اپنے کسی دوست کو ایسے امتحان میں نہیں ڈالے گا، لیکن اگر انھوں نے کبھی ایسی درخواست کی تو انھیں بھی ہمارا یہی جواب ہوگا۔''

''صدر محترم!'' امریکی سفیر نے سنجیدہ ہو کر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''خارجہ تعلقات جذبات کی نہیں قومی مفادات کی بنیاد پر پروان چڑھتے ہیں۔ اور وقت کے ساتھ ان کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ آپ کو اس کا تجربہ ہے۔ طالبان کا بت آپ نے تعمیر کیا تھا، پھر اسے توڑنے میں آپ ہی نے ہماری مدد کی تھی۔ ہم آج بھی آپ کے شکر گزار ہیں اور آپ کی دوستی اور تعاون کے اسی سلسلے کو دراز کرنا چاہتے ہیں۔''

''طالبان ہماری خارجہ لیسی کا ایک اندھا موڑ تھا۔ ہم اس کی سزا بھی بھگت چکے ہیں،

لیکن میں پیچھے کی طرف نہیں آگے کی طرف دیکھنے پر یقین رکھتا ہوں۔''

''ہم اسی لیے آپ کی قدر کرتے ہیں۔ ہم چین کے ساتھ آپ کے تعلقات کی حساس نوعیت سے آگاہ ہیں۔ ہمیں پتا ہے کہ آپ کے ملک میں قائم ہونے والی مانیٹرنگ پوسٹ چین سے چھپی نہیں رہے گی' اسی لیے ہم ایک اچھا کور فراہم کریں گے۔ یہ پوسٹ القاعدہ کے ان بھگوڑوں کو تلاش کرے گی جن کے بارے میں ہمارا خیال ہے وہ شمال کے پہاڑوں کی گپھاؤں میں چھپ گئے ہیں یا سنکیانگ کے مسلم علیحدگی پسندوں میں جا ملے ہیں۔ ہمیں یقین ہے چین کو اعتراض نہیں ہوگا اور آپ کے مفادات بھی محفوظ رہیں گے۔ صدر محترم یہ Pragmaticism کا اور اپنی بقا کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کا دور ہے۔''

''آپ اسے Pragmaticism کہہ کر اخلاقی جواز فراہم کر سکتے ہیں' لیکن میں آپ کے فلسفی پیئرس (Pierce) کا مقلد نہیں ہوں۔ نتائج حاصل کرنے کے لئے اصولوں کو روندنے کا فلسفہ ہمارے روایتی عقیدوں سے میل نہیں کھاتا۔ میں انھیں گمراہ سمجھتا ہوں جو چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر اپنے سینے پر Pragmatic ہونے کا تمغہ سجا لیتے ہیں۔ آئیڈیلزم اور عملیت پسندی کا مقابلہ میرے لیے اخلاقیات اور موقع پرستی کا تصادم ہے۔ Morality against opportunism''

''صدر محترم! میں اس وقت فلسفے کا سبق پڑھنے نہیں آیا۔'' امریکی سفیر نے چہرے سے آہستہ آہستہ سفارتی آداب کا نقاب اتارنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اب تک پہلو نہیں بدلا تھا۔ ہلکی سی جنبش بھی نہیں کی تھی۔ آنکھیں مستقل ایمان علی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

''سی ایس پیئرس صحیح ہے یا ولیم جیمز' اس پر ہم فرصت کے وقت مباحثہ کر سکتے ہیں۔ میری اس نااہلیت کو معاف کیجیے کہ مجھے لچھے دار سفارتی زبان استعمال کرنا نہیں آتی اسی لیے میں نے گفتگو کا آغاز موسم کے حال سے نہیں کیا تھا۔ میں اپنی حکومت کا یہ پیغام صاف صاف طریقے سے ایک بار پھر دہرا رہا ہوں کہ ہمیں چین کو مانیٹر کرنے کے لیے آپ کی زمین پر ایک

پوسٹ چاہیے۔''

''آپ صاف صاف سننا چاہتے ہیں تو پھر میرا غیر سفارتی انداز بھی معاف کیجیے۔ میرا جواب ہے''Over my dead body!''ایمان علی نے اپنے مزاج کی شعلگی پر قابو رکھ کر بہت سرد لہجے میں کہا۔

''جناب صدر! آپ کی جان ہمیں بہت عزیز ہے۔ آپ ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔'' میکفارلین کے چہرے پر پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ شاید اس کھیل کا مزا لے رہا تھا۔ شکار خود جال میں پھنس رہا تھا۔''آپ کے دو بہت طاقت ور حکمران اپنی جان دے چکے ہیں۔ ایک پھانسی پر چڑھ گیا اور دوسرے کے ٹکڑے ہوا میں بکھر گئے۔ ہم اس فہرست میں اضافہ دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔''

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟''

''دھمکی کمزوروں کا حربہ ہے۔ ہم دھمکی نہیں دیتے فیصلے کرتے ہیں۔ آپ ہمارا رِکارڈ جانتے ہیں۔ اب تک کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمارے فیصلوں پر عملدرآمد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکی ہے۔'' میکفارلین نے ایک لمحے کا وقفہ لیا اور پھر اپنا فخریہ لہجہ نرم کر کے کہنے لگا۔''دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی حیثیت سے ہم پر جو ذمے داریاں ہیں وہ ہم بڑے بھائی کی حیثیت سے پوری کر رہے ہیں۔ یہ دنیا ہمارے گھر کی طرح ہے جسے ہم جمہوری اقدار اور انسانی حقوق کی بنیاد پر امن و آشتی کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم آزادی کی راہ میں آنے والے خطرات سے مل جل کر نمٹنے پر یقین رکھتے ہیں۔''

ایمان علی کو معلوم تھا کہ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اپنے کسی بھی عمل کو کوئی بھی اچھی سی توجیہہ دے سکتے تھے۔ بد عملی کے چہرے پر اچھی سی خوش نما نقاب چڑھا سکتے تھے۔ غصے میں بل کھانے یا بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لیکن وہ اس وقت آغا شاہ رخ کے تجزیے کی سچائی آزما سکتا تھا۔

''آپ نے صاف صاف بات کرنے کا وعدہ کیا' لیکن کی نہیں۔'' ایمان علی نے نیل میکفارلین کے چہرے پر نظریں گاڑ کر کہا۔ ''ہمارے ماہرین کو یقین ہے کہ چین کے لیے آپ کو مانیٹرنگ پوسٹ قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ یہ کام ہماری زمین پر اڈہ بنائے بغیر بھی کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کا ہر قدم پر ساتھ دیا ہے۔ خارجہ پالیسی کے کسی موڑ پر ہمارا تصادم نہیں ہوا۔ پھر بھی آپ ہم سے ایسا مطالبہ کیوں کر رہے ہیں جو آپ جانتے ہیں کہ ہم پورا نہیں کر سکیں گے۔ کیوں؟ مطالبے کی اس اسموک اسکرین کے پیچھے اصل میں کیا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟'' امریکی سفیر کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی جیسے اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی ہو۔ ایک غیر محسوس لمحے کے لیے نگاہ کا مرکز بدلا تھا۔ دوبارہ بولا تھا تو آواز بھی اونچی تھی۔ ایمان علی کو جواب مل گیا تھا۔ اس نے میکفارلین کی ''باڈی لینگویج'' پڑھ لی تھی۔ امریکی مطالبہ محض دھوکے کی ٹٹی تھی۔ کھیل کچھ اور تھا۔ ایمان علی کو اپنے وزیر خارجہ کی بصارت پر فخر ہونے لگا۔

''آپ کے ماہرین مفروضوں پر وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' میکفارلین کہہ رہا تھا۔ اس نے کمال مہارت سے موضوع یکسر بدل دیا تھا۔ ''آپ کے ماہرین کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کی سرحدوں پر کتنا بڑا خطرہ منڈلا رہا ہے۔''

''روتھ کینڈل کے بقول ہم یہ کھیل ساٹھ برس سے کھیل رہے ہیں۔ کئی بار اس آگ میں جھلسے اور پھر نکل گئے۔ آپ فکر مت کیجیے ہم پھر نکل جائیں گے۔''

''ہماری انٹیلی جنس کا کہنا ہے کہ بھارت اس بار بہت سنجیدہ ہے۔ وہ ایک فیصلہ کن لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ یقین جانیے اس لڑائی میں چین آپ کی طرف سے لڑنے نہیں آئے گا۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ زبانی اور سفارتی مدد فراہم کرے گا اور بس! آپ کو صرف ہم بچا سکتے ہیں۔ جس طرح ۱۹۷۱ء میں ہم نے بھارت کو مغربی پاکستان میں آگے آنے سے روک دیا تھا' اس بار بھی ہم ......

''سفیر محترم! آپ نے ہم سے اپنی انٹیلی جنس کی اطلاعات شیئر کی ہیں' اس کا شکریہ'' ایمان علی نے گھڑی دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہم اپنی سرحدوں کا دفاع کرنا اور لڑنا جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے دشمن ہم سے بہت زیادہ طاقت ور ہے' لیکن اس نے حملہ کیا تو وہ ہمیں تیار پائے گا۔ ہم پوری قوت سے لڑیں گے۔ ہمارے جتنے حربے ہیں اس پر پلٹ دیں گے۔ یہ دھمکی نہیں ہے۔ وقت آیا تو آپ خود دیکھیں گے۔'' ایمان علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے یقین ہے ہمارے دوست مشکل میں ہمیشہ کی طرح ہمارا ساتھ دیں گے۔ مجھے خوشی ہو گی اگر آپ بھارت کو سمجھانے میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں۔ انھیں بتائیں کہ ہم امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ مکمل امن کے ساتھ۔''

''بہت بہت شکریہ' جناب صدر! میری حکومت پوری کوشش کرے گی کہ علاقے میں کوئی ناخوش گوار واقعہ نہ ہو۔ ہم بھارت کو سمجھائیں گے۔ مجھے یقین ہے آپ بھی ہماری درخواست پر دوبارہ غور کریں گے۔ میں آپ سے دو ہفتے بعد دوبارہ وقت لینے کی کوشش کروں گا۔ امید ہے اس وقت تک ......''

○ ○ ○
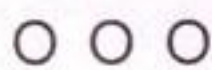
ایمان علی نے گھاس پر ٹہلنا بند کر کے جوتے پہنے اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈوبتا ہوا سورج آسمان پر لالی بکھیر گیا تھا۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی' لیکن خوش گوار لگ رہی تھی۔ ایمان علی کے پاس اتنی اچھی اس شام کو محسوس کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ذہن میں صبح امریکی سفیر سے ہونے والے مکالمے گونج رہے تھے۔ اس سے پہلے جانے والی امریکی سفیر روتھ کینڈل کی ملاقات اور پھر آغا شاہ رخ کا تجزیہ' ایمان علی دو اور دو چار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ امریکہ کو ہمیشہ سے یہ خوف تھا کہ پاک بھارت جنگ ہوئی تو ایٹمی اسلحہ استعمال ہو گا۔ پچھلے کئی موقعوں پر اس نے درمیان میں پڑ کر خطرے کو ٹالا بھی تھا۔ پھر بھی وہ ایمان علی کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کر رہا تھا

جو علاقے میں امن کی امید تھا۔ وہ سردار کی پشت پناہی کر رہا تھا جو بھارت دشمنی کی آگ بھڑکا کر ایمان علی کے خلاف مہم چلا رہا تھا اور کھلے عام ایٹمی حملہ کر کے کشمیر آزاد کرانے کی بات کر رہا تھا۔ دو اور دو چار نہیں بن پا رہے تھے۔ ایمان علی کے چہرے پر یہ سوچ کر مسکراہٹ آ گئی کہ آغا شاہ رخ اس موقع پر ہوتا تو کہتا ''صاحبو! بات کچھ جم نہیں رہی۔''

مسلح افواج کے سربراہ جنرل اکبر کا رویہ بھی ایمان علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کرم قریشی نے کہا تھا سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں، لیکن جس طرح سردار اور امریکہ کی Equation سمجھ میں نہیں آئی تھی، اسی طرح جنرل اکبر اس تکون کو مکمل کرنے والا نقطہ بنتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ امریکہ اگر ایمان علی کی جگہ سردار کو ملک پر بٹھانے کی سازش کر رہا تھا تو اس کا ایک ہی طریقہ تھا۔ فوج! لیکن ایسی کوئی شہادت اور کوئی اشارہ نہیں تھا کہ جنرل اکبر سمیت فوج کا کوئی بھی عنصر ایمان علی کی حکومت گرانا چاہتا ہے، لیکن آج جنرل اکبر آئی ایس آئی کے نئے سربراہ جنرل شہباز کے ساتھ ملنے آیا تو وہ ایسا مطالبہ کر کے گیا تھا جس کے جواب میں ایمان علی کا دل چاہتا تھا کہ میز پر گھونسہ مارے، لیکن پھر یہ سوچ کر رک گیا تھا کہ جنرل اکبر شاید وہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ملک کے دفاع کے لیے کسی بھی فوجی سربراہ کو کرنا چاہیے تھا۔

''ہم نے آپ کی ہدایت کے مطابق خود کو محدود رکھا ہے۔'' جنرل اکبر نے بریفنگ کے بعد فائل بند کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''صرف جواب دیا ہے، کہیں بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔''

''یہ نئے کشمیری مجاہد اچانک کہاں سے آ گئے جنھیں بھارت نے ہمارے اکاؤنٹ میں ڈال دیا ہے اور جنھیں سرحدی جھڑپوں کا بہانہ بنایا ہے؟'' ایمان علی نے پوچھا۔

''ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل شہباز نے کہا ''ہم جن گروپوں کو جانتے ہیں ان میں سے کسی سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ وہ شاید بچے کھچے افغان مجاہدین ہیں جو نئی پناہیں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے Logistics

کے لیے بھی ہم سے رابطہ نہیں کیا۔ شاید انھیں پتا ہے ہم ان کی مدد نہیں کریں گے۔''

''مجھے پتا ہے۔ میں نے آپ کی رپورٹ پڑھی ہے۔'' ایمان علی کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ''یہی گتھی نہیں سلجھ رہی کہ ہندوستان پر اچانک جنگ کا بھوت کیوں سوار ہوا ہے۔''

''صدر محترم! ہم وجہ جاننے کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔'' جنرل اکبر کا لہجہ بدستور سخت تھا۔ ''انٹیلی جنس نے کنفرم کیا ہے کہ بھارت اس بار بڑا حملہ کرے گا۔''

''مجھے معلوم ہے۔ امریکی سفیر نے اپنی انٹیلی جنس کے حوالے سے بھی یہی بتایا ہے۔''

ایمان علی نے اپنی آنکھوں سے تفکر یک دم جھٹک دیا اور وہ میز پر آگے کی طرف جھک آیا۔ یہ اس کا فیصلے سنانے کا انداز تھا۔ ''جنرل اکبر! آپ ساری فوجیں بھارت کی سرحد پر جمع کر دیں۔ اپنی پوری طاقت کشمیر پر لگا دیجیے۔ نیوی اور ایئر فورس کے ساتھ مل کر جنگی مشقیں شروع کیجیے۔ چھپائے بغیر پورے دھوم دھام کے ساتھ! آپ لڑنے کی تیاری کیجیے میں جنگ روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

جنرل اکبر اور جنرل شہباز کے چہروں پر اطمینان کی جھلکیاں تھیں۔ وہ پوری توجہ اور احترام کے ساتھ ایمان علی کو سن رہے تھے۔

''آغا شاہ رخ نے بھارتی حکومت سے رابطے کی اور سفارتی چینل کھولنے کی کوشش کی ہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ انڈین ہائی کمشنر دہلی جا کر بیٹھ گیا ہے۔ ہاٹ لائن بھی بند ہے۔ میں ان کے پرائم منسٹر کو براہِ راست صاف صاف لکھ رہا ہوں۔ امن چاہتے ہیں تو بیٹھیں اور کھل کر بات کریں۔ لڑنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ ہمارے ساتھ اب مزید کھیل نہ کھیلیں۔ میں نے آج صبح امریکی سفیر سے بھی کہا ہے کہ وہ بھارت کو سمجھائیں ورنہ ہم پوری طاقت سے لڑیں گے۔ انھیں معلوم ہے میری مراد ایٹمی طاقت سے ہے۔ ہم چین سے بھی مکمل رابطے میں ہیں۔ میں اگلے ہفتے کسی وقت چین جاؤں گا۔ تاریخ ابھی کنفرم نہیں ہے۔ چینی صدر

سے یہ ملاقات بھارت کو خبردار کردے گی کہ ہم تنہا نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے اسے عقل آجائے گی۔"

"اسے عقل نہیں آئی تو وہ ہمیں پوری طرح تیار پائے گا۔" جنرل اکبر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں آپ سے ایک اور مدد چاہیے۔"

"جنرل منصف بتارہے تھے آپ کی سپلائیز ان آرڈر ہیں۔ سب کچھ......"

"سپلائز کی بات نہیں ہے۔ آپ کی جنیوا اور برازیل کی سورسز نے سچ مچ بہت عجلت دکھائی ہے۔ پروکیورمنٹ والے بہت مطمئن ہیں۔" جنرل اکبر کچھ کہتے ہوئے ہچکچارہا تھا، لیکن پھر اس نے اپنا میزائل داغ ہی دیا۔ "صدر محترم! ایٹمی میزائل شوٹ کرنے کی کمان آپ فوج کو منتقل کردیں۔"

ایمان علی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے دونوں جنرلوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے اٹنشن کھڑے تھے۔ ایمان علی کو خاموش دیکھ کر جنرل اکبر نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

"بھارت جانتا ہے اس کے بڑے حملے کا دفاع ہم ایٹمی حملے سے کریں گے۔ وہ ہماری ایٹمی Installations پر حملہ کرنے میں پہل کرے گا۔ جیت اسی کی ہوگی جو پہل کرے گا۔ ہمیں اپنی انگلی ہر وقت لال بٹن پر رکھنا ہوگی۔ ایک سیکنڈ کی تاخیر ہمیں تباہ کردے گی۔"

"آپ کو معلوم ہے آج صبح امریکی سفیر مجھ سے ملنے کیوں آیا تھا۔" ایمان علی نے جنرل اکبر کی گفتگو کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "وہ چین کی نگرانی کے لیے مانیٹرنگ پوسٹ مانگ رہا ہے......"

"No! Never!" دونوں جنرل بیک وقت بول پڑے۔

"میں نے جواب میں سفارتی زبان استعمال نہیں کی۔" ایمان علی نے ان کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ "میں نے میکفارلین سے کہا تھا۔ !Over my dead body جنرل اکبر!

آپ کو بھی میرا یہی جواب ہے۔''

''صدر محترم......'' جنرل اکبر نے کچھ کہنا چاہا لیکن ایمان علی نے اسے بولنے سے روک دیا۔

''مجھے اپنی فوج' اس کی قیادت اور آپ پر پورا بھروسہ ہے۔'' ایمان علی کا لہجہ نرم اور مصالحانہ تھا۔ ''لیکن فوج کا کام لڑنا ہے۔ اس کی انگلیاں ٹریگر پر ہوں تو وہ بٹن دبانے کے لیے کلبلاتی رہیں گی۔ ایٹمی اسلحے کا سرخ بٹن ہمیشہ اس ملک کی سیاسی قیادت کی کمان میں رہے گا۔ ہم نے ایٹمی طاقت جنگ کرنے کے لیے نہیں' دشمن کو جنگ سے باز رکھنے کے لیے حاصل کی تھی۔''

''ہمارا یہ بلف زیادہ عرصے کام نہیں کرے گا۔'' جنرل اکبر نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''سیاسی قیادت فیصلے کرنے میں وقت لگاتی ہے۔ جنگ کے دوران ہر ٹریگر پر جنگ لڑنے والے کی انگلی ہوتی ہے۔ گولی کے جواب میں پلک جھپکنے سے پہلے گولی چلانا' یہی ہماری ٹریننگ ہے۔ گولی چلانے کے لیے ہم فیصلہ سننے کے انتظار میں رہے تو دشمن کی گولی ہمیں چاٹ جائے گی۔''

''جنگ ابھی اس اسٹیج پر نہیں پہنچی۔'' ایمان علی نے کہا اور جنرل شہباز سے مخاطب ہو گیا۔ ''ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت ہے کہ بھارت ایٹمی حملہ کرنے والا ہے؟''

''No Sir! ہمارے پاس کوئی ٹھوس شہادت نہیں۔ یہ ہمارا اندازہ ہے' بلکہ یقین ہے کہ وہ بڑے حملے کے ساتھ ہمارے نیوکلیئر انسٹالیشنز کو نشانہ بنائے گا۔ اس کی جگہ ہم ہوتے تو یہی کرتے۔''

''ہمارے درمیان نیوکلیئر انسٹالیشنز پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہے۔''

''معاہدے کی خلاف ورزی کا مقدمہ ہم جنگ کے بعد لڑ سکیں گے' بشرطیکہ ہم باقی رہے۔'' جنرل اکبر نے کہا لیکن ایمان علی نے اس کے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کر دیا اور بدستور

جنرل شہباز سے مخاطب رہا۔

''کیا آپ بھی جنرل اکبر سے متفق ہیں؟''

''صدر محترم! یہ صرف جنرل اکبر کی نہیں پوری کمان کی متفقہ سوچ ہے۔ نیول اور ایئر چیف بھی متفق ہیں۔ فوری فیصلے میں تاخیر سے بچنے کے لیے چین آف کمانڈ بدلنا ضروری ہے۔''

ایمان علی اور جنرل منصف نے جنرل شہباز کو بہت دیکھ بھال کر آئی ایس آئی کا چیف بنایا تھا۔ وہ بہت پیشہ ورانہ انداز میں ایجنسی کو چلا رہا تھا' لیکن وہ بھی جنرل اکبر کی زبان بول رہا تھا۔ ''سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔'' ایمان علی نے سوچا۔ ''یا پھر وہ صحیح سوچ رہے تھے؟''

''مجھے اندازے نہیں چاہییں۔ آپ مجھے کوئی ایسی شہادت لا کر دیجیے کہ انڈیا ایٹمی حملہ کرنے والا ہے' میں ایٹمی اسلحے کی کمان آپ کے حوالے کر دوں گا۔'' ایمان علی نے رخصتی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ دونوں جنرلوں کو معلوم تھا کہ اب مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔

○ ○ ○
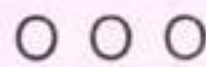
ایمان علی نے گھڑی دیکھی' لان پر ہونے والی میٹنگ کے لیے اس کے وزیروں کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ خبروں کا وقت ہو گیا تھا۔ ملازموں نے لان میں پورٹ ایبل ٹی وی لا کر رکھ دیا تھا اور اس کے تار درست کر رہے تھے۔ سیکورٹی کا ایک افسر کسی الیکٹرانک آلے سے ٹی وی کی اسکینگ کر رہا تھا۔

''کرنل شفقت! اس ڈبے میں دنیا کے سب سے خطرناک بم چھپے ہیں۔'' ایمان علی نے سیکیورٹی چیف سے کہا جو ٹی وی چیک ہوتا دیکھ رہا تھا۔

''نو سر! ہم نے اچھی طرح چیک کیا ہے۔ ٹی وی بالکل ٹھیک ہے۔'' کرنل شفقت نے فوراً جواب دیا لیکن پھر ایمان علی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر چھپتے ہوئے انداز میں خود بھی مسکرانے لگا۔ کرنل شفقت نے اپنی مسکراہٹ پر فوراً ہی قابو پا لیا۔ وہ شاید مسکرانے کو گناہ سمجھتا تھا۔

''یہ بم آپ کے ماہرین نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔ آیئے' میں آپ کو دکھاؤں'' ایمان علی نے کہا تو کرنل شفقت اس کے قریب آ گیا۔ ایمان علی ریموٹ کنٹرول کے بٹن دبانے لگا۔ سی این این' بی بی سی' اے بی سی' فاکس' اسکائی' یورو' ایک ایک کر کے کتنے ہی نیوز چینل ٹی وی کی اسکرین پر آنے جانے لگے۔

''یہ سب ایک ہی فیکٹری کے بنے ہوئے بم ہیں' کیا آپ انھیں ڈفیوز (Defuse) کر سکتے ہیں؟''

''نو سر!'' کرنل شفقت نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''یہ بم صرف آپ ناکارہ بنا سکتے ہیں۔ ہمیں آپ پر مکمل یقین ہے۔''

اسی وقت کرنل افتخار فائلیں لے آیا۔ ٹی وی کے ایک پاکستانی چینل پر کشمیر کی سرحد پر ہونے والی جھڑپوں کی خبریں آ رہی تھیں۔

''صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ ایٹم بم! انڈیا سر نہیں اٹھا سکے گا۔'' کرنل شفقت منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ کرنل افتخار زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ایمان علی نے سنی ان سنی کر دی تھی۔ اس کا خیال تھا یہ دونوں افسر بہت متوازن ذہن رکھتے تھے لیکن پھر اس نے سوچا سب ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے تھے۔ اسی وقت کرنل شفقت کا بیپر بجنے لگا۔

''Permission to leave Sir!'' اس نے اٹنشن ہو کر کہا۔ ایمان علی نے اپنی نظریں ٹی وی سے ہٹائے بغیر سر ہلا دیا۔ کرنل شفقت تیزی سے اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔ ٹی وی پر اب سردار کا انٹرویو آ رہا تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا' حکومت کو بزدلی کے طعنے

دے رہا تھا۔

''سر! آپ نے میڈیا کو زیادہ آزادی دے دی ہے۔'' کرنل افتخار غصے میں بل کھانے لگا۔ ''سرکاری ٹی وی اپنی ہی حکومت کے خلاف زہر اگل رہا ہے۔''

''میں ایسی آزادی پر یقین نہیں رکھتا جس میں صرف میں بول رہا ہوں' باقی سب کے منہ پر پٹیاں بندھی ہوں۔''

اب ٹی وی وزیر اطلاعات جلالی کو دکھانے لگا تھا جو رپورٹروں کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ حکومت کا موقف بتا رہا تھا۔ ''صدر ایمان علی کی حکومت کسی قیمت پر جنگ نہیں چاہتی۔ وہ امن قائم رکھے گی۔ امن......''

''دشمن ہمیں للکار رہا ہے اور ہم امن کی بات کر رہے ہیں۔ دشمن ہمیں کمزور سمجھ سکتا ہے۔'' کرنل افتخار نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر صدر ایمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹی وی کی خبروں کے وقت ان کے درمیان مکالمہ روز کا معمول تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی خود ایمان علی نے کی تھی۔ وہ اسے ذہنی ورزش اور فیڈ بیک حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔ مکالمہ آرائی کبھی کبھی کوئی نئی راہ بھی سُجھا دیتی تھی۔ ایمان علی کوئی جواب دیے بغیر رپورٹروں سے اپنے انفارمیشن منسٹر کی بات چیت سنتا رہا۔ جلالی بہت نپے تلے انداز میں مختصر جواب دے رہا تھا۔ لیکن ہر جملہ بہت موثر تھا۔ اس نے جنگ کی باتیں کرنے والوں کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ ایمان علی جلالی کی کارکردگی سے بہت مطمئن تھا۔

''امن کی بات کرنا بزدلی نہیں ہے۔'' ایمان علی دوسری غیر اہم خبر شروع ہوتے ہی کرنل افتخار سے مخاطب ہوا۔ ''بلکہ جب ہر طرف جنگ کا جنون پھیلا ہوا ہو تو امن کے نعرے لگانا بہت ہمت کی بات ہے۔ بھڑکیں مارنا بہادری نہیں ہے۔ یہ کمزوروں کا ہتھیار ہے۔ اپنے کانوں میں صرف اپنی آواز گونجتی ہے تو خوش فہمی لوریاں دینے لگتی ہے۔''

''کرنل افتخار!'' ایمان علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھی

بھڑکیں لگانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ جلالی کو فون لگائیے۔ وہ کراچی میں ہیں۔''

''قصرِ ناز میں؟''

''نہیں! کراچی میں ان کا اپنا فلیٹ ہے وہیں ٹرائی کیجیے۔'' ایمان علی کے سب وزیر سرکاری رہائش گاہ صرف اس وقت استعمال کرتے تھے جب وہاں ان کا اپنا گھر نہ ہو۔

''جلالی! گڈ ورک، You were very affective on T.V.'' ایمان علی نے انفارمیشن منسٹر کا فون ملتے ہی کہا۔ ''لیکن اب حکمت عملی بدلنے کا وقت آ گیا ہے۔ Pacificism کام نہیں کر رہا۔ ہمیں سخت زبان استعمال کرنا پڑے گی......''

ایمان علی دوسری طرف سے جلالی کا احتجاج سنتا رہا۔ ایمان علی نے سیدھی اور دوٹوک بات کرنے والے جلالی کو بہت مشکل سے کابینہ میں شامل ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ اب بھی ہر وقت جیب میں استعفیٰ لیے گھومتا تھا۔ ایمان علی کو پتا تھا اسے سمجھانا آسان نہیں ہو گا۔

''میں Hostage کا Public opinion نہیں بن رہا۔'' ایمان علی نے فون پر جلالی کی بات سننے کے بعد غصے سے کہا۔ ''میں سردار کے Trap میں بھی نہیں آ رہا۔ سردار بالکل Irrelevent ہے۔ ہمیں بھٹکانے والا ہتھیار۔ اسے بک بک کرنے دیجیے' اس کا کوئی حوالہ یا جواب نہ دیجیے۔ کوئی پوچھے تو نظر انداز کر دیجیے۔ Just ignore him......

''......ٹھیک ہے آپ مجھ سے ملنے تک بلکہ میری پریس کانفرنس تک کوئی بریفنگ نہ دیجیے۔ میں تین دن بعد پریس سے ملوں گا۔ رپورٹروں کو نہیں سینئر ایڈیٹرز کو بلائیے۔ سب کو خواہ وہ ہمارے حامی ہیں یا مخالف۔ ہر نیوز چینل پر لائیو براڈ کاسٹ کا انتظام کیجیے۔ فارن میڈیا کو بھی دعوت دیجیے......''

''جی نہیں! ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔'' ایمان علی نے فائل کھول کر اپنے زانوؤں پر رکھ لی تھی اور اس میں رکھے کاغذات پلٹ رہا تھا۔ ''میرے چین جانے کی خبر میڈیا کو ریلیز کر دیجیے...... نہیں تاریخ طے نہیں ہے۔ اگلے ہفتے کسی بھی دن۔ صرف ایک دن کے لیے۔ میرا پیغام

لے کر آغا شاہ رخ ایران اور جنرل سعید ملک افغانستان جا رہے ہیں' فارن آفس سے تفصیلات لے کر انھیں بھی میڈیا میں ہائی لائٹ کیجیے۔ میڈیا والے خود دو اور دو چار کریں گے۔ فورسز جنگی مشقیں شروع کر رہی ہیں' آئی ایس پی آر سے کوآرڈینیٹ کر کے اس کی بہترین کوریج کرائیے...... جلالی! میں جنگ کی نہیں' جنگ کو ختم کرنے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ آپ کل اسلام آباد آئیں تو فوراً مجھ سے ملیں۔ کل بہت مصروف دن ہے لیکن کرنل افتخار آپ کو آدھے گھنٹے کے لئے Squeez کر لیں گے' آپ انھیں فون کر لیجیے گا۔ اوور اینڈ آل۔'' ایمان علی کے ماتھے پر ناگواری کے بل تھے۔ اسے فیصلوں پر عمل درآمد کے دوران بحث کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ ریموٹ کے ذریعے ٹی وی کے چینل بدلنے لگا۔

کرنل افتخار کو معلوم تھا ایمان علی اب کسی بھی وقت ٹی وی بند کر کے فائلوں میں مصروف ہو جائے گا۔ کسی بھی وقت اس کے وزیر بھی آنے والے تھے۔ یہ کرنل افتخار کے اوپر اپنے دفتر میں جانے کا وقت تھا لیکن جانے سے پہلے وہ ایک مکالمہ اور کر سکتا تھا۔

''کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں ہم دشمن سے نہیں جیت سکتے؟''

''جنگ ہار جیت کا نہیں تباہی کا کھیل ہے۔ جیتنے والے کے لیے بھی اور ہارنے والے کے لیے بھی۔ ہمیں ہر قیمت پر جنگ کو روکنا ہے ہر قیمت پر۔'' ایمان علی نے زور سے ریموٹ کا سرخ بٹن دبایا جیسے ٹی وی نہیں جنگ بند کر رہا ہو۔ ''آپ کو پتا ہے میں اگر صدر نہ ہوتا تو کیا کرتا؟'' اپنی خواہش بیان کرتے ہوئے ایمان علی کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ ''میں اقوام متحدہ کی عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر زور زور سے چیختا۔ جنگ نہیں امن...... امن...... امن!'' اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ ''لیکن حالات نے میرے ساتھ سنگین مذاق کیا ہے۔ میری انگلی ایٹمی میزائل چلانے والے بٹن پر رکھ دی ہے۔ کاش میں اپنا یہ ہاتھ اٹھا کر چلا سکتا...... امن! امن! امن!''

14

نیو یارک

''امن! امن! امن......''

نیو یارک میں اقوام متحدہ کی عمارت کے سامنے سینکڑوں کا ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔ مظاہرین ''جنگ نہیں امن'' اور ''پیار کرو جنگ نہیں'' کے پلے کارڈ ہاتھوں میں لیے ہوئے تھے۔ جو ''پی کے'' نے دن رات ایک کر کے بہت خوبصورت لکھے تھے۔ پاکستان' ہندوستان' بنگلہ دیش اور سری لنکا کے پرچم جنوبی ایشیا کے اتحاد کی علامت بنے پھریریاں لے رہے تھے۔ امریکیوں اور اسپینیوں کی ایک بڑی تعداد بھی مظاہرے میں شریک تھی۔ وہ قوسِ قزح کے رنگوں کا پچاس فٹ طویل بینر لے کر آئے تھے۔

تکریم اور ساحل ایک سرے سے دوسرے سرے تک گشت کرتے ہوئے دیکھ رہے

تھے کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ مظاہرے سے کچھ دن پہلے انھیں مظاہرے میں ہنگامہ کرانے کی سازش کا پتا چلا تھا' اس کا سد باب ہو گیا تھا' پھر بھی دل کے کسی کونے میں خوف چھپا تھا۔ شاید کوئی اور......

مظاہرے کی قیادت میک کر رہا تھا جو اس وقت ٹی وی کے کیمروں میں گھرا ہوا صحافیوں کو بتا رہا تھا۔

''ہم جنگ لڑنا چاہتے ہیں' ایک بڑی اور طویل جنگ لیکن ایک دوسرے کے خلاف نہیں' غربت اور جہالت کے خلاف' بے ایمانی اور نفرت کے خلاف۔ہم......''

تھوڑے فاصلے پر میک کی محبوبہ سیلما' ماتھے پر قوسِ قزح کے رنگوں والی پٹی باندھے نعرے لگانے والوں میں شامل تھی۔ اسپینی نسل کی تھی لیکن رنگ عام اسپینیوں کے مقابلے میں گورا تھا۔ تکریم کا خیال تھا نام سلمیٰ ہوگا جو بگڑ کر سیلما ہو گیا ہوگا لیکن اس نے فوراً ہی تکریم کی غلط فہمی دور کر دی تھی۔ تکریم پہلی بار اس وقت ملی تھی جب مظاہرہ کرنے کی صرف تیاریاں ہو رہی تھیں۔

''تم لوگ کالے بالوں والی میکسیکن اداکارہ کو سلمیٰ حق کہہ کر پاکستانی سمجھتے رہو لیکن میری پیاری! میں تمھاری سلمیٰ نہیں سیلما ہوں۔''

اس نے ایسے پیار بھرے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ تکریم کو برا نہیں لگا' لیکن اسے میک پسند نہیں آیا تھا۔ ایک کان میں بالی' کلائی پر امن کی شکل کا tatoo۔ ایسا ہی tatoo سیلما کے بازو پر بھی تھا۔ لباس بھی ہپّیوں جیسا تھا۔ گھٹنوں سے پھٹی ہوئی جینز' بغیر استری کی ٹی شرٹ اور فوجیوں والی خاکی جیکٹ۔ سر پر چے گیویرا کے طرز کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں ملے تھے۔ تکریم کی یونیورسٹی آج کل بند تھی اسی لیے ساحل کے ساتھ اس نے بھی خود کو مظاہرے کے انتظامات کے لیے وقف کر دیا تھا۔

''بڑی میٹنگ کے لیے جگہ کا مسئلہ ہے۔'' میک ساحل کو بتا رہا تھا۔ ''میں اور سیل ایک

کمرے کے فلیٹ میں رہتے ہیں، تم نے دیکھا ہے اس میں پانچ آدمی مشکل سے سمائیں گے۔ تمھارا فلیٹ بھی چھوٹا ہے۔ یونیورسٹیاں آج کل بند ہیں اور اب وقت بھی کم ہے۔'' بات کرتے ہوئے اس کا ہاتھ سیلما نے شانے سے لپٹا رہا تھا۔

''آپ چاہیں تو میرے اپارٹمنٹ میں......'' تکریم نے پیشکش کی۔

''آپ کے؟''

''میرا مطلب ہے میرے انکل کے، میں انھیں کے گھر میں رہتی ہوں۔ پچاس لوگ آسانی سے سما جائیں گے۔''

''آپ کے انکل کون ہیں؟''

''سرجن رحمان! وہ آج کل اسلام آباد میں ہیں۔ میں ان کی بیٹی کو بتا دوں گی۔ اسے اعتراض نہیں ہوگا۔''

''گریٹ!'' میک نے ساحل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اگلے جمعے کو شام ۷ بجے۔ تم جس جس سے کہہ سکتے ہو کہو۔ میں بھی رِنگ کرتا ہوں۔ ہم فون پر لسٹ ایکسچینج کر لیں گے۔'' میک اور اس کے ساتھ سیلما بھی اٹھ گئی۔ دونوں نے ساحل سے ہاتھ ملایا اور باری باری تکریم کے گال پر پیار کر کے چلے گئے۔ تکریم میک کے بوسے سے سرخ ہو گئی تھی۔ ساحل سوچ رہا تھا کہ وہ کب سے مل رہا تھا، کتنا قریب آ گیا تھا، کتنی شدید خواہش تھی کہ ایک بار ہاتھ تھام لے، لیکن میک پہلی بار ملا اور رخسار چوم کر چلا گیا۔ کب تک وہ اندر ہی اندر مکالمہ کرتا رہے گا؟

''قیادت تم خود کیوں نہیں سنبھالتے۔ یہ میک تو......''

''میں لیڈر شپ میٹریل نہیں ہوں۔ پورے امریکہ میں میک سے بہتر کوئی اور نہیں ملے گا۔''

''اس کا حلیہ، لہجہ، اس کی شکل، اس کا نام تک پاکستانی نہیں ہے۔''

''اس کا نام مکرم قریشی ہے جو وہ شاید خود بھی بھول گیا ہے۔''

''تم کیسے جانتے ہو؟''

''میری طرح وہ بھی ایک بیوروکریٹ کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ کرم قریشی پاکستان کے چند اہم لوگوں میں سے ایک ہے۔''

''پھر بھی وہ اسپینی ہارلم میں ایک کمرے کی کھولی میں رہتا ہے۔ وہ گھر بھی اس کا نہیں' اس کی گرل فرینڈ کا ہے۔''

''تم نے ہمیر شولڈ پلازا کے برابر والی اونچی عمارت دیکھی ہے؟ اس کی سب سے اونچی منزل کا پینٹ ہاؤس میک کا ہے' لیکن اس نے کبھی اس میں قدم نہیں رکھا۔''

''کیوں؟''

''میک کا خیال ہے کہ یہ مکان اس کے باپ نے بدعنوانی سے کمائی دولت سے خریدا تھا۔ میک اور اس کا بھائی امریکہ پڑھنے آئے تھے تو ان کے باپ نے لانگ آئی لینڈ میں انھیں ملین ڈالر کا مکان خرید کر دیا تھا۔ میک کے ضمیر پر محل جیسے گھر میں رہنا بوجھ بنا تو اس نے مکان کے بیک یارڈ میں ایک چھوٹے سے گارڈن شیڈ کو اپنا گھر بنالیا۔ کرم قریشی نے مکان بیچ کر مین ہیٹن میں پینٹ ہاؤس خریدا تو گھر چھوڑ کر سیلما کے ساتھ اس کا کمرہ شیئر کرنے لگا۔ یونیورسٹی سے بھی نام کٹوا لیا۔ کہتا تھا باپ کے برے پیسے سے کی ہوئی پڑھائی زندگی بھر کا بوجھ بن جائے گی۔''

''اور اس کا بڑا بھائی؟''

''اسے میک کے خیالات سے ہمدردی تھی' لیکن اس کی طرح انقلابی نہیں تھا۔ وہ اپنا کیریئر بنا کر اب وال اسٹریٹ کی ایک بڑی فرم میں فائننشل ایڈوائزر ہے اور اپنی امریکی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن باپ کے نہیں اپنے مکان میں۔ میک کی یونیورسٹی کی پڑھائی کا خرچ وہی اٹھاتا ہے۔''

''پینٹ ہاؤس کا کیا ہوا؟''

''کرم قریشی کے اندر بھی انقلاب آ گیا ہے۔ وہ جنرل منصف سے مل کر ایمان علی کو اقتدار میں لانے اور ''نئے پاکستان'' کی بنیاد کھڑی کرنے والوں میں شامل ہوا تو اس نے پاکستان کے ساتھ نیویارک کی پراپرٹی بھی حکومت کے حوالے کر دی۔ وہاں اب امریکہ یا اقوام متحدہ کے آنے والے سرکاری وفد ٹھہرتے ہیں۔

''باپ بیٹے میں صلح ہوئی یا نہیں؟''

''کرم قریشی نیویارک آ کر اپنے بڑے بیٹے کے پاس ٹھہرتا تھا۔ پچھلی بار آیا تو ایئرپورٹ سے سیدھا میک کے گھر پہنچا کہ اس بار اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہے گا۔ سیلما کسی دوست کے پاس رہنے چلی گئی اور کرم قریشی ایک ہفتے تک اپنے بیٹے کے ایک کمرے کے تنگ فلیٹ میں رہا۔ میک کہتا تھا میں اپنے باپ کو ڈی کلاس کر رہا ہوں۔'' ساحل نے ہنس کر کہا۔

''کتنے لوگ ہیں جو میک کی یہ کہانی جانتے ہوں گے؟''

''اکثر لوگ! ایسی کہانیاں بہت تیزی سے پھیلتی ہیں۔ اسی لیے سب کو میک کی ہر ادا پیاری لگتی ہے۔ کتنے ہیں جو ضمیر کی آواز پر عیش و آرام کو ٹھوکر مار دیتے ہیں؟''

''لیکن وہ سیلما جو اس کے گلے میں زنجیر کی طرح لٹکی ہوئی ہے۔ دونوں شادی کے بغیر ساتھ رہتے ہیں۔''

''ہماری کمیونٹی میں سیلما میک سے زیادہ مقبول ہے۔'' ساحل نے مسکرا کر کہا۔ ''وہ وکیل ہے جان گرشم کے ناولوں والی اسٹریٹ لایر۔ جنوبی امریکہ کے غیر قانونی امیگریشن کو مدد دینے والے ایک گروپ کے لیے کام کرتی ہے۔ اس نے بے شمار پاکستانیوں کے کیس لڑے ہیں۔ کتنوں کو امیگریشن ایجنٹوں کے ہاتھوں لٹنے سے بچایا ہے۔ کوئی آدھی رات کو فون کرے تو مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے۔''

''وہ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''ان کا خیال ہے کسی نہ کسی مرحلے پر انھیں اپنے اپنے ملک کے لیے کچھ کرنے واپس جانا پڑے گا۔شادی کی زنجیر انھیں اپنی اپنی سمت میں جانے سے روک دے گی۔''

تکریم کو خود پر سخت غصہ آیا۔ پہلی ہی ملاقات میں ایک نظر دیکھ کر کسی کے بارے میں تاثر قائم کر لینا کتنی بری عادت تھی۔ وہ کئی بار ملے اور تکریم کے دل میں میک اور سیلما کے لیے پسندیدگی کا تاثر گہرا ہوتا گیا۔

OOO

''مکرم!......'' تکریم نے میک کو اس کے اصلی نام سے پکارا تو تینوں اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ وہ ولیج کے ایک چھوٹے سے کیفے میں بیٹھے دوسرے دوستوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آج انھیں مظاہرے کا پروگرام فائنل کرنا تھا۔ سیلما اچک کر میک کے کندھوں کے پیچھے دیکھنے کی اداکاری کرنے لگی جیسے تکریم نے کسی اور کو پکارا ہو۔

''مجھے خود اپنا نام اجنبی لگنے لگا ہے۔'' میک نے قہقہہ لگایا۔

''آپ کو عادت ڈالنی چاہیے۔ آپ پاکستان واپس گئے تو وہاں سب آپ کو آپ کے اصلی نام سے پکاریں گے۔''

''میری جان! میں پھر بھی سلمٰی نہیں بنوں گی۔'' سیلما اٹھلائی۔

''آپ مکرم کے ساتھ پاکستان گئیں تو آپ بھی سلمٰی ہو جائیں گی۔'' تکریم نے مسکرا کر خوش دلی سے کہا تو سیلما کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میک بھی سنجیدہ ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سیلما کے شانے پر میک کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ سیلما نے اپنا چہرہ میک کے کندھے پر ٹکا دیا۔ آنکھیں اداس ہو گئی تھیں۔

''کیا واقعی؟'' تکریم نے دل میں سوچا۔ ''کیا وہ اپنی اپنی الگ سمت میں جانے کا فیصلہ کر چکے تھے؟''

''تم جو سوال مجھ سے کر رہی تھیں وہ میک سے پوچھو۔ وہ اس موضوع کا ہیڈ ماسٹر ہے۔'' ساحل نے ماحول بدلنے کے لیے نیا موضوع چھیڑا۔

''کیا؟'' میک اپنی دنیا سے باہر نکل آیا۔

''جنگ کیوں ہوتی ہے؟'' تکریم نے اسی سادگی سے پوچھا جیسے اس نے ساحل سے پوچھا تھا اور وہ سوچتا رہ گیا تھا۔

''ہر جنگ کی اپنی وجہ اور پس منظر ہوتا ہے۔'' میک نے کہا۔ ''تم نے بہت سادگی سے ایک بہت مشکل سوال کر دیا ہے۔''

''اس میں مشکل کیا ہے؟'' سیلما نے سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تکریم نے بہت آسان سی بات پوچھی ہے۔ انسان دوسرے انسان کا خون کیوں کرتا ہے۔ بمباری کر کے' میزائل داغ کر بستیاں تاراج کیوں کرتا ہے؟ انسان اتنا مہذب ہو کر بھی وحشی کیوں ہے؟''

''فطری جبلت! یا شاید Law of Evolution'' میک نے سیلما کے کندھے سے اپنا ہاتھ اتار لیا۔ ''زندگی جس لمحے پیدا ہوئی تھی اس وقت سے حالتِ جنگ میں ہے۔ شاید یہی اس کے ارتقا کا راز ہے۔ زندگی اربوں سال پہلے جس وائرس کی شکل میں پیدا ہوئی تھی وہ بھی سمندر کی میلوں گہری دنیا میں ایک دوسرے کو کھا کر زندہ تھے۔ مچھلیاں مچھلیوں کی خوراک بنتی ہیں' کیڑے ایک دوسرے کو چاٹ ڈالتے ہیں۔ تم نے کبھی شیر کو زیبرے کا شکار کرتے دیکھا ہے؟ چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں لشکر بنا کر ایک دوسرے سے لڑتی ہیں۔ سائنس دانوں نے لنگوروں پر تجربہ کر کے اور انھیں ایک جگہ بند کر کے دیکھا۔ کچھ دن امن سے رہنے کے بعد وہ بھی اپنے اپنے رہنے کی جگہ کو سرحد مان کر لڑنے لگے۔ ہم انھی لنگوروں کی اولاد ہیں۔''

''سب نہیں!'' سیلما نے مداخلت کی۔ ''ہماری اکثریت چیونٹیوں کے لشکر کی طرح ہے جسے کسی بھی لنگور کی گرم سانس ایک لمحے میں جلا کر خاک کر دیتی ہے۔''

''زندگی نے اسی طرح جنم لیا ہے۔'' میک نے سیلما کی بات نظر انداز کر کے کہا۔ ''یہ تغیر کا

عمل ہے۔ Viral mutation۔ ایک سنڈروم جو پھیلتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ جنگ کرنے کی جبلّت شاید جینز کی اس خرابی کا نام ہے جس سے زندگی پیدا ہوئی۔''

''میک دی سائنٹسٹ! تم ہمیں چیونٹیوں اور لنگوروں کی کہانیاں اور سائنس کے سبق مت پڑھاؤ۔ انسانوں کے بارے میں بتاؤ۔ وہ ایک دوسرے کو کیوں کھاتے رہتے ہیں۔'' سلمانے ایک بار پھر تکریم کی ترجمانی کی۔

''انسان بھی ایک جاندار ہے۔ اس کی نمو بھی اسی جینز سے ہوئی ہے جس میں کھوٹ ہے۔''

''کیوں؟ انسان تو ایک سوچنے والا مہذب جاندار ہے۔ تغیر پذیری کے سینڈروم اور تہذیب کے ارتقا نے اس کی جینز ٹھیک کیوں نہیں کی؟'' اس بار تکریم نے خود اپنی ترجمانی کی۔

''پتا نہیں کیوں۔ شاید یہ جینز تھراپی آسان نہیں تھی۔ زندگی کی بنیاد ٹیڑھی پڑ گئی تھی۔ جنگ کرنے کی جبلّت آج بھی تروتازہ ہے۔ انسان نے پہلی جنگ بارہ ہزار سال پہلے لڑی تھی۔ اس کے بعد تاریخ کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جب انسان ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار نہیں رہا۔ ہر مذہب' نظریے اور طاقت نے کبھی اپنے پھیلاؤ اور کبھی اپنے بچاؤ کے لیے جنگ کی۔ مسلمانوں پر الزام ہے کہ انھوں نے اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا' لیکن ان کے پجاریوں نے کیا کیا؟ ان کی تاریخ بھی مارکاٹ سے بھری ہے۔ اور آپ کی مہذب دنیا؟ نئی اور پچھلی صدی کی سب بڑی جنگیں انھی طاقتوں نے لڑیں جنھیں اپنے مہذّب ہونے پر ناز ہے۔''

''یہ بہت دل چسپ صورت حال ہے۔'' ساحل نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ ''دنیا میں اب صرف ایک نظام اور ایک طاقت باقی ہے' جنگ پھر بھی جاری ہے۔ اور جنگ بھی کیسی؟ یک طرفہ! جس میں ہاتھی بدمست ہو کر مینڈک پر چڑھ دوڑتا ہے۔ مینڈک اس وقت تک اچھلتا اور ٹراتا رہتا ہے جب تک ہاتھی کا پاؤں اس کے سر پر نہیں پڑتا۔''

''اتنے سفاک مت بنو!'' تکریم نے جھرجھری لی۔

''اے دنیا کے عظیم دانشور!'' سیلما نے میک کا بازو ہلایا۔ ''تکریم کے کیوں کا جواب کہاں ہے؟''

''تاریخ کے صفحات پر!'' میک نے خوش دلی سے کہا۔ ''سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مفکر اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ کوئی ملک' معاشرہ یا انسانی گروہ اپنے قومی مفاد کو بڑھانے یا بچانے کے لیے جنگ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے جنگ کی یہی تعریف آج بھی رائج ہے۔''

''فرق ہے۔'' ساحل نے کہا۔ ''کل اور آج کے Law of Evolution یعنی قانونِ ارتقا میں بہت فرق ہے۔ آج کا حملہ آور سمجھتا ہے یہ حملہ اس ملک کے مفاد میں ہے جس پر وہ حملہ کر رہا ہے۔ کمال یہ ہے کہ دنیا اس کے مقصد کی نیکی پر ایمان لاتی ہے۔''

''اکیسویں صدی کا انسان ترقی یافتہ اور مہذب ہو کر زیادہ منافق ہو گیا ہے۔'' میک نے اثبات میں سر ہلایا اور تکریم سے کہنے لگا۔ ''تمھارے سوال کا جواب ملا یا نہیں؟''

''تمھاری فطری جبلّت والی تھیوری میں ایک الجھاوا ہے۔'' تکریم سے پہلے سیلما بول پڑی۔ ''جنگ کے خلاف جو بڑے بڑے مظاہرے ہوتے ہیں' لوگ ہیومن شیلڈ بن کر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتے ہیں' وہ بھی تو انسان ہیں۔''

''یہ بھی ایک جنگ ہے۔ جنگ کے خلاف جنگ۔'' ساحل مسکرایا۔

''انسان کی جینز میں خیر و شر دونوں جذبے ہیں۔'' میک بتانے لگا۔ ''وہ اپنے اندر چھپے ہوئے وحشی کے خلاف مکالمہ کرتا رہتا ہے۔ ہندوؤں کی مہا بھارت کا سب سے مقدس حصہ بھگوت گیتا ہے جس میں پانڈوؤں کا ہیرو ارجن اپنے ہی بھائیوں اور دوستوں کے خلاف لڑنے اور ان کے خون سے ہاتھ رنگنے سے انکار کر دیتا ہے اور کرشن بھگوان اسے واسطے اور دلیلیں دے کر جنگ کے لیے تیار کرتا ہے۔''

''انسان کو اب ہتھیار اٹھانے پر آمادہ کرنے کے لیے کرشن بھگوان کے مکالمے کی

ضرورت نہیں ہے۔'' ساحل کی مسکراہٹ تلخ ہوگئی۔ ''وہ بمباری کر کے گزر جاتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ اس کا بم ہسپتال پر گرا ہے یا کسی بارات پر! اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ وہ ایٹم بم گرا کر واپس اپنے گھر آتا ہے اور آرام سے بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ اسے مدتوں تک معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کیا تباہی پھیلائی ہے۔ ضمیر شکایت بھی کرتا ہے تو کوئی پیشہ ور ماہر نفسیات کرشن بھگوان بن کر اسے مطمئن کر دیتا ہے۔''

''مجھے یاد نہیں امن مظاہرے یا ہیومن شیلڈ کبھی جنگ روک سکے ہوں۔'' میک نے ساحل کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ویت نام کی جنگ۔'' سیلما نے کہا۔ ''دنیا بھر میں، خاص طور پر امریکہ اور یورپ میں شدید مظاہرے نہ ہوتے تو شاید جنگ بند نہ ہوتی۔''

''میں نہیں مانتا۔'' میک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لاشوں کے تھیلے نہ پہنچتے تو امریکہ جنگ بند نہ کرتا۔''

''پھر ہم امن کی قوالی کیوں گائیں؟'' تکریم کو غصہ آ گیا۔ ''ہمیں پتا ہے مظاہروں سے کچھ نہیں ہوگا تو مظاہرہ کیوں کریں؟ دوسرے دوست بھی اپنا اپنا کام چھوڑ کر آنے والے ہیں، کس لیے؟ وہ اپنا اپنا کام کریں، کام نہیں ہے تو چلیں فلم دیکھیں۔''

''سیلاب بہت تیز ہے لیکن بند تو باندھنا ہوگا۔'' میک نے زور زور سے سر ہلا کر کہا۔ ''آواز اٹھانا پڑے گی ورنہ دنیا ایک جنگل بن جائے گی جہاں صرف درندے راج کریں گے۔ ہم الارم لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید آگ لگنے سے پہلے کوئی الارم بج اٹھے اور لوگ پانی کی بالٹیاں لے کر دوڑ پڑیں۔''

اسی وقت ان کے دوسرے دوست بھی آ گئے اور میک کی بات ادھوری رہ گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بہت پُر جوش ہو کر بحث کرنے لگے تھے کہ الارم کہاں کہاں اور کیسے باندھے جائیں۔

○ ○ ○

ساحل دوسری صبح تکریم کو لینے اس کے گھر پہنچا تو وہ اسی وقت ناشتہ ختم کر کے چائے پی رہی تھی۔ انھیں سیّد سے ملنے اس کے اخبار کے دفتر جانا تھا۔ وہی سیّد جس کے جیکسن ہائٹس کے زیرزمین فلیٹ کے چھوٹے سے کمرے میں نیویارک آنے کے بعد رہی تھی۔ تکریم نے ساحل کو چائے دی تو وہ میز پر رکھی پیالی کو ہاتھ لگائے بغیر اس سے اٹھتی بھاپ کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے کوئی جن نکلنے والا ہو جو اس سے آ کر پوچھے گا ''کچھ تو کہو میرے آقا!''

''بہت گھمبیر لگ رہے ہو؟ خیریت تو ہے کیا کسی سے مکالمہ کر کے آئے ہو؟'' تکریم نے خاموشی توڑی۔

''میں مکالمہ صرف اپنے آپ سے کرتا ہوں' دوسروں سے بحث کرتا ہوں۔'' ساحل کے اندر کا لاوا آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔ ''جس سے مکالمہ کرنا چاہتا ہوں کر نہیں سکتا۔ بگولے اندر ہی اندر گول گول پھرتے رہتے ہیں' لیکن اب بہت گھٹن ہونے لگی ہے' لگتا ہے دم گھٹ جائے گا۔''

''اتنا سنجیدہ معاملہ ہے؟'' تکریم ہنس پڑی۔

''ہاں! اگر پچھلی صدی میں ہوتا تو کہتا زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔''

''کیوں؟ کیا اس صدی میں زندگی اور موت کا معاملہ زندگی اور موت کا معاملہ نہیں رہا؟''

''شاید جذبوں میں وہ شدت نہیں رہی جو پاگل کر دیتی ہے۔ انسان نے مر کر بھی زندہ رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔''

''پھر تو معاملہ اتنا سنجیدہ نہیں ہے' تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔''

وہ یہ کہہ کر اٹھ گئی۔ اسے شاید پتا تھا کہ ساحل کیا کہنا چاہتا ہے اسی لیے بھٹکا رہی تھی اور اب بھاگ جانا چاہتی تھی۔

''میری سانس رک جائے گی۔'' ساحل آج ہمتیں جمع کر کے لایا تھا۔ ''میں نے

تمھیں نشاط کی کہانی سنائی تھی۔ وہ ایک آندھی کی طرح تھی، آئی اور چلی گئی۔ میں اس سے کبھی کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ نہ گئی ہوتی اور اب بھی یہیں ہوتی تب بھی شاید کچھ نہ کہہ پاتا۔'' دل دھڑکنے کی آواز صاف نہیں تھی۔ پتا ہی نہ چل سکا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ آج پہلی بار دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ صاف سنائی دے رہا ہے وہ کیا چاہتی ہیں۔ ''تکریم میں......''

''پلیز کچھ نہ کہو۔'' تکریم بیٹھ گئی۔ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ''میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو، لیکن کچھ نہ کہو۔ کچھ مت کہو۔''

ساحل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ تکریم نے تو اسے بولنے ہی نہیں دیا تھا۔ کتنی تیاری کر کے آیا تھا۔ ایک ایک مکالمہ بار بار دہرایا تھا۔ اس کی بات تو پوری سن لیتی۔ پہلی بار اندر کا مکالمہ باہر لانے کی ہمت کی تھی، اسے کم از کم اپنی جھجک تو توڑنے دیتی۔

''میں نے بھی تمھیں مقصود کی کہانی سنائی تھی۔'' تکریم نے سوچا اسے صاف صاف بات کرنا چاہیے۔ ساحل کو اتنا تو حق حاصل تھا۔ ''میں بال بال بچی تھی۔ اس کے فریب کا پردہ چاک ہوا تو شکرانے کے نفل پڑھے تھے اور مسجد میں بیٹھ کر وعدہ کیا تھا کہ اب صرف وہیں شادی کروں گی جہاں امّی طے کریں گی۔ میری زندگی میں اب کسی رومانس کی گنجائش نہیں ہے۔ تم ہی نے تو ابھی کہا تھا کہ اب پاگل پن کا زمانہ نہیں رہا۔''

ساحل اب بھی کچھ نہیں بولا۔ شاید جھٹکے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چہرے کا رنگ آہستہ آہستہ واپس آنے لگا تھا۔

''ساحل! تم بہت اچھے انسان اور ایک اچھے دوست ہو۔ اور ہمیشہ رہو گے مگر......''

''کیا میں اپنی ماں کو تمھاری امی کے پاس بھیج سکتا ہوں؟'' ساحل نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کی ہمت واپس آ گئی تھی۔ ''تمھیں اعتراض تو نہیں ہو گا۔''

''نہیں!'' جواب اچانک ہی منہ پر آ گیا تھا۔ کچھ دیر دیکھتی رہی لیکن پھر آنکھیں جھک گئیں۔ چہرے پر ہلکا سا رنگ آ گیا تھا۔ یہ اس کے سنبھلنے کا وقت تھا۔ ''اب ہم دونوں اس

موضوع پر بات نہیں کریں گے۔'' تکریم اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
''شاہ صاحب! انتظار کر رہے ہوں گے۔''
دونوں گھر سے اسٹیشن تک گئے' پلیٹ فارم پر ٹرین کا انتظار کیا۔ ٹرین کا سفر ختم ہوا تو ایک بار پھر اسٹیشن سے سیّد تک کے دفتر کا پیدل سفر۔ پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اس دوران دونوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بس سیّد کے دفتر میں داخل ہوتے وقت ایک دوسرے کو دیکھا اور نظریں چرا لیں۔
تکریم سیّد کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ خوش حال نظر آنے کے لیے خوش لباس رہا کرتا تھا تاکہ بقول خود اس کے اپنے دشمنوں کو جلا سکے' لیکن اس وقت ایسا جواری لگ رہا تھا جو پچھلی رات اپنی ساری پونجی ہار گیا ہو۔ گلے میں ٹائی تھی لیکن ناٹ ڈھیلی ہو کر جھول رہی تھی۔ قمیص میں سلوٹیں تھیں اور پتلون کی کریز غائب تھی۔ سفید بال بھی میلے میلے لگ رہے تھے۔ کمرے میں اکیلا تھا اور کمپیوٹر کی اسکرین میں آنکھیں گاڑے بیٹھا تھا۔
''شاہ صاحب! سب کہاں گئے؟'' تکریم نے سلام دعا کے بعد نشست سنبھالتے ہوئے پوچھا۔
''کوئی کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتا۔ مجھ جیسا ہو تو بیوی بچے بھی نہیں رہتے۔'' سیّد نے قہقہہ لگایا۔ ''سب چلے گئے۔ تم سناؤ......''
''چوہدری صاحب بھی؟ وہ تو آپ کے بہت وفادار تھے؟''
''وفاداری پیٹ نہیں بھرتی۔ دوسروں کی طرح ان کے سر پر بھی Deportation کی تلوار لٹک رہی ہے۔ وہ جانے سے پہلے کچھ کمانا چاہتے ہیں۔ دشمنوں نے انھیں مجھ سے الگ کرنے کے لیے دوگنی تنخواہ کی آفر دی۔ میری مروّت میں جانا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے پتا چلا تو میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔'' سیّد نے ایک اور قہقہہ لگایا۔
''اخبار کیسے نکلتا ہے؟''

''چٹکی بجاتے ہوئے۔ خبریں نیٹ سے نکل آتی ہیں۔ مفت لکھنے والے کالم نگاروں کی قطاریں لگی ہیں۔ جو اپنی خبریں چھپوانے آتے ہیں ان سے پروف ریڈنگ کراتا ہوں۔ میں صرف اداریہ لکھتا ہوں۔ پیسے بھی بچ رہے ہیں اور میرا زنگ بھی اتر رہا ہے۔''

''آئی ایم ساری......'' تکریم کو سیّد کے اکیلے پن پر سچ مچ دکھ ہوا۔

''نہ! نہ!'' سیّد نے قہقہہ لگایا۔ ''میری تنہائی پر ترس نہ کھاؤ۔ ابھی کچھ دیر میں ہجوم جمع ہو جائے گا۔ وہ پوچھیں گے' شاہ جی! بتاؤ کیا ہونے والا ہے؟' اور میرا بھاشن شروع ہو جائے گا۔ شام کو اپنی اپنی بوتل لے کر باٹلی گروپ آ جائے گا۔ اس سمے میں بھاشن نہیں دیتا' صرف گالیاں بکتا ہوں۔ تم کبھی شام کو یہاں مت آنا۔'' قہقہہ۔ ''بس رات بھاری گزرتی ہے۔ نشہ رہتا ہے نہ نیند آتی ہے۔ اپنے کھوکھلے پن کا احساس جاگ جاتا ہے۔ خواب کھو جائیں تو سونے کو جی نہیں چاہتا۔''

''ایسا نہ کہیں۔ آپ کو تو اپنے آپ سے بہت مطمئن ہونا چاہیے۔ آپ اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے' کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ میں نے خود دیکھا ہے......''

''سب فراڈ ہے۔ ڈھکوسلہ! یہ ہم جرنلسٹوں کا نشہ ہے۔ وزیروں' سفیروں کو للکار کر Kick لیتے ہیں۔ یہ صرف اناؤں کی لڑائی ہے' کسی خواب کو تعبیر دینے والی جنگ نہیں۔''

تکریم اور ساحل اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

''میں نے صحافت شروع کی تھی تو پاکستان میں نیا نیا مارشل لاء لگا تھا۔'' سیّد کی آنکھوں کی مدہم ہوتی قندیلیں پھر روشن ہو گئی تھیں۔ ''اخبار چھپنے سے پہلے سنسر ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے سب کی آنکھ بچا کر پہلے سے لگی ہوئی ایک خبر نکال کر اس کی جگہ خطرناک سمجھی جانے والی خبر چپکا دی۔ دوسرے دن وہ خبر چھپی تو خوب ہنگامہ مچا۔ کونے میں سر جھکائے بیٹھے معصوم شکل بچے پر کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا۔'' سید نے اس بار کافی دیر بعد قہقہہ لگایا۔ ''کوئی اس وقت میرا نام نہیں جانتا تھا۔ آج میں کافی بدنام ہوں۔ سینکڑوں چیختی ہوئی سرخیاں لگا چکا ہوں۔ کالم کے

کالم سیاہ کر ڈالے، بہت لوگوں کو ناراض کیا، ساتھ ساتھ اپنی انا بھی پھلتی پھولتی رہی، لیکن وہ خوشی کبھی نہ ملی نہ ایسا دھماکہ ہوا جو اندر کے صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر چھپنے سے ہوا تھا۔ میں وہ بے نام سپاہی تھا جس کی گولی نے دشمن کا جہاز گرا دیا تھا۔''

''آپ شدید ڈپریشن کا شکار لگتے ہیں۔ میں کسی سے نسخہ لکھوا کر آپ کو دوں گی، آپ پھر سے خواب دیکھنے لگیں گے۔'' تکریم نے مسکرا کر کہا۔

''شاہ صاحب! مجھے حیرت ہے آپ آج کے اس دور میں اتنی ناامیدی کی باتیں کر رہے ہیں جو پاکستان کی تاریخ کا سب سے سنہرا زمانہ ہے۔'' ساحل نے اپنی خاموشی توڑی۔

''آپ خود بھی یہی لکھتے رہے ہیں۔ لگتا ہے سردار کی پروپیگنڈا مشینری کام کر گئی ہے۔ ایمان علی پر آپ کا ایمان کم ہو گیا ہے۔''

''نہیں، نہیں! ایمان علی ایک بہت مضبوط اور تن آور درخت ہے۔ سردار جیسے کتنے ہی کوّے آئیں گے اور کائیں کائیں کر کے اُڑ جائیں گے۔ یہ میری صحافیوں والی چھٹی حس ہے جو مجھے ڈرا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہیں نہ کہیں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ بے حسی کے پیغمبر دوبارہ نظر آنے لگے ہیں۔ وہ اپنے چہرے پر جرم کے اجازت نامے لٹکائے گھوم رہے ہیں۔ کسی کی پیشانی پر ندامت تحریر نہیں ہے۔ حکم ران طبقے اپنی وراثت پر دوبارہ دعویٰ کر رہے ہیں۔ مڈل کلاس آئی ٹی کے روبوٹ بنانے والا کارخانہ بن گئی ہے۔ سارے تانے بانے الگ الگ ہو گئے ہیں۔ مظلوموں نے بنیاد پرستی میں پناہ ڈھونڈ لی ہے۔''

''آپ کے خواب تو سچ مچ بہت ڈراؤنے ہیں۔'' ساحل نے مسکرا کر کہا۔ ''تکریم صحیح کہتی ہے۔ آپ اینٹی ڈپریسنٹ استعمال کیجیے۔''

''شام کو جب حلق میں لال پریاں اتریں گی تو خوابوں کے ڈراؤنے بھوت ڈر کے خود بھاگ جائیں گے۔'' سیّد نے ایک طویل قہقہہ لگایا، لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ''تکریم! اپنی امی سے کہو نئے پاکستان کی نظر اتاریں اور ایمان علی کے گرد اپنے وظیفوں کا حصار کھینچ دیں۔ آج

کل میں سخت توہم پرست ہو رہا ہوں۔''

''جی!''

''تمھارے مظاہرے کی تیاریاں کیسی ہیں؟'' سیّد نے موضوع اور موڈ ایک دم بدل دیا۔

''ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے تھے۔''

''اخباروں میں بہت کچھ چھپ رہا ہے۔ میرے پاس جو بھی آتا ہے مظاہرے کے بارے میں بات کرتا ہے۔ لگتا ہے مظاہرہ شاندار ہوگا۔''

''پاکستانیوں میں ہمارا کام اچھا ہے۔'' ساحل نے کہا۔ ''اسپینیوں اور امریکیوں کے کئی گروپ بھی ساتھ ہیں، لیکن ہم مظاہرے میں جنوبی ایشیا کا اتحاد Portray کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کسی ایسے گروپ کو جانتے ہوں......''

''طاہر سے ملو۔'' سیّد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''میں اسے فون کر دوں گا۔ پارک ایونیو ۴۵ اور ۴۶ اسٹریٹ کے درمیان شیف نامی بار ہے، وہ پانچ بجے کے بعد وہیں ملے گا۔ اس کے ساتھ اس کا شیف گروپ ہوگا جس میں انڈین، بنگالی اور سری لنکن بھی ہیں۔ تم انھیں پسند آ گئے تو سمجھو تمھارا کام ہوگیا۔''

''میں انھیں کیسے پسند آؤں گا؟ میں تو شراب بھی نہیں پیتا۔''

''تم کچھ مت کرنا، صرف خاموش رہنا۔ ان کی کہانیاں سننا، تعریف کرنا یا حیرت ظاہر کرنا۔ تم ان کے محبوب بن جاؤ گے۔''

''یہ کام ساحل سے اچھا کوئی نہیں کر سکتا۔'' تکریم نے ہنس کر کہا۔ ''ساحل کو کئی کئی دن خاموش اور غصہ کیے بغیر رہنے کی عادت ہے۔''

''تمھیں عاطف بٹ یاد ہے؟'' سیّد نے تکریم کی بات نظر انداز کر کے اس سے پوچھا۔

''جی! لیکن میں پھر کبھی اس سے ملی نہیں۔''

''ملو! میرے لال پری گروپ کا خیال ہے تمھارے مظاہرے میں ہنگامہ کرانے کی سازش ہو رہی ہے۔ عاطف بٹ سے پوچھو' اسے ضرور پتا ہو گا۔ وہ پاکستانی انڈر ورلڈ کا اہم کارندہ ہے۔''

سیّد کے فلیٹ سے نکل کر دونوں کی سمتیں الگ الگ ہو گئی تھیں۔ تکریم نے عاطف بٹ کو سیّد کے دفتر سے فون کیا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر کوئینز کے ایک کافی شاپ میں تکریم کے سامنے نظریں نیچی کیے بیٹھا میز پر رکھی نمک دانی سے کھیل رہا تھا۔ تکریم اسے اپنے بارے میں بتاتی اور اس کے بارے میں پوچھتی رہی اور پھر براہ راست مطلب پر آ گئی۔

''اتوار کو ہم اقوام متحدہ کے سامنے امن مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں آپ اور آپ کے ساتھی بھی اس میں شریک ہوں۔''

عاطف بٹ کے ہاتھوں سے نمک دانی چھٹ گئی۔ اس نے پہلی بار تکریم کو آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ ''باجی! آپ اس مظاہرے میں نہیں جائیں گی۔''

''کیوں؟''

''اس میں بہت بلوہ ہو گا۔ پتھر لاٹھیاں چلیں گی۔''

''یہ سب کچھ کون کرے گا۔ آپ؟ آپ کے ساتھی؟'' عاطف بٹ خاموش رہا۔ تکریم کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ''کتنے پیسے ملے ہیں آپ کو اس کام کے؟ بتایئے' کتنا مال ملا ہے آپ کو؟''

''مظاہرہ کرانے والے ملک کے غدار ہیں۔ انڈیا کے ایجنٹ ہیں۔ وہ پاکستان کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انھیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔''

''میں تمھیں غدار نظر آتی ہوں؟ میں اور دوسرے تمام دوست اپنا سارا وقت اور خود اپنا پیسہ خرچ کر رہے ہیں اور اسے ناکام بنانے والے پیسے دے کر بلوہ کرانا چاہتے ہیں۔ ایجنٹ

کون ہوا، ہم یا وہ؟''

''ہم جاہل لوگ ہیں، اتنی گہرائی میں نہیں جاتے۔ بس، آپ اپنے بھائی کا کہنا مان لیں۔ اس مظاہرے میں نہ جائیں۔''

''ضرور جاؤں گی۔ سب سے آگے کھڑے ہو کر نعرہ لگاؤں گی۔ پہلا پتھر اور پہلی لاٹھی میں کھاؤں گی۔''

''نہیں باجی! ایسا نہ کہیں۔ ہمارے ہاتھ بندھ جائیں گے۔'' عاطف بٹ جیسے کانپ گیا۔

''آپ جب پہلی بار ملے تھے تو آپ نے اپنا کارڈ دیا تھا۔ اس پر ہرے رنگ کا چاند تارا دیکھ کر مجھے فخر ہوا تھا۔ اسی لیے آپ کا کارڈ سنبھال کر رکھا تھا۔ آپ نے اپنے کمرشیل کارڈ پر بھی اپنے وطن کا نام اونچا رکھا تھا۔''

''ہمارا وطن ہماری ماں ہے۔ ماں!'' عاطف بٹ نے بہت فخر سے کہا۔

''اپنی ماں کو زخمی مت کیجیے؟ دشمن وہ ہیں جو ملک کو جنگ کی بھٹی میں دھکیل کر اسے تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔'' تکریم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں بھی آپ کو دل سے بھائی مانتی ہوں۔ آپ مجھ پر ایک بڑا احسان کر چکے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں میں اس مظاہرے میں نہ جاؤں؟ نہیں جاؤں گی۔ میری وجہ سے آپ کے ہاتھ نہیں بندھیں گے۔ آپ جو چاہیے کیجیے، لیکن اپنی ماں کو رسوا مت کیجیے۔ وہ میری بھی ماں ہے۔'' تکریم کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی۔

''آپ مطمئن رہیے، کچھ نہیں ہوگا۔'' عاطف بٹ نے نمک دانی دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ شاید اس پر تکریم کے مکالموں کا اثر ہو گیا تھا۔ تکریم جاتے جاتے رک گئی۔

''میں اور میرے ساتھی آئیں گے، لیکن ہنگامہ کرنے نہیں، یہ دیکھنے کہ کوئی اور ہنگامہ نہ کرے۔ کسی نے آپ کے خلاف نعرہ لگانے کی کوشش کی تو ہم اس کا گلا دبا دیں گے۔''

تکریم دوبارہ بیٹھ گئی۔ ''میں جب بھی آپ سے ملتی ہوں آپ کا نقصان ہو جاتا

ہے۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں چاہتی ہوں آپ کا یہ نقصان پورا کر دوں۔ بتائیے کتنا......''

''نہیں باجی! آپ کو پتا ہے ہم......''

''مجھے معلوم ہے۔'' تکریم نے اسے ڈائیلاگ مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر پرس کی زپ واپس بند کر دی۔

''ہمارا کوئی نقصان ہوا بھی نہیں!'' عاطف بٹ پہلی بار مسکرایا۔ ''ایسے کاموں کے واسطے لیے ہوئے پیسے واپس نہیں ہوتے۔ انھیں شاید ہمیں اپنی زبان بند رکھنے کی قیمت بھی چکانا پڑے۔''

ooo
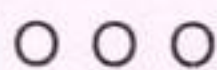
پارک ایونیو تک پہنچتے پہنچتے بوندا باندی بارش میں بدل گئی تھی۔ دن میں دھوپ نکلی ہوئی تھی اس لیے ساحل نے چھتری نہیں لی تھی۔ ۴۵ ویں اسٹریٹ تک بھاگ کر پہنچا اور جب شیف میں داخل ہوا تو کافی بھیگ گیا تھا۔ اندر آ کر دیر تک اپنا سر ہلا کر بالوں سے پانی جھٹکتا رہا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر بڑا سا کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے ایک فربہی مائل عورت بارٹینڈر کا کام کر رہی تھی۔ اندر کی طرف کھانے کی میزیں تھیں جو سب خالی تھیں۔ کاؤنٹر پر دو تین لوگ تھے۔ کونے پر بیٹھا ہوا ایک شخص جس نے بارٹینڈر کے گال پر چٹکی بھر کر قہقہہ لگایا تھا' یقیناً طاہر تھا۔ اسی وقت طاہر نے دروازے میں کھڑے ساحل کو دیکھا اور اسٹول سے اتر آیا۔ وہ لمبے قد اور گندمی رنگ کا جامہ زیب شخص تھا۔ یورپی تراش کا گہرے رنگ کا سوٹ پہنے تھا۔ ابھی ٹائی کی گرہ ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔

''تم یقیناً ساحل ہو۔'' اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ساحل نے اثبات میں سر ہلایا تو گلے ملنے لگا۔

''امریکی ملتے ہیں تو پہلا سوال سوچھتے ہیں' دن کیسا گزرا۔''

''ٹھیک!''

''صرف ٹھیک؟ تم مجھ سے پوچھتے تو میں کہتا' پردہ اٹھتا ہے' پردہ گرتا ہے' یہی پورے دن کی کہانی ہے۔ مجھے مکالمے جمع کرنے اور بولنے کا شوق ہے۔''

ساحل خاموشی سے طاہر کے ساتھ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا تو بارٹینڈر ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میرے دوست سے ملو۔ ڈاکٹر ساحل فرام این وائی یو۔ اور یہ ہے پولا' پرتگالی شراب! دی گریٹ بارٹینڈر۔'' طاہر نے بارٹینڈر کا گال نوچتے ہوئے کہا۔

''کیا پیو گے؟'' پولا نے طاہر کا خالی ہونے والا گلاس دوبارہ بھرتے ہوئے پوچھا اور ساحل کے بتانے پر اسے کوک کا گلاس دے کر دوسرے گاہک کی طرف چلی گئی۔

''سیّد نے بتایا تھا تم نہیں پیتے۔ بہت اچھا کرتے ہو۔'' طاہر نے بڑا سا گھونٹ لے کر منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچھی چیز نہیں ہے۔ کڑوی' بدمزہ' کنگال کرنے اور گھر توڑنے والی کمینی بدذات! رات کو گھر جاؤ تو بیوی سے لڑو' صبح اٹھو تو ہینگ اوور' دفتر آؤ تو موڈ خراب۔''

''پھر آپ کیوں پیتے ہیں۔''

''عادت! چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ پہلے میں پیتا تھا' اب یہ مجھے پیتی ہے۔ یہ ذرا فلمی قسم کا مکالمہ ہے۔ شراب کا مسئلہ یہ ہے کہ اس سے متعلق ہر مکالمہ فلم میں بولا جا چکا ہے۔ ایک نہ ایک دن میں کوئی اوریجنل مکالمہ ضرور تلاش کروں گا۔''

''یقیناً' لیکن آپ مجھے ڈاکٹر کہہ کر نہ ملوائیں۔ میری پی ایچ ڈی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔''

''ہو جائے گی۔ ہو جائے گی۔ ہمارے لیے تم ابھی سے ڈاکٹر ہو۔ دیکھو تردید مت کرنا۔''

ساحل نے کچھ نہیں کہا۔ پولا طاہر کا خالی کیا ہوا گلاس پھر بھر کر چلی گئی۔

''سیّد نے کہا تھا آپ لوگ امن کے لیے مظاہرہ کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں!'' مطلب کی بات سن کر ساحل کو خوشی ہوئی۔ اس نے مظاہروں کے پمفلٹوں کا ایک موٹا بنڈل بیگ سے نکال کر طاہر کو دیا۔

''یار یہ سیّد بھی گریٹ آدمی ہے۔'' طاہر نے پمفلٹ دیکھے بغیر کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ ''گریٹ جرنلسٹ، گریٹ ایڈیٹر۔'' اسی وقت طاہر کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کی بیوی کا فون تھا۔

''ڈارلنگ! میں آج دیر سے آؤں گا، آج میری ڈاکٹر ساحل سے میٹنگ ہے۔ تم ڈاکٹر ساحل کو نہیں جانتیں؟ ڈاکٹر آف فلاسفی، دی گریٹ پولیٹیکل سائنٹسٹ فرام این وائی یو...... ٹھیک ہے میں دودھ لیتا آؤں گا۔ بائی ڈول!''

طاہر نے فون بند کر کے تازہ بھرے ہوئے گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ کچھ دیر تک لگا جیسے کہیں کھو گیا ہو، لیکن فوراً ہی واپس آ گیا۔

''تمھارے نام سے لگتا ہے شاعری بھی کرتے ہو۔''

''جی ہاں! کبھی کبھی۔''

''تم غزل تو نہیں کہتے؟''

''نہیں! کبھی نہیں۔''

طاہر نے اسٹول سے اتر کر ساحل کو گلے لگا لیا۔ ''تم واقعی گریٹ ہو۔ مجھے غزل سے سخت چڑ ہے۔''

''کیوں؟''

''مجھے جھوٹ سے نفرت ہے اور غزل سراسر جھوٹ ہے۔ ڈھٹائی کے ساتھ سرِ عام آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا جانے والا سفید جھوٹ!''

''جھوٹ؟ لیکن کیوں؟ محبت تو دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے۔''

''سچ بول کون رہا ہے۔ وہ جو اپنی کٹیا میں بند ہیں۔ جنھوں نے عشق کی کوئی منزل سر نہیں کی، حسن کو چھو کر نہیں دیکھا، جن سے ان کی بیوی کے سوا کسی نے وفا یا بے وفائی نہیں کی جو میخانے جا کر لڑکھڑائے نہ کسی تحریک اور انقلاب کا حصہ رہے۔''

طاہر ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا۔ ساحل اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ کر سکتا تھا کہ اب جو مکالمہ آئے گا وہ تھیٹریکل انداز میں ادا ہوگا۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔

''دل کو پری خانہ بنائے بغیر کہی جانے والی غزل خالی ڈھول ہے۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ شاعر حسین عورتوں کے پیچھے بھاگتا پھرے، بے وفائی کا سلسلہ دراز کرے، شراب خانے کو گھر بنائے پھر جا کر غزل کہے۔ طاہر بھائی! شاعر کا جسم نہیں تخیل پرواز کرتا ہے۔ غزل اسی تخیل کی پیداوار ہے، کوئی عملی تجربہ نہیں!''

''میرے پاس تمام شاعروں کی کتابیں ہیں۔ سب کے فلیپ پر لکھا ہے ان کی شاعری، مشاہدے اور تجربے کی شاعری ہے۔ یہ مشاہدے اور تجربے کی شاعری نہیں، ان کی حسرتوں کا نوحہ ہے۔ !Masturbation خود لذتی کا تہذیبی پرچار! واہ کیا جملہ کہا ہے، داد دو ڈاکٹر!''

''سبحان اللہ!''

''میں صرف ایک بار نیویارک کے مشاعرے میں گیا تھا۔'' غزل کے خلاف طاہر کی تقریر جاری تھی۔ ''شیروانی اور سر پر رام پوری ٹوپی پہنے سفید داڑھی والا ایک شاعر جگر کے ترنم کی نقل کر رہا تھا۔ وہ شراب پر شعر پڑھتے ہوئے اس طرح جھومتا تھا جیسے میخانہ سر پر اٹھا رکھا ہو۔ اس کی آنکھوں میں اتنی حسرتیں دفن تھیں اور اتنی تشنگی تیر رہی تھی کہ دل چاہا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے شیف لے آؤں، جام پلاؤں اور کہوں اب کہہ غزل!''

ساحل بے ساختہ ہنس پڑا۔اس نے غزل کا اتنا پر جوش مخالف پہلے نہیں دیکھا تھا۔

''یہ ہنسنے کی بات نہیں۔رونے کا مقام ہے......''

غزل کے خلاف طاہر کی تقریر اچانک رک گئی۔ وہ اسٹول سے اتر کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور اس شخص کو سنبھالنے لگا جو لڑکھڑاتا ہوا بار میں داخل ہوا تھا۔اس کا رنگ گورا اور سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ساٹھ سے کم کا نہیں تھا۔اسی کے ساتھ گہرے سانولے رنگ کا ایک شخص داخل ہوا تھا اور طاہر سے مل کر داڑھی والے شخص کو برساتی اتارنے میں مدد کر رہا تھا۔

'طاہر! تو ڈائیلاگ جمع کرتا ہے نا!'' نووارد نے اسٹول پر بیٹھ کر ایک ڈبل پیک کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔''اپنا بھی ایک ڈائیلاگ سنبھال۔ایک کل گزر گیا' ایک کل ابھی نہیں آیا 'آج کی فکر کر اسے برباد نہ کر' بول کیسا ہے۔''

''واہ! واہ یار واہ! تو نے کمال کر دیا۔'' طاہر سر دھننے اور غٹ غٹ کر کے اپنا گلاس خالی کرنے لگا۔اسے اچانک ساحل کا خیال آیا۔

''میرے دوست سے ملو۔ڈاکٹر ساحل۔گریٹ پولیٹیکل سائنٹسٹ فرام این وائی یو He is a great poet too-'' ساحل یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس پڑا کہ طاہر کے ہر نئے پیگ کے ساتھ ساحل کی اپنی عظمت میں اضافہ ہو رہا تھا۔''یہ ہے راج سیٹھی' دی گریٹ آرکیٹیکٹ۔یہاں کے سیوریج سسٹم پر کام کر رہا ہے۔اسی لیے روز نالی میں گرتا ہے۔'' طاہر نے قہقہہ لگایا اور راج کے ساتھ آنے والے دوسرے شخص کا تعارف کرانے لگا جو طاہر ہی کی طرح بہت مہنگا بزنس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔''یہ اے ڈبلیو خان ہے' عبدالوہاب خان فرام ڈھاکہ! ہم اسے صرف ڈبلیو کہتے ہیں' یہ بینکر ہے' گریٹ بینکر۔ہر وقت پیسوں میں کھیلنے والا۔'' ساحل سوچنے لگا آس پاس کوئی ایسا بھی ہے جو گریٹ نہ ہو۔

''گریٹ آرکیٹکٹ بکواس! سپر پاور مائی فٹ!'' راج نے جو پہلے سے پیے ہوئے تھا'

گلاس سے ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''آرکیٹکچر دیکھنا ہے تو پانچ ہزار سال پرانے موہنجوداڑو کا دیکھو۔ ایک لائن میں بنی ہوئی پکی عمارتیں، سیدھی سڑکیں، انڈر گراؤنڈ سیوریج سسٹم، بارش میں کبھی پانی جمع نہیں ہوا۔ کسی کے ٹھوکر نہیں لگی۔ کوئی نالی میں نہیں گرا۔''

''ٹھوکر اس لیے نہیں لگی کہ موہنجوداڑو میں شراب خانہ نہیں تھا، شرابی نہیں تھے۔'' طاہر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''وہ آرٹسٹ لوگ تھے۔ گریٹ آرٹسٹ۔'' راج نے طاہر کا قہقہہ نظر انداز کر دیا۔ ''آج کے آرکیٹکٹ صرف کرافٹسمین ہیں۔ آرٹ کے لیے من کی شانتی چاہیے۔ وہ ایک دم شانت لوگ تھے۔ آج جو باجو ملکوں میں خون خرابا تھا، لیکن انھوں نے کبھی لڑائی نہیں لڑی۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ ڈاکٹر! آپ کبھی موہنجوداڑو گئے ہو؟''

''کئی بار! میرے ماں باپ سندھ سے ہیں۔ میں کالج کی چھٹیاں سندھ میں گزارتا تھا۔''

''سائیں تم تو ہمارا بھائی ہے۔ برادر Real Brother''۔ راج اچھل کر اسٹول سے اترا اور ساحل کو گلے لگانے لگا۔ راج کے بعد طاہر اور پھر ڈبلیو نے گلے لگایا۔ انھیں کے پیچھے گہرے کالے رنگ کا ایک شخص آ کھڑا ہوا تھا، وہ بھی ساحل سے گلے ملنے لگا۔ ساحل ادھر ادھر دیکھ کر جھینپتے ہوئے سوچ رہا تھا وہ ان شرابیوں کے درمیان تماشا بننے کیوں آیا ہے۔

''یہ ٹونی ہے، سری لنکا کا ٹائیگر۔'' طاہر نے آنے والے کا تعارف کرایا۔ ''ٹرانسپورٹ کا کام کرتا ہے۔ گریٹ بزنس مین! لکھ پتی ہے سالا لکھ پتی!''

''سنڈے کو ہم مظاہرہ کر رہے ہیں۔'' تعارف ختم ہوا تو ساحل نے ان کی توجہ حاصل کرنا چاہی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنا کام کر کے جائے۔ بہت وقت ضائع ہو گیا تھا۔

''Peace March'' طاہر نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ ''ساؤتھ ایشین پیس مارچ! سب کو آنا ہے۔'' طاہر نے پمفلٹوں کے بنڈل راج اور ڈبلیو کو دیے۔ ٹونی نے بھی ہاتھ بڑھایا،

لیکن طاہر نے دیکھا نہیں یا نظر انداز کر دیا۔

''تم لوگوں کا یہی مسئلہ ہے، ہمیں اپنا حصہ نہیں سمجھتے۔'' ٹونی نے غصے سے کہا۔

''تم ہمارا حصہ نہیں ہو۔ تمھارا رنگ بھی کالا ہے اور تم ہماری زبان بھی نہیں سمجھتے۔'' طاہر نے پلٹ کر جواب دیا۔

''اور ڈبلیو؟ کیا اس کا رنگ کالا نہیں ہے۔ کیا وہ تمھاری زبان بولتا ہے؟''

ڈبلیو اپنی کلائی ٹونی کی کلائی سے ملا کر رنگ کا فرق بتانے لگا۔

''ڈبلیو اردو بول سکتا ہے۔ کیوں ڈبلیو؟ بول کر بتا۔'' طاہر نے ڈبلیو کو امید بھری نظروں سے دیکھا۔

''میرے باپ نے 1971ء میں اردو نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ میں مجبور ہوں۔''

''سب قسمیں ٹوٹ گئی ہیں، خستہ ہو کر خود بخود بکھر گئی ہیں۔'' طاہر کو مکالمہ بولنے کا موقع مل گیا۔

''آپ ہمارا بہت اٹوٹ حصہ ہیں۔'' ساحل نے اپنے بیگ سے پمفلٹوں کا ایک اور بنڈل نکال کر ٹونی کو دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ مظاہرے میں ضرور آیئے گا۔'' ٹونی خوش گیا۔

''آپ نے ڈبلیو کی کہانی سنی ہے؟'' اس نے ساحل سے پوچھا۔

''نہیں!'' ساحل سے پہلے ڈبلیو بول پڑا۔ ''میں آج کہانی نہیں سناؤں گا۔ سالا طاہر رو دے گا۔ اسے اپنے بچے کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''نہیں آئے گا۔'' طاہر نے کہا۔ وہ اس وقت مکمل ترنگ میں تھا۔ ''بچوں کے لیے میں نے دودھ کی نہر کھود دی ہے۔ وہ سالا فرہاد۔ فرہاد نہیں فراڈ۔ وہ شیریں کے لیے دودھ کی نہر نکالنے چلا تھا۔ اب عورت تو خود دودھ ہے۔ دودھ ہی دودھ۔ اسے دودھ نہیں چاہیے۔ دودھ بچے کی ضرورت ہے۔ میں نے دودھ کی نہر بچوں کے لیے نکالی ہے۔''

''کہانی سنو۔'' ڈبلیو نے کاؤنٹر پر ہاتھ مار کر سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

''ڈھاکہ میں ایک سوشل ورکر تھی' مس چوہدری۔ وہ چائلڈ لیبر کی ویلفیئر کے لیے کام کرتی اور عوامی تھیٹر بھی لگاتی تھی۔ ایک بار اس نے بہت درد بھری کہانی اسٹیج کی۔ رکشہ چلانے والے ایک بچے کو اپنے بیمار باپ کی دوا خریدنے کے لیے سوا روپے کم پڑ رہے تھے۔ اس نے سوا روپے کی ایک سواری طے کر کے اسے گھر پہنچایا تو مسافر نے اسے صرف ایک روپیہ دیا اور کہا وہ چونی زیادہ مانگ رہا ہے۔ رکشے والا بچہ بہت گڑگڑایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دوسری سواری بہت دیر بعد ملی۔ دوا کے پیسے پورے ہوئے تو دوا کی دکان بند ہو چکی تھی۔ گھر پہنچا تو باپ مر گیا تھا۔ تھیٹر کے آخری سین نے لوگوں کو رلا دیا تھا۔''

ساحل کو کہانی کے انجام پر افسوس ہوا۔ لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ڈبلیو گھونٹ لے کر دوبارہ شروع ہو گیا۔

''مس چوہدری نے ڈرامہ ختم کرنے کے بعد گھر جانے کے لیے جو رکشا لیا اسے بھی ایک بچہ چلا رہا تھا اور اس سے بھی سوا روپے کا کرایہ طے ہوا تھا' لیکن گھر پہنچ کر مس چوہدری نے بھی صرف ایک روپیہ دیا اور بچے کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اس بچے کی ماں بیمار تھی اور دوا کے لیے پیسے کم تھے۔ گھر پہنچا تو اس کی ماں بھی مر چکی تھی۔''

''منافق عورت!'' ساحل منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''کہانی ختم نہیں ہوئی' پنچ لائن ابھی باقی ہے۔'' طاہر نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ڈبلیو نے اس بار بڑا سا گھونٹ لیا' اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

''وہ بچہ کوئی اور نہیں تھا۔ وہ میں تھا' میں!'' ڈبلیو نے گلاس کی پوری مائع حلق میں اتار لی اور سسکنے لگا۔ سب سے پہلے ٹونی نے اسے گلے لگایا' پھر راج نے اور آخر میں طاہر نے۔

''نہ رو میرے بچے! میرے بچے کو بھی دودھ نہیں ملا' آج کی رات وہ بھوکا سوئے گا۔'' اس کے ساتھ ہی طاہر بھی رونے لگا۔ ٹونی سب کو آنسو پونچھنے کے لئے ٹشو تقسیم کر رہا تھا۔

اس نے طاہر کو تسلی دی۔

''میری ٹرانسپورٹ کمپنی تمھارے بچے کے لیے دودھ حاصل کر کے رہے گی۔''

''وعدہ!'' ٹونی نے جواب میں سر ہلایا تو طاہر نے رونا بند کر دیا۔ اسی وقت پولا جو کاؤنٹر کے دوسرے کونے پر تھی' تیزی سے ان کی طرف آئی۔

''کیا رونے کا آئٹم ختم ہو گیا؟'' ٹونی نے اثبات میں سر ہلایا تو اسے غصہ آ گیا۔ ''میں نے کہا تھا میرا انتظار کرنا' آج مجھے بھی رونا تھا۔''

''کیوں؟ کیا تمھارے بچے کو بھی دودھ نہیں ملا؟''

''نہیں! میرے بچہ ہی نہیں ہے۔'' اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور رو پڑی۔ اس کے ساتھ ہی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے سب لوگ رو پڑے۔ ساحل روتے ہوئے شرابیوں کو چھوڑ کر خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اس کو سیّد پر سخت غصہ آیا تھا۔ شرابیوں کے ساتھ اس کے چار پانچ گھنٹے خواہ مخواہ ضائع ہوئے تھے۔ اسے پتا تھا انھیں صبح اٹھ کر مظاہرے کے بارے میں کیا' یہ بھی یاد نہ رہے گا کہ رات انھوں نے کیا کیا تھا۔

ساحل کا خیال صحیح نہیں تھا۔ مظاہرے میں جنوبی ایشیا کا سب سے نمائندہ جتھہ انھی لوگوں کا تھا۔ سو سے زیادہ لوگوں کا گروپ تھا جس کے شرکاء چاروں میں سے کسی نہ کسی ایک ملک کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ سب بہت بردبار اور سنجیدہ لوگ تھے۔ امن کے بارے میں اپنے پمفلٹ خود لکھ کر لائے تھے۔ طاہر ایک ٹورسٹ کو مظاہرے کے بارے میں سمجھاتا ہوا مکالمہ بول رہا تھا۔

''دن کی روشنی کسی بہت چھوٹے سے سوراخ سے طلوع ہوگی۔''

ooo

مظاہرے کی کامیابی کا جشن انھوں نے جیکسن ہائٹس کے ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں

نہاری کھا کر منایا تھا۔ تیز مرچوں کی وجہ سے غیر پاکستانی ہی نہیں، تکریم بھی سوں سوں کر رہی تھی لیکن سیلما ہری مرچیں بھی چاکلیٹ کی طرح چبا رہی تھی۔ شام کو ولیج کے ایک ریسٹورنٹ میں نینی نے کافی کی دعوت دی تھی۔

نینی نے مظاہرے میں شرکت کر کے تکریم کو حیران کر دیا تھا۔ تکریم نے اپارٹمنٹ میں میٹنگ کرنے کی اجازت لینے کے لیے اسے فون کیا تھا۔ یہ نینی کے باپ سرجن رحمان کا اپارٹمنٹ تھا اور وہ اسے میٹنگوں کے لیے بغیر اجازت استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نینی ایک دم جوشیلی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے فیشن شو کے لیے بہت مصروف تھی، لیکن کہا تھا ایک دن کے لیے آئے گی، مظاہرے میں شرکت کرے گی اور واپس چلی جائے گی۔

''میں اپنے روٹس کی طرف واپس آنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔ ''میری بیٹی کو شاید بہت عرصے تک پاکستان میں رہنا پڑے۔ میں نہیں چاہتی میں جا کر اس سے ملوں تو اجنبی نظر آؤں۔''

تکریم سمجھ سکتی تھی، پھر بھی اسے یقین نہیں تھا کہ نینی آئے گی۔ وہ نہ صرف خود آئی تھی بلکہ نیویارک کی فیشن کی دنیا کے دوستوں کو ساتھ لے کر مظاہرے میں شریک ہوئی۔ صحافیوں اور ٹی وی کیمرے کی ٹیمیں ان کے گرد جمع ہو گئی تھیں۔ نینی نے تکریم کا بازو تھام لیا تھا اور مظاہرے کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ''کچھ نہ کچھ کہیے'' کسی صحافی نے اصرار کیا تو اس نے امن کے موضوع پر چند منٹ بات کی۔ تکریم اس کا انداز اور بات کرنے کا سلیقہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ نینی مظاہرہ ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے اپنی دوستوں کے ساتھ چلی گئی تھی اور جاتے جاتے میک اور اس کے سب ساتھیوں کو کافی کی دعوت دے گئی تھی۔

جیکسن ہائٹس سے ولیج جاتے ہوئے ٹرین کے سفر میں تکریم اور سیلما ساتھ بیٹھی تھیں۔

''نینی تمھاری فرسٹ کزن ہے؟'' سیلما نے تکریم کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے

کہا۔

''نہیں، لیکن سگی بہن سے بڑھ کر ہے۔''

''پھر بھی، ذرا بچ کر رہنا۔'' سیلما نے کہنی مار کر شرارتی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تم نہیں جانتیں؟''

''کیا نہیں جانتی؟''

''She is a lissy!''

''کیا؟'' تکریم کی سمجھ میں نہیں آیا اور جب آیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''چند مہینوں پہلے میگزین نینی کی کہانی سے بھرے ہوئے تھے۔''

''میں Gossip میگزین نہیں پڑھتی۔''

''میں بھی صرف ڈینٹسٹ کے ویٹنگ روم میں اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے پڑھتی ہوں۔'' سیلما نے ذرا جھنجلا کر کہا، لیکن پھر موڈ ٹھیک کر لیا۔ ''اس کی طلاق کی وجہ بھی یہی تھی۔ نینی کا پیرس کی ایک ماڈل سے افیئر چل رہا تھا۔ ایک دن جب اس کے شوہر نے اپنے بیڈ روم میں دونوں کو محوِ اختلاط دیکھا تو نینی نے اپنی بند الماری کے پٹ کھول دیئے۔ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرتی، لیکن اب تردید بھی نہیں کرتی اور اپنی ماڈل محبوبہ کے ساتھ کھلے عام رہتی ہے۔ میاں بیوی بہت مہذب انداز میں الگ ہوئے تھے، لیکن بیٹی کی کسٹڈی کے لئے قانونی جنگ ہو رہی ہے۔

''کون جیتے گا؟''

''کسٹڈی کیسز میرا ایریا نہیں ہیں، لیکن دونوں کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ برسوں لڑ سکتے ہیں۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے۔'' تکریم کو سچ مچ دکھ ہوا تھا۔

''افسوس کی کیا بات ہے؟'' سیلما نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''کسی کی جنسی ترجیحات اس کے اپنے معاملات ہیں۔ اس میں کسی کو مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔''

اسی وقت ان کا اسٹیشن آ گیا۔ تکریم کو ٹرین سے اترتے ہوئے نیویارک میں نینی سے پہلی ملاقات یاد آئی۔ کس طرح وہ اسے بار بار گلے لگاتی اور بھینچتی تھی۔ دیر تک اپنے سینے پر اس کا ہاتھ رکھے بیٹھی رہی تھی۔ انکل رحمان شاید اس لیے زیادہ رنجیدہ تھے۔ ریسٹورنٹ میں کافی پیتے ہوئے تکریم نینی سے فاصلے پر بیٹھی رہی۔ سب جانے لگے اور ساحل نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اس نے فوراً ہاں کہہ دی۔ نینی کو جس کی لیموزین باہر انتظار کر رہی تھی، مایوسی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا ایئرپورٹ جانے تک تکریم اس کے ساتھ رہے گی۔ وہ اس سے اسلام آباد کی باتیں کرنا چاہتی تھی جو اب اس کی بیٹی کا شہر تھا۔

ساحل کو والڈروف آسٹوریا میں کسی نواب سے ملنا تھا۔ تین مہینے سے اس کا اسکالرشپ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو فون کیا تھا۔ دوسرے ہی دن برازیل سے کسی نواب کا فون آیا تھا جس نے کہا تھا وہ نیویارک آ رہا ہے۔ اس نے ساحل کو ہوٹل میں ملنے کا وقت دیا تھا۔ ساحل تکریم کے ساتھ ہوٹل پہنچا تو ریسپشن نے انھیں اوپر کمرے میں جانے کا پیغام دیا۔

کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو کافی دیر بعد کھرکھراتی ہوئی Come in کی آواز آئی۔

سامنے کے صوفے پر ہلکے کریم کلر کی سلکی قمیص اور پتلون پہنے ایک شخص بیٹھا تھا۔ سر پر سفید گھنگریالے بال اور آستین میں قیمتی کف لنک چمک رہے تھے، اس نے رعشہ زدہ ہاتھوں سے انھیں سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تکریم اسے تشویش سے دیکھتی ہوئی اسی طرح کھڑی رہی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''تم آ گئے! تم آ گئے!'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔

شاید سر کو ہلنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا یا آواز کو اندر آنے سے روک رہا تھا۔

تکریم نے ادھر ادھر دیکھا تو اسے ڈریسنگ ٹیبل پر گولیوں کے پتے رکھے نظر آئے۔ تکریم کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس نے ان میں سے ایک گولی نکال کر دی تو اس نے کچھ کہے بغیر منہ میں رکھ کر نگل لی اور دوبارہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ تکریم اب بھی اسے پہلے جیسی تشویش سے دیکھے جا رہی تھی۔

''تھینک یو!'' اس نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''بدتہذیبی معاف! کیا آپ اپنے لیے خود کافی بنا سکتی ہیں؟'' لہجہ بہت تھکا تھکا سا تھا۔

تکریم کچھ کہے بغیر سائن بورڈ کی طرف بڑھ گئی جہاں کافی بنانے کا سامان اور ہاٹ پلیٹ پر گرم کافی رکھی تھی۔ ''آپ کس طرح لیں گے۔'' تکریم نے پیالیاں سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس ڈرنک ہے۔'' اس نے ساتھ رکھی ہوئی میز سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ رنگ بتا رہا تھا کہ وہ شراب تھی۔

''آپ نے ابھی جو گولی لی ہے اس کے ساتھ الکحل نہیں لینا چاہیے۔''

''کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟''

''ابھی پڑھ رہی ہوں۔ اسکزوفرینیا (Schizofrenia) میری اسپشلائزیشن ہے۔''

''آپ نے پروفیسر گرین کا نام سنا ہے؟''

''جی ہاں! اس مرض کے بہت مانے ہوئے ماہر ہیں۔''

''پچھلے ایک سال سے وہی میرے ڈاکٹر ہیں۔ انھیں دکھانے خاص طور پر برازیل سے یہاں آتا ہوں۔ انھوں نے کبھی الکحل لینے سے منع نہیں کیا۔''

''ممکن ہے......''

اس نے تکریم کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔ ''جس دن آپ اپنی پریکٹس شروع کریں

گی، میں پروفیسر گرین کو چھوڑ کر آپ کا مریض بن جاؤں گا۔ آپ جو کہیں گی کروں گا۔ اس دن تک مجھے آزاد رہنے دیجیے۔'' اس نے گلاس ہلاتے ہوئے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا۔ ''میں نواب ہوں، نواب ٹن[1] ! تم ساحل ہو، فیاض منگی کے بیٹے؟'' نواب ٹن نے ساحل کی طرف رخ کیا۔

''جی ! یہ ڈاکٹر تکریم ہیں میری دوست !'' تکریم ساحل اور اپنے لیے کافی بنا کر ساحل کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

''فیاض منگی نے فون کیا تھا کہ تمھیں پچھلے تین مہینوں سے پیسے نہیں ملے۔ آئی ایم سوری، یہ میری غلطی ہے۔ میرے بینکنگ چینل تبدیل ہو رہے تھے اس لیے گڑ بڑ ہوئی۔'' نواب ٹن نے میز سے ایک لفافہ اٹھایا جس پر ساحل کا نام لکھا تھا۔ ''پچھلے تین مہینے کے بقایا جات اور اگلے تین مہینوں کا ایڈوانس، یہ چھ مہینے کی رقم کا چیک ہے۔''

نواب ٹن نے لفافہ بڑھایا تو ساحل کو لگا اس کے اندر سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ دماغ میں میک کی کہانی فلم کی طرح چلنے لگی۔ اس نے سوچا شاید پاکستان کے ہر بیوروکریٹ کی اولاد ایک نہ ایک دن اپنے باپ کی بددیانتی کے سامنے ننگی ہو جاتی ہو گی۔ تکریم کے سامنے ننگا ہونا اور برا لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا کاش وہ تکریم کو ساتھ نہ لایا ہوتا۔

''میرے اسکالرشپ کی رقم آپ کیوں ادا کرتے ہیں؟''

''تمھارے ڈیڈی نے نہیں بتایا؟''

''نہیں ! مجھے معلوم نہیں ڈیڈی نے آپ کے کیا کام کیے ہیں جن کی قیمت آپ میری فیس کی صورت میں چکاتے ہیں۔'' ساحل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ معلوم کرنا ضروری بھی نہیں ہے۔ مجھے یہ چیک نہیں چاہیے۔ آپ نے اب تک جو کچھ دیا ہے وہ بھی کبھی نہ کبھی سب کا سب لوٹا دوں گا۔''

''لوٹانا تو پڑے گا۔'' نواب ٹن نے مسکرا کر کہا۔ ''میں رشوت میں اسکالرشپ نہیں

---

[1] نواب ٹن کی مکمل کہانی ''وزیراعظم'' میں پڑھیے۔

دیتا۔ وظیفے میری فاؤنڈیشن دیتی ہے۔ اسکالرشپ لینے والے یہ Pledge دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں کسی ایک طالب علم کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ اُٹھائیں گے۔ آپ نے بھی دستخط کیے تھے' شاید آپ کو یاد نہیں۔ میں کسی نالائق شخص کو اسکالرشپ دے ہی نہیں سکتا۔ میرا سائیکل خراب ہو جائے گا' تم فیاض منگی کے بیٹے نہ ہوتے تب بھی اسکالرشپ حاصل کر سکتے تھے۔ تم اپنے ڈیڈی اور میرے بارے میں غلط اندازے لگا رہے ہو۔'' نواب ٹُن نے چیک والا لفافہ ایک بار پھر ساحل کی طرف بڑھایا۔

''میرا اندازہ غلط ہوا تو میں معافی مانگ لوں گا۔ چلیے تکریم!''

''بیٹھ جاؤ!'' نواب ٹُن سانپ کی طرح پھنکارا۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی اور لہجہ اتنا سرد تھا کہ سننے والا منجمد ہو جائے۔ نواب ٹُن ہپناٹائز کر دینے والے اپنے اس لہجے کے لیے مشہور تھا۔ ساحل کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ نواب ٹُن کی گھورتی نگاہوں کی تاب نہ لا کر نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔ تکریم تو اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تھی۔

''میں جانتا ہوں تم بھی انھی میں سے ہو۔ خود کو پارسا سمجھنے والے Self Sacrifising Idealist۔ جو امریکہ آ کر لفٹسٹ ہو جاتے ہیں یا نمازیں پڑھنے لگتے ہیں۔ جنھیں گھمنڈ ہوتا ہے کہ ان کے ماں باپ انھیں سمجھ نہیں سکے۔''

نواب ٹُن نے ایک بڑا سا گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔ تکریم نے اسے بہت تشویش سے دیکھا تھا۔ اس کے لیے وہ اس وقت صرف ایک مریض تھا۔

''تمھارا باپ میرے پسندیدہ لوگوں کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔'' نواب ٹُن نے سلسلۂ کلام دوبارہ شروع کیا۔ ''لیکن وہ راشی اور بد دیانت نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کے ایک ایک شخص کو جانتا ہوں کہ کس کس نے کب' کس سے اور کتنی رشوت لی۔ تمھارا باپ اس فہرست میں بھی نہیں ہے۔ وہ اگر بد دیانت ہوتا تو ملک کے سب سے زیادہ دولت مند لوگوں میں ہوتا۔ تم اس کی طاقت سے واقف نہیں ہو۔ وہ تمھیں پڑھانے کے لئے اسکالرشپ دلوانے کے

بجائے کرم قریشی کی طرح پینٹ ہاؤس خرید کر دے سکتا تھا۔''

ساحل نے درمیان میں کچھ کہنا چاہا' لیکن نواب ٹُن نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔

''تم جاننا چاہتے ہو تمھارے باپ نے میرے لیے کیا کیا تھا؟ اس نے مجھے زندگی دی تھی۔ زندگی! اس نے مجھے مرنے سے بچا لیا تھا۔''

نواب ٹُن کو کئی سال پہلے کی وہ رات یاد تھی جب اقتدار مافیا پر یہ راز کھلا تھا کہ وہ ان کے اجلاس ٹیپ کرتا ہے۔ فیاض منگی راتوں رات اسلام آباد سے ایئر فورس کے ایک جہاز میں ٹھکانے لگانے والی ٹیم لے کر کراچی آیا تھا۔ وہ رحم کرنے والا نہیں تھا۔ پھر بھی جانے کیوں اس نے نواب ٹُن کو ملک چھوڑنے کے لیے چار گھنٹوں کی مہلت دے دی تھی۔

''وہ ایک ایسی ہی سچویشن تھی۔'' نواب ٹُن نے تفصیل میں جائے بغیر کہا۔ ''میں اس وقت فیاض منگی کو کسی بھی کرنسی میں کروڑوں روپے یا ڈالر دے سکتا تھا۔ میرے اصرار پر پتا ہے اس نے کیا مانگا؟ بیٹے کے لیے اسکالر شپ حاصل کرنے میں مدد!'' نواب ٹُن کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دوبارہ رینگ آئی جو اس کی پہچان تھی۔

''اپنے ڈیڈی کو کبھی نہ بتانا کہ میں نے تم پر کیا راز کھول دیا ہے...... وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔'' نواب ٹُن نے ایک بار پھر لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ اس کے ہاتھ دوبارہ کانپنے لگے تھے۔ ''اپنے باپ کی کم از کم اس لیے عزت کرو کہ وہ بددیانت نہیں ہے۔ یہ اسکالر شپ تم پر بوجھ نہیں ہے' اسے لینے سے انکار نہ کرو۔''

ساحل نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا تو تکریم اٹھی اور نواب ٹُن کے ہاتھ سے لفافہ لے کر ساحل کو دے دیا۔

''ساحل! ہٹ دھرمی نہیں کرتے۔ یہ رشوت نہیں ہے۔ قرضہ ہے جسے تم لوٹاؤ گے۔''

ساحل نے ایک نظر تکریم کو دیکھا اور بجھے دل سے لفافہ لے لیا۔ اسے لگا اس کے ہاتھوں میں کوئی پہاڑ آ گیا ہو۔

15

اسلام آباد

فیاض منگی نے اپنی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو ایئر فورس اور نیوی کے سربراہ ایوانِ صدر سے واپس جا رہے تھے۔ وہ صدر ایمان علی کے ساتھ اپنی ہفتہ واری بریفنگ کے لیے آئے تھے۔ فیاض منگی کو حیرت ہوئی کہ آرمی چیف جنرل غلام اکبران کے ساتھ نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد زینے سے اترتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ جنرل اکبر اور ایمان علی اتر کر لان کی طرف جا رہے تھے۔ شاید انھیں کھلی ہوا میں ایسے محفوظ مقام پر گفتگو کرنا تھی جہاں کوئی اور ان کی بات نہ سن سکے۔ آج ایمان علی اپنے دفتر میں بہت مصروف رہا تھا۔ صبح سے چاروں صوبوں کے گورنروں کے ساتھ میٹنگ چل رہی تھی۔ ان اجلاس میں فیاض منگی کو بھی بیٹھنا پڑا تھا۔ پھر ایک کے بعد ایک تین غیر ملکی وفود آئے تھے۔ لنچ پر انفارمیشن منسٹر جلالی

اوراس کے بعد زرعی کوآپریٹوز کے حکام اپنے مسائل لے کر آ گئے تھے۔ شام کی چائے پر تینوں سروسز کے سربراہوں کی بریفنگ تھی۔

فیاض منگی کو معلوم تھا کہ جنرل اکبر زیادہ دیر ایمان علی کے ساتھ نہیں رہے گا کیونکہ آدھے گھنٹے بعد وہ ملاقات ہونے والی تھی جس کی خبروں سے آج کے اخبارات بھرے ہوئے تھے۔ سب نے ملاقات کی اہمیت پر تبصرے کیے تھے۔ قومی حکومت بننے کی پیش گوئیاں کی گئی تھیں۔ فیاض منگی دل ہی دل میں ہنسا تھا۔ اسے پتا تھا کہ یہ ملاقات کتنی بے معنی تھی۔ محض اخبارات کی توجہ اور پبلسٹی حاصل کرنے اور خبروں میں زندہ رہنے کا طریقہ! فیاض منگی نے سامنے میز پر رکھے ہوئے اخباروں کو دیکھا' سب کی شہ سرخیوں میں سردار کا نام سجا ہوا تھا۔ سردار نے اپنی ٹیم کی مدد سے یہ کام بہت مہارت سے کیا تھا۔ اس کے ذمے بس یہی کام تھا۔ توجہ کھینچے رکھنا۔ اصل کام دوسروں کے ذمے تھا۔

ایمان علی نے اپنے مشیروں کی رائے اور سردار کو نظرانداز کرنے کی خود اپنی حکمت عملی کے برخلاف سردار سے ملنا منظور کیا تھا۔ انفارمیشن منسٹر ذہین جلالی نے سخت مخالفت کی تھی۔ ایمان علی نے سمجھایا تھا کہ سرحدوں پر سخت کشیدگی ہے' جنگی ترانے بج رہے ہیں' ایسے میں اپوزیشن کو نظرانداز کیے رکھنا اچھا تاثر نہیں چھوڑے گا۔ ایمان علی نے جب سے بھارت کے خلاف سخت لہجہ اختیار کیا تھا اور فوجی مشقیں شروع کرائی تھیں' جنگ کے خلاف سردار کا باجا بند ہو گیا تھا۔ اس نے ٹریک بدل دیا تھا اور اب اپوزیشن کو اعتماد میں لینے کا مطالبہ کرنے لگا تھا۔ اس نے ایمان علی کو ملاقات کی پیشکش بھی کی تھی۔ ایمان علی نے بڑے پیمانے کی کسی ملاقات یا مذاکرات سے انکار کر کے سردار کو ون ٹو ون ملاقات کی دعوت دی تھی۔ فیاض منگی کو معلوم تھا یہ ملاقات بھی زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ سردار کی ملاقات کے صرف آدھے گھنٹے بعد وزیر خارجہ شاہ رخ اور وزیر خزانہ حبیب الحق آنے والے تھے' جبکہ آخری ملاقات کرم قریشی سے طے تھی۔

فیاض منگی کو ایمان علی کی ذہنی اور جسمانی توانائی پر حیرت ہوتی تھی۔ فیاض منگی کا خیال

تھا کہ کام کرنے کی اس جیسی توانائی کسی اور میں نہیں۔ لیکن ایمان علی نے اسے بھی مات دے دی تھی۔ بارہ گھنٹے لگاتار کام، میٹنگیں کرنا، صورت حال سمجھنا، اس کا تجزیہ کرنا، فیصلے کرنا اور پھر فیصلہ پر عمل درآمد کو یقینی بنانا۔ فیاض منگی دل ہی دل میں افسوس کرتا کہ یہ سب محنت بے کار جانے والی تھی۔

فیاض منگی کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ ایمان علی اپنے وزیروں مشیروں یا فوج کے سربراہوں سے کیا باتیں اور کیا فیصلے کرتا ہے۔ جو ہونا تھا اب وہی ہونا تھا۔ صرف چند دنوں کی بات تھی۔ اس کے وزیراعظم بننے میں چند ہفتوں کی دیر تھی۔ پہیہ گھوم چکا تھا۔ منصوبے کا آخری ٹکڑا بھی اپنی جگہ بٹھا دیا گیا تھا۔ کل امریکی سنٹرل کمان کا سربراہ جنرل چارلس ورتھ جنرل غلام اکبر سے ملنے فلوریڈا سے آیا تھا۔ اس نے ساڑھے تین گھنٹے کی طویل ملاقات کی تھی۔ فیاض منگی کو یقین تھا کہ جنرل اکبر نے ایمان علی کو ہٹانے کا امریکی مطالبہ مان لیا ہوگا۔ وہ منع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ فیاض منگی کو اطمینان تھا کہ نئی حکومت بنتے ہی جنگ کے بادل چھٹ جائیں گے۔ امریکہ بھارت کو پہلے ہی آمادہ کر چکا تھا۔ پروگرام طے تھا کہ امریکی صدر دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کو واشنگٹن آنے کی دعوت دے گا، جہاں ایک ایسے امن معاہدے پر دستخط ہوں گے جو سب کو مطمئن کر دے گا۔ فیاض منگی نے سوچا اس کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے روشن ہو جائے گا۔ پاکستان ہندوستان کے درمیان امن قائم کرنے کا وہ کام جو کوئی نہ کر سکا، اس کے ہاتھوں انجام پائے گا۔ وہ تصور میں دیکھنے لگا کہ وہائٹ ہاؤس میں امریکی صدر کے دائیں ہاتھ پر وہ اور بائیں ہاتھ پر بھارتی وزیراعظم کھڑے صحافیوں کے سوالوں کا جواب دے رہے ہیں۔ اسے بھارتی وزیراعظم کے ساتھ امن کا نوبل پرائز ملنے کا بھی یقین تھا۔

خوابوں کو جھٹک کر اس نے سرخ فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ اسے معلوم کرنا تھا کہ جنرل اکبر اور جنرل چارلس ورتھ کی میٹنگ میں کیا ٹائم ٹیبل طے ہوا۔ جنرل اکبر تیار بھی ہوا یا نہیں۔ رونالڈ نے اسے پاکستان میں کام کرنے والے چند بھارتی ایجنٹوں کے نام بتانے

جنرل اکبر کے ساتھ لان کی طرف جاتے ہوئے ایمان علی کے ذہن میں آدھے گھنٹے بعد سردار سے ہونے والی ملاقات گھوم رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا سردار کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے؟ سخت، نرم، مصالحانہ یا جارحانہ! یہ بات اسے یقین سے معلوم ہوگئی تھی کہ سردار کی پشت پر فوج نہیں ہے۔ ایمان علی کے وزیر دفاع جنرل منصف نے ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ فوجی قیادت ایمان علی کا تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ دوسرے مشیروں کا تجزیہ بھی یہی تھا کہ فوج ایک مقبول صدر کا تختہ الٹنے کی حماقت نہیں کرسکتی۔ جنرل منصف کو پتا تھا کہ فوج کے جنرل کشمیر پر فوج کشی کے حق میں ہیں، لیکن سردار سیاسی محاذ پر ان کی عقابوں والی سوچ کا نمائندہ نہیں تھا اور نہ ہی بھارت کے خلاف سردار اور فوجی قیادت کی جنگی سوچوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق تھا۔ سب کا خیال یہی تھا اور شواہد بھی تائید کرتے تھے کہ امریکہ نے سردار کا بُت ایمان علی پر دباؤ ڈالنے کے لیے کھڑا کیا تھا۔ سردار محض دھوکے کی ٹٹی تھا۔ امریکہ کا ایجنڈا کچھ اور تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ امریکی ایجنڈا معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ ایمان علی یہ سوچ کر مسکرایا کہ سردار کو ملاقات کی دعوت دے کر اسے اہمیت دینے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہ باور ہو جائے کہ ایمان علی فریب کھا گیا ہے۔ سب سردار کو کھلونا بنا کر کھیل رہے تھے۔ اس کھیل میں اب ایمان علی بھی شامل ہو گیا تھا۔ ایمان علی نے سوچا وہ یہ کھیل زیادہ دیر تک نہیں کھیلے گا ورنہ اس میں اور دوسروں میں فرق نہیں رہے گا۔ پہلے بھی سب اسی طرح کے کھیل کھیلتے اور کھیل ہی کھیل میں ملک کو برباد کرتے رہے تھے۔ ایمان علی تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کھیل کا مقصد کیا ہے۔

امریکی محکمۂ خارجہ کا ایک وفد پچھلے ہی ہفتے ایمان علی سے مل کر گیا تھا اور انھوں نے پاکستان میں چین کے لیے ایک مانیٹرنگ پوسٹ قائم کرنے کا وہ مطالبہ دہرایا تھا جو امریکی سفیر نیل میکفارلین پہلے کر چکا تھا۔ وزیر خارجہ شاہ رخ اپنے اس تجزیے پر قائم تھا کہ امریکی مطالبہ محض اسموک اسکرین ہے۔ کئی اور شواہد بھی یہ تجزیہ صحیح ثابت تے تھے۔ ایمان علی ایک روزہ

دورے پر چین گیا تو دفتر خارجہ کے افسروں نے چینی وزارت خارجہ کے حکام کو امریکی مطالبے کے بارے میں بتایا تھا۔ انھوں نے کوئی تشویش ظاہر کی نہ تفصیلات جاننے اور کریدنے کی کوشش کی۔ ایمان علی سے ملاقات کے دوران چینی صدر نے بھی یہ موضوع نہیں چھیڑا۔ کیا انھیں معلوم تھا؟

کئی تھیوریاں زیر بحث آئی تھیں، لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ بڑا سا سوالیہ نشان ابھی تک کھڑا تھا کہ امریکہ کیا کرنا چاہتا ہے اور جو کچھ کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے۔ آغا شاہ رخ کا اصرار تھا کہ تجزیوں سے کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہے۔ کسی طرح اندر کی خبر کھوجنا ہوگی۔ ایمان علی کو امید تھی شاید کوئی خبر آج مل جائے۔ مسز چنائے اپنی چھٹیاں بیچ میں چھوڑ کر اچانک واپس آ گئی تھی۔ کرم قریشی اور مسز چنائے نے فوری ملنے کی درخواست کی تھی۔ دونوں آج شام ملنے والے تھے۔ کیا وہ کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟

○ ○ ○

''تشریف رکھیے۔'' ایمان علی نے لان کے اس کونے میں پہنچ کر جہاں میز اور کرسیاں رکھی تھیں، جنرل اکبر کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

''صدر محترم! اگر مناسب سمجھیں تو ہم ٹہلتے ہوئے بات کر سکتے ہیں۔'' جنرل اکبر نے اسی طرح کھڑے کہا تو ایمان علی نے اثبات میں سر ہلا کر ٹہلنے کے لیے قدم اٹھا لیا۔

''مجھے معلوم ہے کچھ دیر میں آپ کی بہت اہم میٹنگ ہے جس کے لیے آپ کو تیاری بھی کرنا ہوگی۔'' جنرل اکبر نے ایمان علی کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے صرف پانچ منٹ لوں گا۔''

''سردار سے میری ملاقات اتنی اہم نہیں نہ مجھے تیاری کی ضرورت ہے۔'' ایمان علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کہیں زیادہ اہم آپ سے ہونے والی یہ میٹنگ ہے۔ آپ

جتنا وقت چاہیں لے سکتے ہیں۔''

جنرل اکبر کچھ دیر کے لیے خاموش رہا۔شاید بولنے سے پہلے الفاظ تول رہا تھا۔

''جنرل اکبر!'' ایمان نے وقفے کا فائدہ اٹھایا۔'' حالات میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی کہ میں اپنا فیصلہ بدل سکوں۔اگر آپ ایٹمی ہتھیاروں کی کمان کے بارے میں......''

''جناب صدر! ہمیں اس وقت اس سے زیادہ سنگین مسئلہ درپیش ہے۔'' جنرل اکبر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں یقین ہے ایوانِ صدر میں کوئی Mole ہے۔جاسوس' جو دشمن کو خبریں پہنچا رہا ہے۔'' جنرل اکبر نے دھماکہ کیا۔ایمان علی رک کر کھڑا ہو گیا اور جنرل اکبر کو دیکھنے لگا۔

''یہ ناممکن ہے۔'' اس نے دوبارہ قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔''میری کابینہ میں کوئی ایسا نہیں جس پر شبہ کیا جا سکے۔کابینہ کے علاوہ اہم فیصلوں تک کرنل افتخار اور فیاض منگی کی رسائی ممکن ہے۔وہ دونوں آزمودہ ہیں۔الیکٹرانک بگز استعمال ہو سکتے ہیں' لیکن کرنل شفقت صبح شام چیک کراتے ہیں۔میرا خیال ہے وہ بھی شبہے سے بالاتر ہیں۔''

''کوئی شبہے سے بالاتر نہیں ہے۔جب تک چور پکڑا نہ جائے سب شبہے کی زد میں ہیں۔'' اس بار جنرل اکبر رک کر کھڑا ہو گیا۔''ہم اس Mole کو جلد پکڑ لیں گے۔صرف آپ کی اتھارائزیشن چاہیے۔''

''میری اتھارائزیشن کی ضرورت نہیں ہے۔یہ آئی ایس آئی کا کام ہے۔انھیں کہیے اس کام کو Top priority حاصل ہونا چاہیے۔ایوان صدر میں دشمن کے جاسوس کا مطلب ہے دشمن ہماری سرحد میں گھس آیا ہے۔جنرل شہباز سے کہیے مجھے فوری رپورٹ کریں۔''

''جناب صدر! ہمیں ایوان صدر کا مکمل تعاون چاہیے۔''

''آپ کو میرا مکمل تعاون حاصل ہے۔General, get that bastard!''

''تھینک یو مسٹر پریذیڈنٹ!'' جنرل اکبر نے اجازت لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے

ہوئے کہا۔

''کل جنرل چارلس ورتھ نے آپ سے ملاقات کے دوران چین کے لیے مانیٹرنگ پوسٹ کا ذکر کیا تھا؟'' ایمان علی نے جاتے جاتے اچانک پوچھ لیا۔

''نو سر!'' جنرل اکبر نے پلکیں جھپکائے بغیر کہا۔ ''میں نے ان سے ہونے والی پوری گفتگو آپ کو رپورٹ کر دی ہے۔''

''تھینک یو اینڈ گڈ نائٹ'' ایمان علی نے مصافحہ کیا اور جاتے ہوئے جنرل کو دیکھ کر سوچنے لگا امریکہ نے اپنی اسموک اسکرین جنرل کے منہ پر کیوں نہیں پھینکی؟ یا جنرل اکبر جھوٹ بول رہا تھا؟

ooo

سردار ایمان علی سے ملنے اکیلا ہی آیا تھا۔ صرف ڈرائور اور ایک باڈی گارڈ ساتھ تھا۔ ایمان علی نے جب سردار کو ملاقات کی دعوت دی تھی تو سردار کے ساتھیوں نے مل کر ''ہرا'' کا نعرہ لگایا تھا اور رات کو سردار اور رخسار نے شیمپین کے جام ٹکرائے تھے۔ جب ایمان علی نے صرف ون ٹو ون ملاقات کے لیے کہا تو سردار کے مشیروں نے برا سا منہ بنایا تھا لیکن سردار کا دل بلّیوں اُچھلا تھا۔ ون ٹو ون کا مطلب تھا ایمان علی اس سے ذاتی بنیاد پر کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے' شاید وہ اسے اقتدار میں شرکت کی پیش کش کرے۔ سردار نے سوچا کہ اگر ایمان علی نے ایسی کوئی پیشکش کی تو وہ فوراً قبول کر لے گا اور بساط ان چہروں پر الٹ دے گا جو اسے مہرہ بنا کر چالیں چل رہے تھے۔

سردار دل ہی دل میں سوچ کر ہنسا کہ اسے کٹھ پتلی بنا کر ڈوریاں ہلانے والے اسے بے وقوف سمجھ رہے تھے۔ سردار نے کوئی عقل مندی دکھانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور فیاض منگی جو فائل دے گیا تھا اسے بائبل سمجھ کر اس پر عمل کیا تھا۔ مشیروں کی جو فہرست دی گئی تھی صرف انھی

کے مشوروں پر چلا تھا۔ اسے دی جانے والی ٹیم سردار اور سردار کے دوستوں کے درمیان دیوار بن گئی تھی۔ سردار کے پرانے ساتھی اب بے چین ہونے لگے تھے۔ سردار نے انھیں صبر سے کام لینے کے لیے کہا تھا۔ اسے دیکھنا تھا اسے کھلونا بنا کر کھیلنے والے آخری چال کب چلیں گے۔ وہ اپنا کھیل اس وقت کھیلے گا جب اس کے کندھے پر بندوقیں رکھ کر چلانے والے اپنی توپ داغ چکے ہوں گے، جب وہ اقتدار حاصل کر چکا ہوگا۔

سردار کو معلوم تھا کہ وہ فیاض منگی اور ان کے سرپرستوں کی مجبوری تھا۔ وہ اسے اس لیے سامنے لائے تھے کہ صرف وہی ایمان علی کو کامیابی سے چیلنج کر سکتا تھا، لیکن وہ کٹھ پتلی بن کر حکومت نہیں کرے گا۔ اس نے فیاض منگی کو یقین دلایا تھا کہ صدر بنتے ہی اسے وزیراعظم بنائے گا۔ وہ یہ وعدہ پورا کرے گا، لیکن پھر اسے ذلت آمیز طریقے سے معزول کر کے اپنا انتقام لے گا۔ فیاض منگی نے خود بھی اس کے ساتھ یہی کیا تھا۔ سردار کو فیاض منگی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ اقتدار کے رکھوالوں سے براہ راست تعلق قائم رکھ سکتا تھا۔ قربان ہونا فیاض منگی کا مقدر تھا۔ یہ سوچ کر سردار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

سردار یہ بھی جانتا تھا کہ ایمان علی کو اقتدار سے الگ کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس کی جڑیں بہت مضبوط تھیں۔ اسے اکھاڑنے میں بہت وقت لگ سکتا تھا۔ سردار اقتدار سے کئی سال تک الگ رہا تھا، اب مزید انتظار مشکل تھا۔ ایمان علی نے پیشکش کی تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ وہ اور ایمان علی دونوں کے خاندان اپنے اپنے علاقوں کے تمن دار رہے تھے۔ دونوں کا طبقہ ایک تھا، شوق ایک سے تھے۔ دونوں ساتھ شکار کھیل چکے تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں تھا۔ وہ ایمان علی کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ اور پھر ایمان علی کو اندر سے تارپیڈو کرنا زیادہ آسان ہوتا۔ سردار کو فیاض منگی اور اس کے ساتھیوں کی پروا نہیں تھی۔ بلکہ اس نے سوچا اقتدار میں ساجھے داری کے بعد بھی پہلی قربانی فیاض منگی کی ہی دی جائے گی۔ وہ فیاض منگی کے بارے میں ایمان علی کو بتا دے گا۔ ایمان علی کے ساتھ کام کرنے کے لیے اس کا

اعتماد جیتنا ضروری تھا۔ ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ سردار نے سوچا وہ ایسی پوزیشن میں ہے جب چت بھی اس کی ہے اور پٹ بھی اس کی۔

سردار کی کار جب چھوٹی سی گلی میں مڑ کر رکی تو ایمان علی کے ایوان صدر کو دیکھ کر سردار کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ جب کرنل افتخار اس کے ساتھ ایمان علی کے دفتر جانے کے لیے زینے چڑھنے لگا تو اس کا سینہ فخر سے تن گیا۔ اسے اپنے دورِ صدارت کے وہ سال یاد آ گئے جب ایکڑوں میں پھیلے' اونچی فصیلوں' ماربل کے ستونوں' لمبی راہداریوں' بڑے بڑے ہالوں اور اُونچی چھتوں والے ایوان صدر میں رہ کر اس نے صدر کے منصب کی شان اور عظمت میں اضافہ کیا تھا۔ ایمان علی کا ایوانِ صدر تو غربت' تنگی اور فرسودگی کی علامت تھا۔ سردار نے دل ہی دل میں عہد کیا وہ ایوانِ صدر کی شان و شوکت بحال کرے گا۔ ایمان علی نے عجائب گھر کے نام پر اصلی ایوانِ صدر میں جو کچرا جمع کیا تھا اسے باہر پھنکوا دے گا' اندر لگے ہوئے مجسموں کو اپنے ہاتھ سے پاش پاش کر دے گا۔ اس کے دورِ صدارت سے بت شکنی کے نئے دور کا آغاز ہو گا۔

ایمان علی نے اپنے دفتر سے باہر آ کر سردار کا استقبال کیا۔ سردار اس سے بہت گرم جوشی سے بغل گیر ہوا تھا۔ کافی پیتے ہوئے دونوں پرانے وقتوں اور اپنے اپنے خاندانوں کی باتیں اور کچھ دیر عالمی حالات پر تبصرے کرتے رہے۔ اس دوران فوٹو گرافرز اور ٹی وی کیمرے ان کی تصویریں لے رہے تھے۔ ان کے جاتے ہی ایمان علی نے کام کی بات شروع کی۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری دعوت قبول کی۔ دشمن سے نمٹنے کے لئے ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہ اس کا بریف ہے۔'' ایمان علی نے سردار کی طرف ایک فائل بڑھائی۔ ''یہ ٹاپ سیکریٹ ڈاکومنٹ صرف آپ کی نظروں کے لیے ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم جو کچھ کر رہے آپ کو اس کا علم ہو۔''

’’مجھے خوشی ہے کہ حکومت نے ہمارا مطالبہ تسلیم کر کے بھارت کے خلاف سخت موقف اختیار کیا ہے۔‘‘ سردار نے فائل لیتے ہوئے کہا۔ ’’ہمیں یقین ہے کہ ہم متحد ہو کر اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر دشمن کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔‘‘

’’جنگ کوئی اچھا حل نہیں ہے۔ وہ ہمارے ترقیاتی پروگراموں کو کئی سال پیچھے لے جائے گی۔‘‘ ایمان علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’لیکن اگر بھارت نے جنگ تھوپنا چاہی تو وہ ہمیں پوری طرح تیار پائے گا۔‘‘

’’مجھے یقین ہے۔ مجھے یقین ہے۔‘‘ سردار نے زور زور سے سر ہلایا۔ ’’ہماری فوجیں دشمن کا مقابلہ کرنے کی پوری اہلیت رکھتی ہیں۔ ہمارا ایٹمی پروگرام اسے نیست و نابود کر دے گا۔‘‘ سردار نے تھوڑا سا توقف کیا اور پھر براہِ راست مطلب پر آ گیا۔ ’’یہ ایک نازک گھڑی ہے۔ ہمیں اپنے اختلافات پس پشت ڈال کر قومی حکومت بنانی چاہیے۔ پوری قوم ایک چھتری کے نیچے جمع ہو گئی تو دشمن ہمارا اتحاد دیکھ کر آنکھ اٹھانے کی ہمت نہیں کرے گا۔‘‘

’’میں آپ سے متفق ہوں‘ لیکن اس وقت قومی حکومت بنانا پریکٹیکل نہیں ہے۔‘‘ ایمان علی نے صاف صاف جواب دیا۔ ’’ہم نئے آئین پر ریفرنڈم کرانے اور نئے انتخابات کی تیاری کر رہے ہیں۔ حکومت کا ڈھانچہ بدلا تو یہ کام پیچھے چلا جائے گا۔‘‘ ایمان علی نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر سردار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ کچھ کہا جسے سننے کے لیے سردار بے تاب تھا۔ ’’قومی حکومت ضروری نہیں ہے۔ آپ اس کے بغیر بھی ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ ہمارے ساتھ مل کر کام کریں۔‘‘

سردار کے سوکھے دھانوں میں جیسے پانی پڑ گیا۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ ایمان علی اسے اپنی حکومت میں شامل ہونے کی پیشکش کر رہا تھا۔ سردار سوچنے لگا وہ کس عہدے کے لیے سودے بازی کرے۔ نائب صدر یا وزیر اعظم! ایمان علی کی حکومت میں وزیر اعظم کوئی نہیں تھا۔ صدر ہی چیف ایگزیکٹو بھی تھا۔ سردار کو یقین تھا ایمان علی اسے وزیر اعظم نہیں بنائے گا۔

نائب صدارت ہی ٹھیک تھی۔ صدر کا عہدہ اس کے صرف ایک دھڑکن کے فاصلے پر رہے گا۔ آئین میں نائب صدر کا عہدہ نہیں تھا۔ لیکن نیا آئین ابھی پیش نہیں ہوا تھا۔ گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔ اس نے سوچا فوری ہاں کہنا کمزوری سمجھا جائے گا۔ اس وقت ڈھکے چھپے لفظوں میں عندیہ دینا کافی ہوگا۔

''میرا ہر سانس میری قوم کی امانت ہے۔ ملک کو اس نازک گھڑی میں مشکل سے نکالنا میرا فرض ہے۔'' سردار نے کوئی عجلت ظاہر کیے بغیر کہا۔ ''مجھے آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے میں خوشی ہوگی' لیکن یہ ایک بڑا قدم ہے' مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا ہوگا۔''

''یقیناً!'' ایمان علی نے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ سردار اس کی بات کا کیا مطلب سمجھ رہا تھا؟ ایمان علی نے سوچا سردار کی غلط فہمی دور کر دے' مگر کیوں؟ دشمن کی صفوں میں کنفیوژن پھیلانا بری حکمت عملی نہیں تھی۔ وہ یہ سوچ کر مسکرایا کہ اسے بھی سیاست کرنا آ گئی تھی۔

''آپ اگلے ہفتے کی رات میری حویلی میں قیام کیجیے۔'' سردار نے ایمان علی کو امید بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''ہم دوسرے دن علی الصبح شکار کھیلیں گے اور لنچ پر تفصیلات طے کر لیں گے۔''

''آپ کو حالات کا اندازہ ہے۔'' ایمان علی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ ''میں ایک منٹ کے لیے بھی دفتر سے قدم نہیں نکال سکتا۔ آج کل اتوار کو اپنی ماں سے ملنے بھی نہیں جا پاتا۔ کرم قریشی میرے سیاسی امور کے مشیر ہیں' وہ آپ سے رابطے میں رہیں گے۔''

''وعدہ کیجیے کہ آپ ایک دن میرے گاؤں ضرور آئیں گے۔''

''صدارت سے ریٹائر ہونے کے بعد میں آپ کے گاؤں میں ایک نہیں کئی دن گزاروں گا۔''

''میں اس دن کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔'' سردار نے پورے خلوص سے کہا۔

ایمان علی اسے چھوڑنے دروازے تک آیا۔ جہاں سے کرنل افتخار اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ ایمان علی اسے جاتا دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ وہ سردار کو برطانیہ کا سفیر بنانے کی پیشکش کرے گا۔ ایک مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے یہ کوئی برا سودا نہیں تھا۔

سردار کو اپنی کار میں بیٹھ کر واپس جاتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ایمان علی کا قلعہ فتح کر آیا ہو۔ اسے یقین ہو رہا تھا کہ منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ اس بار وہ صدر بنا تو تاریخ میں اس کا دورِ صدارت سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔

○ ○ ○

وزیر خزانہ حبیب الحق نے ایمان علی سے ملنے ایوان صدر کے دروازے میں قدم رکھا تو اسے بھی یقین تھا کہ اس کا نام تاریخ میں ضرور جگہ پائے گا۔ صرف پاکستان کی نہیں دنیا کی تاریخ میں۔ اس نے اپنی بغل میں دبی ہوئی فائل کو تھپ تھپایا جیسے خود اپنی کمر تھپک رہا ہو۔ وہ پوری دنیا کے لیے ایک مثال قائم کرنے جا رہا تھا۔ اس کی گردن فخر سے تن گئی۔ وہ جو خواب دیکھتا رہا تھا اس کی تعبیر نکلنے والی تھی۔ آئی ایم ایف سے پنجہ لڑانے کا منصوبہ حبیب الحق نے بنایا تھا لیکن اسے حقیقت بنانے کے لیے ایمان علی کی جرأت اور بڑی طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ چاہیے تھا۔ حبیب الحق کو خوشی تھی کہ وزیر خارجہ شاہ رخ نے اس کے منصوبے کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ ساتھ دیا تھا۔ ایمان علی نے شاید اسی لیے آج کی میٹنگ میں آغا شاہ رخ کو بھی بلایا تھا۔ اس منصوبے میں آغا شاہ رخ کا کردار اہم تھا۔

حبیب الحق نے ہارورڈ سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کی تو اس کا شمار ذہین ترین طلبہ میں ہوتا تھا۔ وہ اس زمانے میں بھی تیسری دنیا کے معاشی نظام میں انقلاب لانے کی باتیں کرتا تھا۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ آئی ایم ایف تیسری دنیا کے ملکوں کی معیشت میں اصلاح اور

ان کے معاشی ڈھانچے کو بہتر بنانے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس لیے اس نے پرائیویٹ سیکٹر میں جانے یا یونیورسٹی میں پڑھانے کے بجائے آئی ایم ایف میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی جہاں وہ آئی ایم ایف کے ایک ہزار کنسلٹنٹس کی اس فوج میں شامل ہوگیا، جن کی انگلیوں پر تیسری دنیا کی معیشتیں ناچ رہی تھیں۔ اسے 63 ہزار ڈالر سالانہ کا سب سے نچلا اسکیل ملا تھا۔ اس کے ساتھ نوے ہزار ڈالر کی تنخواہ پر بھرتی ہونے والے بھی شامل تھے، لیکن حبیب الحق کو پروا نہیں تھی۔ جو کچھ مل رہا تھا وہ بھی اس کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ دولت کمانے نہیں دنیا بدلنے آیا تھا۔

اسے وہ دن یاد تھا جب وہ نئے بھرتی ہونے والوں کے لیے دو ہفتوں کے تربیتی پروگرام میں شرکت کرنے پہنچا تھا۔ واشنگٹن میں آئی ایم ایف کے ہیڈ کوارٹرز کی عمارت سے دو بلاک دور شمال میں واقع آئی ایم ایف انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں داخل ہوا تھا تو جسم میں بے حد توانائی، دل میں زبردست ولولے اور آنکھوں میں خواب ہی خواب تھے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کا سربراہ محسن خان اس کا ہم وطن تھا۔ اس نے حبیب الحق کا خاص خیال رکھا تھا۔ اسے ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں وہ مقام دکھانے بھی لے گیا تھا جہاں ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے تھے۔

بارہویں فلور پر تقریباً ساٹھ فٹ لمبے بیضوی شکل کے خالی کمرے کی خاموشی بہت پر ہول تھی، لیکن نیلے رنگ کے قالین نے فضا میں ہلکی سی نرمی پیدا کر دی تھی۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں بورڈ آف ڈائریکٹرز کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ لمبی سی میز کے گرد ڈائریکٹروں کے لئے تیس کرسیاں رکھی تھیں اور دیواروں پر سابق مینجنگ ڈائریکٹرز کی قد آدم تصویریں آویزاں تھیں۔

''حبیب! یہاں ایک دن تمھاری تصویر بھی لگ سکتی ہے۔'' محسن خان نے مسکرا کر کہا۔

''یہاں آپ کی تصویر نہیں لگی تو میری بھی نہیں لگ سکے گی۔'' حبیب الحق نے جواباً مسکرا کر کہا۔ ''یہاں لگنے والی تصویریں وہ مصور بناتے ہیں جنھیں ہمارے خدوخال اور رنگ

پسند نہیں ہیں۔''

محسن خان نے حبیب الحق کو گہری سنجیدگی کے ساتھ دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اجلاس کے صدر کے لیے مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ پھیرتا گہرے سانس لیتا رہا۔ شاید کرسی کے چمڑے کی نرمی محسوس کر کے اس کی خوشبو اپنے نتھنوں میں بسا رہا تھا۔

''یہاں خواب نہیں دیکھے جاتے۔'' محسن خان کی آنکھوں میں انتباہ کی سرخ لالٹین جھول رہی تھی۔ ''یہ جگہ آئیڈیلزم کے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہاں صرف عملیت پسندی اور زمینی حقائق کام آتے ہیں۔ یہ سبق یاد رکھنا۔''

حبیب الحق کو محسن خان کا دیا ہوا سبق سمجھنے اور یہ جاننے میں دو سال لگے کہ سسٹم سے لڑنا مشکل ہے۔ وہ تیسری دنیا کو غریب سے غریب تر ہوتے اور قرضوں کے جال میں الجھتا ہوا دیکھتا رہا۔ 1970ء تک تیسری دنیا کا قرضہ ایک سو ملین تھا جو اگلے پندرہ بیس برسوں میں بڑھ کر ڈیڑھ ٹریلین ڈالر تک پہنچ گیا تھا۔ آئی ایم ایف مسیحائی کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ حبیب الحق کو سب سے زیادہ تکلیف یہ دیکھ کر ہوئی کہ آئی ایم ایف کی سرپرست طاقتیں کام آسان بنانے کے بجائے تیسری دنیا پر اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے آئی ایم ایف کو استعمال کر رہی تھیں۔ دو سال بعد حبیب الحق نے آئی ایم ایف کی ملازمت سے استعفیٰ دیا تو اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

کچھ عرصے امریکہ ہی میں ایک تھنک ٹینک کے لیے کام کرتا رہا اور پھر پاکستان آ گیا جہاں ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف سے نکل کر آنے والے ماہرین کو سر پر بٹھایا جاتا تھا۔ حبیب الحق کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک دور ایسا آیا جب وہ وزیرِ خزانہ بن گیا۔ اسے وزیر بننے کی خوشی اس لیے ہوئی تھی کہ وہ ان خوابوں کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا جو اس نے پاکستان جیسے ملک کی معیشت کو سنوارنے کے لیے دیکھے تھے۔ دو سال کی وزارت میں کوئی ایک خواب بھی تعبیر نہ بن

سکا تو استعفیٰ دے کر پھر ریسرچ سے وابستہ ہوگیا۔ وہ ان حکم رانوں کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتا تھا جن میں جرأت تھی نہ بصیرت! ایمان علی نے جب اسے اپنی ٹیم میں شامل کرنے کی پیشکش کی تھی تو وہ تذبذب کا شکار تھا۔ اس کا پچھلا تجربہ اچھا نہیں تھا' پھر بھی اس نے ہاں کہہ دی۔ اسے اپنے فیصلے پر افسوس نہیں کرنا پڑا۔ ایمان علی نہ صرف اس کے خوابوں میں جھانک سکتا تھا بلکہ خوابوں کی کوکھ سے تعبیر برآمد کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔

حبیب الحق نزدیک پہنچا تو ایمان علی اور شاہ رخ کسی گہری گفتگو میں الجھے ہوئے تھے۔ حبیب الحق کے آنے کے بعد جلد ہی انھوں نے اپنی بات مکمل کر لی اور وزیر خزانہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''سب کچھ اس میں ہے۔'' حبیب الحق نے فائل ایمان علی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''سب کچھ وہی ہے جس پر ہم پچھلے تین برسوں میں بات کرتے رہے ہیں۔ منصوبے کے ایک ایک جزو کی تفصیل۔ برے سے برا کیا ہو سکتا ہے اور اچھے سے اچھا کیا' دونوں منظر نامے ہیں۔''

ایمان علی فائل کے ورق پلٹتا رہا۔ سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد اس نے فائل آغا شاہ رخ کی طرف بڑھا دی۔ ایمان علی کی طرح آغا شاہ رخ کو بھی حبیب الحق کے منصوبے کی سب جزئیات کا علم تھا۔ وہ بھی سرسری طور پر ورق الٹتا رہا۔ اس عرصے میں مکمل خاموشی تھی۔ ایمان علی کو پتا تھا حبیب الحق کے منصوبے کا پہیہ گھوما تو کتنا بڑا دھماکہ ہوگا۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ آئی ایم ایف کی شرائط مکمل طور پر رد کر دی جائیں گی۔ حبیب الحق کی دلیل تھی کہ آئی ایم ایف کی مدد کسی ملک کی معیشت ٹھیک نہ کر سکی۔ پاکستان تو صرف ایک دو بلین کے پھیر میں تھا' آئی ایم ایف کا نسخہ ان کی صحت ٹھیک نہ کر سکا تھا جنھیں اس نے بھاری قرضے دیے تھے۔ پچھلے آٹھ دس برسوں میں کوریا کو 51' میکسیکو کو 50' برازیل کو 41' انڈونیشیا کو 33' روس کو 22 اور تھائی لینڈ کو 17 بلین ڈالر کے پیکج ملے تھے' لیکن ان کی معاشی حالت سنبھل نہیں سکی۔

ارجنٹائن اور ترکی کی کہانی بھی یہی تھی۔ وہ ممالک بہتر رہے جو آئی ایم ایف کے جال میں نہیں پھنسے تھے۔ ملائیشیا تازہ مثال تھا جس نے ایشیا کے معاشی بحران کے دوران آئی ایم ایف کی مدد لینے سے انکار کیا اور بحران سے نکل گیا۔ حبیب الحق کو یاد تھا تھائی لینڈ آخر تک آئی ایم ایف کا پیکج لینے سے منع کرتا رہا تھا' لیکن بغیر کوئی دعوت ملے آئی ایم ایف کے افسر بنکاک جا کر سر پر بیٹھ گئے تھے۔ تھائی لینڈ کو ہتھیار ڈالنے پڑے تھے اور ابھی تک انڈونیشیا کی طرح پھنسا ہوا تھا۔

''برے سے برا منظر نامہ کیا ہے؟'' ایمان علی نے پوچھا تھا۔

''آئی ایم ایف' ورلڈ بنک اور او ای سی ڈی کے ملکوں سے سرمائے کی آمد رک جائے گی۔ ہم نادہند ہو جائیں گے' ادائیگیوں کا توازن خراب ہوگا اور ہمارے روپے کی قیمت گر جائے گی۔''

''یعنی ہم دیوالیہ ہو جائیں گے؟''

''نہیں! یہی منظر نامہ ہمارے مسائل کا حل بن جائے گا۔ غیر ملکی سرمایہ کاری پہلے بھی کم ہے اس لیے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ قرضے لینا ہم خود بند کر دیں گے اور قرضوں کی واپسی کی شرائط ہم خود طے کریں گے۔ ہم نادہند ہونے سے پہلے حملہ کریں گے۔ ری شیڈولنگ بھی ہم خود کریں گے' پیرس کلب کے پاس جا کر نہیں گڑگڑائیں گے۔ قرضوں کی واپسی برآمدات کی آمدنی کے ایک حصے سے منسلک ہو جائے گی' جس طرح ایک زمانے میں جنوبی امریکہ کے ملکوں نے کیا تھا۔ جن قرضوں پر اصل کے برابر یا زیادہ سود دیا جا چکا ہے' ان کی واپسی معطل کر کے لانگ ٹرم بانڈز جاری کیے جائیں گے۔ شارٹ ٹرم قرضوں کے بھی لانگ ٹرم بانڈز جاری ہوں گے جنھیں کیپٹل مارکٹ میں خریدا اور بیچا جا سکے گا۔

''کون خریدے گا؟''

''ہم خود! تجارتی بنک ہمارے قرضے بیچ کر جان چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ مارکیٹ سے ہمارے بروکرز چالیس پچاس سینٹ فی ڈالر کے حساب سے یہ قرضے اٹھالیں

گے۔قرضوں کی واپسی قابو میں ہوگی تو ریزروز کی صورت حال خراب نہیں ہوگی۔ادائیگیوں کا توازن بھی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ ہماری کپاس اور چاول کی کیش لانے والی فصلیں اچھی ہو رہی ہیں۔اوورسیز پاکستانیوں کا بھیجا جانے والا زرمبادلہ بھی بڑھا ہے۔روپے کی قیمت کم ہوگی تو برآمدات بڑھیں گی اور درآمدات کم ہوں گی۔ لیکن ہم قیمت اتنی نہیں گرنے دیں گے کہ دیوالیہ ہو جائیں۔کرنسی کی عالمی منڈی میں ہمارے روپے کا لین دین بھی اتنا نہیں ہے۔بس ہمیں درآمدت قابو میں رکھنا ہوں گی۔''

''کوئی اور اچھا منظر نامہ؟''

''عرب مغربی ملکوں اور امریکی منڈیوں سے اپنا سرمایہ واپس لانا چاہتے ہیں' شاید اس کا کوئی حصہ ہمیں مل جائے۔ہمیں ملائیشیا کی ہمدردی بھی حاصل ہوگی' ان کی سرمایہ کاری بھی آ سکتی ہے۔ یہ سب کچھ نہ ہوا تب بھی ہمارا قرضہ چالیس سے بڑھ کر اسی ارب ہونے کے بجائے گھٹ کر دس پندرہ بلین رہ جائے گا اور ہمیں مجبوراً سہی' خود انحصاری کی عادت ہو جائے گی۔زرعی پیداوار ہماری کفالت کے لیے کافی ہے۔ہم بھوکے نہیں مریں گے۔

''واشنگٹن میں آپ کے پرانے دوست آپ سے خوش نہیں لگتے۔'' آغا شاہ رخ فائل بند کر کے ایمان علی کی طرف کھسکاتے ہوئے مسکرایا۔

''وہ کسی کے دوست نہیں ہیں۔'' حبیب الحق بدستور سنجیدہ تھا۔''انھیں محسن خان کا سبق یاد ہے۔عملیت پسندی اور زمینی حقائق! آئیڈیلزم کو وہ یونیورسٹی کے کافی ہاؤس میں کافی اور سگریٹ پیتا چھوڑ آئے ہیں۔''

''آئی ایم ایف کا مسئلہ کیا ہے؟'' آغا شاہ رخ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔''ہماری معاشی ترقی کی سالانہ شرح بڑھی ہے' معیشت کا ڈھانچہ منظم ہوا ہے۔ زرعی معیشت قومی معیشت سے نتھی ہو سکتی ہے' ٹیکس ریونیو بڑھا ہے' دفاعی بجٹ میں کمی جیسا ناممکن کام ہوا ہے' قرضوں کے مقابلے میں اثاثے بڑھے ہیں پھر بھی وہ خوش نہیں ہیں؟

''شاید امریکی دباؤ ہے۔'' حبیب الحق نے جو واشنگٹن سے چند روز پہلے ہی واپس آیا تھا کہا۔ ''انھوں نے تعریف تو کی ہے لیکن وہ چاہتے ہیں ہم اپنی مقامی پروڈکٹس کو تحفظ نہ دیں اور درآمدات پر ٹیکس اور پابندیاں کم اور ختم کر دیں۔ ہم نے بجلی، گیس اور آٹے چینی پر جو سبسڈی بڑھائی ہے اسے بھی کم کرتے کرتے مکمل طور پر ختم کر دیں۔ وہ ہمارے منتخب ہو کر آنے والے نمائندوں کو جمہوریت کا سبق پڑھانا' اس کے لیے قرض دینا اور ہمارے ترقیاتی فنڈز کو اپنی صوابدید سے اور اپنے ہی ملکوں میں خرچ کرانا چاہتے ہیں۔''

''Bullshit!'' ایمان علی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ہمیں آئی ایم ایف سے قرضہ چاہیے' اس کی غلامی نہیں! ہم یہ ناتا توڑ کر نتائج کا سامنا کریں گے۔''

''یقیناً!'' وزیر خارجہ نے کہا۔ ''صرف ٹائمنگ کا مسئلہ ہے۔ ہمیں جنگ کا خطرہ ٹلنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ ہم ایک ساتھ دو جنگیں نہیں لڑ سکتے۔''

''کیا سچ مچ جنگ کا خطرہ ہے؟'' حبیب الحق نے پوچھا۔

''ہر تجزیہ کہتا ہے کہ نہیں' پھر بھی سرحد پر فوجیں جمع ہیں۔ چھٹی حس بھی کہہ رہی ہے کہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ہے۔''

''آپ یہ فائل ابھی اپنے پاس رکھیے۔'' ایمان علی نے فائل حبیب الحق کو دیتے ہوئے کہا۔ ''اس منصوبے کا علم ہم تینوں کے علاوہ کسی چوتھے شخص کو نہیں ہونا چاہیے۔''

''کیا آپ اسے کولڈ اسٹوریج میں ڈال رہے ہیں؟'' حبیب الحق کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''نہیں! مجھے حملہ کرنے کی جلدی آپ سے زیادہ ہے' لیکن انٹیلی جنس کی اطلاع ہے کہ ایوان صدر سے خبریں لیک ہو رہی ہیں۔ لیک بھر جائے تو یہ منصوبہ کابینہ کے سامنے پیش ہو گا۔ ہم اتنا بڑا اقدام کابینہ میں مکمل بحث کیے بغیر نہیں اٹھا سکتے۔ میں آغا صاحب سے بھی متفق ہوں۔ ہمیں سرحدوں پر ہونے والی کشیدگی ختم ہونے کا انتظا رنا پڑے گا۔'' ایمان علی نے

رخصتی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہم اس منصوبے پر عمل کر سکے تو تاریخ میں آپ کے نام کا ایک اور باب لکھا جائے گا۔'' حبیب الحق نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور دل ہی دل میں سوچا' اس منصوبے کے آرکیٹیکٹ کے طور پر اس باب کے حاشیے میں کہیں نہ کہیں خود اس کا نام بھی درج ہوگا۔ تاریخ اپنے صفحات پر نام لکھوانے والوں کو دیکھ کر بہت بے رحمی سے ہنس رہی تھی۔

○ ○ ○
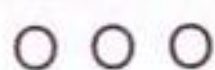
ایمان علی' حبیب الحق اور آغا شاہ رخ کے جانے کے بعد بھی لان میں بیٹھا رہا۔ وہ کرم قریشی اور مسز چنائے سے بھی وہیں ملنا چاہتا تھا۔ آج کابینہ کا اجلاس نہیں تھا اس لیے اس کا خیال تھا کہ جلدی گھر چلا جائے گا۔ جانے کیوں ذہنی طور پر تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ کسی دوست کو گھر بلائے گا' پرانی باتیں یاد کر کے قہقہے لگائے گا یا ٹی وی پر کوئی ہلکی پھلکی مزاحیہ فلم دیکھے گا اور کچھ دیر کے لیے دماغ کو امورِ مملکت سے بالکل آزاد کر دے گا۔ صبح آئے گا تو تھکن اتری ہوئی ہوگی' وہ فیصلے کرنے کے لیے توانا اور تر و تازہ ہوگا۔

وہ فائلیں دیکھنے لگا جو فیاض منگی اسے دے گیا تھا۔ آج فیاض منگی بھی جلدی چلا گیا تھا۔ ایمان علی کو یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی اتنی جلدی دفتر سے گیا ہو۔ شاید اس کا ذہن بھی تھک گیا تھا۔ اس نے سوچا فیاض منگی کے گھر میں اس کا انتظار کرنے والی اس کی بیوی موجود تھی' لیکن اس کے پاس کون تھا؟ کب تک وہ عارضی سہارے تلاش کرتا رہے گا۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ جب تک حکومت میں ہے شادی نہیں کرے گا۔ اس نے دل میں اپنا یہ عہد بھی تازہ کیا کہ انتخابات کے بعد پہلی چار سالہ ٹرم پوری کر کے سیاست سے ریٹائر ہو جائے گا۔ حالات کیسے بھی ہوں' کوئی نہ کوئی اس کی جگہ لینے کو تیار ہوگا۔ اس دنیا میں کوئی ناگزیر اور ہمیشہ رہنے والا نہیں تھا۔ اس کے بعد شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے کر دنیا کے سفر پر نکلے گا اور واپس آ کر اپنا وقت

اپنے خاندان اور فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دے گا۔

اس نے خیالوں کو جھٹک کر سر فائلوں پر جھکا دیا۔ اس وقت چونکا جب کرنل افتخار اس کے پاس فون لے کر آیا۔ کوئی اہم فون تھا ورنہ وہ شاید ایمان علی کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔ فون پر گفتگو کے دوران مسز چنائے اور کرم قریشی بھی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایمان علی نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ فون ختم ہوا تو اس نے کرنل افتخار کے حوالے کیا جو فون لے کر واپس اپنے دفتر چلا گیا۔ ایمان علی نے کھڑے ہو کر کرم قریشی سے ہاتھ ملایا اور مسز چنائے کے گال پر بوسہ دیا۔

''میں سمجھتا تھا آپ اب مستقل وائٹ ہاؤس میں قیام کریں گی اور واپس نہیں آئیں گی۔'' ایمان علی نے مسکرا کر کہا۔

''میری ایک ہفتے کی چھٹی ابھی باقی ہے۔'' مسز چنائے نے جوابی مسکراہٹ کے لیے ہونٹ پھیلائے لیکن بہت تناؤ کے ساتھ' بہت تھکے ہوئے انداز میں۔ کرم قریشی کے چہرے پر بھی فکر کا سایہ تھا۔

''آپ لوگ اتنے grim کیوں ہیں' یا میری طرح ذہنی تھکن کا شکار ہو گئے ہیں؟''

''خبر اچھی نہیں ہے۔'' کرم قریشی نے مسز چنائے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ ''مسز چنائے کو واشنگٹن میں ایک ذریعے سے اور مجھے اسلام آباد میں ایک بہت معتبر انفارمر سے' ایک ہی خبر ملی ہے۔''

''کیا؟'' ایمان علی نے بے صبری سے کہا۔ اسے پتا تھا اس کے جلدی گھر جانے اور ذہنی تفریح کا پروگرام غارت ہونے والا ہے۔

''ہماری سرحدوں پر جو کشیدگی ہے وہ امریکہ نے پیدا کی ہے۔''

''کیا!؟''

''امریکہ نے بھارت اور ہمارے جنرلوں کو شہ دی ہے [illegible] کشمیر کا مسئلہ طے کرنے کا یہی

موقع ہے۔ اس نے دونوں کو الگ الگ یقین دلایا ہے کہ امریکہ اس جنگ میں ان کے ساتھ ہو گا۔''

''What nonsense!'' ایمان علی نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا۔

''بالکل الٹی بات ہے۔ امریکہ کشیدگی کم کرنا چاہتا ہے۔ اسے پتا ہے جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ آگ سے کیوں کھیلے گا؟''

''نہیں معلوم!'' مسز چنائے نے کہا۔ ''بات دل کو نہیں لگتی، لیکن ذریعہ معتبر ہے۔''

''اپنے ذرائع سے معلوم کیجیے کیوں، آخر کیوں؟''

''ہم دونوں کے ذرائع کی پہنچ جڑوں تک نہیں ہے۔''

''امریکہ نے ہمارے جرنلوں کو پٹی پڑھائی ہے تو ہم انٹیلی جنس کے چینل بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ ہمیں خود کوئی ذریعہ ڈھونڈنا ہوگا۔'' ایمان علی کے لہجے میں تشویش تھی۔ اسے اب تک یہ اطمینان تھا کہ سرحدی کشیدگی جنگ تک نہیں پہنچے گی اور معمول کے مطابق کچھ عرصے کی ٹھوں ٹھاں کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ جنگ کے شعلے سچ مچ بھڑک سکتے ہیں۔ کیا امریکہ کا اصلی ایجنڈا یہی تھا، لیکن کیوں؟''

''نواب ٹن!'' کرم قریشی کی آنکھوں میں ایک دم چمک آئی۔ ''اس نے بتایا تھا سی آئی اے میں اس کی ایک اہم سورس ہے جس پر اس نے کوئی بڑا احسان کیا تھا۔''

''فوراً فون کیجیے، اسے فوری طور پر واشنگٹن بھیجیے خواہ جہاز چارٹر کرنا پڑے۔'' ایمان علی کھڑا ہو گیا۔ ''یہاں سے نہیں۔ یہاں کوئی لیک ہے۔ باہر جا کر کوئی محفوظ فون استعمال کیجیے۔ بلکہ وہیں سے آغا شاہ رخ اور جنرل منصف کو فون کیجیے، ایک گھنٹے کے اندر آپ لوگ مجھ سے میرے گھر میں ملیں گے۔ ہمیں بہت تیزی سے کچھ کرنا ہوگا، جنگ روکنا ہوگی ورنہ ہمیں تباہ ہونے سے کوئی نہ روک سکے گا۔''

ایمان علی کو اندازہ نہیں تھا کہ تباہی ان کے کتنا قریب پہنچ گئی تھی۔

16

ریوڈی جنیرو (برازیل)

نواب ٹن نے کرم قریشی سے فون پر بات ختم کی تو صبح کے پانچ بجے تھے۔ اس کی نیندیں پہلے ہی آنی جانی تھیں' اب کرم قریشی کے فون سے پوری طرح اڑ گئی تھیں۔ کانوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔ ہزاروں ٹن کے وزنی بموں کا شور تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے دونوں کان مضبوطی سے بند کر لیے۔ دھماکے بند ہو گئے تھے' اب جنگ کا طبل بجنے لگا تھا۔ ہر تھاپ ''تباہی' تباہی'' کا نعرہ اچھال رہی تھی۔ نواب ٹن کانوں پر ہاتھ رکھے رکھے بالکونی میں آ گیا۔ سامنے سمندر کی چادر پھیلی تھی۔ ''کوپاکیبانا'' کے ساحل کے ساتھ ''ایپانیما'' ریوڈی جنیرو کا سب سے پر رونق علاقہ تھا۔ سیاحوں کی جنت' راتوں کو دیر تک جاگنے والا' لیکن نواب ٹن کبھی رنگین راتوں کا جادو دیکھنے نہیں گیا' نہ کبھی ساحل پر ٹہلا۔ اس نے ساحلی علاقے کی اونچی عمارت

کی سب سے اونچی منزل پر اتنا مہنگا پینٹ ہاؤس صرف سمندر کا نظارہ کرنے کے لیے لیا تھا۔ اسے سمندر میں غوطہ لگانے' بلکہ پاؤں تک بھگونے کا شوق نہیں تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھتا تو ہر جذبہ پرسکون ہو جاتا۔

لیکن کرم قریشی کے فون نے سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ کانوں میں تباہی تباہی کے نعرے اور بموں کا شور مچ رہا تھا۔ پورا وجود شعلہ بن کر دہکنے لگا تھا۔ سامنے سمندر کی گود سے نکلتا ہوا سورج افق پر سرخی پھیلا رہا تھا' جیسے بدن کی آگ پورے آسمان پر پھیل گئی ہو۔ سنہری ہوتا ہوا سمندر اسے آواز دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سمندر کی طرف اٹھا دیے۔ وہ بالکونی سے کود کر اڑتا ہوا سیدھا سمندر میں جا کر ڈبکی لگانا چاہتا تھا تاکہ بدن کی آگ چھن کر کے بجھ جائے۔ آوازیں تیز ہونے لگیں۔ ''کود جاؤ' اڑ جاؤ' ڈوب جاؤ۔'' نواب ٹن نے ایک بار پھر دونوں کانوں پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ لیے اور تیزی سے واپس کمرے میں آ کر بالکونی کا دروازہ اس زور سے بند کیا کہ اس کی آواز سے کانوں میں مچنے والا شور دب گیا۔

نواب ٹن نے خود کو زمین پر پڑے ہوئے اس گدے پر گرا دیا جو اس کی مستقل نشست تھا اور دیوار سے لگے تکیے پر اپنی کمر ٹکا دی۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے برابر میں رکھی ہوئی تپائی سے ایک گولی اٹھا کر منہ میں ڈالی' لیکن پانی کی بوتل اٹھائی تو خالی تھی۔ پانی لینے کے لیے اٹھنے کی ہمت نہیں تھی' نقش والے کٹورے میں وہ پانی ڈھکا ہوا رکھا تھا جو دلاور کسی اللہ والے بابا سے پڑھوا کر لایا تھا۔ نواب ٹن نے ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی کر گولی نگل لی اور برا سا منہ بنایا۔ پانی میں عجیب سا کسیلا پن تھا جیسے کوئی دوا ملی ہوئی ہو۔ منہ کی کڑواہٹ نے توجہ بدلی تو کانوں میں آنے والی آوازیں دور ہونے لگیں۔ گولی بھی اثر کرنے لگی تھی' وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح اپنی نشست پر پڑا سوچنے لگا کیا وہ واقعی بالکونی سے کودنے والا تھا؟

نواب ٹن نے سوچا وہ جلد ہی اس اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر نچلی منزل پر کوئی فلیٹ یا واٹر فرنٹ کی کوئی کاٹیج لے گا۔ ڈاکٹر نے اسے خبردار کیا تھا کہ اکیلا رہتا رہا تو ممکن ہے بالکونی سے

کود کر، گولیوں کا اوورڈوز لے کر یا باورچی خانے کی گیس کھول کر اپنی جان لے لے۔ مکان بدلنا اور دلاور کو ساتھ رکھنا ضروری تھا۔ دلاور اور اس کی پرتگالی بیوی 'پولا' پہلے نواب ٹن کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے، لیکن دلاور کو ڈر تھا کہ نواب ٹن پر آنے والا جن اس کی ہری آنکھوں اور سنہری بالوں والی سفید فام پولا پر عاشق ہو جائے گا۔

نواب ٹن پر دورہ پڑتے ہی پولا دونوں ہاتھ جوڑ کر ہرے کرشنا ہرے رام کا جاپ کرنے لگتی۔ دلاور نے اسے ڈانٹا تھا کہ وہ مسلمان ہے ہندو نہیں، لیکن پولا پر اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ نواب ٹن اپنے اندر کی آوازوں کا شور سن کر ماضی میں جھانکتا اور مستقبل میں دیکھتا ہوا اول فول بکتا تو دلاور جن بھگانے کے لیے لاحول پڑھ پڑھ کر پھونکتا اور پولا آنکھیں بند کیے بیٹھی ہرے کرشنا کے نعرے لگاتی۔

ایک دن جب نواب ٹن کی حالت معمول پر تھی تو دلاور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

''صاحب! ہمیں گھر جانے کی اجازت دے دو، میری بیوی مجھ سے نہ چھینو۔''

''کیا بکتا ہے؟'' نواب ٹن غصے سے چلایا۔ ''میں نے کبھی اپنی محبوبہ کو ہاتھ نہیں لگایا، تیری بیوی تو میری ماں ہے۔ کیوں ڈرتا ہے۔''

''آپ سے نہیں صاحب، جن صاحب سے۔ وہ پولا پر عاشق ہو کر مجھے مار ڈالے گا۔''

''ابے کوئی جن ون نہیں ہے۔ تجھے سمجھایا ہے یہ میری بیماری ہے۔ جن ہے بھی تو مجھے چھوڑ کر تیری بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔''

''وہ نہیں آیا تو میری بیوی چلی جائے گی۔ آپ نے دیکھا ہے آپ پر جن آتے ہی جھومنے لگتی ہے۔''

''میرا کیا ہوگا؟ میرا خیال کون رکھے گا۔'' نواب ٹن نے کچھ دیر اسے خاموشی سے گھورنے کے بعد کہا تھا۔

''آپ میرے مائی باپ ہو۔ آپ کو چھوڑ کر کدھر جاؤں گا صاب! ہم دن بھر آپ کے پاس رہیں گے، کھانا پکائیں گے، صفائی کریں گے۔ آپ کو روز مکّی بابا کا پڑھا ہوا پانی لا کر دوں گا، مگر رات کو نہیں رہوں گا۔ رات سے ڈر لگتا ہے۔'' دلاور نے دیکھا تھا رات کو دورے کی حالت میں نواب ٹن کی لال لال آنکھیں بھجن گاتی ہوئی پولا پر گڑی رہتی تھیں۔

''جا تجھے آزاد کیا۔'' نواب ٹن نے اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے مکھی بھگا رہا ہو اور آنکھیں بند کر لیں۔

نواب ٹن نے بہت سمجھایا تھا، پھر بھی دلاور کو یقین تھا کہ نواب ٹن بیمار نہیں بلکہ اس پر جن کا سایہ ہے۔ کسی شیطانی جن کا۔ اس نے ریوڈی جنیر و میں ایک پیر تلاش کر لیا تھا جو حال ہی میں اس علاقے میں آیا تھا اور ساحل پر ایک خاموش کونے میں ڈیرہ جما کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی ہیئت سادھوؤں کی طرح تھی گیروے رنگ کا جھولا، گلے میں کئی رنگوں کی مالائیں، کلائی میں لوہے کے کڑے اور انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں۔ بڑی اور گھنی داڑھی تھی اور پشت پر گھنگریالے بالوں کی لٹیں۔ دلاور کو اس کے حق اللہ کے نعروں نے متوجہ کیا تھا اور جب دلاور کو دیکھ کر اس نے روانی سے اردو بولی تو اس کے پیروں میں پڑ گیا تھا۔ مکّی بابا اپنے عقیدت مندوں کی بیماریاں بھگانے کے لیے انھیں جادوئی سفوف اور پڑھا ہوا پانی دیتا، کتنے ہی مریض اس کے ہاتھوں صحت پا چکے تھے۔ دلاور کو یقین تھا وہ نواب ٹن کا جن بھی بھگا دے گا۔

نواب ٹن پڑھا ہوا پانی تو رکھ لیتا لیکن دلاور کی نظر بچا کر سفوف کی پڑیاں کوڑے میں پھینک دیتا۔ دلاور نے صرف مکّی بابا کی کرامات پر اکتفا نہیں کیا تھا، پاکستان سے اپنے باپ کو لکھ کر ایبٹ آباد کی پہاڑی چوٹی پر رہنے والے لنگڑے پیر کا جن بھگانے والا تعویز بھی منگایا تھا اور اسے نواب ٹن کے تکیے کے نیچے دبا دیا تھا۔ نواب ٹن نے ایک دن دلاور کی غیر موجودگی میں تعویز کھول کر پڑھا تھا، اس پر صرف یا اللہ مدد لکھا تھا۔ چوتھی جماعت کے کسی بچے کی تحریر لگتی تھی۔ نواب ٹن نے تعویذ اسی طرح لپیٹ کر تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا اور سوچا تھا اعتقاد کی ڈور

مضبوط ہو تو کسی معصوم کا دیا ہوا کورا کاغذ بھی اکسیر ہو سکتا تھا۔ یقین نہ ہو تو کسی بڑے سے بڑے پیر کا دیا ہوا نقش بھی بے اثر تھا۔

دلاور چھوٹی عمر میں نواب ٹن کے کراچی والے گھر میں آ کر ملازم ہوا اور اسی کی خدمت کرتے کرتے بڑا ہوا تھا۔ نواب ٹن اس کے لیے باپ سے بڑھ کر تھا۔ وہ نواب ٹن کا ذاتی خادم، سیکرٹری، باورچی اور ساقی، سب کچھ تھا۔ نواب ٹن نے اسے برازیل بھیجا تو ریو کے نواحی علاقے میں ایک کمرے کا مکان خرید کر دیا تھا اور اسے ہر مہینے باقاعدگی سے خرچ بھیجتا تھا۔ دلاور ایک ریسٹورنٹ میں برتن دھونے پر ملازم ہو گیا تھا، جہاں پولا بھی کام کرتی تھی۔ وہ پرتگال سے کارنیوال دیکھنے آئی تھی، پیسے ختم ہو گئے تو نوکریاں کر کے واپسی کا کرایہ جمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دلاور دیکھنے میں اچھا تھا، کچھ پٹھانوں والی سادگی بھی پولا کو بھا گئی تھی، اس کی ادائیں دلاور پر نچھاور ہونے لگیں۔ دلاور کو کسی عورت نے پہلی بار مسکرا کر دیکھا تھا۔ وہ قریب آئی تو دلاور کے جسم کا ایک ایک رواں کھڑا ہو جاتا۔ پولا کے دل کا گرجا بھی گھنٹیاں بجانے لگا تھا۔ رہنے کے لیے جگہ بھی چاہیے تھی، اس نے دلاور کی سب شرطیں مان لیں۔ کلمہ پڑھا، نکاح کے دو بول پڑھوائے، اسکرٹ اتار کر شلوار پہنی، نوکری چھوڑی اور اس کے گھر کی رانی بن کر دلاور کو پرتگالی زبان اور آداب سکھانے لگی۔ نواب ٹن مستقل طور پر برازیل آ گیا تو دلاور کی کراچی والی نوکری بحال ہو گئی اور وہ اپنی کھولی کو تالا لگا کر نواب کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا۔ پولا خوش تھی کہ اس کا شوہر ریسٹورنٹ کے گندے برتن دھونے کے بجائے ایک نواب کا بٹلر ہو گیا تھا اور وہ ایک گندی بستی میں چور بچوں سے ڈر کر رہنے کے بجائے اب سب سے مہنگے علاقے کی ایک اونچی عمارت میں شان سے رہتی تھی۔

نواب ٹن کسی کاروباری سلسلے میں باہر جاتا تو پولا پورے گھر کی مالکن بن جاتی۔ اس نے ایک بار دلاور کو گھر میں پارٹی کرنے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے پرانے دوستوں اور

ریسٹورنٹ کے ان ویٹرز کو جن کے ساتھ کام کیا کرتی تھی' نوابی ٹھاٹ دکھانا چاہتی تھی۔ دلاور کی انا بھی پھول گئی تھی۔ وہ جس ریسٹورنٹ میں برتن دھوتا تھا اس کا مالک دلاور کا مہمان بنا تھا اور گھر کی سجاوٹ دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکا رہا تھا۔ دلاور کو پارٹی کا چلن پسند نہیں آیا تھا۔ کسی نے ان کھانوں پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی جو دلاور نے بہت محنت سے بنائے تھے۔ سب شراب پیتے سگریٹ پھونکتے اور ناچتے رہے تھے اور رات گئے لڑھکتے ہوئے واپس چلے گئے تھے۔ دلاور نے پولا کو پہلی بار اتنا خوش دیکھا تھا اس لیے پولا کے شراب اور سگریٹ پینے پر جھگڑا نہیں کیا تھا' لیکن پولا نے جب کبھی دوبارہ پارٹی کے لیے کہا تو بہانے کر کے ٹال دیتا تھا۔

پولا' دلاور کی وفادار تھی' لیکن اپنے مالک سے بھی وفاداری نباہنا چاہتی تھی۔ اس نے نوابوں اور نوجوان ملازموں سے ان کے تعلقات کی بہت کہانیاں پڑھی اور سنی تھیں۔ پولا نے بھی تعلقات کی یہ رسم نباہنے کی کوشش کی' لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ اس نے ہر طرح سے اشارے کنائے دیے تھے۔ ساقی گری کے فرائض اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ نواب ٹن کی دورے کی ہر کیفیت کو عبادت سمجھ کر پوجا تھا۔ دلاور مکی بابا کی خدمت کرنے گھنٹوں گھر سے غائب رہتا تو کسی نہ کسی بہانے سے نواب ٹن کے گرد چکراتی پھرتی۔ اپنی پرانی سکرٹ اور بلاوز نکال کر پہنتی اور اونچی ایڑھی کی جوتی سے فرش پر ٹھک ٹھک کرتے ہوئے نواب ٹن کے جذبات کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتی۔ نواب ٹن نہیں جاگا تو اس نے ایک دن وہ خصوصی لباس نکالا تھا جو اس نے کارنیوال میں پہنا تھا اور اگلے کارنیوال میں پہننے کے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔ سرخ رنگ کی چڈی اور چولی' اس پر آر پار دیکھے جانے والا شفاف پیلا گاؤن۔ دیر تک کیٹ واک کرتی رہی لیکن نواب ٹن نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

پولا کو یقین ہو گیا تھا کہ نواب ٹن واقعی بیمار ہے۔ ایسی بے حسی صرف بیماری کا نتیجہ ہی ہو سکتی تھی۔ پھر بھی اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن نواب صحت مند ہو جائے گا۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اسے پرتگال جانے سے پہلے نواب کی محبوبہ ہونے کا اعزاز حاصل کرنا

تھا۔ وہ لزبن میں اپنی ہم جولیوں کو دلاور نہیں نواب ٹن کی کہانی سنانا چاہتی تھی۔ دلاور نے جب فیصلہ سنایا کہ وہ اپنی کٹیا میں واپس جا رہے ہیں تو اس نے انکار کر دیا تھا' لیکن دلاور نے سختی سے کہا تو ڈر کر مان گئی۔ دلاور اسے پٹھانوں کی غیرت اور غیرت کے لیے کیے جانے والے قتل کی کئی کہانیاں سنا چکا تھا۔

نواب ٹن کے لیے یہ بچکانہ کھیل تھا۔ اسے پتا تھا پولا کیا چاہتی ہے' اسے یہ بھی پتا تھا کہ پولا زیادہ دیر دلاور کے ساتھ نہیں رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ اگلے کارنیوال تک۔ وہ کارنیوال میں اپنا نیم عریاں اور آر پار دیکھے جانے والا لباس پہن کر پریڈ کرنے نکلے گی اور جشن مناتی ہوئی کسی گلی میں گم ہو جائے گی یا دلاور خود اسے طلاق دے کر نکال دے گا۔ پولا کے پاس اب پرتگال واپس جانے کے لیے پیسوں کی کمی نہیں رہی تھی۔ پرتگال اسے بہت یاد بھی آ رہا تھا' برازیل اچانک غیر مہذب اور غیر محفوظ لگنے لگا تھا۔

نواب ٹن خود بھی برازیل چھوڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ برازیل آ کر اس نے اسلحے کی تجارت جاری رکھی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سودے کیے تھے' لیکن کام پھیلا ہوا تھا اسے سمیٹنے میں وقت لگا تھا۔ اقتدار مافیا ٹوٹنے کے بعد اس کے ملک سے باہر رہنے کی وجہ ختم ہو گئی تھی۔ ''اسکزوفرینیا'' کے دورے بھی شدت پکڑ گئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ پاکستان جا کر اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ وہ اپنا کاروبار سمیٹ کر واپس جانے کے لیے تیار ہی ہوا تھا کہ پاکستان میں جنگ کا نقارہ بجنے لگا۔ اس نے برازیل سے اسلحے کی فراہمی کا ایک بڑا سودا کیا' اسے اسلحہ پاکستان پہنچنے تک برازیل میں رہنا اور اسلحے کی وقت پر ترسیل کو یقینی بنانا تھا۔

نواب ٹن برازیل میں کام کرنے کے طریقے جانتا تھا۔ اس نے کافی سامان وقت سے پہلے بھجوا دیا تھا لیکن باقی سامان کی فراہمی اچانک رک گئی تھی۔ جن کارخانوں میں پاکستان کا سامان بن رہا تھا وہ کوئی ایمرجنسی پورا کرنے کے لیے کچھ اور بنانے لگے تھے۔ وہ جہاز بھی روانہ نہیں ہو سکے تھے جن میں تیار شدہ سامان لادا جا چکا تھا۔ نواب ٹن کو طرح طرح کی

وجوہات بتا کر یقین دلایا گیا تھا کہ چند دن کی تاخیر ہے، سب کچھ وقت پر چلا جائے گا۔ نواب ٹن کے پاس یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن کرم قریشی کے فون کے بعد اس کا سانس رکنے لگا تھا۔ اگر کرم قریشی کی خبر صحیح تھی اور امریکہ واقعی کوئی خطرناک کھیل کھیل رہا تھا تو تاخیر کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ تھا۔ امریکہ کے ایک اشارے پر اسلحہ بنانے والے برازیلی کارخانوں کے پہیے رک سکتے اور جہازوں کے رخ گھوم سکتے تھے۔

نواب ٹن کو پتا تھا اسلحے کے ہر تاجر کی طرح اس پر بھی جانے کس کس ایجنسی کی نظر ہوگی۔ اس نے واشنگٹن میں اپنے اس دوست کو فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا جس سے وہ بہت کچھ جان سکتا تھا۔ اسے اب خود واشنگٹن جانا تھا۔ وہ نگاہوں سے بچنے کا ہنر جانتا تھا۔ واشنگٹن پہنچ کر اپنے ذریعے تک پہنچنے کا رستہ بھی ڈھونڈ سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے پہلی پرواز سے نکل جانا چاہیے۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

نواب ٹن نے گھڑی دیکھی، نو بج چکے تھے، ٹریول ایجنٹ کا دفتر کھل گیا ہوگا۔ اس نے فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو ڈائل ٹون غائب تھی۔ وہ زور زور سے کریڈل کھٹکھٹاتا رہا لیکن فون بالکل مردہ ہو چکا تھا۔ اس نے غصے سے ریسیور پٹخ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ فون غلط وقت پر خراب ہوا تھا۔ وہ لابی جا کر ریسپشن کا فون استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے اٹھ کر گاؤن اور سلیپر پہنے۔ لابی تک جانے کے لیے پوری طرح تیار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ کھولا تو باہر ایک باوردی پولیس والا کھڑا تھا جس نے نواب ٹن کو دیکھتے ہی سلیوٹ مارا اور اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دے دیا۔ وہ سامنے سے نہیں ہٹا، نواب ٹن نے بھی باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے پتا تھا فون بند ہونے اور دروازے پر پولیس کے پہرے کا کیا مطلب تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اسی طرح دروازے میں کھڑے کھڑے لفافہ چاک کر کے اس میں سے کاغذ نکال کر پڑھنے لگا۔

یہ خط نہیں، وزارت داخلہ کا حکم نامہ تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ایک غیر ملکی انٹیلی جنس

ایجنسی نے اس پر اسلحے کی اسمگلنگ کرنے کا الزام لگایا ہے۔ اس الزام کی تحقیقات مکمل ہونے تک اسے اپنے گھر تک محدود رہنا تھا۔ بہت سی تفصیلات تھیں' اسے اس کے حقوق بتائے گئے تھے' یقین دلایا گیا تھا کہ اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا اور الزام صحیح ثابت نہیں ہوا تو وہ پہلے کی طرح برازیل میں رہنے اور کام کرنے کے لیے آزاد ہوگا...... یہ بھی کہا گیا تھا کہ تحقیقات ایک ہفتے تک مکمل ہو جائیں گی۔ نواب ٹن کو یقین تھا جو کچھ بھی ہونا تھا اسی ایک ہفتے کے اندر ہونا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد اسے گھر میں بند رکھنے اور اسلحے کی فراہمی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کے بعد شاید پاکستان کو اسلحے کی ضرورت بھی نہ رہے۔

نواب ٹن نے دروازہ بند کیا اور واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ خطرے سے لڑنے والی حس بیدار ہوگئی تھی۔ اسے مکمل طور پر پرسکون رہنے کی ضرورت تھی۔ وہ پاکستانی سفارت خانے تک اپنی نظر بندی کی خبر پہنچا سکتا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سفارت کاری کے عمل میں ایک ہفتہ کھینچنا مشکل نہیں تھا۔ نقصان یہ ہوتا کہ اس کی نگرانی سخت کر دی جاتی۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ بالکل ٹوٹ جاتا۔

وہ باتھ روم جا کر ٹھنڈے پانی سے نہایا' تیار ہو کر سفید شارک اسکن کا سوٹ پہنا۔ گلے میں سونے کی موٹی زنجیر اور کلائی میں رولیکس کی ہیروں والی سب سے قیمتی گھڑی باندھی اور جا کر ایک جھٹکے سے فلیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ پولیس والا جو کہیں سے ایک کرسی لا کر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا تھا' ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ ہولسٹر میں رکھے ہوئے پستول پر تھا۔

''اندر آؤ!'' نواب ٹن نے بہت تحکمانہ انداز سے کہا اور اپنے حکم کا ردِعمل دیکھے بغیر پلٹ کر اندر آ گیا۔ اندر آ کر بھی کچھ دیر اسی طرح پیٹھ موڑے کھڑا رہا۔ پلٹ کر دیکھا تو سپاہی اندر آ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر رہا تھا۔ نواب ٹن اس کے قریب جا کر کھڑا اسے گھورتا رہا۔ سپاہی نروس ہو کر نظریں بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نواب ٹن [illegible]ب سے نوٹوں کی ایک موٹی

گڈی نکالی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی مٹھی میں بند کر دی۔

''جاؤ! میرے کسی ملاقاتی کو روکنے کی کوشش نہ کرنا۔'' نواب ٹن کا لہجہ ایسا ہی تھا جیسے اپنے ادنیٰ ماتحت کو حکم دے رہا ہو۔

سپاہی نے تکلفاً بھی نہ کہنے کی کوشش نہیں کی۔ نوٹ گنے بغیر جیب میں رکھے اور نواب ٹن کو سیلیوٹ مار کر باہر چلا گیا۔

نواب ٹن اپنی نشست پر جانے کے بجائے کمرے کے وسط میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا اور پاؤں پر پاؤں رکھ کر ہلانے لگا۔ اسے امید تھی دلاور اور پولا وقت پر آ جائیں گے۔ دونوں میں اگر جھگڑا نہ ہوا اور دلاور ملنگی بابا کے پاس اور پولا اپنے دوستوں سے ملنے نہ چلی گئی ہو تو اس وقت تک انھیں آ جانا چاہیے تھا۔ نواب ٹن دورہ نہ پڑنے کی دعا بھی کر رہا تھا۔ آوازیں ابھی بند تھیں۔ کانوں میں ہلکی ہلکی سائیں سائیں ہو رہی تھی لیکن ایسی نہیں کہ سوچوں پر حاوی ہو سکے۔ ابھی دوا کھانے کا وقت بھی نہیں ہوا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو پولیس کا سپاہی دلاور اور پولا کو روکے کھڑا تھا۔ دونوں کے چہرے خوف سے سفید ہو رہے تھے۔

''آنے دو!'' نواب ٹن کا حکم سن کر سپاہی سامنے سے ہٹ گیا۔ سپاہی کو نواب ٹن کا حکم مانتے دیکھا تو دونوں کے چہروں کا رنگ بحال ہو گیا۔

''پولیس کیوں آئی ہے صاب؟'' دلاور نے دروازہ بند کر کے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''تو کہتا ہے میرے اوپر جن آتا ہے۔ میں نے پولیس بلا لی ہے۔ وہ کسی جن کو اندر نہیں آنے دے گی۔'' دلاور خوش ہو گیا۔ نواب ٹن اسی طرح سنجیدہ تھا۔ ''تیرا ملنگی بابا کہاں ہے؟''

''اپنے آستانے پر۔ بلا کر لاؤں؟''

''جا! ابھی اور اسی وقت' اس سے پہلے کہ مجھ پر جن آ جائے۔''

دلاور تقریباً دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے ڈر تھا کہیں نواب ٹن ارادہ نہ بدل دے۔ مکّی بابا نے کئی بار گھر آنے کے لیے اصرار کیا تھا۔ کہا تھا جب تک وہ سامنے آ کر وظیفہ نہیں پڑھے گا جن نہیں بھاگے گا۔ دلاور نے نواب ٹن سے کہا تھا اور نواب ٹن نے ہر بار منع کر دیا تھا۔ پیری مریدی اس کی ضرورت نہیں تھی نہ اسے جعلی پیروں سے کوئی دل چسپی تھی۔

دلاور کے جاتے ہی پولا نے نواب ٹن کے سامنے آ کر اٹھلانے کی کوشش کی، لیکن نواب ٹن نے اسے ناشتہ اور کافی بنانے باورچی خانے بھیج دیا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ کھیل کا وقت نہیں تھا۔

ناشتہ ختم کرتے ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ پولا کچن سے نکل کر بھاگتی ہوئی دروازہ کھولنے گئی۔ دلاور اندر داخل ہوا لیکن مکّی بابا ابھی تک روانی سے پرتگالی بولتا ہوا پولیس کے سپاہی کو ترقی پانے کی نوید سنا رہا تھا۔ سپاہی نے دونوں کو اندر آنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مکّی بابا نے پولا کو دیکھا تو حق اللہ کہہ کر اسے گلے لگا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا دعائیں دینے لگا۔ اس کی دعائیں طویل ہوتی جا رہی تھیں۔ پولا بھی کسمانے لگی تھی اور دلاور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا ''میری بیوی پر رحم کر بابا۔'' پولا کو بابا کی آغوش سے رہائی ملی تو وہ دوبارہ کچن میں چلی گئی اور بابا دلاور کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا نواب ٹن کی طرف بڑھنے لگا جو صوفے سے اٹھا نہیں تھا۔ مکّی بابا کو اتنے سرد استقبال کی توقع نہیں تھی۔ وہ سمجھ گیا اس نئے گاہک کو مرعوب کرنا آسان نہیں ہوگا۔ نواب نے اسے اپنے سامنے کے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں پاتال سے آیا ہوں، زمین میری سسرال ہے، میرا گھر۔ میں گدّوں پر نہیں بیٹھتا۔'' مکّی بابا حق اللہ کا نعرہ لگا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ دلاور بھی دوزانو ہو کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا تھا۔

''تم کون ہو؟'' نواب ٹن نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''پیروں کا پیر، ولیوں کا ولی، دیوتاؤں کا دیوتا، پاتال [illegible]یوتا، ہیڈس، پلوٹو، پلوٹون! تم

مجھے نہیں پہچانتے؟''

''نہیں!''

''کیسے پہچانو گے۔ یہ تین ہزار سال پرانی بات ہے۔ تم اس وقت بچے ہو گے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زمینوں اور آسمانوں پر میرے عشق کے چرچے تھے۔ تمھاری ماں نے سنائے ہوں گے۔ کتابوں میں بھی لکھے گئے تھے۔ تم نے ضرور پڑھے ہوں گے۔''

''نہیں! میں نے نہیں پڑھے۔'' نواب ٹن نے ایک بار پھر صاف صاف جواب دیا۔

''میں تمھیں سناتا ہوں۔'' مکّی بابا داستان گو بن گیا۔ ''میں ''کوری'' پر عاشق تھا جو اناج کی دیوی ''دیمیتری'' کی بیٹی تھی۔ وہ لہلہاتی فصلوں کے درمیان ہوا کی طرح لہراتی اور سورج دیوتا کے گیت گاتی ہوئی ناچا کرتی تھی۔ اس کے بال گیہوں کی بالیوں جیسے سنہرے تھے' گالوں پر ٹماٹر اور ہونٹوں پر سنگترے اگے ہوئے تھے۔ جسم میں کہیں خربوزا اور کہیں تربوز گڑے تھے۔''

مکّی بابا خلا میں اس طرح گھور رہا تھا جیسے کوری کا سراپا دیکھ رہا ہو۔

''ایک دن میں کوری کو اپنی دنیا میں کھینچ کر لے گیا۔'' مکّی بابا نے آنکھیں نواب ٹن کے چہرے پر گاڑھ کر کہانی دوبارہ شروع کر دی۔ ''زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں۔ پاتال کے اندھیرے اس کی آمد سے چمک اٹھے تھے' لیکن پھر سماج درمیان میں آ گیا۔ میری ظالم ساس ''دیمیتری'' اپنی بیٹی کو ڈھونڈتی ہوئی آ گئی۔ اس کا میری دنیا پر بس نہیں تھا' لیکن وہ زمین پر راج کرتی تھی۔ اس نے فصلیں اگانا بند کر دیں۔ زمینیں بنجر ہو گئیں تو مجھے کوری کو واپس بھیجنا پڑا۔ اس کی گود میں میرا بیٹا تھا۔ پلوٹس! خوش حالی اور دولت کا دیو! اس کے زمین پر آتے ہی زمینیں پھر سے سونا اگلنے لگیں۔ میں نے کوری کو واپس پاتال میں بلایا تو ایک بار پھر گھمسان کا رن پڑا۔ آخر دیوتاؤں نے صلح کرا دی۔ کوری تین مہینے پاتال میں میرے ساتھ اور نو مہینے زمینوں پر اپنی ماں دیمیتری کے ساتھ رہنے لگی۔ اسی لیے اب فصلیں صرف نو مہینوں کے لیے

لہلہاتی ہیں اور زمین تین مہینے تک خاموش ہو کر کوری کی واپسی کی راہ تکتی ہے۔''

مِکّی بابا نواب ٹن کے چہرے پر ردعمل تلاش کرنے لگا، لیکن وہ اس طرح سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا رہا۔

''میری کہانی زندگی اور موت کا استعارہ ہے۔ موت جس قبر میں گاڑھ دیتی ہے، اس مدفن سے نئی زندگی نمو پاتی ہے، لیکن کسی کو یاد نہیں رہتا۔ وہ سکندر اعظم کا بچہ دنیا فتح کر کے سمجھتا تھا کہ ہمیشہ خدا بنا رہے گا۔ وہ دور دیس سے واپس آیا تو اپنے دیوتاؤں کے لیے نئی خوشبوئیں اور نئی سانسیں لے کر نہیں آیا۔ سب کی سانسیں ختم ہو گئیں، سب مر گئے، صرف میں زندہ ہوں، میں۔ حق اللہ!'' مِکّی بابا نے نعرہ لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور جھومنے لگا۔

اسی وقت پولا مِکّی بابا کے لیے شربت لے کر آئی۔ اس نے پیر کے شانے پر ہاتھ لگایا تو وہ اچھل پڑا۔

''نہیں نہیں! مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ تو مجھے نہیں پا سکتی۔ میں تجھے پہچانتا ہوں، تو ڈیانا ہے۔ اپالو کی جڑواں بہن! تجھے میں نے روم میں بتا دیا تھا، میں تیرا نہیں ہوں، جا بھاگ جا۔'' پیر صاحب کو جلال آ گیا تھا۔ پولا اسے سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''نہیں تو وہ نہیں ہے!'' بابا نے گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ''تو ارطمیس ہے جو مجھے یونان میں ملی تھی۔ چاند کی ہمیشہ کنواری رہنے والی دیوی جس پر کوئی سواری نہ کر سکا۔ تجھ پر بری نظر ڈالنے والے شکاریوں کو کتوں نے چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اورین نے چھونا چاہا تو اسے تو نے زہریلے بچھو کے ڈنک سے مروا دیا تھا۔ لیکن تیرا وہ چاقو کہاں گیا جو مقدس زمین اور مظلوموں کی حفاظت کرتا تھا۔ تیرے سینے سے چیتوں جیسی وحشت زدہ چھاتیاں کہاں گئیں، کیا تجھ پر بھی بریسٹ کینسر کا دیوتا حاوی ہو گیا؟ کہاں گئی تیری ہرنوں جیسی نزاکت، تیرے اندر بیٹھا ہوا بھیڑیا جو تیری خود مختاری کی علامت تھا۔ دیکھ تیری مقدس زمین پر اب بھی حملے ہوتے ہیں، مخلوق آج بھی بے یار و مددگار ہے، ہر طرف بری نظروں کا گھیرا ہے، جسم بے حرمت ہو رہے

ہیں، اٹھا اپنا چاقو، اچھال اپنی چھاتیاں، دکھا بھیڑیوں والی دہشت۔''
مکّی بابا کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ پولا نے زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور ہرے کرشنا میرے ہرے راما الاپنے لگی۔ دلاور بھی سخت خوف زدہ تھا۔

''مت ڈرو میرے بچو! مت ڈرو۔'' مکّی بابا نے پولا کا بازو پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''تو ارطمیس نہیں ہے۔ تو آئسس ہے رحم کرنے والی چاند کی دانش ور دیوی۔ میں نے تجھے مصر میں دیکھا تھا۔ میں تجھے پہچان گیا ہوں، تو بھی مجھے پہچان لے۔ میں ہورس ہوں، سورج دیوتا۔ تیرا شوہر، تیرا باپ۔ کوری، پلاٹو اور دیمیتری ہمارے آباؤ اجداد تھے۔ فرعون ہمارا نیا روپ ہے، لیکن تو نے کیا گناہ کیے تھے کہ تو نے اس چھنال قلوپطرہ کے روپ میں جنم لیا ہے؟'' مکّی بابا نے پولا کا بازو جھٹک دیا اور ایک بار پھر جلال میں آ گیا۔

''تجھے پتا ہے قلوپطرہ نے میری زمینیں ہتھیا لی تھیں؟ میرا کمینہ دوست جس کی خاطر میں انطونیو سے لڑا تھا، اسی نے میری زمینیں قلوپطرہ کو دی تھیں۔ انطونیو فتح مند ہوا تو میں نے اسے سچ بتا دیا تھا کہ ہاں میں تیرے خلاف لڑا تھا، پھر بھی اس نے قلوپطرہ سے زمینیں لے کر مجھے واپس کر دیں۔ انطونیو عظیم تھا لیکن وہ کتیا قلوپطرہ...... اس کا آدھا جسم زمین میں گاڑ دوں گا۔ اس کے جسم کا وہ حصہ جو اس کی طاقت ہے پاتال میں چلا جائے گا۔ پاتال جہاں کا میں دیوتا ہوں۔ حق اللہ!''

''چپ فرا ڈیئے!'' نواب ٹن چیخ پڑا۔ اس کے ذہن میں اٹھنے والی آوازوں کا شور مکّی بابا کی آواز سے گڈمڈ ہو گیا تھا۔ مکّی بابا کا جھومنا بند ہو گیا اور آنکھیں کھل گئیں۔

''تو یونانی دیومالا کی رٹی ہوئی کہانیاں سناتا ہے۔ طوطے!'' نواب ٹن بھی کسی اور دنیا سے آواز دے رہا تھا۔ ''تو مجھے نہیں پہچانتا؟ میں الف لیلیٰ ہزار داستان کا آدم خور دیو ہوں۔ تیری ہڈیاں چبا جاؤں گا۔ تیری آنکھوں کے ڈھیلوں کو فٹ بال بنا کر کھیلوں گا۔ تو اسی طرح دربدر رہے گا۔ ملک ملک بھاگتا پھرے گا اور تیری بیویاں چڑیلیں بن کر تیرا تعاقب

کریں گی۔ تجھے تیری سنتان کا سکھ نہیں ملے گا۔ اپنی اولاد کو دیکھ نہیں پائے گا۔ ڈبا پیر! فراڈیے۔'' دلاور لاحول پڑھ کر پھونکنے اور پولا دونوں ہاتھ جوڑ کر ہرے کرشنا ہرے راما کا جاپ کرنے لگی۔

''میرے باپ! پیر تو ہے کہ میں؟'' مکی بابا منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور پھر پلٹ کر دلاور اور پولا سے کہنے لگا۔ ''تمھارے مالک کا جن باہر آ گیا ہے۔ بڑی خوفناک جنگ ہونے والی ہے۔ جاؤ تم لوگ کسی کمرے میں چھپ جاؤ۔''

دلاور اور پولا اٹھ کر بھاگے اور بیڈروم میں بند ہو گئے۔ نواب ٹن کا دورہ اپنے شباب پر تھا۔

''تو تباہ ہو جائے گا۔ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ تباہی! میرے خدا' کیسی تباہی آنے والی ہے۔ کچھ نہیں بچے گا۔ کچھ نہیں بچے گا۔'' نواب ٹن کے کانوں میں اب آوازوں کے شور کی جگہ بموں کے دھماکے ہو رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اپنے کانوں پر رکھ لئے۔

مکی بابا نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا اور تیزی سے اس تپائی کی طرف گیا جس پر دوائیں رکھی تھیں۔ اس نے دوا کی ایک گولی منتخب کی اور لا کر نواب ٹن کا وہ گلاس جو پولا اس کے لیے لائی تھی نواب ٹن کے منہ سے لگا دیا۔ نواب ٹن کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ حیرت ابھرنے لگی۔ بموں کے دھماکے بھی کم ہو گئے تھے۔ اس نے ہاتھ کانوں سے ہٹائے' سر صوفے کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو مکی بابا اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا اسے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔

''میں پاتال سے واپس آ گیا ہوں۔'' مکی بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''میں دورے کی حالت سے نکل آیا ہوں' تم بھی پیری کا چولا اتار دو۔'' نواب ٹن نے آگے کی طرف جھک کر کہا۔ ''تم دواؤں کے بارے میں کیسے جانتے ہو' کیا تم ڈاکٹر ہو؟''

''میرا نام مقصود ہے۔ ڈاکٹر مقصود!'' ملکی بابا بنے ہوئے مقصود نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا پیری کا ڈرامہ نواب ٹن کے سامنے نہیں چل سکے گا۔ ''لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''کیا؟''

''میری دربدری' بیویوں کا تعاقب' اولاد کا دکھ!''

''مجھے یاد نہیں میں نے کیا کہا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''ایک ایک لفظ!'' مقصود نے بہت فخر سے کہا اور اپنے کارنامے بیان کرنے لگا۔

''میری ایک بیوی پاکستان میں' ایک شکاگو اور ایک نیویارک میں ہے۔ تینوں سے ایک ایک بیٹی ہے۔ کسی طرح تینوں کو ایک دوسرے کا پتا چل گیا تو مجھے ڈھونڈتی ہوئی میکسیکو آ گئیں جہاں میری چوتھی بیوی ہے جو پیٹ سے ہے۔ وہ بھی باقی تینوں سے مل گئی تو میں برازیل بھاگ آیا۔''

''یہاں شادی نہیں کی؟''

''صرف چار کی اجازت ہے۔'' مقصود ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ''ضرورت بھی نہیں ہے۔ مریدوں سے کام چل جاتا ہے۔''

''یہ پیری کا ڈرامہ' جادوئی سفوف اور پڑھا ہوا پانی؟''

''مجھے میڈیکل پریکٹس کی اجازت نہیں ہے۔ میں پیر بن کر پریکٹس چلاتا ہوں۔ اینٹی بایوٹک گولیوں کے سفوف میرے عقیدت مندوں کی بیماریاں ٹھیک کر دیتے ہیں۔ پانی پھونک کر اس میں نائیٹروگلیسٹر ائڈ کے قطرے ٹپکا کر دیتا ہوں تو دل کا درد دُور ہو جاتا ہے۔ اینٹی ڈپرسنٹ گولیوں کا سفوف پھانکتے ہی دنیا حسین نظر آنے لگتی ہے۔ میں ان کے دماغ میں گھس کر ان کی نفسیاتی الجھنوں کا علاج بتاتا ہوں۔ سائیکوتھراپی۔ نواب صاحب! میں شفا بانٹ رہا ہوں' شفا!''

''بس یہی کہانی ہے؟''

''بہت کہانیاں ہیں۔ کہاں سے شروع کروں؟''

''مجھے دل چسپی نہیں ہے۔'' نواب ٹن نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ وہ کہانیوں کا سوداگر تھا۔ کہانیاں جمع کرتا تھا لیکن اب وقت نہیں تھا۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ یونانی دیو مالا میں الجھ کر بہت وقت ضائع ہو چکا تھا۔ نواب ٹن سوچنے لگا کیا ایک بڑبولا جعل ساز جو اپنے بیوی بچوں سے وفا نہ کرسکا' اس کی مدد کرسکے گا؟ لیکن اسے آزمانے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

''کیا تمھیں اپنے وطن سے محبت ہے؟''

''بہت!'' مقصود کو نواب کے اس اچانک سوال نے حیران کردیا۔

''اس کے لیے کچھ کرسکتے ہو؟''

''جان بھی دے سکتا ہوں۔''

''تمھاری جان نہیں چاہیے۔'' نواب ٹن نے مقصود کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ایک دن کے لیے واشنگٹن جانا اور راز کو راز رکھنا ہوگا۔''

''میں امریکہ نہیں جاسکتا۔'' مقصود نے دھیمے لہجے میں شرمندہ ہوکر کہا۔ ''وہاں مجھ پر ایک سے زیادہ شادی کرنے کے الزام میں مقدمہ قائم ہے۔ ایئرپورٹ پر اترتے ہی گرفتار ہو جاؤں گا۔''

''ہوں!'' نواب ٹن دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ ''راز کو راز رکھ سکتے ہو؟'' مقصود نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''برابر کی میز پر کاغذ قلم رکھا ہے وہ اٹھاؤ اور اس طرح لکھو جیسے کوئی نسخہ یا تعویذ لکھ رہے ہو۔ ہوسکتا ہے کوئی خفیہ آنکھ ہمیں دیکھ رہی ہو۔''

مقصود نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر ''حق اللہ'' کا نعرہ لگایا اور جھومنے لگا۔ جھومنا بند ہوا تو کاغذ قلم اٹھا کر زائچے بنانے لگا۔ نواب ٹن آنکھیں بند کرکے بڑبڑا رہا تھا۔ جیسے وظیفہ پڑھ رہا ہو۔ مقصود ڈر گیا تھا کہ شاید غیر ملکی جاسوسوں کے [illegible] میں پھنس گیا ہے لیکن نواب ٹن

نے جو کچھ کہا وہ سن کر سنجیدہ ہو گیا۔ نواب ٹن نے اس کے کندھے پر ایک بھاری ذمے داری ڈال دی تھی۔

نواب کا بڑبڑانا بند ہوا تو مقصود کاغذ مٹھی میں بند کر کے اٹھا اور نواب ٹن کے جسم کے گرد سات دفعہ ہاتھ ہلایا جیسے نظر اتار رہا ہو۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر حق اللہ کا نعرہ لگایا۔ اس سرگرمی کے دوران اس نے کاغذ جھولی میں ڈال لیا تھا۔ نواب بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر مقصود کے ہاتھ میں رکھ دی۔

''یہ حبّ الوطنی کی قیمت نہیں، تمھاری پیری کا نذرانہ ہے۔''

مقصود عرف مکّی بابا نے باہر کھڑے ہوئے سپاہی کی طرح نوٹ واپس کرنے یا گننے کی کوشش نہیں کی۔ حق اللہ کا زوردار نعرہ لگایا اور پیسے اپنی جھولی میں ڈال کر دلاور اور پولا کو آواز دینے لگا۔

''آ جاؤ میرے بچو! خطرہ ٹل گیا ہے۔''

دلاور اور پولا شاید کمرے کے دروازے سے کان لگائے کھڑے تھے۔ فوراً باہر آ گئے۔ دلاور نے نواب ٹن کو نارمل حالت میں کھڑے دیکھ کر دل ہی میں حق اللہ کا نعرہ لگایا۔ وہ خوش تھا کہ مکّی بابا نے جن کو شکست دے کر بھگا دیا تھا۔

''پیر صاحب کو چھوڑ آؤ۔'' نواب ٹن نے دلاور کو دیکھ کر کہا۔

مکّی بابا نواب ٹن کے سر پر ہاتھ رکھ کر رخصتی دعائیں بڑبڑانے لگا۔ اس سے فارغ ہوا تو پولا کو گلے لگانے کے لیے اس کی طرف بڑھا، لیکن دلاور دل ہی دل میں لاحول پڑھتا ہوا جلدی سے درمیان میں آ گیا، مکّی بابا کے ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ پولا نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور مکّی بابا نے اسے دور ہی سے ہاتھ اٹھا کر دعا دی۔ دلاور باہر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا نواب ٹن کا کام ہو گیا تھا، اب وہ اپنے لیے کچھ مانگے گا۔ اس وقت تک آستانے سے نہیں اٹھے گا جب تک مکّی بابا اسے پولا کو ہمیشہ کے لیے غلام بنائے رکھنے والا تعویذ نہیں دے گا۔

ان کے جاتے ہی نواب ٹن دوبارہ صوفے پر گر گیا۔ ایک بوجھ سا اتر گیا تھا' لیکن ذہن تھکا تھکا سا تھا۔

''میری ڈرنک!'' اس نے دروازہ بند کر کے آتی ہوئی پولا کو دیکھ کر کہا۔

پولا تیزی سے کپڑے بدلنے کمرے میں چلی گئی۔ ساقی بننے کے لیے یونیفارم پہننا ضروری تھی۔ کپڑے بدلنے کی جلدی میں بھول گئی تھی یا دل میں نئی امید جاگ گئی تھی' اس نے کھلے گلے کے باریک بلاؤز اور منی اسکرٹ کے نیچے کچھ نہیں پہنا تھا۔ نواب ٹن کو ڈرنک لا کر دی تو خود بھی صوفے پر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''سر درد باؤں؟''

نواب ٹن نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا' لیکن کچھ کہا نہیں اور آنکھیں بند کر کے اپنا سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا۔ پولا اس کے چاندی جیسے گھنے گھنگریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی سوچ رہی تھی کیا کمال کا پیر تھا' ایک ہی ملاقات میں نواب ٹن کو صحت مند کر گیا۔

17

واشنگٹن

واشنگٹن میں ہلٹن کیپٹل ہل کے سامنے ایک ہی بار کھلا تھا۔ اس پر لال رنگ کے نیون سائن کی روشنیوں سے ایکس کے تین بڑے بڑے نشان جل بجھ رہے تھے۔ سرخ اور نیلے رنگوں کی روشنیوں کے جھماکے Topless کی نوید بھی سنا رہے تھے۔ ساحل نے جیب سے کاغذ نکال کر پتا دوبارہ پڑھا۔ پتا صحیح تھا' دائیں بائیں کوئی اور ریسٹورنٹ بار یا کلب نہیں تھا۔ ساحل ہمت کر کے دروازے پر پہنچا تو وارننگ کے سائن نے قدم روک لیے۔ ۲۱ سال سے کم عمر لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ ساحل دل ہی دل میں ہنسا۔ عمر کی ۲۵ بہاریں دیکھنے کے بعد بھی وہ شاید ایسے مقامات پر جانے کے لیے بالغ نہیں ہوا تھا۔ دل کڑا کر کے اندر داخل ہوا تو وہاں کا منظر دیکھ کر واپس بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا۔

ساحل واشنگٹن پہلے بھی آ چکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ شام چھ سات بجے شہر سائیں سائیں کرنے لگتا تھا۔ دنیا میں ہونے والے اکثر شور و ہنگامے اسی شہر کے مرہون منت تھے' لیکن اس کی اپنی گلیاں اور سڑکیں سرِ شام ہی سونی ہو جاتیں۔ ابھی سات نہیں بجے تھے' لیکن سب دکانیں اور ریسٹورنٹ بند ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر ہلکی سی ٹریفک تھی' چلتے پھرتے کسی شخص کا وجود نہیں تھا۔ ساحل کو سات بجے کسی سے ملنا تھا' لیکن وہ چھ بجے سے علاقے میں گھوم رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے ہلٹن ہوٹل کی سنسان لابی میں ایک چکر بھی لگا آیا تھا۔ پیانو بار کھلا تھا جہاں تھکے تھکے انداز میں پیانو بجاتا ہوا موسیقار بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صرف ایک گاہک بیٹھا اونگھ رہا تھا جو کبھی کبھی آنکھ کھول کر اپنے جام میں اس طرح جھانکتا جیسے صہبا سے صبح طلوع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ بارٹینڈر شیشے کے گلاس کپڑے سے رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا' اس نے ساحل کو امید بھری نظروں سے دیکھا تو ساحل جلدی سے واپس پلٹ گیا تھا۔ ہلٹن کے مقابلے میں Topless بار کا منظر بالکل مختلف تھا۔ لگتا تھا شہر کی سب رونقیں اور سارا شور اس ایک کمرے میں جمع ہو گیا تھا۔

چھوٹے سے اسٹیج پر تین لڑکیاں اپنے دودھ پلانے والے غدود مختلف زاویوں سے ہلا اور دکھا رہی تھیں اور ان کے اردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے تماشائی شیر خوار بچوں کی طرح کلکاریاں بھر رہے تھے۔ وہ باری باری اسٹیج کے پاس جاتے اور اپنی پسند کی کسی ایک لڑکی کی چڈی یا ران پر بندھا ہوا سیاہ لاسٹک کھسکا کر ڈالر کے نوٹ ٹھونستے ہوئے اس کے بدن کے کسی حصے کو چھونے کی سعادت حاصل کرتے۔ خوش خوش اپنی میز پر واپس آتے تو ان کا اس طرح استقبال ہوتا جیسے وہ کوئی مہم سر کر کے آئے ہوں۔ سب سے زیادہ شور اس میز پر تھا جس کے گرد آٹھ دس آدمی بیٹھے تھے۔ ہر عمر کے لوگ تھے' جوان' معمر اور بوڑھے! سب اپنے چہروں اور سوٹوں کی تراش خراش سے معزز لگتے تھے' لیکن اس وقت ان بچوں کی طرح تھے جنھیں پڑھتے پڑھتے اچانک کھیل کے میدان میں جانے کی اجازت مل گئی ہو اور وہ باری باری گیند پکڑنے کا

کھیل کھیل رہے ہوں۔

ساحل بار کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا جو اسٹیج سے فاصلے پر تھا اور جہاں اکثر اسٹول خالی پڑے تھے۔ صرف ادھیڑ عمر کا ایک شخص کونے کے ایک اسٹول پر ترچھا ہو کر اسٹیج پر نظر گاڑے اپنے جام سے کھیل رہا تھا۔ ساحل نے ایک خالی اسٹول پر بیٹھ کر کوک لانے کے لیے کہا تو بار ٹینڈر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ساحل نے پیسے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا' لیکن بار ٹینڈر اسے کوک دے کر پیسے لیے بغیر چلا گیا۔ ساحل کوک کی چسکیاں لیتا ہوا کبھی کبھی کنکھیوں سے اسٹیج کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ ساحل کے قریب بیٹھا ہوا شخص ایک بار بھی اسٹیج پر پیسے دینے نہیں گیا تھا' لیکن جب اسٹیج پر لڑکیوں کی دوسری ٹولی آئی تو اسٹیج سے اترنے والی تینوں لڑکیاں اپنا اپنا گاؤن پہن کر سیدھے اس کے پاس آئیں۔ اس نے باری باری ان کے رخسار کے بوسے لیے' ان کی کمر پر ہاتھ پھیرا' ان سے مذاق کیا اور تینوں قہقہہ لگاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ وہ یقیناً کوئی اہم آدمی تھا' شاید اس کلب کا مالک ہو' یا پرانا گاہک! ساحل اس کا خیال جھٹک کر اس شخص کے بارے میں سوچنے لگا جس سے ملنے وہ اس شراب خانے میں بیٹھا کوک پی رہا تھا۔

برازیل سے کسی مکی بابا نے فون کر کے نواب ٹن کا پیغام دیا تھا' ساحل اسی کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ اس نے واشنگٹن میں رابرٹ نیلسن نامی شخص کو نواب ٹن کا حوالہ دے کر فون کیا تھا۔ آپریشن مندوخیل کا نام سنتے ہی اس نے کوئی سوال کیے بغیر ملنے کا وقت دے دیا تھا۔ ساحل نہیں جانتا تھا کہ اسے کیسے پہچانے گا۔ رابرٹ نے کہا تھا وہ اسے خود پہچان لے گا۔ اس نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بج گئے تھے۔ ساحل نے سوچا وہ آئے گا بھی یا نہیں؟ اسی وقت بار ٹینڈر نے آ کر اس کا خالی گلاس بھر دیا۔ ساحل نے پیسے دینے کی کوشش کی' لیکن اس بار بھی وہ پیسے لیے بغیر مڑ گیا۔

''اس شراب خانے میں صرف شراب کے پیسے لیے جاتے ہیں۔'' کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا اور اٹھ کر ساحل کے برابر کے اسٹول پر آ گیا۔ ''تم نیویارک سے آئے

ہو؟''

''جی! لیکن آپ کو کیسے معلوم؟''

''تمھارے چہرے پر لکھا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ عجیب سی ہنسی تھی۔ صرف دانت نظر آئے تھے' آواز نہیں نکلی تھی۔ اس کے بالوں میں چاندی بکھری ہوئی تھی۔ چہرہ جیسے دھوپ میں جھلسا ہوا ہو۔ جینز پر آدھی آستین کی قمیض پہنے ہوئے تھا جس سے اس کے بازو کی مچھلیاں اور کسرتی جسم نمایاں تھا۔

ساحل کاؤنٹر پر جھک کر کوک پینے لگا۔ اسے سخت احتیاط کی تاکید کی گئی تھی۔ اس وقت کسی اجنبی سے گفتگو کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

''تم مجھ سے ہی ملنے آئے ہو۔'' اجنبی نے روانی سے اردو بولتے ہوئے کہا تو ساحل اچھل پڑا۔

''میں رابرٹ نیلسن ہوں' تم مجھے بابی کہہ سکتے ہو۔ پاکستان میں بابر کہلاتا تھا۔''

''آپ کو اتنی اچھی اردو کیسے آتی ہے؟'' ساحل نے حیرت کا اظہار کیا۔

''میں سندھی بھی بول سکتا ہوں۔''

''آپ کو کیسے معلوم کہ میں سندھی ہوں؟''

''یہ بھی تمھارے چہرے پر لکھا ہے۔'' رابرٹ ایک بار پھر خاموشی سے ہنسا' لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ''کئی سال تمھارے ملک میں رہا ہوں۔ پشتو اور بلوچی بھی جانتا ہوں۔ زبانیں نہیں جانتا تو تمھارے ملک سے زندہ واپس نہیں آتا۔ وہ کچھ اسی طرح کا زمانہ تھا۔''

''آپ اتنی دیر سے بیٹھے تھے' کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں تھا؟''

''دیکھتے ہی پہچان لیا تھا' لیکن احتیاط میرے پیشے کی ضرورت ہے۔'' اس نے اسٹیج پر تھرکتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔ ''انھیں بھی دیکھنا تھا ورنہ وہ ناراض ہو جاتیں۔ انھیں عادت ہے کہ میں انھیں دیکھتا رہوں۔ میں ان کے فن کا قدردان ہوں۔

''فن؟ اسے آپ فن کہتے ہیں؟''

''وہ لباس کا غلاف اتار کر ننگے بدن کی جنبشوں سے آرٹ پیدا کرتی ہیں۔ نیچر اپنے اصلی رنگ میں دھمال کرتی ہے۔ ہر عضو نیا زاویہ دکھاتا ہے۔ یہ شاعری ہے، سچ مچ کی شاعری۔ انھیں پتا ہے میں ان کا جسم چھونے نہیں شاعری کو سراپا مجسم دیکھنے آتا ہوں۔ اس لیے وہ میرا احترام کرتی ہیں۔''

''پیسے لیے بغیر؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی ساحل کے لہجے میں طنز آ گیا تھا۔

''فن کے لیے صرف قدر دانی کافی نہیں۔ دولت کا اس سے گہرا رشتہ ہے۔'' رابرٹ نے آنکھ مار کر کہا۔ ''وہ وقفے میں میرے پاس آتی ہیں، میرے ساتھ ڈرنک پیتی ہیں، میرے مذاق پر قہقہے لگاتی ہیں اور بھاری ٹپ لے کر چلی جاتی ہیں۔ نواب ٹن میرا ہم مذاق ہے۔ وہ بھی حسن کو ہاتھ لگائے بغیر سراہتا ہے۔ میں ننگے بدن کا عاشق ہوں اور وہ چہروں کا۔ تم نواب ٹن کا ٹائپ نہیں لگتے، تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

''میں ان کے اسکالرشپ پر پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔ وہ میرے والد کے دوست ہیں۔''

''تمھارے والد کون ہیں؟''

''فیاض منگی! وہ پریذیڈنٹ کے چیف آف اسٹاف ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔ وہ......'' رابرٹ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور فوراً بات بدل دی۔

''نواب ٹن نے تمھیں کیوں بھیجا ہے؟''

''انھوں نے اپنا قرض واپس مانگا ہے۔''

''وہ خود کیوں نہیں آیا؟ کیا وہ ابھی تک برازیل میں ہے؟''

''جی ہاں! مگر انھیں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ فون کی لائن تک کاٹ دی گئی ہے۔ وہ کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے۔''

''نواب ٹن نے اتنے چھوٹے کام کے لیے کہا ہے؟ یہ کام تو وہ خود بھی کر سکتا ہے۔ برازیل میں ایسے کئی لوگ اس کے Payroll پر ہوں گے جو اسے برازیل سے باہر نکلوا سکتے ہیں۔'' رابرٹ کی آنکھوں میں حیرت تھی، لیکن پھر اس نے کندھے اچکا دیے۔ ''ٹھیک ہے! تم نواب ٹن کو پیغام بھیج دو۔ میں اسے برازیل سے باہر نکلوا دوں گا' زیادہ سے زیادہ تین چار روز لگیں گے۔''

''نواب ٹن کا پیغام یہ نہیں ہے۔'' ساحل نے اپنی آواز نیچی کر کے کہا۔ ''آپ کی حکومت ہمارے اور بھارت کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکا رہی ہے۔ ہماری حکومت کا خیال ہے آپ لوگ علاقے میں کوئی خطرناک کھیل رچا رہے ہیں۔ نواب ٹن چاہتے ہیں آپ معلوم کر کے بتائیں کہ کیا اور کیوں؟''

''تم مجھ سے میری حکومت کے راز اگلوانا چاہتے ہو؟'' رابرٹ نے غصے سے کہا۔ اس کی گھومنے والی آنکھیں ساحل کے چہرے پر گڑ گئی تھیں۔ ''تمھیں پتا ہے میں تمھیں جاسوسی کے جرم میں پکڑ کر ایف بی آئی کے حوالے کر سکتا ہوں۔ قومی سلامتی کے نام پر تمھیں قتل کر کے کسی کوڑا گھر میں پھینک سکتا ہوں۔ مجھ پر سات خون معاف ہیں۔''

ساحل نے بھی اپنی پلک نہیں جھپکنے دی۔ یہ کم زوری دکھانے کا وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے نظریں پھیریں کوک کا آخری گھونٹ لیا اور اسٹول سے اتر آیا۔

''اگر آپ مجھے گرفتار نہیں کر رہے تو اجازت دیجیے۔'' ساحل کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''میں نواب صاحب کو پیغام بھجوا دوں گا کہ انھوں نے مجھے غلط آدمی کے پاس بھیجا تھا۔''

''بیٹھو بیٹھو!'' رابرٹ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ساحل کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا پھر اچک کر دوبارہ اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''تمھیں اندازہ نہیں ہے یہ کتنے نازک اور حساس معاملات ہیں۔'' رابرٹ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''نواب ٹن نے ایک کچے نوجوان کو بھیج دیا۔ [illegible] سے کوئی اناڑی پولیس والا

بھی راز اگلوا سکتا ہے۔ آئی ایم ساری۔ برانہ مانو۔ میں حقیقت بتا رہا ہوں۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔''

''میں کوئی پیشہ ور یا تربیت یافتہ جاسوس نہیں ہوں۔ لیکن اپنے ملک کے مفاد اور اس کے راز کی حفاظت کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں' دے سکتے ہو۔ اس عمر میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جذباتی' آئیڈیلسٹ' انقلاب کے نعرے لگانے والے۔ تم کس یونیورسٹی میں پڑھتے ہو؟''

''این وائی یوّ۔''

''میں کولمبیا میں تھا۔ جذباتی اور نعرہ باز۔ جنگ کے خلاف مظاہروں میں سب سے آگے۔ تیسری دنیا کے مظلوم عوام کا پر جوش حامی' لیکن زندگی آگے بڑھتی ہے تو سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں نے تمھاری تیسری دنیا تم سے زیادہ دیکھی ہے۔ وہ کچھ دیکھا ہے کہ دل میں گھاؤ پڑ کر ناسور ہو جائیں۔ لیکن دل پتھر کا ہو جائے تو ہر منظر معمول کا حصہ لگنے لگتا ہے۔ جذبے کولڈ اسٹوریج میں رہ کر ٹھنڈے یخ ہو جاتے ہیں۔ آئس کولڈ! دو چار سال میں تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''آپ نواب ٹن کے مقروض کیوں ہیں؟'' ساحل اسے واپس کھینچ لایا۔ وہ اس کا لیکچر سننے نہیں آیا تھا۔

''نواب ٹن نے میری جان بچائی تھی۔ میری زندگی نواب ٹن کا دیا ہوا قرض ہے۔ کہانی سنو گے؟''

ساحل نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ اسے اب بھی وہ کام ہونے کی امید تھی جس کے لیے وہ آیا تھا۔ حالات نے اس کے کندھوں پر ایک بھاری ذمہ داری رکھ دی تھی۔ نواب ٹن کے پیغام میں راز داری کی سخت تاکید تھی۔ پھر بھی ساحل نے تکریم اور میک کو اعتماد میں لیا تھا' دونوں اسے واشنگٹن جانے والی ٹرین میں بٹھانے گرینڈ سنٹرل آئے تھے۔ میک نے گلے لگا کر

اور تکریم نے کامیابی کی دعا دے کر الوداع کہا تھا۔ میک کے چہرے پر تشویش کا سایہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ساحل کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ کس نازک اور مشکل مشن پر جا رہا ہے۔ اس نے ساحل کو سخت احتیاط کی تاکید کی تھی۔ تکریم بھی میک کی پریشانی دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے ساحل کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی، لیکن میک اور ساحل دونوں نے اسے سختی سے روک دیا تھا۔

''مجھے کراچی میں ایک دوست نے نواب ٹن سے ملوایا تھا۔'' رابرٹ نے کہانی شروع کی تو ساحل چونک پڑا۔ ''میں بلوچستان اور سرحد کے مشکل علاقوں سے چھٹی لے کر کراچی آتا تو نواب ٹن کا مہمان ضرور بنتا۔ وہ کمال کا ذریعہ تھا۔ ہر خبر تک اس کی پہنچ تھی، ہر اطلاع اس کے پاس موجود تھی۔ اس وقت وہ اتنا دولت مند نہیں تھا، لیکن اس نے مجھ سے کسی خبر یا اطلاع کے پیسے نہیں لیے۔ کہتا تھا وہ دوستوں سے کاروبار نہیں کرتا۔''

اسی وقت ناچنے والی لڑکیوں کی شفٹ بدلی تھی۔ اسٹیج سے اترنے والی لڑکیاں رابرٹ کی طرف آئیں۔ اس نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیے بغیر انھیں اسی وقت رخصت کر دیا۔

''افغان جنگ ختم ہوتے ہی میں واپس واشنگٹن آ گیا۔'' لڑکیوں کے جاتے ہی کہانی دوبارہ شروع ہو گئی۔ ''میری ترقی ہو گئی تھی، میرا خیال تھا اب میں دفتر تک محدود رہوں گا۔ فیلڈ آپریشنز کا زمانہ ختم ہو گیا تھا، لیکن سی آئی اے ایک عجیب ادارہ ہے، یہاں کوئی کسی بھی وقت کہیں بھی بھیجا جا سکتا ہے۔''

ساحل کے اندر دوڑتی ہوئی سنسنی تیز ہو گئی۔ اب تک کتابوں میں پڑھا اور فلموں میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سچ مچ سی آئی اے کے ایک بڑے افسر سے ہم کلام تھا، جو اعتراف کر رہا تھا کہ وہ کون ہے اور اپنے کارنامے سنا کر خوش ہو رہا تھا۔

''مجاہدین ہمارے دیے ہوئے اسٹنگر میزائل مارکیٹ میں بیچ رہے تھے۔ ہمیں کسی طرح ان سے وہ میزائل واپس خریدنے تھے۔ اس کام کے لیے مجھے خود پاکستان جانا پڑا۔ میں

نے اسے آپریشن مندوخیل کا نام دیا تھا۔ کچھ دن نواب کے پاس کراچی میں رہا اور پھر بلوچستان جا کر میزائلوں کی واپسی کے سودے کرنے لگا۔ ملاّ کلاشنکوف نامی ایک قبائلی سردار کے دو اسٹنگر دو ملین ڈالر میں لینے کا سودا ہوا۔ ہمیں چمن اور اسپن بولڈک کے درمیان ایک ویران مکان میں پیسوں اور میزائلوں کا تبادلہ کرنا تھا۔ لیکن اس سے ایک رات پہلے نواب ٹن مجھے تلاش کرتا ہوا چمن پہنچ گیا۔ نواب سے میرا رابطہ نہیں تھا پھر بھی اس نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا۔ اس نے بتایا یہ سودا محض ایک جال ہے۔ ملا کلاشنکوف کے پاس اسٹنگر نہیں ہیں' اس کے آدمی ہمیں مار کر پیسہ چھینیں گے اور بھاگ جائیں گے۔

''مجھے یقین نہیں آیا۔ جس کے ذریعے سودا ہوا تھا وہ بہت معتبر تھا۔ میرا کئی بار کا آزمودہ' لیکن نواب ٹن کی اطلاع نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم دو ملین ڈالر لے کر طے شدہ جگہ پہنچے' لیکن مکان میں پہنچ کر پیچھے کی دیوار میں نقب لگائی اور باہر نکل کر پتھروں کے پیچھے چھپ گئے۔ نواب کی اطلاع سو فیصد درست تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مکان زبردست گولہ باری کی زد میں تھا۔ ہم وہاں ہوتے تو منٹوں میں چھلنی ہو جاتے۔ ملاّ کلاشنکوف نوٹوں کے تھیلے لینے اندر آیا اور کسی کو نہ پا کر واپس بھاگ گیا۔ میں نے کبھی موت کو اتنا قریب آ کر واپس جاتے نہیں دیکھا تھا۔''

رابرٹ نے بارٹینڈر کا دیا ہوا تازہ جام اٹھا کر منہ میں انڈیلا اور برا سا منہ بنا کر کہنے لگا۔ ''میں نے نواب ٹن سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جو کچھ میرے بس میں ہے' وہ جب چاہے طلب کر سکتا ہے۔ اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اس نے کہا تھا۔ وہ وعدے جمع کرتا ہے' جب ضرورت پڑی' تجوری سے نکال کر کیش کرا لے گا۔ Rain cheque کی طرح!''

ooo

''نواب ٹن نے وہی وعدہ تجوری سے نکال کر آپ کو بھیجا ہے۔'' ساحل نے ایک بار پھر کوشش کی۔

''ہمارے پیشے کی اخلاقیات فیلڈ آپریٹرز کے کیے ہوئے وعدوں کے گرد گھومتی ہیں۔

یہ وعدے پورے نہ ہوں تو کوئی ہمارا اعتبار نہیں کرے گا' لیکن اس کی بھی کچھ حدود ہیں۔''

رابرٹ کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھنے لگا۔ ''تمھارے پاس کوئی آئی ڈی ہے؟''

''کیوں؟''

''مجھے دیکھنا ہے تم وہی ہو جو کہہ رہے ہو کہ ہو۔''

ساحل نے اپنے بٹوے میں سے کارڈ نکال کر رابرٹ کو دیا' اس نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے نیپکن پر سوشل سیکیوریٹی نمبر لکھ کر کارڈ واپس کر دیا۔

''تم کہاں ٹھہرے ہو؟''

''کہیں نہیں! میں ٹرین سے اتر کر سیدھا یہیں آیا تھا۔''

رابرٹ نے ایک اور نیپکن پر کچھ لکھ کر ساحل کو دیا۔ ''یہ ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جس ٹیکسی ڈرائیو کو بتاؤ گے پہنچا دے گا۔ وہاں تمھارے نام سے کمرہ بک ہوگا۔ کل شام چار بجے کے بعد کمرے میں رہنا' میں کسی وقت بھی آ سکتا ہوں۔''

''آپ کا بہت شکریہ!'' ساحل اسٹول سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

''میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔'' رابرٹ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''صرف وہی بتا سکتا ہوں جسے بتانا غداری کی حدود سے باہر ہوگا۔''

O O O
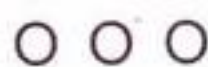
موٹل چھوٹا لیکن کمرہ بہت شاندار اور آرام دہ تھا۔ ساحل رات بھر سو نہیں سکا۔ پیٹ میں بار بار مروڑ اٹھ رہے تھے۔ آنکھ لگی بھی تو ڈراؤنے خوابوں نے چونکا کر اٹھا دیا۔ کسی طرح صبح ہوئی تو موٹل سے ناشتہ کر کے نکلا' شہر میں بے مقصد گھومتا رہا اور چار کے بجائے دو بجے کمرے میں واپس آ کر رابرٹ نیلسن کا انتظار کرنے لگا۔ ٹی وی دیکھنے کی کوشش کی' لیکن کسی پروگرام پر نظر جم نہیں رہی تھی۔ بہت مشکل سے چار بجے۔ چار [illegible] کے بعد وقت کی رفتار اور

ست ہوگئی۔ پانچ بجے تو ساحل سوچنے لگا رابرٹ آئے گا بھی یا وہ اسے یرغمال بنا کر چلا گیا ہے۔ ایک بار ساحل نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ وہ باہر سے مقفل تو نہیں، یا دروازے پر کوئی پہرے دار تو نہیں کھڑا۔ اس کے اوہام صحیح نہیں تھے۔ رابرٹ چھ بجے ساحل کے کمرہ میں موجود تھا۔

اس کے چہرے پر بارہ بجے کا سماں تھا۔ اس نے سامنے کھڑے ہوئے ساحل کو دیکھا تک نہیں اور اپنے بیگ سے جیک ڈینیل کی بوتل نکال کر گلاسوں میں بھرنے لگا۔

''آپ کو پتا ہے میں شراب نہیں پیتا۔'' ساحل نے اسے دو گلاسوں میں شراب انڈیلتے دیکھ کر کہا۔

''مجھے معلوم ہے'' لیکن آج سے پینے لگو گے۔'' رابرٹ نے کھڑے کھڑے ایک ہی گھونٹ میں ساری مائع حلق میں انڈیلی اور گلاس دوبارہ بھر کر آرام دہ کرسی میں دھنس گیا۔

''تمھارے ملک پر بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔'' رابرٹ نیلسن نے ساحل کو دیکھ کر کہا جو خود بھی اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ''مجھے یقین نہیں تم لوگ جاننے کے بعد بھی کچھ کر سکو گے۔''

ساحل کے پیٹ میں ایک بار پھر مروڑ ہونے لگا۔ سامنے بیٹھا ہوا شخص کسی چھوٹی بربادی کو تباہی نہیں کہہ سکتا تھا۔

''تمھاری حکومت کو صحیح اطلاع ملی ہے۔ تمھاری سرحدوں پر فوجوں کو آمنے سامنے کھڑا کرنے میں ہمارا ہاتھ ہے۔''

''کیوں؟''

''دل کو مضبوط کر کے اور غور سے سنو۔'' وہ بوربن کا دوسرا جام پینے کے بعد پرسکون ہو گیا تھا اور میز پر جھک کر ساحل کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ''ہم دونوں ملکوں کے درمیان ایٹمی جنگ چاہتے ہیں، ایٹمی جنگ! سرحد کے دونوں طرف ایٹم بم گرنے والے ہیں۔ صرف

دنوں یا گھنٹوں کی بات ہے۔''

''یہ ناممکن ہے۔ یہ ناممکن ہے۔'' ساحل نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ اس وقت یہ ہمارے ادارے کا سب سے گہرا راز ہے۔ میری ٹاپ سیکیوریٹی کلیرنس ہے پھر بھی تفصیلات جاننے کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنا پڑا تھا۔ ایک ایک تفصیل طے ہے۔ یہ تک کہ یہ دن یا وہ دن۔''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ کتنی بڑی تباہی آئے گی' کتنے لوگ مریں گے؟''

''دو ملین کا اندازہ ہے۔'' رابرٹ نے اس طرح کہا جیسے مکان کی قیمت بتا رہا ہو۔

''بھارت کی آبادی ایک ارب ہے اور تمھاری پندرہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ بیس لاکھ کی کمی سے بڑا فرق نہیں پڑے گا۔ افریقہ کا قتل عام یاد ہے؟ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ ان کے پاس ایٹم بم نہیں تھے۔ انہوں نے صرف بندوقوں اور چھروں سے لاکھوں کو مار دیا۔ دنیا کا ضمیر یہ قتل عام دیکھ کر بھی سوتا رہا تھا۔''

''یہ وحشی قبائل کا جھگڑا نہیں ہے۔ ایٹمی لڑائی سے پوری دنیا دہل جائے گی۔ وہ آپ کو معاف نہیں کرے گی۔''

''دنیا! کون سی دنیا؟ ہم نے عراق پر حملہ کیا' اقرار کیا کہ حملے کی وجہ جھوٹی تھی' پھر بھی قبضہ کیے بیٹھے رہے۔ دنیا نے کیا کیا؟ ہم دنیا کو آج بھی آزادی' جمہوریت اور اخلاقیات کا درس دے رہے ہیں۔ تمھارے معاملے میں تو ہمارا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔''

رابرٹ سکون سے بوربن کے گھونٹ لیتا ہوا شیطان کا وکیل بن گیا تھا۔ ''تم دونوں نے ایٹم بم لالی پاپ کی طرح چوسنے کے لیے نہیں بنائے تھے۔ خودکشی کا شوق خود تمھیں ہے' دوش ہمارا نہیں ہے۔ ہم تو صرف سوئم اور چالیسویں کا کھانا کریں گے۔ نوحے پڑھتی ہوئی دنیا بھی تمھی کو الزام دے گی۔''

رابرٹ کے سکون اور اطمینان کو دیکھ کر ساحل کے پیٹ کا مروڑ بڑھنے اور سر گھومنے

لگا۔ اندر ہی اندر ایک لہر اٹھتی ہوئی دماغ کی طرف جا رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تو اس نے رابرٹ کا نسخہ استعمال کیا۔ رابرٹ نے اس کے لیے گلاس میں جو شراب ڈالی تھی اسے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ ایسا لگا جیسے سینے میں تلوار اتر گئی ہو۔ معدہ حلق میں آ گیا تھا۔ وہ باتھ روم کی طرف بھاگا اور اندر جا کر الٹیاں کرنے لگا۔ پیٹ میں کچھ نہیں بچا پھر بھی ابکائیاں آتی رہیں۔ قرار آیا تو سر پکڑ کر ٹائیلٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سر گھومنا بند ہوا تو پیلا چہرہ لیے ہوئے باہر آیا جہاں رابرٹ نے اس کے لیے سیاہ کافی بنا کر رکھ دی تھی اور خود اطمینان کے ساتھ ہاتھ میں گلاس لیے اسے گھما رہا تھا۔

''شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رابرٹ نے ساحل کو دیکھ کر کہا جو نظریں نیچی کیے کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔ ''میرے اعصاب فولادی ہیں' پھر بھی میرا پہلا ردعمل یہی تھا۔ سیدھا باتھ روم کی طرف بھاگا تھا۔ مجھے لگا تھا قتل عام کرنے والوں میں مَیں بھی شامل ہوں۔ پہلے سوچا تھا' نہیں بتاؤں گا۔ کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ وہی ہونا ہے جو ہونا ہے۔ لیکن ایک موہوم امید ہے' شاید کوئی روک سکے۔ میرے ضمیر پر بوجھ نہیں رہے گا۔ یہ بھی ڈر تھا تم کسی سے میرا نام نہ لے دو۔ لیکن اب پروا نہیں ہے۔ جہاں بیس لاکھ وہاں ایک اور۔''

''فائدہ کیا ہوگا' امریکہ کو اس تباہی سے کیا ملے گا؟''

''فائدے ہی فائدے ہیں' ان گنت فائدے!''

رابرٹ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب وہ ایک پیشہ ور تجزیہ کار تھا۔ ''پورا علاقہ ایٹمی ہتھیاروں سے پاک ہو جائے گا۔ بیس لاکھ افراد کی ہلاکت عالمی ضمیر جھنجھوڑ کر رکھ دے گی۔ عالمی ادارے بڑی طاقتوں کی مدد سے ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ ایران جیسے ملک جو ایٹمی طاقت بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں' ان کا گلا دبا دیا جائے گا۔ عالمی رائے عامہ چوں نہیں کرے گی نہ کوئی دوسرا ملک کچھ کہہ سکے گا۔ تباہی خود تمھاری اپنی لائی ہوئی ہوگی' امریکہ اور اس کے اتحادیوں پر کوئی انگلی نہیں اٹھے گی۔ ہم امن کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر پہنچیں

گے، تمھارا ریڈیائی ملبہ صاف کریں گے، امداد کے ڈھیر لگا دیں گے اور مسیحا کہلائیں گے۔ عراق میں ہمیں جو بدنامی ملی ہے اس کے داغ دھبے مٹ جائیں گے یا بھلا دیے جائیں گے۔ جس طرح عراق کے پردے میں افغانستان چھپ گیا تھا' اسی طرح ہندوستان اور پاکستان کے پردے میں مڈل ایسٹ چھپ جائے گا' کسی کو دیکھنے کی فرصت نہیں ہوگی کہ ہم وہاں کیا کر رہے ہیں نہ کسی کو یہ پوچھنا یاد رہے گا کہ عراق سے کب جاؤ گے؟''

رابرٹ جو بہت اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا اور بہت سست نظر آ رہا تھا بجلی کی سرعت سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ شاید کوئی کھٹکا ہوا تھا لیکن دور تک کوئی نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر پردہ برابر کر کے مطمئن ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کچھ اور سنو گے؟'' اس نے نیا جام بناتے ہوئے کہا۔ ساحل کچھ نہیں بولا۔ اس نے صرف اپنی کافی کا آخری گھونٹ لیا اور کپ واپس رکھ دیا۔ اس کی طبیعت کافی بہتر ہو گئی تھی۔

رابرٹ کی تقریر دوبارہ شروع ہو گئی۔ ''ہمیں اور اسرائیل کو ہمیشہ سے یہ غم ہے کہ تمھارے ایٹمی ہتھیار انتہا پسندوں کے ہاتھ لگ جائیں گے یا کوئی انتہا پسند مذہبی جنرل اقتدار میں آ کر القاعدہ کو ایٹمی ہتھیاروں سے لیس کر دے گا۔ یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گا۔ ایک بم شمال کی اس پٹی پر گرے گا' جہاں کتنے ہی اسامہ بن لادن چھپے بیٹھے ہیں۔ ان کی آنے والی نسلیں بھی اسلامی انقلاب کا نام نہیں لیں گی۔''

''خطرہ پاکستانی بم سے ہے تو بھارت کو سزا کیوں؟'' ساحل پہلی بار بولا۔ ''امریکہ اتنے بڑے پیمانے کی تباہی کا خطرہ لیے بغیر ایک چھوٹا سا آپریشن کر کے یہ کام خود کر سکتا ہے۔''

''ہمیں یہ کام ایک بھی سپاہی بھیجے اور انگلی اٹھائے بغیر کرنا ہے۔ ہم ایک نئی بدنامی مول نہیں لے سکتے۔''

''لیکن بھارت کیوں؟'' ساحل نے سوال پھر دہرایا۔

''ہم اُس خطے میں طاقت کا توازن بگاڑنا نہیں چاہتے۔ صرف پاکستان کی ایٹمی طاقت ختم ہوئی تو بھارت اور شیر ہو جائے گا۔ کل وہ ہمیں بھی آنکھیں دکھا سکتا ہے۔ پاکستان ہمارا پرانا دوست ہے ہم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے اس کے دشمن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔''

''دوست!'' ساحل بہت مشکل سے ہنس سکا۔ ''آگ کے کنویں میں دھکیل کر بھی دوستی کا دعویٰ ہے۔''

''یقیناً ہے!'' رابرٹ ایک بار پھر شیطان کا وکیل بن گیا۔

''تمھاری دنیا میں جینا مرنا روز کا معمول ہے۔ دہشت' فسادات' وبائیں' گرمی' سردی' بارشیں' سیلاب' زلزلے ہر روز کے اخبار کی سرخی یہی ہے۔ اس بار کچھ زیادہ لوگ' اور ایک ہی بار مر جائیں گے' لیکن اس کے بعد خوش حالی آئے گی۔ عالمی طاقتیں تمھارے سر پر آ کر بیٹھ جائیں گی۔ تمھارے تنازعے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ ہتھیاروں کی دوڑ بھی بند ہو جائے گی۔ گولی کی جگہ روٹی خریدو گے' میزائلوں کی جگہ اسکول بناؤ گے اور ٹینکوں کی جگہ ٹریکٹر چلاؤ گے۔ ایک ایٹمی جنگ سے تمھاری دنیا نئی ہو جائے گی۔ یہ تباہی کا نہیں' نئی خوش حال دنیا کا سپنا ہے۔ جاپان بھی دو ایٹم بم کھانے کے بعد دنیا کی بڑی معیشت بن کر ابھرا تھا۔''

''آپ جسے تجزیہ اور نئی دنیا کا سپنا کہہ رہے ہیں' وہ ہمارے ملک کا ایک پرانا لطیفہ ہے۔'' ساحل کے اندر غصے کی لہر کروٹیں لے رہی تھی۔ ''یہ آپ کا تجزیہ ہے یا یہ بھی......''

''نہیں میرا نہیں ہے۔'' رابرٹ کی آنکھوں میں اداسی تیر گئی۔ ''آپریشن ہیروشیما کے منصوبہ سازوں نے اپنے ضمیر کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ نئے افغانستان اور نئے عراق کے بعد اب ہم نیا پاکستان اور نیا ہندوستان بنائیں گے۔ دنیا کو خوش نما بنانے کے لیے پرانے بوسیدہ مکان گرا کر نئے مکان کی تعمیر! آپریشن ہیروشیما اسی منصوبے کا حصہ ہے۔''

''آپ لوگ سخت بیمار ہیں۔ پاگل اور جنونی۔'' ساحل کے چہرے کا پیلا رنگ لال ہو

گیا۔ ''آپ چنگیز اور ہلاکو خان کا نیا روپ ہیں، لیکن وہ لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ انھوں نے بغداد کی لائبریری جلانے کے لیے نئی کتابیں لکھنے کا بہانہ نہیں کیا تھا۔ آپ لوگ آخر چاہتے کیا ہیں؟ آپ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہیں۔ پوری دنیا آپ کو بادشاہ سلامت مانتی ہے۔ پھر بھی آپ مطمئن نہیں ہوتے؟ آپ جنگل کے شیر ہیں، چھوٹے چھوٹے خرگوشوں اور کچھووں پر رحم کیجیے۔ انھیں اپنی دوڑ لگانے دیں، آپ کسی ہاتھی کا شکار کریں، کسی ہاتھی کا!''

''کوئی ہاتھی بچا ہی نہیں۔'' رابرٹ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''ہم ایک کچھوا ڈھونڈ کر اور اس میں ہوا بھر کے اسے ہاتھی بناتے ہیں۔ پھر اسے ہانکا دیتے ہیں اور پتھر مار مار کر اس کا سر کچل دیتے ہیں۔ یہ کھیل رک گیا تو ہمارے ہزاروں ماہرین اور منصوبہ ساز بے روزگار ہو جائیں گے۔ خبرنامے دیکھنے والے نہیں رہیں گے اور ٹی وی نیٹ ورک دیوالیہ ہونے لگیں گے۔''

''تاریخ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ کبھی نہیں!''

''تاریخ!'' رابرٹ ہنسا۔ وہی بے آواز ہنسی۔ ''تاریخ میں معاف کرنے یا نہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ وہ صرف پرانی داستانیں پڑھ کر ان کا مزا لینے اور لوری دینے کے کام آتی ہے۔ تاریخ میں کچھ لکھا بھی گیا تو کیا ہوگا، تم نے کسی چھوٹے یا بڑے حکمران کو تاریخ سے سبق لیتے دیکھا ہے؟ تاریخ کا سبق صرف تاریخ دان لیتے یا دیتے ہیں۔''

''میں آپ کے آپریشن ہیروشیما کا پردہ فاش کرنے جا رہا ہوں۔'' ساحل کھڑے ہو کر اپنا بیگ سنبھالنے لگا۔ باتیں بہت ہو گئی تھیں، اب کچھ کرنا بھی تھا۔

''کیا کرو گے؟''

''واشنگٹن پوسٹ جا کر انھیں پوری کہانی سناؤں گا۔ بتاؤں گا ان کی حکومت نسل کشی پر آمادہ ہے۔''

''اسکالرشپ پر رہنے والے ایک پاکستانی طالب علم کی [illegible] کون سنے گا؟ سنی بھی تو یقین

کون کرے گا۔'' رابرٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم ریسپشن سے آگے نہیں بڑھ پاؤ گے۔ کسی تک پہنچ بھی گئے تو تمھاری Conspiracy theory کی ہنسی اڑے گی۔ ثبوت اور شہادت کے بغیر کوئی کچھ نہیں چھاپے گا۔ سی آئی اے والوں سے پوچھا گیا تو وہ بھی مذاق اڑائیں گے۔ تم میرا نام لو گے تو ثابت ہو جائے گا تم چنڈو خانے سے آئے ہو۔ کاغذات پر میں اس شراب خانے کا مالک ہوں جہاں کل تم کوک پی رہے تھے۔ اس کے بعد تم نیویارک جانے سے پہلے غائب ہو جاؤ گے۔''

''تباہی پھیلی تو انھیں میری کہانی یاد آئے گی۔ آپ کا بھید کھل جائے گا۔''

''کیا فائدہ؟ جو ہونا ہے وہ تو ہو چکا ہوگا۔ تم کسی کو یاد بھی آئے تو زیادہ سے زیادہ کسی کہانی کا حاشیہ بن جاؤ گے۔''

ساحل کے پیٹ میں پھر مروڑ اٹھا اور وہ گہرے سانس لے کر طبیعت سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

''چین!'' ساحل کی آنکھیں چمک گئیں۔ ''مجھے یقین ہے چین ایسا نہیں ہونے دے گا۔''

''تمھارا خیال ہے چین کو پتا نہیں ہے؟''

''کیا؟'' ساحل کی آنکھوں کی چمک حیرت میں بدل گئی۔ ''میں نہیں مان سکتا کہ چین بھی شامل ہے۔''

''تم بہت بھولے ہو۔ اپنے قومی مفادات سب کو عزیز ہیں۔ ڈپلومیسی انھی مفادات کو بچانے کی سوداگری ہے۔''

''چین کو کیا فائدہ پہنچے گا؟''

''امریکہ چین کو ایشیا کی سپر پاور تسلیم کر لے گا۔ چین کو عالمی طاقت بننے کا شوق بھی نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جاپان اسے بڑا بھائی تسلیم کر لے اور G-8 کے بجائے چین سے

ناطہ جوڑے۔'' رابرٹ پھر سے تجزیہ کار بن گیا۔''چین کے لیے بھارت ایک چیلنج ہے۔ایٹمی جنگ کے بعد یہ چیلنج بھی ختم ہو جائے گا۔ امریکہ کو ڈیل کرنا پڑی ہے۔ چین کی تجارت بھی فائدے میں رہے گی۔ عالمی منڈی میں بھارت چین کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ چین پاکستان کا دوست ہے' اس کی تعمیر نو کا سب سے بڑا ٹھیکہ چین کو ملے گا۔ وہ پاکستان کو صنعتی طاقت بننے میں مدد دے گا۔ پاکستان سے چین کا وہی تعلق ہوگا جو جاپان کا جنوبی کوریا سے ہے۔ پاکستان کے لیے فائدہ ہی فائدہ ہے۔''

''Sick!'' ساحل نے حلق تک آنے والی لہر کو واپس بھیجتے ہوئے کہا۔ آنکھوں میں اداسی اور مایوسی ساتھ ساتھ تیر رہی تھیں۔

''میں قاتلوں کے نہیں تمہارے ساتھ ہوں۔ صرف وہ بتا رہا ہوں جو مجھے معلوم ہوا ہے۔ مجھے اس طرح مت دیکھو۔'' رابرٹ ساحل کی طرف جھک آیا۔''صرف ایک شخص اس تباہی کو روک سکتا ہے۔''

''کون؟'' ساحل کی آنکھوں میں امید جاگ گئی۔

''تمہارا صدر۔ ایمان علی! آپریشن ہیروشیما کے Risk evaluation میں بھی اسے رکاوٹ سمجھا گیا ہے۔ اس لیے اسے بھٹکانے اور چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تک خبر پہنچنا ضروری ہے' وہ بھی کسی ایسے ذریعے سے کہ اسے یقین آ سکے۔''

''خبر پہنچ بھی گئی تو وہ کیا کر سکے گا۔''

''وہ ایک ملک کا صدر ہے' اس کی شہرت اچھی ہے۔ اور اس کا اعتبار بھی ہے۔ اس کی کہی ہوئی بات نظر انداز نہیں کی جا سکے گی۔ وہ انٹرنیشنل میڈیا میں راتوں رات کھلبلی مچا سکتا ہے' چین کو صاف صاف بات کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ اپنے جنگ باز جنرلوں کی پیٹیاں اتار سکتا ہے اور نئی دہلی جا کر بھارتی وزیراعظم کو بھی ایسا ہی کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ لیکن تم اسے خبر پہنچاؤ گے کیسے؟

''نواب ٹن نے اپنے پیغام میں اپنے نیشنل سیکیوریٹی ایڈوائزر کرم قریشی کا نمبر بھیجا ہے۔ انھوں نے ہی نواب ٹن سے کہا تھا کہ وہ کسی ذریعے تک پہنچ کر تفصیلات حاصل کریں۔ میں یہ پیغام کرم قریشی تک ان کے بیٹے کے ذریعے بھجواؤں گا۔''

''تو پھر دیر مت کرو' فوراً روانہ ہو جاؤ۔''

''اسلام آباد اور نئی دہلی کے سفارت خانوں میں آپ کے اور آپ کے اتحادیوں کے سینکڑوں لوگ ہیں۔ کیا آپ لوگ انھیں بھی آپریشن ہیروشیما کی بھینٹ چڑھا دیں گے۔'' ساحل نے اٹھتے اٹھتے وہ سوال پوچھا جو بہت دیر سے اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔

''اسلام آباد اور نئی دہلی کے سفارت خانے تقریباً خالی پڑے ہیں۔ کیا تم اخبار نہیں پڑھتے؟'' رابرٹ اٹھتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ''کل سے کولمبو میں ایشیائی ملکوں میں کام کرنے والے امریکی اور یورپی سفارت کاروں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ ان کے خاندان چھٹیوں کے بہانے پہلے ہی واپس جا چکے ہیں۔ جو نہیں گئے وہ پکنک کرنے کولمبو چلے گئے ہیں۔ جو بچ گئے ہیں وہ Collateral damage! ہمارے کچھ لوگوں کا مرنا ضروری ہے ورنہ ہمارا ضمیر پوری طرح نہیں جاگے گا۔''

''کانفرنس کب ختم ہو گی؟'' ساحل کی آواز سرگوشی کی طرح نکلی تھی۔ بار بار ایک نیا حیرت کدہ کھل رہا تھا۔

''پرسوں! جو کچھ ہونا ہے کل اور پرسوں کے درمیان ہونا ہے۔ صرف چند گھنٹوں کی بات ہے۔''

○ ○ ○

ساحل کو نیویارک پہنچتے پہنچتے آدھی رات ہو گئی۔ راستے بھر اوہام کا شکار رہا تھا' جیسے بدن پر ایٹم بم بندھے ہو۔ دونوں کندھوں پر ایک ایک ملین کی آبادی کا بوجھ تھا۔ اگر اس کے

جسم پر بندھے ہوئے بم پھٹ گئے‘ کندھوں پر چڑھے ہوئے لوگ گر کر مر گئے؟ یہ سوچ سوچ کر ابکائیاں آتیں‘ کئی بار باتھ روم کی طرف بھاگا تھا۔ اونگھتا ہوا پڑوسی مسافر کبھی کبھی آنکھ کھول کر اسے تشویش سے دیکھتا اور پھر سو جاتا۔ ''ایم ٹریک'' کی تیز دوڑتی ٹرین کو جھٹکا لگتا تو ساحل خوف زدہ ہو جاتا۔ اگر ٹرین پٹڑی سے اتر گئی‘ اسے کوئی حادثہ پیش آیا تو کیا ہوگا؟ اس کے ساتھ وہ اطلاع بھی ٹرین کے ملبے میں دب جائے گی جو بیس لاکھ افراد کو مرنے سے بچا سکتی ہے۔

گرینڈ سنٹرل اتر کر میک کے پاس جانے کے لیے ٹرین کے انتظار میں ویران پلیٹ فارم پر اسے پہلی بار ڈر لگا۔ کسی نے اسے لوٹنے کی کوشش کی اور وہ مارا گیا تو! وہ پہلی لائنوں والے اس حصے میں کھڑا رہا جو سیکیوریٹی کیمروں کی زد میں تھا۔ بارہ بجے کے بعد ٹرینیں دیر دیر سے آتی تھیں۔ وقت بتانے والی سوئیاں بھی شاید چلتے چلتے تھک گئی تھیں۔ ساحل نے جب دو بجے میک کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وقت اور ساحل کا چہرہ دیکھ کر میک اور سیلما دونوں سمجھ گئے تھے کوئی بہت بری اور ایسی خبر ہے جو انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

سیلما کافی بنا کر لائی اور ساحل نے جلدی جلدی اپنا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اب اس کی سانس رک بھی جاتی تو اسے پروا نہیں تھی۔ سیلما کا ساحل جیسا حال ہوا تھا۔ وہ تیزی سے باتھ روم کی طرف دوڑی لیکن میک کا اندرونی نظام مضبوط تھا‘ پھر بھی اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ سیلما اپنے لیے کافی بنا کر لے آئی اور فرش پر میک کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ساحل کمرے میں رکھے ہوئے واحد صوفے پر نیم دراز تھا۔

''تم لوگ سوچ کیا رہے ہو؟'' تمھارے پاس ضائع کرنے کے لیے ایک منٹ بھی نہیں ہے۔'' سیلما نے فون میک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں ڈیڈی کو فون ملاتا ہوں لیکن بات تم کرو گے۔'' میک نے ساحل سے کہا۔

''تفصیلات تمھیں پتا ہیں‘ تم ہی انھیں سمجھا سکو گے۔'' ساحل سر ہلاتا ہوا صوفے پر سیدھا ہو کر

بیٹھ گیا۔

میک نے اپنے باپ کو ہر نمبر پر فون کیا لیکن کرم قریشی کہیں نہیں ملا۔ اس نے اسلام آباد میں اپنی ماں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ تلاش کر کے بتائے۔ وہ خاموشی سے بیٹھے انتظار کرتے رہے' ماں کا فون آیا' اسے کرم قریشی کا پتا نہ چل سکا تھا۔ اس کا موبائل فون بھی مستقل بند تھا۔ سب کا خیال تھا وہ مری کی کسی کاٹیج میں رات گزارنے چلا گیا ہے۔ میک کو پتا تھا یہ اس کے باپ کی پرانی عادت تھی۔ ذہن پر دباؤ زیادہ ہوتا' پریشانیاں گھیر لیتیں یا کوئی گتھی سلجھانا ہوتی تو وہ مری کی اس کاٹیج میں چلا جاتا جس کا پتا کسی کو معلوم نہیں تھا' نہ وہاں کوئی فون تھا۔ موبائل فون بند اور رابطے کے سب ذریعے منقطع ہو جاتے۔

''کیا کریں' کیا کریں؟'' ساحل کو اپنی آواز کی گونج خود ہی سنائی دے رہی تھی۔

''ڈائریکٹ پریذیڈنٹ کو فون کرو۔'' سیلما نے کہا تو میک نے فون پھر سنبھال لیا۔ کئی کالوں کے بعد صدر کے اے ڈی سی کرنل افتخار تک پہنچ سکا جس نے ''صدر میٹنگ میں ہیں'' کہہ کر فون بند کر دیا۔ میک دوبارہ اسلام آباد اپنے گھر فون کرنے لگا۔ شاید کرم قریشی سے رابطہ ہو سکا ہو۔ فون بند کیا تو مایوسی اس کے چہرے پر لکھی تھی۔

''اب یہ کام صرف تم کر سکتے ہو'' میک نے ساحل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے ڈیڈی کو فون کر کے اعتماد میں لو۔ وہ صدر کے چیف آف اسٹاف ہیں۔ ان سے زیادہ صدر کے قریب کوئی نہیں ہے۔''

ساحل اچھل کر صوفے سے اتر آیا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگا۔ اسے خود یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ اس کا باپ ملک کے چند اہم ترین لوگوں میں سے تھا' لیکن اس نے کبھی اپنے باپ کا مقام سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ماں کا زخم دل میں ابھی تک تازہ تھا' لیکن یہ وقت پرانے گھاؤ کھرچنے کا نہیں تھا۔ وہ تیزی سے اپنے باپ کا نمبر ملانے لگا۔

پہلی ہی کوشش میں فیاض منگی کا فون مل گیا تھا۔ ساحل اسے آپریشن ہیروشیما کی

تفصیلات بتانے لگا۔ فیاض منگی حیرت زدہ ہو کر پہلے خاموش ہو گیا' لیکن پھر سوال کر کے باقی تفصیلات پوچھنے لگا۔

''آپ صدر محترم تک فوراً یہ تفصیلات پہنچا دیں۔'' ساحل نے بات مکمل کرنے کے بعد کہا۔ ''اگر کچھ اور پوچھنا ہو تو میک کا نمبر لکھ لیں۔ میک کرم قریشی کا بیٹا ہے۔ میں اس وقت اس کے گھر پر ہوں۔ کرم قریشی نے ہی نواب ٹن سے معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا تھا۔ نواب ٹن نے مجھے واشنگٹن بھیجا تھا۔ جس نے آپریشن ہیروشیما کا انکشاف کیا ہے وہ سی آئی اے کا بے حد اہم آدمی ہے...... نہیں! اس نے مجھے نام نہیں بتایا۔'' ساحل نے میک کی طرح اپنے باپ کو بھی رابرٹ نیلسن کا نام نہیں بتایا۔

''صدر میٹنگ میں ہیں' جیسے ہی میٹنگ ختم ہو گی میں......'' فیاض منگی نے دوسری طرف سے کہا لیکن ساحل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ڈیڈی! اہم سے اہم میٹنگ بھی اس سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتی۔ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ آپ پلیز ابھی' اسی وقت ان تک خبر پہنچا دیں۔''

''تم صحیح کہتے ہو' میں جاتا ہوں' ابھی اسی وقت۔ تم اپنا خیال رکھو۔''

''I love you daddy!'' ساحل کو بہت زمانے بعد اپنے باپ سے اتنی محبت محسوس ہوئی۔

''آئندہ چند منٹوں میں صدر ایمان علی کو آپریشن ہیروشیما کی ایک ایک تفصیل پہنچ جائے گی۔'' ساحل نے فون بند کر کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ باچھیں کھل گئی تھیں' اچانک بھوک کھل اٹھی تھی۔ میک نے اٹھ کر اسے گلے لگایا' سیلما اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

''میں تکریم کو فون کر کے بتاتا ہوں۔'' ساحل دوبارہ فرش پر بیٹھ کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ آدھی سے زیادہ رات ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے اپنے ملک کو تباہی سے اور بیس لاکھ افراد کو مرنے سے بچایا تھا۔ یہ خبر کسی وقت بھی سنائی جا سکتی تھی۔

18

اسلام آباد

فیاض منگی نے ساحل سے بات ختم کر کے فون رکھا تو اس کی پیشانی پر گہرے بل پڑے ہوئے تھے۔ اسے پہلی بار اپنے بیٹے کے بارے میں اتنی تشویش ہوئی۔ ''کیا وہ دیوانہ ہو گیا تھا؟'' فیاض منگی اسی لیے ساحل کی پی ایچ ڈی کے حق میں نہیں تھا۔ اسے پتا تھا کتابی علم سے صرف خیالی دنیائیں تعمیر ہو سکتی تھیں۔ تجزیوں کے گنبد میں رہنے والے محقق اور مفکر خواب تو دیکھ سکتے تھے' ان میں حقیقتوں کی پتھریلی زمینوں پر چلنے اور زمینی حقائق سمجھنے کی اہلیت نہیں تھی۔ کسی نے اپنی تجزیاتی قوت سے ایک منظر نامہ تراش لیا تھا۔ دنیا ایسے خبطیوں سے بھری ہوئی تھی جنھیں ہر کام میں سازش اور ہواؤں میں سی آئی اے کے بھوت ناچتے نظر آتے تھے' لیکن اس کے بیٹے کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایک بے بنیاد تھیوری پر کیوں ایمان لے آیا تھا' کیا وہ بھی

خبطی ہو گیا تھا؟

بے یقینی کے لیے یہ وجہ کافی تھی کہ ذریعہ نواب ٹن تھا۔ ''نواب ٹن!'' فیاض منگی کے چہرے پر ایک اہانت آمیز مسکراہٹ آ گئی۔ اقتدار مافیا کا چھوٹا سا سیکیوریٹی آپریٹس، اسلحے کا معمولی سا تاجر، مالیخولیا کا مریض جسے فخر تھا کہ وہ کہانیاں جمع کرتا ہے۔ اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ نواب ٹن کے ایک دوست نے جو اس سے برازیل میں مل کر آیا تھا فیاض منگی کو بتایا تھا کہ نواب ٹن نیم دیوانہ ہو گیا ہے۔ وہ ہواؤں سے باتیں کرتا ہے اور دواؤں پر زندہ ہے۔ نواب ٹن کا ذریعہ بھی شاید اسی جیسا کوئی مریض تھا جو اسے کسی ڈاکٹر کی انتظار گاہ میں ملا ہو گا۔ شاید کبھی حکومت میں رہا ہو اور اب تصوراتی دنیا میں شطرنج کی عالمی بساط سجائے مہرے آگے پیچھے کر رہا ہو۔

ساحل نے ایٹمی جنگ کی کہانی سناتے ہوئے سی آئی اے کو خبر کا ذریعہ بتایا تھا۔ فیاض منگی دل ہی دل میں ہنسا تھا۔ پاکستان میں سی آئی اے کا فیاض منگی سے بڑا رازدار کون تھا۔ آج سے نہیں برسوں سے! اس خطے میں امریکہ کی ہر کروٹ اس کے علم میں تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ ساحل کے بتائے ہوئے منظرنامے کا بالکل الٹ تھا۔ اس نے سوچا تھا ساحل کو بتائے کہ اس کا باپ وزیراعظم بن کر اس ملک کی نئی تاریخ لکھنے والا ہے، لیکن وہ بتا نہیں سکتا تھا، خاموشی سے ساحل کی بات سنتا رہا تھا۔ یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ اسے یقین آ گیا ہے، ورنہ ساحل جانے کس کس سے خیالی ایٹمی جنگ رکوانے کی اپیلیں کرتا اور اسلام آباد میں فیاض منگی کی جگ ہنسائی کی وجہ بنتا۔ فیاض منگی نے سوچا وہ آج ہی کلثوم سے کہے گا کہ نیویارک جانے کی تیاری کرے اور کچھ روز ساحل کے ساتھ رہے۔ اس کا ذہنی توازن وہی درست رکھ سکتی تھی۔ وہ جب وزیراعظم بن کر بھارت سے امن معاہدہ کرنے واشنگٹن جائے گا تو دو دن اپنے نجی دورے کے لیے رکھے گا اور سارا وقت ساحل کے ساتھ گزارے گا۔ ضروری تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے۔ اس کی وراثت اس کے اکلوتے بیٹے کو سنبھالنا تھی۔

فیاض منگی نے گھڑی دیکھی، کچھ دیر بعد وہ ہنگامی اجلاس شروع ہونے والا تھا جو ایمان علی نے آج صبح اچانک طلب کیا تھا۔ وہ سب لوگ آنے والے تھے جو ایمان علی کے قریب تھے۔ جنرل اکبر کو اجلاس میں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ ایمان علی نے فیاض منگی کو اجلاس میں شریک ہونے کے لیے کہا تھا تو اسے حیرت ہوئی تھی۔ فیاض منگی فیصلوں پر عمل درآمد کرانے والا وہ پہیہ تھا جسے عموماً فیصلے ہونے کے بعد بلایا جاتا تھا۔

فیاض منگی نے اجلاس میں جانے سے پہلے فون کا ریسور اٹھا کر نمبر ملایا۔ رونالڈ کو بتانا تھا کہ واشنگٹن میں کوئی سی آئی اے کا نام لے کر ایٹمی جنگ کی کہانیاں سنا رہا ہے۔ ایسے خبطیوں کی روک تھام ضروری تھی۔

''یہ امریکی سفارت خانے کے فوجی اتاشی کا نمبر ہے۔ کرنل رونالڈ اسٹرانگ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ آپ اپنا پیغام......'' فیاض منگی کل سے یہ پیغام کئی بار سن چکا تھا۔

فیاض منگی فون کا ریسور کریڈل پر رکھ کر اٹھ گیا۔ کیا رونالڈ بھی کولمبو چلا گیا؟ اس نے سوچا اجلاس ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر کوشش کرے گا اور رونالڈ نہیں ملا تو براہ راست وہاں فون کرے گا۔ جہاں صرف ہنگامی ضرورت کے لیے فون کیا جا سکتا تھا۔

○ ○ ○

ایمان علی اپنے ذہن میں کچھ دیر بعد ہونے والے اجلاس کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ کرنل افتخار نے آ کر بتایا سب آ گئے ہیں تو وہ اٹھ گیا اور آہستہ آہستہ قدموں سے میٹنگ روم کی طرف جانے لگا۔ ''آج یہ قصہ بھی ختم ہو جائے گا۔'' اس نے گہری سانس لے کر سوچا۔ آج پتا چل جائے گا کہ ایوان صدر سے دشمن کو خبریں پہنچانے والا کون ہے۔ آئی ایس آئی کا چیف جنرل شہباز آج صبح ہی منصوبہ لے کر آیا تھا۔ ایمان علی نے ایک دو دن کے لیے ٹالنا چاہا تھا لیکن جنرل شہباز نے اصرار کیا تھا کہ دانہ آج ہی ڈالا جائے گا۔ جو کچھ ہوگا آج ہی ہوگا۔ ذرا

سی بھی تاخیر نقصان دہ ہوسکتی تھی۔

ایمان علی کی چھٹی حِس کہیں پیچھے بیٹھی ''نہیں نہیں'' کا شور مچا رہی تھی۔ ایمان علی نے سوچا بھی تھا کہیں یہ جال خود اسی کے لیے تو نہیں تھا؟ لیکن ہاں کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حالات نہیں کہنے والے نہیں تھے۔ کسی پر تو اعتبار کرنا تھا۔ ایمان علی کی فیصلہ کرنے کی قوت یہ جان کر متاثر ہوئی تھی کہ ایوان صدر میں کوئی جاسوس ہے جو دشمن کو خبریں پہنچا رہا ہے۔ فیصلے چھپا کر رکھنے کے لیے نہیں تھے۔ ان پر عمل درآمد کے میکانکی نظام میں ایک نہیں کئی پہیے تھے۔ ایک پہیہ دوسرے پہیے کو چلاتا تھا۔ ایمان علی کو اطمینان تھا کہ آج بے اعتباری کا موسم گزر جائے گا۔

آج اس کے دو اہم ساتھی نہیں آ سکتے تھے۔ نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر کرم قریشی اور ڈیفنس ایڈوائزر منصف خان۔ جنرل منصف بیمار تھا اور کرم قریشی ۲۴ گھنٹوں کے لیے غائب تھا۔ ایمان علی کو بتا کر گیا تھا کہ اسے اپنے اعصاب کو آرام دینے کے لیے ایک دن کا مکمل وقفہ چاہیے۔ ایمان علی نے ان کی غیر موجودگی کو اجلاس ملتوی کرنے کا بہانہ بنانا چاہا تھا' لیکن جنرل شہباز نے کہا تھا جنرل منصف اور کرم قریشی دونوں شبہے سے بالاتر ہیں' ان کا ہونا اور اس آزمائش سے گزرنا ضروری نہیں۔

ایمان علی کے لیے جنرل منصف اور کرم قریشی ہی نہیں' اس کا ہر ساتھی شبہے سے بالاتر تھا۔ اسے پتا تھا کل سب کو پتا چلے گا کہ آج کی میٹنگ جھوٹ اور انھیں آزمانے کا ایک طریقہ تھی تو انھیں سخت تکلیف پہنچے گی۔ وہ اپنی ذاتی حیثیتوں میں بھی بڑے رتبے والے لوگ تھے۔ انھوں نے ایمان علی کے ساتھ کسی لالچ کے بغیر دن رات ایک کیے تھے۔ ایمان علی کو یقین تھا سیکیوریٹی کے معاملات اور اس کی مجبوریاں سمجھ کر وہ اس کے اس ایک جھوٹ کو معاف کر دیں گے۔

چور پکڑنے کا منصوبہ بہت سادہ تھا۔ ایمان علی اجلاس میں ایک ایسے فیصلے کا اعلان کرے گا جو سچ نہیں' لیکن اتنا اہم ہوگا کہ دشمن کا جاسوس ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر دشمن تک خبر

پہنچانا چاہے گا اور پکڑا جائے گا۔ اجلاس میں جنرل اکبر کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ آئی ایس آئی کے چیف جنرل شہباز کو اجلاس میں نہیں آنا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ آپریشن روم میں بیٹھ کر نگرانی کرے گا۔ ایمان علی کو یقین تھا سب کے فون اور موبائل ٹیپ ہو رہے ہوں گے۔ سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی سایا ہوگا، لیکن اسے ایوان صدر میں کوئی غیر معمولی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ ایمان علی سوچ رہا تھا، ایوان صدر میں آئی ایس آئی کا آدمی کون ہے؟

ایمان علی میٹنگ روم میں داخل ہوا تو سب کھڑے ہو گئے۔ جنرل اکبر کی نشست ایمان علی کے برابر رکھی گئی تھی۔ ایمان علی نے اشارے سے سب کو بیٹھنے کے لیے کہا لیکن خود کھڑا رہا۔

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' سب بیٹھ گئے تو ایمان علی نے کہا۔ ''آپ سب کا بہت شکریہ جو چند گھنٹوں کے نوٹس پر میٹنگ میں شریک ہیں۔ معاملہ اتنا اہم ہے کہ آپ سب کی شرکت ضروری تھی۔'' ایمان علی نے کرنل افتخار کی طرف دیکھا تو اس نے ایک فولڈر صدر کی طرف بڑھا دیا جس میں صدر کے مونوگرام والا ایک کاغذ نتھی کیا ہوا تھا۔ ''یہ صدارتی فیصلہ ہے جو ملٹری کمان اور سیکورٹی ایجنسیز کے مشورے اور بہت غور و خوض کے بعد کیا گیا ہے۔ آپ کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اس فیصلے کے نتائج کا سامنا ہم سب کو بلکہ پوری قوم کو مل کر کرنا ہوگا۔'' ایمان علی نے فولڈر سامنے میز پر رکھ دیا۔

''ہماری اطلاع تھی کہ دشمن ہماری ایٹمی تنصیبات پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس اطلاع کی آج تصدیق ہوئی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ حملے میں پہل کر کے سبقت حاصل کرے اور ہمیں مفلوج کر دے۔ پہلا حملہ ہم کریں گے۔''

ایمان علی کا آخری جملہ دھماکے کی طرح تھا۔ سب حیرت زدہ اور سکتے میں رہ گئے۔

''بھارت کو اپنے میزائل موبائل کرنے میں دو گھنٹے بیس منٹ لگیں گے۔'' ایمان علی نے ان کی حیرت نظر انداز کر کے کہا۔ ''ہمیں یہ فوقیت حاصل ہے کہ ہم اس سے آدھے وقت

میں تیار ہو سکتے ہیں۔ بھارت کی میزائل بیٹری حرکت میں آتے ہی ہم .R.T.F موڈ میں چلیں جائیں گے۔''Reday to fire. We will strike first''

ایمان علی نے دیکھا' سب کی آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں' ان میں حیرت کے ساتھ اداسی بھری ہوئی تھی۔ لگتا تھا سب کچھ لٹنے جارہا ہو۔ بولنے کی اجازت ہوتی تو سب ایک ساتھ چیخ پڑتے۔

''میں اگلے بارہ گھنٹے کے لیے ایٹمی حملے کی کمان سی این سی جنرل غلام اکبر کو دے رہا ہوں۔'' ایمان علی نے ایک اور دھماکہ کیا۔ ''اگلے بارہ گھنٹوں میں ایٹمی میزائل فائر کرنے والے بٹن پر جنرل اکبر کی انگلی ہوگی۔ انھیں صورت حال کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار ہو گا۔'' ایمان علی نے فولڈر میں رکھے ہوئے کاغذ پر دستخط کر کے فائل جنرل اکبر کی طرف بڑھا دی۔

''میری دعا ہے کہ ایسا نہ ہو' لیکن ایسا ہوتا ہے تو وہی کیجیے جو کرنا ضروری ہے۔''

''صدر محترم! پاکستان کی مسلح افواج آپ کو مایوس نہیں کریں گی۔'' جنرل نے ایمان علی سے فائل لے کر اسے سیلیوٹ کیا۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ جو پچھلے تین برسوں میں ایمان علی کے ہر اہم فیصلے میں شریک رہے تھے' خاموش تماشائی کی طرح بیٹھے وہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے جو پورے خطے کی تقدیر بدل سکتا تھا۔ ''صاحبو! بات کچھ جم نہیں رہی۔'' وزیر خارجہ آغا شاہ رخ کے ذہن میں یہ جملہ بار بار گونج رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تعجب تھا۔ ایمان علی نے اپنے وزیر خارجہ کو بتائے اور اعتماد میں لیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا؟ یقیناً جنرل اکبر نے سر پر پستول رکھ کر فیصلہ کرایا ہوگا۔ ایمان علی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کی اجازت بھی نہیں دی ہوگی۔ جنرل منصف اور کرم قریشی موجود نہیں تھے' کیا وہ حراست میں تھے؟ آغا شاہ رخ کو تعجب اس بات پر تھا کہ ایمان علی دباؤ قبول کرنے اور مصالحت کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ کیا اسے بھی اقتدار

عزیز ہو گیا تھا؟

وزیر داخلہ جنرل سعید ملک کے دماغ میں غصے کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ اتنا بڑا فیصلہ اوراس سے مشورہ کیے بغیر؟ ایمان علی نے جنرل منصف اور کرم قریشی کوایک بار پھراس پر فوقیت دی تھی۔ صرف انھیں اعتماد میں لے کر فیصلہ کرلیا تھا۔ اسی لیے دونوں اجلاس میں نہیں آئے تھے۔ بوڑھے جنرل کا غصہ کم ہوا تو اس نے سوچا وہ کل ایمان علی سے اپنے مستقبل کے بارے میں بات کرے گا۔ اس کے قویٰ اب مضبوط نہیں رہے تھے۔ اسے جلدی غصہ آ جاتا تھا۔ اس کی افادیت بھی کم ہوگئی تھی۔ رِٹائر ہونے اور اللہ اللہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ مشورے دے بھی کیا سکتا تھا۔ ایٹمی جنگ روکنا اب اللہ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی تسبیح ٹٹولنے لگا۔

وزیرِ خزانہ حبیب الحق کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ ایمان علی نے حملہ کرنے کا اختیار جنرل اکبر کو کیوں دے دیا تھا؟ حملہ تو اسے کرنا تھا۔ آئی ایم ایف کے خلاف جنگ ایٹمی حملے سے زیادہ بڑا دھماکہ ثابت ہوتی۔ اب اس کا منصوبہ ایک بار پھر پیچھے چلا گیا تھا۔ ''ایمان علی نے شاید ٹھیک ہی کیا تھا۔'' اس کا اعتماد اپنے صدر پر بحال ہونے لگا۔ ملک کی سلامتی ہر دوسرے معاملے سے زیادہ اہم تھی۔ اسے یقین تھا ایٹمی جنگ کا خطرہ محض ایک جھوٹا الارم ثابت ہوگا۔ آج کی دنیا ایٹمی جنگ کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ جنگ کا خطرہ ٹلتے ہی وہ اپنی جنگ شروع کر دے گا۔ اب مزید دیر نہیں ہوسکتی تھی۔

انفارمیشن منسٹر ذہین جلالی نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں بناتے بناتے تیزی سے کچھ لکھنا شروع کردیا تھا۔ باقی سب کے ذہنوں میں بھی کیا ہوگا کا سوال گونج رہا تھا، حقیقتیں جذب ہورہی تھیں اور ذہن کے کسی گوشے میں خوف بیٹھتا جارہا تھا۔ ''کیا موت ان کے واقعی اتنا قریب تھی؟'' وہ اپنی اپنی کرسیوں پر جم گئے۔ سب سوچ کر آئے تھے کہ میٹنگ کئی گھنٹوں تک جاری رہے گی اس لیے سب فارغ تھے۔ کسی کو اٹھنے کی جلدی نہیں تھی۔

صرف فیاض منگی اپنی کرسی پر پہلو بدل رہا تھا' جیسے موقع ملتے ہی اٹھ بھاگے گا۔ ایمان علی نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''آپ چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ یا اپنی میٹنگ جاری رکھ سکتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ خبر اس کمرے سے باہر نہیں نکلنی چاہیے۔ ہمیں بہت الرٹ رہنا ہے۔ آج کی رات بہت بھاری ہے۔ وہ کٹ جائے تو ہم کل صبح نو بجے اسی کمرے میں ملیں گے اور امن کے لیے اپنی جدوجہد دوبارہ شروع کریں گے۔''

''صدر محترم مجھے آپ کے فیصلے سے اتفاق نہیں ہے۔'' جلالی نے اپنی کرسی سے اٹھ کر ایمان علی کو ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا استعفیٰ ہے' براہِ کرم اسے قبول کر لیجیے۔''

''اسے اپنی جیب میں رکھیے۔'' ایمان علی نے جلالی کو غصے سے گھورا۔ ''چھوڑ کر بھاگنا بزدلی کی نشانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بزدل نہیں ہیں۔ آپ کو اپنے اصول عزیز ہیں تو ان کے لئے لڑنا سیکھیے۔'' جلالی نے کاغذ والا ہاتھ نیچے کر لیا۔ ایمان علی کا لہجہ بھی نرم ہو گیا۔ ''کل تک انتظار کیجئے' اگر آپ پھر بھی اپنے فیصلے پر قائم رہے تو مجھے آپ کا استعفیٰ قبول کر کے خوشی ہو گی۔''

ایمان علی جنرل اکبر کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ان کے بعد فیاض منگی تیزی سے باہر نکلا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے کرنل افتخار بھی اترا تھا۔ باہر ایوان صدر کی سیکیوریٹی کا انچارج کرنل شفقت اپنے فوجیوں کے ساتھ الرٹ کھڑا تھا۔ جنرل اکبر اس سے کچھ پوچھنے لگا۔ کیبنٹ روم سے کوئی اور باہر نہیں نکلا۔ دروازہ بند ہوا تو کمرے کے اندر شروع ہونے والی گفتگو کی بھن بھن شور میں بدلنے لگی۔ ایمان علی کو جنرل اکبر سے ضروری بات چیت کرنا تھی۔ وہ لان میں اپنے پسندیدہ کونے کی طرف جانے کے لیے سیڑھیاں اترنے لگا۔ جنرل اکبر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ان سب سے پیچھے کرنل شفقت اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

○ ○ ○

فیاض منگی نے اپنے دفتر میں پہنچتے ہی لال فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ اس کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ یہ کیا پاگل پن تھا۔ کیا ایمان علی دیوانہ ہوگیا تھا؟ فیاض منگی کو مستقبل کے سب منصوبے مٹی میں ملتے نظر آنے لگے۔ اس کی وزارت عظمیٰ، پاک بھارت امن معاہدہ، نوبل پرائز۔ نواب ٹن کے ذریعے سے ساحل کو جو کہانی بتائی گئی تھی کیا وہ صحیح تھی؟ لیکن اس نے بتایا تھا ایمان علی اس تباہی کو روک سکتا ہے۔ ایمان علی تو خود ایٹمی حملہ کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ اسے فوراً رونالڈ کو بتانا تھا۔ رونالڈ نہیں ملا تو براہ راست لینگلی فون کرنا تھا۔ واشنگٹن تک اطلاع پہنچنا ضروری تھی۔ صرف واشنگٹن کی مداخلت ہی اس تباہی کو روک کر ان کا منصوبہ ٹریک پر واپس لا سکتی تھی۔ ایمان علی کو معزول کرنے کا بہتر جواز بھی مل گیا تھا۔ وہ ایٹمی جنگ شروع کر کے پورے خطے میں تباہی پھیلانا چاہتا تھا۔ پوری دنیا ایمان علی کا سر مانگے گی اور پھر جب وہ وزیراعظم بنے گا تو...... فیاض منگی نے اطمینان کی سانس لی۔

دوسری طرف رونالڈ کے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

اسی وقت کرنل افتخار طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ فیاض منگی کی طرف تھا۔

''فون رکھ دو، فوراً! اسی وقت!'' کرنل افتخار چیخا۔

فیاض منگی اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔ دل زور زور سے دھڑک کر جلدی جلدی کی آواز لگا رہا تھا۔ رونالڈ فون اٹھا لے تو وہ اسے چند سیکنڈ میں بتا سکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس کے بعد وہ مار دیا یا گرفتار کر لیا جائے، اسے پروا نہیں تھی۔ اسے ایٹمی جنگ روکنا تھی۔ اس نے اپنے بیٹے سے وعدہ کیا تھا۔ فون پر فیاض منگی کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

کرنل افتخار نے دل میں ایک دو تین گن کر ٹریگر دبا دیا۔ کئی گولیاں فیاض منگی کے سینے میں اتر گئیں۔ اس نے ٹھیک دل کا نشانہ لیا تھا۔ فیاض منگی کی پھٹی پھٹی آنکھیں بے یقینی کے عالم میں کرنل افتخار کو گھور رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ ساتھ ہی وہ خود بھی فرش پر گر

پڑا۔ جسم سے خون کی بہت سی لکیریں نکل کر قالین میں جذب ہونے لگیں۔

کمرے میں سب سے پہلے ایمان علی اور جنرل اکبر داخل ہوئے۔ وہ لان کی طرف جانے کے لیے فیاض منگی کے دروازے کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس کے چند سیکنڈ بعد سیکیورٹی چیف کرنل شفقت اور اس کے ساتھ چار فوجی بھاگتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ ایک فوجی باہر دروازے پر جم گیا اور دروازہ بند کر کے کسی کو بھی اندر آنے سے روک دیا۔ دو فوجی ایمان علی کے آگے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی ڈھال بن گئے تھے۔ جنرل اکبر خاموش کھڑا کرنل افتخار کو دیکھ رہا تھا جو فیاض منگی کی میز کے پیچھے اس کی لاش تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک وہ پستول تھا جس سے اس نے فیاض منگی پر گولیاں چلائی تھیں۔

''کرنل افتخار! اپنا پستول پھینک دو۔'' کرنل شفقت کرنل افتخار پر اپنا ریوالور تان کر چیخا۔ اس کے ساتھ آنے والا فوجی بھی پستول تانے شکاری کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

کرنل افتخار نے اسے نظر انداز کر کے نیچے گرا ہوا فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف ٹیپ چلا رہا تھا۔

''یہ امریکی سفارت خانے کے فوجی اتاشی کا نمبر ہے۔ کرنل رونالڈ اسٹرانگ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ آپ اپنا پیغام اور فون نمبر چھوڑ دیجیے' وہ آتے ہی آپ سے رابطہ کریں گے۔ یہ امریکی سفارت......''

کرنل افتخار نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ فیاض منگی کا سفید ہونے والا مردہ چہرہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ فیاض منگی کی کھلی ہوئی ویران آنکھوں میں شکایت ثبت تھی۔ ''تم نے مستقبل کے وزیراعظم کو مار کر اچھا نہیں کیا۔''

''کرنل افتخار! میں پھر کہہ رہا ہوں اپنا پستول گرا دیجیے۔'' کرنل شفقت دوبارہ چلّایا۔

''سر!'' کرنل افتخار نے ایک بار پھر اسے نظر انداز کر دیا اور براہ راست آرمی چیف

سے مخاطب ہو گیا۔ ''ہمارا اندازہ غلط نہیں تھا۔ لیکن ہمیں دیر ہو گئی۔ وہ دشمن کو پیغام پہنچا چکا ہے۔ "He has conveyed the massage

''What?'' جنرل اکبر دہاڑا۔

''یہ آخری وارننگ ہے' آپ پستول پھینک دیجیے۔'' کرنل شفقت پستول تانے ہوئے کرنل افتخار کی طرف بڑھا۔ ''میں تین تک گنوں گا۔ اس کے بعد گولی ماردوں گا۔ ون۔ ٹو......''

کرنل افتخار نے تین ہونے سے پہلے اپنا پستول پھینک دیا۔

''کرنل افتخار کو حراست میں لے لو۔'' کرنل شفقت نے ان دونوں فوجیوں کو اشارا کیا جو ایمان علی کی ڈھال بنے کھڑے تھے۔

''رک جاؤ!'' جنرل اکبر نے کرنل افتخار کی طرف بڑھتے ہوئے فوجیوں کو روک دیا۔ ''کرنل افتخار آئی ایس آئی کے ایک آپریشن میں شریک تھے۔ مارا جانے والا دشمن کا جاسوس تھا۔''

''سر!'' کرنل شفقت نے اپنا پستول واپس ہولسٹر میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ایوان صدر اور صدر محترم کی سیکورٹی کا ذمے دار ہوں۔ کرنل افتخار نے ایک افسر کو گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔ اس واقعہ میں صدر محترم کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ کرنل افتخار کو اپنی بے گناہی کورٹ مارشل کے دوران ثابت کرنا ہوگی۔''

جنرل اکبر نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ایک ماتحت افسر سے بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے بعد میں نمٹ سکتا تھا۔ کرنل افتخار کو بھی بعد میں رہا کرایا جا سکتا تھا۔ کرنل شفقت جو کر رہا تھا اسے ایسا کرنے کا اختیار تھا۔ وہ غلط نہیں تھا' لیکن یہ مکھی مچھروں کی بھن بھناہٹ تھی۔ یہ وقت اس بارے میں سوچنے کا نہیں تھا۔ آج کی رات تاریخ لکھی جانی تھی۔ جنرل اکبر نے فیاض منگی کی لاش پر ایک نظر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔ اس کے لیے لاشیں نئی چیز نہیں تھیں۔ اسے پچھلی جنگ یاد

تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح دشمن کے چھتے میں گھس گیا تھا۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ اسے نہیں معلوم اسے کس طرح واپس نکال کر لایا گیا تھا۔ شکست کا غم آج بھی تازہ تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود میزائل پر سوار ہو کر جاتا اور اپنی آنکھوں سے دشمن کی تباہی کا منظر دیکھتا۔

کرنل افتخار کو فوجی باہر لے کر چلے تو اس کی آنکھوں میں احتجاج تھا۔ جنرل اکبر نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ایمان علی وقتی صدمے سے سنبھل کر سارے ڈرامے کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ کرنل افتخار کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں غصے کی جگہ اداسی آ گئی۔ وہ جانتا تھا آئی ایس آئی کا کوئی نہ کوئی آدمی ایوان صدر کی ڈیوٹی کرتا ہوگا۔ اس نے ہمیشہ کرنل شفقت پر شک کیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے سر پر لگا ہوا آئی ایس آئی کا ٹرانسمیٹر کرنل افتخار تھا۔

''آفیسر! کیا آپ ہمیں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں؟'' جنرل اکبر نے کرنل شفقت سے کہا۔ ''باہر بھی اطمینان دلا دیجیے کہ کچھ نہیں ہوا۔ صدر محترم خیریت سے ہیں۔''

''یس سر!'' کرنل شفقت اور اس کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے فوجی نے اپنے سربراہ کو سیلیوٹ کیا اور باہر نکل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

جنرل اکبر نے دروازہ کھلتے وقت کچھ اچکتی ہوئی گردنیں دیکھی تھیں۔ دفتری وقت ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے عملے کے بیشتر لوگ جا چکے تھے۔ شام اور رات کی شفٹ میں کام کرنے والا مختصر عملہ موجود تھا۔ جنرل اکبر کو پتا تھا گولی چلنے کی آواز زیادہ اونچی نہ تھی، پھر بھی سنی گئی ہو گی۔ انھوں نے کرنل شفقت اور اس کے آدمیوں کو ہاتھوں میں پستول لیے بھاگتے اور پھر کرنل افتخار کو فوجیوں کی گرفت میں باہر جاتے دیکھا ہوگا۔ انھیں یہ بھی پتا تھا کہ جنرل اکبر اور ایمان علی کمرے کے اندر ہیں۔ وہ کچھ بھی سوچ سکتے اور کسی کو فون کر کے کچھ بھی بتا سکتے تھے۔

جنرل اکبر کو زیادہ ڈر ایمان علی کی کابینہ کے ارکان اور مشیروں سے تھا جو ابھی تک ایوان صدر میں موجود تھے۔ شاید ان تک گولیوں کی آواز نہیں گئی تھی۔ کیبنٹ روم اوپر کی منزل

پر اور ذرا ہٹ کر تھا۔ دروازہ بند اور خود ان کی باتوں کا شور اتنا تھا کہ انھیں باہر کا شور سنائی نہ دیا ہوگا۔ کوئی آواز آئی بھی ہوگی تو کسی گاڑی کا بیک فائر سمجھی گئی ہوگی۔ جنرل اکبر کا خیال غلط نہیں تھا۔ ایمان علی کی کابینہ کے ارکان نیچے ہونے والے ڈرامے سے بے خبر اپنی بحث میں مصروف تھے۔ عملے کے ارکان کو قابو میں رکھنا آسان تھا۔ کرنل شفقت کی ایک ہی بھبکی کافی تھی۔

ایمان علی میز کے پیچھے پڑی ہوئی لاش کے پاس آیا۔ فیاض منگی کی آنکھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ پھیر کر آنکھیں بند کر دیں۔ اتنے قریب سے فیاض منگی کی لاش دیکھی تو افسوس اور بڑھ گیا۔ اسے اب بھی یقین نہیں تھا کہ اتنی محنت اور وفاداری سے کام کرنے والا شخص دشمن کا ایجنٹ ہوسکتا تھا۔ فیاض منگی کرم قریشی کی ٹیم کا حصہ تھا۔ اسے کرم قریشی نے خاص طور پر صدر کا پرنسپل سیکرٹری منتخب کیا تھا۔ لیکن کرنل افتخار کو بھی کرم قریشی ہی نے چنا تھا جو ان کا نہیں آئی ایس آئی کا وفادار تھا۔ کیا صحیح تھا اور کیا غلط! ایمان علی کو اس وقت کرم قریشی اور جنرل منصف خان کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا ڈاکٹر کلثوم کو خود فون کر کے اسے اس کے شوہر کے مرنے کی اطلاع دے گا۔ لیکن کیا کہے گا؟

''صدر محترم! ہمارے پاس اب وقت نہیں ہے۔'' جنرل اکبر مخاطب ہوا تو ایمان علی لاش کے پاس سے ہٹ کر جنرل اکبر کے سامنے آ گیا۔

''دشمن تک خبر پہنچ گئی ہے کہ ہم حملہ کرنے والے ہیں۔ وہ تیاری کر رہا ہوگا۔''

''لیکن یہ اطلاع صحیح نہیں ہے، جھوٹی ہے۔''

''دشمن کو نہیں معلوم کہ خبر جھوٹی تھی۔''

''میں انھیں بتاؤں گا کہ خبر جھوٹی ہے۔ میں بھارتی وزیر اعظم کو خود فون کروں گا۔''

''کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ وہ سمجھیں گے ہم بہانہ کر رہے ہیں۔ بے خبری میں مارنا چاہتے ہیں۔ صدر محترم! گولی بندوق سے نکل چکی ہے۔ اب وہی ہونا ہے جو ہونا ہے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ فیاض منگی نے دشمن کو فون کیا تھا؟''

''جنرل شہباز سے تصدیق ہو سکتی ہے۔ فون ٹیپ کیا گیا ہوگا۔''

''جنرل شہباز کو فون ملایئے۔''

جنرل اکبر میز کے پاس پہنچ کر فون کا نمبر ملانے لگا۔ ایمان علی صرف وقت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے پتا تھا جواب کیا ہوگا۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ وکیل، گواہ اور منصف سب ایک تھے۔ فیصلہ ہونے سے پہلے سزا بھی دے چکے تھے۔

''مسٹر پریذیڈنٹ آن دی لائن۔'' فون ملنے کے بعد جنرل اکبر نے کہا اور ریسیور ایمان علی کے ہاتھ میں دے دیا۔

''فیاض منگی کے بارے میں مجھے افسوس ہے۔'' دوسری طرف سے جنرل شہباز نے کہا تو ایمان علی نے سوچا چند منٹ پہلا واقعہ پنڈی میں بیٹھے ہوئے جنرل شہباز کو کیسے معلوم ہو گیا تھا؟ لیکن حیرت ظاہر کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔

''فیاض منگی نے مرنے سے پہلے کسے فون کیا تھا؟''

''وہ سیکیورڈ فون تھا۔ اسکریمبلر بھی لگا تھا جو عموماً غیر ملکی جاسوس استعمال کرتے ہیں۔ ہم میسج نہیں سن سکے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ فون اس علاقے میں کیا گیا تھا جہاں غیر ملکی سفارت خانے ہیں۔ شاید کسی فارن مشن میں۔''

''آپ کا کیا اندازہ ہے؟''

''دشمن تک ہمارے فیصلے کی اطلاع پہنچ گئی ہے۔ وہ اپنی میزائل بیٹری Move کر رہا ہے۔''

''آپ کو یقین ہے؟''

''سو فیصدی! ہمارا ذریعہ بہت معتبر ہے۔'' جنرل شہباز نے ایمان علی کو یہ نہیں بتایا کہ ذریعہ سی آئی اے تھا جس نے بھارتی میزائلوں کی موومنٹ کے سیٹلائٹ فوٹو بھیجے تھے جو اس کے سامنے میز پر پڑے تھے۔ جنرل شہباز کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پاکستانی میزائلوں کی موومنٹ

کے ایسے ہی سیٹلائٹ فوٹو بھارتی جنرلوں کی میز پر بھی موجود تھے۔

''صدر محترم! یہ اطلاع جنرل اکبر کو دینا ضروری ہے۔'' جنرل شہباز نے دوسری طرف سے کہا تو ایمان علی نے کچھ کہے بغیر فون جنرل اکبر کو دے دیا۔

ایمان علی نے سوچا اس کی بازی مات ہوگئی تھی۔ سارا جال ایٹمی میزائل کی کمان حاصل کرنے کے لیے بچھایا گیا تھا۔ ایمان علی نے اپنے طور پر بہت احتیاط کی تھی۔ حملے کی کمان صرف بارہ گھنٹوں کے لیے فوجی سربراہ کے حوالے کی تھی۔ انھیں بارہ گھنٹوں میں سب کچھ ہونے والا تھا۔ ایمان علی کی احتیاط کام نہیں آئی تھی۔ ایمان علی کو یقین ہوگیا پورا منظر نامہ پہلے سے لکھا گیا تھا۔ جنرل شہباز کو پوچھے بغیر معلوم تھا کہ ایوان صدر میں کیا ہوا ہوگا۔ فیاض منگی قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا۔ جانے کیا فون کرنا چاہتا تھا؟

''صدر محترم! دشمن کے میزائل......'' جنرل اکبر نے فون رکھ کر کہنا چاہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ جنرل شہباز نے بتایا ہے۔'' ایمان علی نے جنرل اکبر کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ ''آپ کو پتا ہے کتنی بڑی تباہی آئے گی۔''

''تباہی ہمارا نہیں دشمن کا مقدر ہے۔'' جنرل اکبر نے بہت سرد لہجے میں کہا۔ اب کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ''ہمارا ایٹمی حملہ دشمن کو مفلوج کر دے گا۔ ہماری فوجیں چند گھنٹوں میں کشمیر میں داخل ہو جائیں گی۔ کشمیر کے اندر مجاہدین حکومت سنبھالنے کے لیے تیار ہیں۔ جنگ رکنے سے پہلے کشمیر پر ہمارا قبضہ ہوگا۔''

''آپ کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔'' ایمان علی غصہ برداشت نہ کر سکا۔ ''میں آپ کو حملے کی کمان دینے کا حکم نامہ واپس لے سکتا ہوں۔''

''کل صبح تک نہیں۔ بارہ گھنٹوں کے لیے ایٹمی حملے کی کمان میرے پاس رہے گی۔'' جنرل اکبر نے اپنی بغل میں دبی ہوئی فائل تھپ تھپائی۔

''جنرل اکبر ہوش سے کام لیجیے۔'' ایمان علی کا لہجہ ملتجیانہ ہوگیا۔ ''میں واشنگٹن فون

کرتا ہوں۔ امریکہ ہماری طرف سے بھارت کو یقین دلائے گا کہ ہم حملہ کرنا نہیں چاہتے۔ امریکہ ایٹمی جنگ نہیں ہونے دے گا۔ مجھے یقین ہے امریکی صدر خود مداخلت کریں گے۔''

''واشنگٹن کو پتا ہے۔''

''کیا؟''

''جنرل چارلس ورتھ ہمارے منصوبے کی منظوری دے چکے ہیں۔ امریکہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہے۔''

آنکھوں سے ایک دم سب پردے ہٹ گئے۔ پزل کے سب ٹکڑے اپنی اپنی جگہ لگ گئے۔ سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ اطلاع غلط نہیں تھی۔ ایٹمی جنگ امریکی ایجنڈا تھا۔ دونوں فوجوں کو وہی اکسا کر سامنے لایا تھا۔ سردار کو صدر بنانے نہیں جنگی بخار بڑھانے کے لیے آگے لایا گیا تھا۔ ایمان علی کو چین کے مسئلے پر الجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چین نے کسی تشویش کا اظہار تک نہیں کیا تھا۔ کیا چین کو معلوم تھا؟ ایمان علی کو پہلی بار لگا اس کے سب ہتھیار چھن گئے ہیں۔

''صدر محترم! مجھے فوری جی ایچ کیو جا کر حملے کی کمان سنبھالنا ہے۔ ہماری فتح کے لیے دعا کیجیے۔'' جنرل اکبر نے ایمان علی کو سیلوٹ کیا اور جواب سنے بغیر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ جنرل اکبر نے سوچا جی ایچ کیو میں سب جنرل اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ سب اس کے منصوبے کے ہم نوا تھے۔ منصوبہ تیار کرنے میں مددگار بھی رہے تھے' لیکن سب صدر ایمان علی کا حکم نامہ دیکھنا چاہتے تھے۔ جنرل اکبر نے سوچا وہ جاتے ہی ان کے منہ پر حکم نامہ مارے گا اور بٹن پر انگلی رکھ کر ''کاؤنٹ ڈاؤن'' شروع کر دے گا۔

ایمان علی خاموشی' افسوس اور اداسی سے تباہی کے ہر کارے کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جنرل اکبر کو جنرل منصف' کرم قریشی' جنرل سعید ملک اور ایمان علی کے پہلے وزیر دفاع مرحوم جنرل عالم گل جیسے فوجی معاملات کے ماہرین کی تجویز پر بہت سوچ سمجھ کر فوج کا سربراہ بنایا گیا

تھا۔ سب نے ایک پہلو پر زور دیا تھا۔ ایسا جنرل جسے اقتدار کی ہوس نہ ہو۔ جو سیاسی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ ان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ جنرل اکبر کو اقتدار حاصل کرنے کی تمنا نہیں تھی، لیکن سب نے دوسرا پہلو نظر انداز کر دیا تھا۔ جنرل اکبر جنگی جنون میں مبتلا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ فوجی کمان پر اپنے جیسے پاگلوں کا جال بنا دیا تھا۔ سب خواب دیکھ رہے تھے۔ امریکہ نے شہہ دے کر ان کے خواب اور گہرے کر دیے تھے۔

انھیں جگانا ضروری تھا۔ ایمان علی اپنے ہوتے ہوئے سب کچھ تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تباہی بھی وہ جو اس کے نام سے اور اس کے حکم سے پھیلائی جانے والی تھی۔ اس نے سوچا جنرل اکبر نے پورا منصوبہ بہت ہوشیاری کے ساتھ بنایا تھا۔ تباہی کا ہرکارہ جنرل اکبر نہیں ایمان علی کہلائے گا۔ ایٹمی جنگ ایمان علی نے شروع کی تھی، ایٹم بم اس کے حکم سے برسائے گئے تھے۔ تاریخ میں یہی لکھا جائے گا۔ فوری طور پر سب کچھ روکنا ضروری تھا۔ تاریخ کا لکھا نہیں بلکہ تباہی، جو صرف چند گھنٹوں میں پھیلنے والی تھی۔ وہ دنیا کے سب لیڈروں کا فون کھٹکھٹائے گا کہ وہ بھارت کو روکیں۔ اپنے جنرلوں کو وہ خود روکے گا۔ ابھی جی ایچ کیو جائے گا اور انھیں سمجھائے گا۔ جنرل اکبر نہیں مانا تو اسے معزول کر کے دوسرے جنرل کو فوج کی کمان دے گا۔ وہ ابھی تک ملک کا صدر اور مسلح افواج کا سپریم کمانڈر تھا۔

ایمان علی باہر جانے کے لیے بڑھا تو ایک بار پھر فیاض منگی کی لاش پر نظر پڑ گئی۔ اسے یہ سوچ کر جھرجھری آ گئی کہ وہ ابھی تک ایک لاش کے ساتھ کمرے میں اکیلا تھا۔ اسی وقت کرنل شفقت کمرے میں داخل ہوا۔

''صدر محترم! انویسٹیگیٹرز باہر انتظار کر رہے ہیں۔''

ایمان علی سر ہلاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کے باہر کھڑے ماہرین اسے دیکھتے ہی ایک طرف ہو گئے۔ انھوں نے سلام اور سیلیوٹ کے لیے اپنے اپنے ہاتھ بلند کیے۔ سب کی آنکھوں میں احترام تھا۔ ایمان علی سر کی جنبش سے ان کے سلام اور سلامی کا جواب

دیتا ہوا اپنے دفتر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے باڈی گارڈز کا فرض انجام دینے والے دو فوجی پیچھے پیچھے آئے تھے۔ ایمان علی کو اپنی کابینہ کے ارکان کا خیال آیا۔ ''کیا وہ ابھی تک یہیں تھے؟'' وہ کیبنٹ روم کے سامنے رکا' لیکن کمرہ خالی تھا۔ سب چلے گئے تھے یا شاید بھیج دیے گئے تھے۔ ایمان علی اپنے دفتر میں آیا تو دونوں فوجی پہرہ دینے باہر جم گئے۔

سب سے پہلے جنرل منصف کو بستر علالت سے اٹھا کر بلانا تھا۔ جی ایچ کیو جانے کے لیے وزیر دفاع کا ہمراہ ہونا ضروری تھا۔ جنرل منصف فوج کا سابق سربراہ تھا۔ وہ جنرلوں پر قابو پانے کا گُر جانتا تھا۔ ایمان علی نے جنرل منصف کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا لیکن گھنٹی کی آواز نہیں تھی۔ اس نے باری باری سب فون آزمائے' سب مردہ تھے۔ اس نے ریسیور زور سے کریڈل پر پٹخا اور غصے سے فون کو دیکھا کہ وہ ریزہ ریزہ کیوں نہیں ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ غصے پر قابو پا کر فون کٹنے کا مطلب سوچنے لگا۔ جنرل اکبر نے انقلاب برپا کر دیا تھا یا یہ محض فیاض منگی کے قتل کا شاخسانہ تھا۔ معلوم کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اس نے گھنٹی بجائی تو ایک فوجی کمرے میں آیا اور سلامی دے کر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہ فوجی نہیں تھا جو پہلے باہر کھڑا تھا۔ ایمان نے سوچا ''کیا پہرا اتنی جلدی بدل گیا تھا؟''

''میری گاڑی تیار کرائیے۔ مجھے جی ایچ کیو جانا ہے۔'' ایمان علی کا حکم سن کر وہ ربورٹ کی طرح مڑا اور پریڈ کرتا ہوا باہر اور پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔

دفتر میں بیٹھنا بے کار سمجھ کر ایمان علی باہر ٹیرس پر نکل آیا۔ دوسرا باڈی گارڈ پیچھے تھا لیکن وہ ٹیرس پر نہیں آیا۔ ایمان علی کو حیرت ہوئی کہ ٹیرس خالی تھا اور وہاں معمول کے مطابق پہرا دینے والے فوجی موجود نہیں تھے۔ اسے یاد تھا وہ ایک رات چاندنی کا مزہ لینے ٹیرس پر آیا تھا اور اس کی حفاظت کے لیے کرنل شفقت کے آدمیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی یہی سمجھا تھا کہ فوج نے تختہ الٹ دیا ہے۔ اس کے بعد سے ٹیرس پر پہرا مستقل کر دیا گیا تھا' لیکن آج جب فوجی انقلاب کا خطرہ حقیقی تھا اور اسکے فون تک کٹ چکے تھے' ٹیرس

سے فوجی غائب تھے۔ باہر بھی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کیا ہو رہا تھا؟ کیا سب کچھ اس کا وہم تھا؟

ایمان علی قدموں کی آواز سن کر مڑا۔ آنے والا کرنل شفقت تھا۔

''آپ نے چاندنی پر پہرا ختم کر دیا؟'' ایمان علی کے چہرے پر آج پہلی بار مسکراہٹ آئی۔

''نہیں سر!'' کرنل شفقت کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ''صرف پہرے دار بدلے ہیں۔''

اسی وقت دو فوجی ٹیرس پر آ گئے اور معمول کے مطابق اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ ایمان علی کو یاد نہیں تھا کہ اس نے انھیں پہلے کبھی دیکھا ہو۔

''کیا میری گاڑی تیار ہے؟'' ایمان علی نے ٹیرس سے واپس اندر آتے ہوئے کہا۔

''صدر محترم! آپ کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ آج آپ ایوان صدر تک محدود رہیں۔''

''یہ کس کا خیال ہے؟'' ایمان علی نے کرنل شفقت کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''سی این سی جنرل غلام اکبر!۔ دشمن کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے' اس لیے صدر محترم کی حفاظت ہر قیمت پر ضروری ہے۔ نیچے لان میں خندق کھودی جا رہی ہے۔ حملے کی صورت میں آپ کو وہاں لے جایا جائے گا۔''

''وہ خندق نہیں' میری قبر کھود رہے ہیں۔'' غصے میں ایمان علی کی آواز اونچی ہو گئی۔ ''کرنل شفقت! صدر مملکت اور ملک کی افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے میں آپ کو حکم دیتا ہوں......''

''صدر محترم! ایوان صدر اب میری کمان میں نہیں رہا۔'' کرنل شفقت نے بات کاٹ دی۔ ''مجھے اس پوسٹنگ سے فارغ کر کے جی ایچ کیو رپورٹ کرنے کا حکم ملا ہے۔ ایوان

صدر بارہ گھنٹے کے لیے آئی ایس آئی کے چارج میں رہے گا۔''

''Is it the take over?''

''No Sir! ایسا ہوا تو فوج میں بغاوت ہو جائے گی۔ آئی ایس آئی کا دستہ صبح ۷ بجے واپس چلا جائے گا۔''

حقیقت جذب ہونے لگی۔ اس کی صدارت بارہ گھنٹے کے لیے معطل ہوئی تھی۔ جنرل اکبر نے بارہ گھنٹے کا جوا کھیلا تھا۔ اسے پتا تھا ایمان علی کبھی ایٹمی حملے کا حکم نہیں دے گا۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ ایمان علی کی حکومت کا تختہ نہیں الٹ سکے گا۔ اس نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے بارہ گھنٹے کی مہلت لی تھی۔ بارہ گھنٹوں کے لیے ایمان علی کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ جنرل اکبر کو جو کچھ کرنا تھا آج ہی کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر آج کچھ نہ کر سکا تو کل صبح اپنے عہدے پر نہیں رہے گا۔ سب ایمان علی کی بے رحمی سے واقف تھے۔ جنرل اکبر اور اس کی فوجی کمان کا سارا منصوبہ آج کی رات میں بند تھا۔ آج کی رات ہی بھاری تھی۔ ایمان علی نے سوچا کسی طرح آج کی رات تھام کر بیٹھ جائے۔ پاؤں مار مار کر زمین کی گردش روک دے۔ ایسا کچھ ہو کہ گھڑیوں کی سوئیاں چلنا بھول جائیں' اور پھر اچانک ایک روشن اور چمکدار صبح طلوع ہو...... وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ وہ بھی Illusion کا شکار ہونے لگا تھا۔ خواب دیکھ رہا تھا۔

''Permission to leave sir!'' کرنل شفقت نے کہا تو ایمان علی چونک پڑا۔

''آپ کا ٹرانسفر؟ شاید آپ کو حکم عدولی کی سزا ملی ہے۔ اس نے دی ہے جس نے خود حکم عدولی کی ہے۔''

''صدر محترم! کل صبح سزا دینے کا اختیار آپ بھی استعمال کر سکیں گے۔'' کرنل شفقت زیر لب مسکرایا۔

''کل صبح شاید کبھی طلوع نہ ہو۔'' ایمان علی نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آپ ایک اچھے' دیانت دار' اصول پسند اور محنتی افسر ہیں' ہوسکتا ہے آپ کی دعا قبول ہو جائے۔ جایئے اور دعا کیجیے کہ جو ہونے والا ہے وہ نہ ہو۔''

''میرے اور میرے جوانوں کے لیے آپ کی ڈیوٹی کرنا باعث فخر تھا۔'' کرنل شفقت نے رخصت لیتے ہوئے کہا۔ ''It was the highest point of our career, Sir''

ایمان علی نے خاموشی سے اپنا سر ہلایا۔ کرنل شفقت نے دونوں ایڑیاں بجا کر سلامی دی اور مڑ کر سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ ایمان علی خاموشی سے اسے سیڑھیاں اترتا دیکھتا رہا۔ کرنل شفقت واقعی ایک اچھا افسر تھا۔ کل صبح ہوئی تو...... اس سے آگے سوچنا بھی بے کار تھا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا۔ بے چارگی کی کیفیت خالی الذہنی میں بدلنے لگی تھی۔ وہ آہستہ اپنے رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔ اللہ داد نے جو اس کے وقت سے پہلے آنے پر حیران تھا' جلدی سے اس کا کوٹ لیا اور کندھوں پر شال ڈال دی۔

ایمان علی معمول کے مطابق بیڈروم میں نہیں گیا بلکہ الماری سے ایک کتاب منتخب کر کے راکنگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ اللہ داد نے لیمپ آن کیا اور کچھ دیر بعد کافی بنا کر لے آیا۔ ایمان علی نے کتاب میز پر رکھ کر کافی لی اور اللہ داد کو دیکھنے لگا جو اس کے سامنے کھڑا نئے حکم کا منتظر تھا۔ آج سب کچھ معمول سے ہٹ کر ہو رہا تھا۔ اللہ داد خطرے کی بو سونگھنے لگا۔ اس کی شکاری کتے والی حس بے دار ہوگئی تھی۔ اس نے زور زور سے کئی سانس لیے۔ اسے لگا خطرہ بڑھتا ہوا اسی طرف آرہا ہے۔ وہ تیزی سے باہر جانے کے لیے مڑا۔

''آج پہرا دینا بے کار ہے۔ تم خطرہ روک نہیں سکو گے۔'' ایمان علی نے اللہ داد کے قدم روک لیے۔ ''بیٹھ جاؤ۔ یہیں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔''

اللہ داد زمین پر بیٹھ گیا۔ ایمان علی نے اپنے سامنے فرش پر اکڑوں بیٹھے ہوئے اللہ داد کو دیکھا تو کرسی پر جھولنا بھول گیا۔ نگاہوں کے سامنے سے کچھ اور پردے ہٹ گئے۔ اللہ داد

کے چہرے پر نسلوں کے دکھوں کی لکیریں بکھری ہوئی تھیں۔ زمین پر بیٹھنے کا انداز غلام اور آقا کے تعلق کی صدیوں پرانی کہانی سنا رہا تھا۔ ایمان علی کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ اسے اپنے تین سالہ دورِ صدارت کے کارناموں پر بہت فخر تھا' لیکن وہ اپنی ناک کے نیچے بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ اپنے ساتھ صبح شام رہنے والے ایک شخص کے بیٹھنے کا انداز بدل سکا نہ اس کے چہرے سے دکھ کی کوئی لکیر مٹا سکا تھا۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہونے لگا۔ کتنا کچھ کرنا باقی تھا۔ وہ تو ابھی کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔

ایمان علی صدر بننے سے بہت پہلے ایک روز اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا گاؤں کے حالات پر کڑھ رہا تھا تو اس کی ماں نے اسے سمجھایا تھا کہ سب اللہ کی مرضی ہے۔ زندگی کا چلن یہی ہے۔ سب کو اپنا اپنا حصہ ملا ہے۔ ہر سایہ قد کے برابر ہے۔ سب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ایمان علی سوچنے لگا کیا اللہ داد کوئی بڑا کام کر کے اپنی حیثیت بڑی کر سکتا تھا؟ بہت سے وہ سوالات پوچھنا یاد آ گئے جو وہ اللہ داد سے برسوں کی رفاقت کے باوجود نہ پوچھ پایا تھا۔ کیا وہ خوش تھا؟ اس کی بیوی ایمان علی کے گاؤں والے گھر کی ملازمہ تھی۔ بیٹا کھیت پر مزدوری کرتا تھا۔ اس کے خستہ مکان کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ بیوی بچوں سے صرف اس دن ملتا جب ایمان علی ماں سے ملنے گاؤں جاتا تھا۔ کیا وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا؟ لیکن یہ سوالات پوچھنے کا وقت نہیں تھا۔ صبح ہوئی تو پوچھے گا۔ اس وقت تو ایک اور ہی کہانی لکھی جا رہی تھی۔

ایمان علی نے ایک بار پھر غور سے اللہ داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے کی لکیروں اور بیٹھنے کے انداز میں گہرا اطمینان چھپا تھا۔ ایمان علی نے سوچا یہ اطمینان شاید قناعت کا عطیہ تھا۔ وہ جس کے پاس کچھ نہیں تھا کتنا مطمئن تھا اور وہ جو سب کچھ رکھتا تھا۔ کتنا بے چین' مایوس اور اداس تھا۔

''اوپر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

''میری یہی جگہ ہے مالک!'' اللہ داد نے ایمان علی کا حکم سن کر ہاتھ جوڑ دیے۔

''اوپر بیٹھو!'' ایمان علی نے سختی سے کہا۔ اس کے پاس اس وقت مساوات کا فلسفہ سکھانے کا وقت نہیں تھا۔

اللہ داد کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ اچھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بمشکل اگلے کونے پر ٹکا ہوا تھا اور ذرا سا دھکا لگتے ہی گر سکتا تھا۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے کرسی کے دونوں ہتھے مضبوطی سے تھام لیے۔

''تمھیں ہیروشیما پتا ہے؟'' ایمان علی نے میز سے کتاب دوبارہ اٹھالی۔ اللہ داد نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''یہ جاپان کا شہر ہے جس پر امریکہ نے ایٹم بم گرایا تھا۔ میں تمھیں سناتا ہوں کیا ہوا تھا۔

ایمان علی کتاب کھول کر رواں انگریزی میں بلند آواز سے پڑھنے لگا۔ اللہ داد اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے ایک ایک لفظ سمجھ میں آ رہا ہو۔

''پیر ۶ اگست ۱۹۴۵ء کی تاریخی صبح امید کے سپنے دیکھتی ہوئی طلوع ہو رہی تھی۔ صبح کے ساڑھے پانچ بجے چین کے ساحل سے ایک بی۔ ۲۹ بمبار چنگھاڑتا ہوا ہیروشیما کے آفاق تک پہنچا تو جواب میں سائرن چیخ پڑے۔ سب بھاگتے ہوئے زمین دوز پناہ گاہوں میں چلے گئے اور بمباری کا انتظار کرنے لگے۔ دیر تک کوئی بم نہیں گرا' خطرہ ٹل گیا تو سب پناہ گاہوں سے باہر نکل آئے۔ شرمندہ شرمندہ سے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ کیا دشمن ان سے کھیل رہا تھا' ان کا مذاق اڑا رہا تھا؟ صبح کے ۸ بجے ان کا کاروبار معمول کے مطابق شروع ہونے لگا تو نگرانی کرنے والے تین طیارے آسمان پر نمودار ہوئے۔ سائرن ایک بار پھر بج اٹھے۔ انھوں نے بہت اہانت سے اوپر آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ صرف چند احتیاط پسند تھے جو پناہ گاہوں میں گئے' وہ دشمن کے کھیل سے تنگ آ گئے تھے۔ چند منٹوں بعد ایک بی ۲۹ طیارہ بہت بلندی سے گزرا اور غائب ہو گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب تاریخ ایک

مختصر سے لمحے کے لیے ٹھہر گئی تھی۔"

ایمان علی نے اللہ داد کو دیکھا جو پوری محویت سے سن رہا تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ ایمان کس زبان میں اور کیا سنا رہا تھا۔ اس کے لیے ایمان علی کی آواز کانوں میں رس گھولنے والی موسیقی کی طرح تھی۔ وہ کرسی پر اب آرام سے بیٹھ گیا تھا۔ ہتھوں پر گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ایمان علی نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔

"۸ بج کر ۱۴ منٹ ہوئے تھے کہ ہیروشیما کی پوری وادی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تیز چمک دار پیلی روشنی سے بھر گئی۔ کسی فوٹو گرافر کی چکا چوند کر دینے والی فلیش لائٹ کی طرح۔ ایک بڑا دھماکہ ہوا اور روشنی چمکنے کے صرف دس سیکنڈ بعد چھتیں تڑخنے لگیں۔ پورا ہیروشیما جلنے لگا تھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ مکان جل رہے تھے۔ عمارتیں گر رہی تھیں۔ بجلی اور فون کے کھمبے ماچس کی تیلیوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگے تھے۔ آسمان پر گہرا سیاہ غبار تھا۔ زمین پر سیاہ بارش ہو رہی تھی، جیسے پٹرول برس رہا ہو۔ آگ کے شعلے طوفان بن کر دوڑ رہے تھے۔

"لوگ شہر سے نکل کر بھاگنے لگے، لیکن کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ ان کے چہرے جلتے ہوئے لوہے کی طرح سرخ تھے۔ انھوں نے اپنے بدن سے کپڑے اتار پھینکے لیکن پانی میں نہا کر بھی جسم کی حدت کم نہیں ہوئی۔ گرتی ہوئی عمارتوں کے شیشوں کی کرچیاں انھیں گولیوں کی طرح نشانہ بنا رہی تھیں۔ دروازے اور کھڑکیوں کے فریم اڑتے ہوئے آ کر ان کے سروں پر گرنے لگے۔ چھتوں کے ملبوں میں دبے ہوئے جسموں کو آگ نے چاٹ لیا تھا۔ تباہی کی داستان میلوں میلوں اور قریہ قریہ پھیلی ہوئی تھی۔ کئی گھنٹوں بعد ٹوکیو سے ایک طیارہ پرواز کرتا ہوا آیا تو اس نے سو میل دور سے شہر پر گہرے دھوئیں کی چادر تنی ہوئی دیکھی۔ روشن چمک دار دوپہر میں تباہ شدہ شہر ابھی تک جل رہا تھا۔ وہ ہیروشیما نہیں، زمین کے چہرے پر لگا ہوا گہرا گھاؤ تھا۔"

ایمان علی نے آنکھیں بند کر کے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ "کیا یہی کچھ ہونے والا

تھا؟'' اس نے کتاب میز پر پٹخ دی۔ کیا وہ اسی طرح کرسی میں جھولتا ہوا کتاب پڑھتا اور شہر جلنے کے انتظار میں نیرو کی طرح بانسری بجاتا رہے گا۔ وہ اتنا بے بس تو کبھی نہیں تھا' لیکن وہ کیا کرسکتا تھا؟ اس کے سب رابطے ٹوٹ گئے تھے۔ وہ باہر نہیں جا سکتا تھا' کسی کو باہر سے اندر آنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی' صرف اللہ داد اس کے ساتھ تھا جو کتاب بند ہوتے ہی خودکار طریقے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ایمان علی نے سوچا اللہ داد کی مدد سے پہرے داروں کو چکمہ دے کر برابر کی چھت پر جایا جا سکتا تھا۔ صرف باہر کھڑے ہوئے پہرے داروں کا انتظام کرنا تھا۔ وہ دونوں کو اندر بلائے گا اور اللہ داد انھیں پستول دکھا کر قابو کرلے گا۔ ٹیرس پر پہرا دینے والے فوجی فاصلے پر تھے۔ وہ ان سے چھپ کر برابر کے گھر کی چھت پر پہنچ سکتے تھے۔ برابر میں سجاد علی رہتے تھے۔ ایمان علی کو یقین تھا وہ اس کا ساتھ دیں گے۔ شاید ان کا فون صحیح ہو۔ وہ ان کی گاڑی لے کر جی ایچ کیو جا سکتا تھا۔ جی ایچ کیو پہنچ کر کنٹرول دوبارہ حاصل کرسکتا تھا۔

اعتماد بحال ہوا تو ایمان علی اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا' لیکن تیز چمک دار پیلی روشنی نے آنکھیں خیرہ کردیں اور وہ بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ ایک لرزہ خیز دھماکہ ہوا اور چھت ترخنے لگی۔ شیشوں کی کرچیاں برچھیوں کی طرح آکر جسم میں پیوست ہوگئیں۔ کھڑکی کا فریم قبضہ چھوڑ کر اندر آگرا۔ اس کے ساتھ ہی آگ اور دھویں کا تیز ریلا اندر گھس آیا۔ ایمان علی کی انگلیاں پگھل کر کرسی کے جلتے ہوئے ہتھوں میں دھنس گئیں۔ کرسی کے ساتھ ایمان علی کا جسم بھی شعلہ بن گیا تھا۔

اللہ داد دھماکہ ہوتے ہی پستول ہاتھ میں لے کر شکاری کتے کی طرح باہر بھاگا' لیکن آگ کے تیز ریلے نے اسے واپس اندر دھکیل دیا۔ باہر دونوں پہرے دار اپنے اپنے جسم کی آگ بجھانے زمین پر لوٹ رہے تھے۔ اللہ داد کے ہاتھ میں دہکتے ہوئے لوہے نے اس کی انگلیاں پگھلا دیں' پھر بھی اس نے ایمان علی کی طرف جست لگائی۔ اسے کسی طرح ایمان علی

کے جسم کی آ گ بجھانا تھی۔ وہ جیسے ہی ایمان علی کے نزدیک پہنچا چھت سے ایک بڑے سے ٹکڑے نے گر کر اس کا سر پاش پاش کر دیا۔ ایمان علی کی کرسی جل کر زمین بوس ہوئی تو اس کی لاش بھی زمین پر اللہ داد کی لاش کے برابر گر پڑی۔ دونوں کے جسموں سے اٹھتے ہوئے شعلے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ اسی وقت کمرے کی باقی چھت بھی ٹوٹ کر آن گری۔

سر پر کچھ نہیں تھا، آسمان کہیں کھو گیا تھا۔ ہر طرف گہرا کالا دھواں چھایا تھا یا آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ ایمان علی کی آنکھوں کے ڈھیلے پگھل کر بہہ گئے تھے اور خالی حلقے آسمان کی طرف رخ کیے گہرے کالے دھویں کے پیچھے چھپی ہوئی کسی روشن چمک دار صبح کو تک رہے تھے۔

صدرِ محترم!

19

نئی امید!

"تمھیں صدرِ محترم سے کب ملنا ہے؟"

"پانچ بجے! نہ ایک منٹ پہلے نہ ایک منٹ بعد۔" ساحل نے تکریم کو جواب دیا۔ دونوں اسلام آباد کی مرکزی شاہراہ کے کنارے ایک ٹوٹے ہوئے پتھر پر بیٹھے تھے۔ وہ ان امدادی ٹیموں کا حصہ نظر آتے تھے جن کے اِدھر سے اُدھر بھاگتے ہوئے کارکن کبھی کبھی تھک کر ٹوٹی ہوئی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ملبے کے کسی پتھر پر جا بیٹھتے۔ یہ ان عمارتوں کا ملبہ تھا جو کبھی اقتدار کی علامت تھیں، لیکن اب انھیں دیکھ کر آنکھوں میں ویرانی سمانے لگتی تھی۔

چاروں طرف رنگ برنگے خیموں کا جال پھیلا تھا۔ بڑے بڑے سفید خیمے امدادی

ہسپتال تھے۔ ہر خیمے پر اس کے ملک کا جھنڈا لگا تھا۔ شاید ہی کوئی بڑا ملک بچا ہو جس کی امدادی ٹیمیں موجود نہ ہوں۔ ایک خیمے پر ہندوستان کا جھنڈا بھی تھا۔ اس کا سہرا صدر محترم کے سر تھا۔ انھوں نے لاہور سے ایک امدادی ٹیم نئی دہلی بھیجی تھی۔ تباہی وہاں بھی کم نہیں آئی تھی۔ بڑے بڑے لال پتھروں سے بنی ہوئی شاہانہ عمارتیں جہاں حکومت کرنے والے بیٹھتے تھے' ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں۔ درد کی لکیر نکل کر دور تک پھیل گئی تھی۔ دونوں طرف سسکیوں اور آہوں کا شور یکساں تھا۔ دونوں طرف لاکھوں قبریں تھیں' لاکھوں مردے جلائے گئے تھے۔ جواب میں بھارت نے بھی امدادی ٹیمیں پاکستان بھیجی تھیں۔ ایک دوسرے پر تباہی تھوپنے کے بعد اب دونوں گلے مل کر ایک دوسرے کا درد بانٹ رہے تھے۔

صرف غیر ملکی ٹیمیں ہی نہیں آئی تھیں' اندرون ملک سے امدادی دستوں کا سیلاب بھی آیا ہوا تھا۔ حکومت نے اسلام آباد میں داخلہ محدود کر دیا تھا۔ صرف انھی لوگوں کو آنے کی اجازت ملتی جن کی ضرورت تھی۔ اکثر امدادی ٹیموں کا رخ شمالی علاقوں کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں نسبتاً کم تباہی آئی تھی' پھر بھی ہزاروں لوگ مرے تھے۔ تباہی سرحد پار کر کے افغانستان کے سرحدی علاقوں تک بھی پہنچی تھی۔

جس ایوانِ صدر پر ایمان علی نے سیاسی عجائب گھر بنایا تھا اسی کے ملبے کے سامنے بڑے سے سپاٹ احاطے کی جلی ہوئی گھاس پر سبز رنگ کے کئی خیمے تھے جن کے گرد رسی کا گھیرا ڈال دیا گیا تھا۔ باہر ایوان صدر کا بورڈ لگا تھا۔ درمیان میں نسبتاً بڑا سا خیمہ تھا جس پر صدر محترم کا نام لکھا تھا۔ یہ نئی حکومت کی عارضی قیام گاہ تھی۔ صدر محترم نے کھنڈرات کے درمیان بیٹھ کر صرف چند ہفتوں کے اندر اندر ملکی معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ لوگ ابھی تک سکتے اور غم کی کیفیت سے نکلے نہیں تھے' لیکن صدر محترم کے بہادرانہ فیصلوں نے ان کے دلوں میں امید کی شمعیں روشن کر دی تھیں۔

''یہ کھنڈرات کب تک یوں ہی رہیں گے؟'' تکریم نے پتھر پر لگی ہوئی سیاہی کھرچتے

ہوئے پوچھا۔

''ہمیشہ!'' ساحل نے تکریم کو غور سے دیکھ کر کہا۔ وہ باہر سے پرسکون لیکن اندر سے بہت بے چین نظر آتی تھی۔ ''صدر محترم یہ عبرت کدہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لوگ یہاں آئیں گے اور امن کی دعائیں مانگیں گے۔ یہیں ہر سال ایٹمی حملے کی یاد منائی جائے گی۔''

''تم نے خاموش رہ کر اچھا نہیں کیا۔'' تکریم کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''اتنی بڑی تباہی لانے والے آنکھوں کا تارا بنے ہوئے ہیں۔'' تکریم نے سامنے تنے ہوئے سب سے بڑے سفید خیمے کو دیکھا جس پر امریکی جھنڈا لہرا رہا تھا۔

''میں نے سب کچھ صدر محترم کو دے دیا تھا۔ رابرٹ نیلسن کا حلفیہ بیان بھی جو اس نے مجھے بھیجا تھا اور اپنا بیان بھی۔ میرا خیال تھا صدر محترم خود اتنے بڑے انٹرنیشنل اسکینڈل کا پردہ چاک کریں گے۔ ان کا اثر زیادہ ہوگا اور سب کو یقین بھی آ جائے گا' لیکن انھوں نے منع کر دیا۔''

''کیوں؟''

''کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ امریکہ کو دشمن بنا کر ہم امریکی امداد سے محروم ہو جاتے۔ فائدہ صرف بھارت کو پہنچتا جہاں امریکی دلچسپی زیادہ ہے۔ صدر محترم کا خیال ہے اگر امریکہ نے بھارت سے ترجیحی سلوک کرنا چاہا تو رابرٹ نیلسن کا حلف نامہ ٹرمپ کارڈ کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ امریکہ کبھی نہیں چاہے گا کہ یہ راز افشا ہو۔''

''تم اسی لیے حکومت میں شامل نہیں ہوئے؟''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔'' ساحل نے ایک گہری سانس لی۔ ''شروع میں غصہ آیا تھا۔ پھر ٹھنڈے دماغ سے سوچا اور صدر محترم کے فیصلے کے فائدے نظر آئے تو اپنی بے عقلی پر غصہ آیا۔''

''تو پھر شامل کیوں نہیں ہوئے؟''

''مجھے دل چسپی نہیں ہے۔ حکومت کرنے والوں میں سرد مزاجی اور دور اندیشی بہت ضروری ہے۔ ان کا وژن بہت صاف ہونا چاہیے۔'' ساحل کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''ڈیڈی کہا کرتے تھے میں اپنے دادا کی طرح ہوں۔ خواب دیکھنے اور جلد مایوس ہو جانے والا۔ ایسے لوگ حکومت کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔'' ساحل نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ ''ڈیڈی میری بات پر یقین کر لیتے تو شاید یہ تباہی نہ آتی۔

''تمھیں پتا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔'' تکریم نے ساحل کو ہم دردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے ضمیر پر کتنا بھاری بوجھ لیے بیٹھا تھا۔ ''حملے میں بچ جانے والا کرنل ایوانِ صدر کے آخری لمحوں کا شاہد ہے۔ اس نے جو کچھ بتایا ہے اس نے تمھارے ڈیڈی کو ہر ذمے داری سے بری کر دیا ہے۔ فوج حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ نہ تمھارے ڈیڈی نہ صدر ایمان علی!''

''شاید تم صحیح کہتی ہو۔'' ساحل نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''صدر محترم نے کرنل شفقت کی پریس کانفرنس کے دوران موجود رہ کر اچھا کیا۔ صدر ایمان علی کا نام صاف ہو گیا۔ صدر ایمان علی نے آخری وقت تک تباہی روکنے کی کوشش کی تھی۔''

''صدر محترم نے اچھا کیا جو فی الحال فوجیوں کی وردیاں اتروا دی ہیں۔ لوگ انھیں معاف نہیں کرتے۔''

''یہ وقتی فیصلہ نہیں ہے۔'' ساحل نے اداسی جھٹک دی۔ ''مستقبل کے پاکستان کا جو نقشہ بنا ہے اس میں فوج کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صدر محترم نے حلف اٹھانے سے پہلے اپنا فیصلہ بتا دیا تھا۔ سب نے تائید کی۔ اس کے بعد حلف اٹھایا تھا۔''

''فوج کے بغیر ملک کیسے رہ سکے گا؟''

''فوج کے ساتھ رہ کر بھی ملک کو کیا ملا؟ یہ تباہی!'' ساحل نے اردگرد پھیلے ہوئے ملبے کو دیکھ کر کہا۔ ''صدر محترم جو نئی بارڈر سیکورٹی فورس قائم کر رہے ہیں وہ سرحدوں پر لڑائی نہیں،

ان کی پہرے داری کرے گی۔ پولیس' انٹرنل سیکورٹی فورس میں ضم ہو جائے گی۔ دفاع کی ذمہ داری اقوام متحدہ نے لی ہے۔''

''بے چاری اقوام متحدہ!'' تکریم نے افسوس سے سر ہلایا۔

''اقوام متحدہ کے فیصلے کو بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے۔ ملبہ صاف ہوتے ہی اقوام متحدہ کی فوج کمان سنبھال لے گی۔ کشمیر بھی آخری فیصلہ ہونے تک اقوام متحدہ کی نگرانی میں رہے گا۔ ایسٹ تیمور کی طرح۔''

''آخری فیصلہ! وہ کب ہوگا؟''

''جب بھی ہو۔ اس وقت تو صرف ایک نکاتی ایجنڈا ہے۔ امدادی کام اور امدادی کام۔''

''تم کیا کرو گے؟''

''امدادی کام!'' ساحل مسکرایا۔ میں امدادی ایجنسیوں کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تباہی نہ آئی ہوتی تب بھی شاید یہی کرتا۔ کسی کو مٹھی بھر آٹا' سر پر ایک چھپر' دوا کی ایک خوراک' پڑھنے کے لیے ایک کتاب' یہی مقصد ہے۔''

''صدر محترم نے کوئی ذمے داری دی تو کیا منع کر دو گے؟''

''نہیں! یہ نہ کہنے کا وقت نہیں ہے۔ صدر کے احکامات ہماری خواہشات کے تابع نہیں ہو سکتے۔ اس سے صرف انتشار پھیلے گا۔ یہ وقت ڈسپلن توڑنے کا نہیں ہے۔''

''تم مجھے کیوں ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟''

''اس کے بعد تمھیں بہت دنوں تک صدر محترم سے ملنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ میں نے بتا دیا تھا تم میرے ساتھ ہوگی۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' تکریم کی نگاہوں میں صدر محترم کا چہرہ سما گیا۔ ''ایک نوجوان کو جسے پاکستان میں کوئی نہیں جانتا تھا' کیسے قبول کر لیا گیا؟''

''کوئی چارہ نہیں تھا۔'' ساحل خاموش ہوگیا۔ لمبے سفید کوٹ اور چہروں پر سفید نقاب پہنے غیر ملکی کارکنوں کی ایک ٹولی سامنے سے گزر رہی تھی۔ ''انھیں کون جانتا ہے؟ یہ مدد کرنے آئے تو سب نے انھیں سر پر بٹھالیا ہے۔ لوگ پرانا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہر سیاست دان کو قصوروار سمجھتے ہیں۔ کوئی کوشش کرتا تو اس کی بوٹیاں نوچ لیتے۔ صدر محترم کا تعلق ویسے بھی حکم ران خاندان سے ہے۔ ان کے نانا اپنے زمانے میں بادشاہ گر تھے۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ سے واپس آ کر سب بندوبست کر دیا تھا۔ کوئی چوں نہ کر سکا' لیکن صدر محترم نے حلف اٹھاتے ہی اپنے نانا کو ہر معاملے سے بے تعلق کر دیا ہے۔ صدر محترم کا عوام سے درد کا رشتہ بھی ہے۔ ان کا پورا خاندان ہلاک ہوا ہے۔''

''ہمارا اور تمھارا بھی!'' تکریم نے ایک لمبی سانس لی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی۔ ''پچھلے چند ہفتوں میں اتنی سسکیاں اور آہیں سنی ہیں اور اتنے زخم دیکھے ہیں کہ اپنا غم یاد نہیں رہا۔''

اسی وقت ان کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک شخص ٹھٹک کر رک گیا۔ اور ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ ڈاکٹروں والا لمبا سفید کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ لیکن چہرے پر ماسک نہیں تھا۔

''تکّی کیسی ہو؟''

تکریم نے مخاطب کو نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایک لمحے تک پہچان نہیں سکی۔ داڑھی نے چہرہ چھپالیا تھا' لیکن آنکھیں وہی تھیں۔ بڑی بڑی اور چمک دار جن میں کبھی شرارت ناچا کرتی تھی۔

''تم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' تکریم کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔

''اپنے گناہ بخشوانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس جنگ نے میری وہ بیٹی چھین لی جسے میں کبھی دیکھ نہیں سکا تھا۔'' اس کے لہجے میں گہری اداسی تھی۔

تکریم نے جواب نہیں دیا۔ ماتھے پر ناگواری کی شکنیں پڑی رہیں۔

’’میں ڈاکٹر مقصود ہوں۔‘‘ اس نے ساحل کی طرف مڑ کر ہاتھ بڑھایا۔ ساحل کی سمجھ میں تکریم کی ناگواری کی وجہ آ گئی۔

’’ساحل!‘‘ اس نے مقصود سے ہاتھ ملا کر اپنا تعارف کرایا۔ ’’تکریم اور میرے والدین بھی اس جنگ میں ہلاک ہوئے ہیں۔ ہم امدادی ٹیموں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔‘‘

’’آپ اس تباہی کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکے؟‘‘ مقصود نے اسے تیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ’’میں مِکّی بابا ہوں جس نے آپ کو نواب ٹن کا پیغام پہنچایا تھا۔‘‘

’’اوہ!‘‘ ساحل کو اب پتا چلا اس کی آواز جانی پہچانی کیوں لگ رہی تھی۔ ’’نواب ٹن کہاں ہیں؟‘‘

’’وہاں جہاں اور سب ہیں۔‘‘ مقصود نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ’’جس دن جنگ ہوئی تھی۔ وہ سخت بے چین تھے۔ اپنے نوکر کو چیخ چیخ کر بتا رہے تھے تباہی آنے والی ہے۔ کانوں پر ہاتھ رکھے کمرے میں ناچتے پھر رہے تھے۔ شاید کانوں میں دھماکے گونج رہے تھے۔ ایک بار بالکونی سے کودنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ان کے نوکر نے کودنے سے بچایا تو بہت سی گولیاں نگلیں اور شراب پینے لگے۔ کچھ ہی دیر میں دل کی دھڑکن رک گئی۔‘‘

ساحل کو جانے کیوں بے حد دکھ ہوا۔

’’ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔‘‘ مقصود نے تکریم کی طرف متوجہ ہو کر کہا اور تیزی سے خیموں کی طرف چلا گیا۔ تکریم اور ساحل کچھ دیر تک بالکل خاموش رہے۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

’’ایک وہی نہیں ہزاروں واپس آئے ہیں۔‘‘ ساحل نے خاموشی توڑی۔ ’’میں سوچتا تھا وہ نسل نایاب ہو گئی ہے جو آئیڈیل بنایا اور خواب دیکھا کرتی تھی۔ سب اپنی اپنی دنیا کے خواب دیکھتے ہوئے پیدائش سے موت تک ایک تنگ دہانے کی سرنگ میں سفر کرنے والے روبوٹ بن کر زندہ تھے۔ اس تباہی کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے علاوہ دوسروں کے لیے

بھی زندہ رہنا سیکھ رہے ہیں۔''

''نینی آپا بھی ہمیشہ کے لیے پاکستان آرہی ہیں۔''

''واقعی!'' ساحل سچ مچ حیران ہو گیا۔

''وہ خود کو انکل رحمان اور اپنی بیٹی کی موت کا ذمے دار سمجھتی ہیں۔ انھوں نے ہی انکل کو سومی کے ساتھ اسلام آباد رہنے کے لیے بھیجا تھا۔ انھوں نے اپنا کاروبار اور اپنی اور انکل کی ساری جائیداد بیچ دی ہے۔ وہ پاکستان میں ایک بڑا امدادی ادارہ قائم کریں گی اور یہیں رہیں گی۔ انھوں نے فون کیا تھا تو کہہ رہی تھیں اب ان کی زندگی کا بس یہی ایک مقصد ہے۔''

''وہ زبردست انتظامی صلاحیت رکھتی ہیں' پاکستان کے لیے ایک بڑا اثاثہ ثابت ہوں گی۔'' ساحل نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

''انھوں نے مجھ سے ساتھ دینے کے لیے کہا ہے' میں نے ہاں کہہ دی ہے۔ ان کے آتے ہی ہسپتال چھوڑ دوں گی۔'' تکریم نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آؤ چلیں وقت ہو گیا ہے۔''

ساحل اسی طرح بیٹھا رہا۔ تکریم اسے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

''تمھاری اور میری امی زندہ نہیں ہیں۔'' ساحل ہمت کر کے اندر کا مکالمہ باہر لایا۔ ''میں اب تمھارا ہاتھ کس سے مانگوں۔''

''کیا یہ ان باتوں کا وقت ہے؟''

''ہاں یہی وقت ہے۔ ہم نئی ابتدا کر رہے ہیں۔ یہ سفر ہم تنہا نہیں کر سکتے۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد تکریم نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ ''نینی آپا کو آنے دو' ان سے پوچھیں گے۔''

ساحل کھڑا ہو گیا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ تکریم نے جو کچھ کہا تھا شاید وہی

اس کی ہاں تھی۔

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سبز خیموں والے ایوان صدر کی طرف بڑھے۔ جس خیمے کے سامنے صدر محترم کا بورڈ نصب تھا اس کے باہر میز کرسی ڈالے ایک لڑکی آنے اور جانے والوں کا رجسٹر کھولے بیٹھی تھی۔ اس نے رجسٹر پر ساحل اور تکریم کے ناموں کے آگے نشان لگایا اور مسکرا کر انھیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس وقت ایک غیر ملکی وفد خیمے سے باہر نکل رہا تھا۔ ساحل اور تکریم انھیں راستہ دینے ایک طرف ہو گئے۔ خیمے کے باہر یا اندر کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ ساحل اور تکریم اندر آئے تو سامنے ایک بڑی سی میز کے سرے پر صدر محترم اپنے سامنے لیپ ٹاپ کمپیوٹر کھولے تنہا بیٹھے تھے۔ خیمے کے مختلف حصوں میں چھوٹی چھوٹی میزیں لگی تھیں جن کے پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ کچھ نہ کچھ کر رہے تھے۔ ہر ایک کے سامنے کمپیوٹر اور زمین پر فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔

ساحل اور تکریم نزدیک آئے تو صدر محترم نے اٹھ کر ساحل کو گلے لگایا اور تکریم کے گالوں پر بوسہ دیا۔ تکریم حسب عادت سرخ ہو گئی۔ دونوں صدر محترم کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

''صدر محترم......''

''تمھارے لیے صدر محترم کہنا ضروری نہیں۔'' صدر محترم ساحل کا جملہ کاٹ کر مسکرائے۔ ''میں تمھارے لیے وہی پرانا میک اور تکریم کے لیے مکرم ہوں۔'' صدر محترم تکریم کی طرف متوجہ ہو کر ہنسے۔ ''سیلما بھی پاکستان آ کر سلمٰی ہو گئی ہے۔ سلمٰی قریشی!''

''کیا واقعی؟ کہاں ہیں وہ؟''

''شمالی علاقوں میں' وہاں کے امدادی کاموں کی نگرانی کرنے۔'' صدر محترم سنجیدہ ہو گئے۔ ''تم کچھ دنوں کے لیے جا کر اس کا ہاتھ بٹا سکو تو وہ بہت خوش ہو گی۔ وہاں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔''

یہ صدارتی حکم نہیں، ایک خواہش کا اظہار تھا۔ لیکن تکریم زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔ نگاہیں مکرم قریشی کے چہرے پر جمی تھیں۔ یہ نیو یارک والا میک نہیں تھا جس کے کندھے پر ہر وقت سیلما کا سر ٹکا رہتا تھا۔ کان کی بالی بھی غائب تھی۔ ٹی شرٹ اور جینز کی جگہ نیلے رنگ کا سوٹ اور سلیقے سے بندھی ہوئی ٹائی۔ بال بھی قاعدے سے سنورے ہوئے تھے۔ ساحل بھی مکرم قریشی کو دیکھ کر سوچ رہا تھا وہ صدر محترم کے بار بار کے اصرار کے باوجود انھیں میک نہیں کہہ سکے گا۔

''ساحل! مجھے پتا ہے تم حکومت میں شامل ہونا نہیں چاہتے۔'' صدر محترم براہِ راست مطلب کی طرف آ گئے۔ رسمیات کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ ''مجھے تمھارا صرف ایک سال چاہیے، اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔'' صدر محترم نے ایک موٹی سی فائل ساحل کی طرف کھسکائی۔

''میں نے ہر صوبے میں خصوصی ٹیمیں بھیجی ہیں، صرف سندھ باقی ہے۔'' صدر محترم نے ساحل کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سندھ میں میرے نمائندے تم ہو گے۔ تمھیں کل صبح روانہ ہونا ہے۔ گورنر ہاؤس میں تمھارا انتظار کیا جائے گا۔ وہاں تمھاری میز لگا دی گئی ہے، لیکن تم زیادہ دیر میز پر نہیں بیٹھو گے۔ ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں جاؤ گے۔ دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو سکتا ہے۔ گورنر سندھ اور ان کی انتظامیہ تم سے تعاون کرے گی۔ تم......''

صدر محترم فائل کے ورق پلٹ کر اسے ایک ایک بات بتا رہے تھے اور ساحل بہت جوشیلے انداز میں سوالات کرتا ہوا ہر بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں کچھ دیر کے لیے وہاں بیٹھی ہوئی تکریم کو بھول گئے تھے۔

صدر مکرم قریشی کے پچھلے خیمے کی دیوار پر صدر ایمان علی کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ ہلکے سے اندھیرے کے باوجود ایمان علی کی مسکراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ تکریم کی نظریں صدر محترم پر واپس آئیں تو اسے ایمان علی کی تصویر مکرم قریشی کے چہرے پر جمی ہوئی نظر آئی۔

دونوں ایک ہو گئے تھے۔ مسکراہٹ بھی ایک جیسی تھی۔ تکریم نے اپنی وہ کتاب کھول لی جو وہ صدرِ محترم کا آٹوگراف لینے ساتھ لائی تھی۔ وہ ورق سامنے آ گیا جس پر صدر ایمان علی نے اسے آٹوگراف دیا تھا۔

''مستقبل کے مسیحا کے نام!''

روشنی کی ایک لکیر نکلی اور صدر محترم کے خیمے میں پھیل گئی۔

......ختم شد......

اشرف شاد کے بے لاگ قلم سے نکلا ہوا

ایک اور سچ

نیا زیرِ تحریر ناول

جج صاحب

ایک ایسے جج کی کہانی جس نے ظالموں سے مل کر
انصاف کا ترازو توڑ دیا تھا۔

دوست پبلی کیشنز 8A خیابان سہروردی، اسلام آباد

۱۹۹۷ء کے بہترین ناول کا

''وزیراعظم ادبی ایوارڈ'' حاصل کرنے والا

اشرف شاؔد کا پہلا ناول

بے وطن

''اشرف شاؔد کی بے وطن ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے علم میں اضافہ ہوا ہے......''

شوکت صدیقی

''اشرف شاؔد نے بے وطن میں ایک ناول کی تکمیل کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں ایک اہم ناول نگار چھپا ہوا تھا جو اپنے تخلیقی کرب کے حوالے سے خود ہی ظاہر ہوا اور اپنی صلاحیتوں کو منوالے گیا۔''

پروفیسر سحر انصاری

''بے وطن اتنا دلچسپ ناول ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم کرنا ضروری ہو جائے گا۔''

عبیداللہ بیگ

دوست پبلی کیشنز 8A خیابان سہروردی، اسلام آباد

اقتدار کی میوزیکل چیئر کھیلنے والوں کی کہانی

اشرف شاد کا تہلکہ خیز ناول

وزیراعظم

''سیاسی موضوعات کو ناول کی بنیاد بنانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام اشرف شاد جیسا ماہر صحافی ہی کر سکتا تھا جو اس ملک میں اقتدار کے بے رحمانہ کھیل کا نزدیک سے جائزہ لیتا رہا ہے۔''

احمد ندیم قاسمی

دوست پبلی کیشنز 8A خیابان سہروردی، اسلام آباد

اشرف شاد کی تصنیفات

نصاب (شعری مجموعہ)

بے وطن (ناول)

وزیر اعظم (ناول)

آ مرے قریب آ (شعری مجموعہ)

صدرِ محترم (ناول)

رابطے کا پتہ:

سڈنی : 208/99, Jones St.

ULTIMO, NSW 2007

AUSTRALIA

العین : P.O.Box 17551

UAE University

Al Ain, UAE

برقی ڈاک : ashrafshad@hotmail.com

بے وطن اور وزیراعظم کے بعد صدر محترم اشرف شاد کا تیسرا ناول ہے جو پاکستان، ہندوستان، امریکہ اور برازیل کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اشرف شاد شاعر بھی ہیں اور ان کے دو مجموعے ''نصاب'' اور ''آمرے قریب آ'' شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سڈنی میں ریڈیو کی اردو سروس کے سربراہ ہیں اور بیشتر وقت متحدہ عرب امارات میں گزارتے ہیں جہاں وہ یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیق سے اور ان کی بیگم ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاد تدریس و تحقیق سے وابستہ ہیں۔

صدر محترم

یہ صدر ایمان علی کی کہانی ہے جو جنرل منصف خان کی مدد سے برسر اقتدار آ کر ایوان صدر کو عجائب گھر اور ایک چھوٹے سے مکان کو ایوانِ صدر بنا دیتا ہے۔ وہ حکمران طبقوں کی کمر توڑ کر نیا سیاسی اور معاشی ڈھانچہ بناتا ہے لیکن نیا فوجی سربراہ جنرل اکبر میزائل چلانے والے بٹن پر انگلی رکھ دیتا ہے۔ ایک سابق صدر، سردار، جو دوبارہ صدر بننے کے لیے ایک امریکی صحافی سے شادی کرنا چاہتا تھا، ایمان علی کو چیلنج کرتا ہے۔ فیاض منگی سردار کی پشت پناہی کرنے والی طاقتوں کا نمائندہ ہے۔ وہ سندھ کے ایک گاؤں سے تحصیل دار بننے نکلا تھا اور ملک کا سب سے طاقت ور بیوروکریٹ بن کر وزیراعظم بننے کا خواب دیکھنے لگا تھا......

ایک گولی چلتی ہے، ایک دھماکہ ہوتا ہے اور...... ایک خیمے میں بیٹھا نیا صدر نئے پاکستان کی بنیاد رکھتا ہے۔

ISBN: 969-496-228-5